فریبِ خدائی
رچرڈ ڈاکنز

# فریبِ خدائی

از

رچرڈ ڈاکنز

ڈگلس ایڈمز کی یاد میں ۱۹۵۲ – ۲۰۰۱

’کیا باغ کی خوبصورتی کی تعریف کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں بسنے والی پریوں پر بھی ایمان لایا جائے‘؟

# فہرست

# پیپر بیک اشاعت کا دیباچہ

میری کتاب The God Delusion کی مجلّد اشاعت سنہ ۲۰۰۶ میں حیران کن حد تک کامیاب رہی۔ Amazon کو بھیجی گئے ۱۰۰۰ سے بھی زائد ای میل پیغامات میں قارئین نے اپنی والہانہ ستائش اور ذاتی خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے بر عکس اخبارات میں شائع ہونے والے تجزیے اتنے حوصلہ افزا نہیں تھے۔ کوئی ناقد ان منفی تجزیات کو کمزور تخیّل کے حامل کسی مدیر کے سنکی پن پر تھوپ دیتا: 'کتاب کے عنوان میں "خدا" کا لفظ شامل ہے؛ اس کتاب کو کسی مذہبی تجزیہ نگار کو بھیج دو'۔ زیادہ تر منفی تجزیے اس جیسے خطرے سے بھرپور جملے سے شروع ہوتے ہیں: "اگر چہ میں ملحد ہوں لیکن..."۔ ڈانیئل ڈینیٹ اپنی کتاب Breaking the Spell میں لکھتے ہیں کہ دانشوروں کی ایک کثیر تعداد "ایمان" پہ یقین رکھتی ہے، اگر چہ بذات خود یہ خواتین و حضرات ملحد اور دہریے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا دوسرے درجے کا یہ "ایمان" اصل سے زیادہ پر جوش ہوتا ہے اور ان میں یہ جوش ان کی خوشامدانہ روشن خیالی کی بدولت ظاہر ہوتا ہے: "افسوس! میں آپ کے عقاید پر ایمان تو نہیں رکھتا لیکن ان کا احترام کرتا ہوں اور ان سے ہمدردی رکھتا ہوں"۔

"میں دہریہ ہوں لیکن...." کے بعد آنے والا جملے کا باقی حصہ ہمیشہ ہی یا تو تقریباً ناکارہ ہوتا ہے، یا عدم اعتقاد سے بھرپور، بالکل مہمل یا متفاخرانہ منفیت سے لبریز ہوتا ہے۔ ان ناقدین کے ایک اور ہر دل عزیز جملے پر غور کیجئے: "میں ملحد ہوا کرتا تھا لیکن...."۔ یہ ناقدین کے قدیم ترین حربوں میں شمار کیا جا سکتا ہے، جو سی ایس لویس سے لے کر دور حاضر تک کے مذہب کے تمام حمایتی بصد شوق استعمال کرتے ہیں۔ اس حربے کے استعمال سے یہ دانشور اپنے مقالہ کے شروع میں ہی اپنی "قابلیت" کا سکہ منوانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ آپ اس حربے کی کامیابی سے حیران ہوں گے؛ اس سے محتاط رہیں۔

میں نے اپنی ویبسائٹ RichardDawkins.net میں "میں دہریہ ہوں لیکن...." کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا تھا۔ اور اس میں کی گئی بحث کو اپنی کتاب کے خلاف کی گئی تنقید کے بارے میں مزید گفتگو کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ میرے قابل دوست جاش ٹموسن کی زیرادارت اس ویبسائٹ پر بہت سے احباب نے تنقید کے خلاف بھرپور اور کئی بار مجھ سے اور میرے دوستوں اے سی گریلنگ، ڈانیئل ڈینیٹ، پال کرٹز، سٹیون وائنبرگ سے زیادہ جارحانہ زبان میں میری کتاب کا دفاع کیا ہے۔ (ان دوستوں کے خیالات آپ کو اس ویبسائٹ پر مل سکتے ہیں)۔

## آپ مذہبی کتابوں کا تفصیلی مطالعہ کئے بغیر مذہب پر تنقید نہیں کر سکتے ہیں

حیران کن حد تک کامیاب کتاب؟، اپنی ہی دانشورانہ صلاحیتوں سے مرعوب ایک نقّاد نے لکھا "اگر میں نے اکویناس (Aquinas) اور ڈنس سکاٹس (Duns Scotus) کے متضاد نظریات علم (epistemological differences) کا موازنہ کیا ہوتا"۔ اگر میں نے ایروجینہ کی داخلیت، راہنر کے فضل، یا مالٹمین کی امید کے ساتھ ہی انصاف کیا ہوتا (جیسا کہ شاید خود ناقد کو مجھ سے امید رہی ہو گی)، تو میری یہ کتاب یقیناً کامیاب سے زیادہ معجزاتی گردانی جاتی؛ لیکن مسئلہ یہ نہیں ہے۔ سٹیفن ہاکنگ کے برعکس، (کہ جس نے ناشرین کی اس تجویز کو قبول کر لیا تھا کہ کتاب میں چھپنے والا ہر فارمولا اس کی کتاب کی فروخت کو آدھا کر دے گا)، اگر مجھے ذرا سا بھی یقین ہوتا کہ ڈنس سکاٹس سے میری کتاب میں پوچھے گئے خدا کے وجود کے سلسلے میں مرکزی سوال کا جواب تلاش کرنے میں مدد ملے گی، تو میں بخوشی اس کی کامیابی کو قربان کر دیتا۔ الٰہیات کے موضوع پر لکھی گئی زیادہ تر کتابوں میں خدا کے وجود کو شروع میں ہی فرض کر لیا جاتا ہے، اور یہیں سے مصنفین بات آگے بڑھاتے ہیں۔ اپنے مقاصد کے لئے مجھے صرف ان ہی مصنفّین پر توجہ دینے کی ضرورت ہے جو وجودِ خدا کے انکار کے بارے میں سنجیدہ ہیں اور پھر اس کے ہونے کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرے مطابق باب ۳ میں اس مسئلہ پر مزاحیہ انداز میں خاطر خواہ جامعیت کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔

جب بات مزاح کی آتی ہے تو میں "درباری کا جواب" سے بہتر مزاح نہیں لکھ سکتا جسے پی زیڈ مائرز نے اپنی ویبسائٹ Pharyngula میں شائع کیا ہے۔

> مجھے ڈاکنز صاحب کے گستاخانہ الزامات کی کم علمی پر شدید غصہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے کاونٹ راڈریگو آف سیویل کے شہنشاہ کے چرمی جوتوں کے سلسلے میں تفصیلی مباحثے پڑھنے کی زحمت ہی نہیں کی اور نہ ہی شہنشاہ کے پروں والی ٹوپی کے بارے میں بیلینی کے رقم شدہ شاہکار کو ہی کوئی اہمیت بخشی۔ ہمارے پاس شہنشاہ کے دلکش ملبوسات کے بارے میں بیش بہا عالمانہ صحیفے موجود ہیں، اور ہر بڑے اخبار میں شاہی انداز لباس کے بارے میں خاص سیکشن شائع ہوتا

ہے.... ڈاکنز نے اپنے غرور میں ان سب گہرے فلسفیانہ تخیّلات کو نظر انداز کرتے ہوئے شہنشاہ پر برہنگی کا الزام لگایا ہے... جب تک کہ ڈاکنز پیرس اور میلان کے درزی خانوں میں کام نہ سیکھ لے، جب تک کہ اسے جھالر اور پھولی ہوئی شلوار کا فرق معلوم نہ ہو جائے، ہم سب کو اس کے ساتھ ایسا روّیہ رکھنا چاہئے جیسے اس نے کچھ کہا ہی نہیں۔ حیاتیات کے شعبے میں اس کی تربیت نے بھلے اس کو معلّق عقدی شکبہ (dangling ganglia) کو پہچاننے کی قابلیت بخش دی ہو، لیکن اس تربیت نے اسے خیالی کپڑے کی پہچان کرنے کی صلاحیت عطا نہیں کی۔

ہم اس نقطے کی مزید وضاحت یوں کر سکتے ہیں کہ ہم میں سے اکثر پریوں، علم نجوم، یا Flying Spaghetti Monster کو "پاسٹا فیرین مذہب" کی کتابیں پڑھے بغیر نظر انداز کرنے میں کوئی عذر محسوس نہیں کرتے۔

اگلی تنقید بھی اسی تنقید سے منسلک ہے: "تنکوں کے آدمی" کی عظیم یلغار۔

**آپ ہمیشہ مذہب کے برے پہلوؤں پر حملہ کرتے ہیں اور اس کی اچھائیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔**

"آپ ٹیڈ ھاگرڈ، جیری فالویل اور پیٹ رابرٹسن جیسے عامیانہ قسم کے بھیڑ کو اکسانے والے مذہبی شعبدہ بازوں پر حملے کرتے ہیں، اور ٹیلیچ یا باِنھافر جیسے نفیس اور جیّد مذہبی علماء کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو اس مذہب کی تعلیم دے رہے ہیں جس پر میں یقین رکھتا ہوں"۔

اگر واقعتاً دنیا میں مذہب کی ایسی ہی نفیس اور لطیف صورت کا دور دورہ ہوتا تو دنیا یقیناً قدرے بہتر ہوتی اور مجھے یہ کتاب لکھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ لیکن المیہ تو یہی ہے کہ ایسے شائستہ مذہب کے پیروکار بہت کم ہیں جو اپنے اندر ترمیم سے گھبراتے، شرماتے نہیں۔ مذاہب کو ماننے والوں کی اکثریت ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو رابرٹسن، فالویل، یا ھاگرڈ، یا پھر اسامہ بن لادن اور آیت اللہ خمینی جیسے مذہبی رہنماؤں کی تعلیمات کو مانتے ہیں۔ یہ کوئی عام لوگ نہیں۔ ان کا لوگوں کے دماغوں اور ذہنوں پر غلبہ ہے، اور فی زمانہ ہم سب کو کبھی نہ کبھی ان کا یا ان کی تعلیمات کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔

**میں دہریہ ہوں، لیکن میں آپ کی تلخ، بلا احتیاط، اور ناشائستہ ہرزا سرائی سے دور رہنا چاہتا ہوں۔**

در حقیقت اگر آپ The God Delusion کی زبان پر غور فرمائیں اور دور حاضر کے سیاسی یا فنون لطیفہ کے ناقدین کی زبان سے اس کا موازنہ کریں گے تو اسے قدرے شائستہ اور دھیما پائیں گے۔ ملاحظہ کیجئے لندن کے اخبارات میں چھپنے والے چند تنقیدی کالم جو ریستورانوں کے بارے میں لکھے گئے ہیں:

"اس بات کا تصّور کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے کہ کوئی شخص ایک ایسا ریستوران بنانے کا سوچ بھی سکتا ہے جہاں کھانا اس قدر برا ہو کہ نگلنا بھی محال ہو"۔

".... لندن کا یا شاید دنیا کا بد ترین ریستوران.... جہاں آپ کو نہایت بد ذائقہ کھانا مجبوراً ایک ایسے کمرے میں پیش کیا جاتا ہے جو عطالوی ویٹروں کے ۱۹۷۶ کی طرز کا عجائب گھر لگتا ہے"۔

"آج تک میں نے جو فضول ترین کھانا کھایا ہے۔ تھوڑا بہت نہیں، انتہائی فضول! خوفناک حد تک ناگوار!"

"دیکھنے میں ایک چھوٹی سی بحری سرنگ لگتی تھی اور کھانے میں ان کیچوؤں جتنی ہی قابل نفرت تھی جو بچپن میں کبھی مجھے زبردستی کھلا دیے گئے تھے"۔

میری کتاب میں پائی جانے والی سخت ترین زبان بھی ان جملوں کے مقابلے میں بہت ہلکی پھلکی اور سادہ ہے۔ یہ محض اس خاص استحقاق کی وجہ سے آپ کو ناشائستہ لگتی ہے جو صرف اور صرف مذہب کو حاصل ہے۔ خدا کی شان میں گستاخی کے مقابلے میں ریستوران کی شان میں گستاخی بہت معمولی سی بات لگتی ہے۔ لیکن ریستوران کے مالک اور خانساماں جیتے جاگتے انسان ہیں، جن کے دل دکھتے ہیں۔ جبکہ "مذہب" ایک ایسا جرم ہے جس کا کوئی شکار نہیں ہوتا۔

۱۹۱۵ میں برطانوی پارلیمان کے ممبر جناب ہوراشیو باٹملی نے تجویز پیش کی کہ عالمی جنگ کے بعد "اگر آپ کو ایک روز کسی ریستوران میں پتا چلے کہ جس ویٹر نے آپ کو کھانا پیش کیا ہے وہ جرمن ہے تو آپ اپنا شوربہ اس کے منہ پر پھینک دیں؛ اگر آپ خود کو کسی جرمن کلرک کے قریب بیٹھا پائیں تو سیاہی کی دوات اس کے سر پر انڈیل دیں"۔ اب یہ ہوتی ہے گستاخانہ زبان! (جو اپنے دور کے لحاظ سے بھی خاصی مضحکہ خیز اور غیر مؤثر بیان بازی تھی)۔ اس کا موازنہ باب ۲ کے ابتدائی جملے سے کیجئے، جو کہ عموماً عدم شائستگی اور گستاخی کے نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ شاید میں اپنی کاوش میں مکمل طور پر کامیاب تو نہیں ہو پایا، لیکن میری نیت صرف ایک خوش طبع چوٹ کرنے کی تھی۔ میں نے جب بھی کسی محفل میں یہ ابتدائی جملے پڑھے، سامعین نے ہمیشہ ہنس کر داد دی؛ اسی لئے میں اور میری بیگم ہمیشہ محفل کے آغاز میں اسی کا استعمال کرتے ہیں۔ تاکہ ماحول کے تناؤ کو زائل کیا جا سکے۔ شاید اس جملے کے مزاح کی کامیابی کا راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ ایک ایسے موضوع کو جسے نہایت بھونڈے انداز میں پیش کیا جا سکتا تھا، لاطینی زبان کے لمبے لمبے الفاظ میں لپیٹ کر قارئین کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ میں نے یہ طرز تحریر بیسویں صدی کے مزاح نگار ایویلن واح سے مستعار لیا۔ اب ایویلن واح کو تو یقیناً کوئی ناشائستہ یا گستاخ نہیں کہے گا۔ (آگے آنے والے ایک واقعہ میں تو میں نے اس راز کا پردہ بھی فاش کیا ہے)۔

کتابوں اور اسٹیج ڈراموں کے نقاد ایک تمسخرانہ منفی روّیہ رکھتے ہیں اور اگر کوئی ان کی تحریر کے مزاح کی تعریف کر دے تو فخر سے پھولے نہیں سماتے۔ لیکن مذہب کی تنقید کے وقت تو وضاحتیں بھی فضیلت کی بجائے جارحانہ عناد لگنے لگتی ہیں۔ ایک سیاستدان پارلیمان کے ایوان میں اپنے حریف پر شدید ترین حملے کر سکتا ہے اور تعریف کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ لیکن مذہب کا کوئی ناقد سادہ اور مدلل ترین زبان بھی استعمال کرے تو اسے گستاخانہ ہرزہ سرائی گردان دیا جاتا ہے۔ مہذب معاشرہ اس پر افسوس میں سر ہلاتا ہے۔ یہاں تک کہ لا دین معاشرہ بھی، جو فخریہ اعلان کرتا رہتا ہے کہ "میں ملحد ہوں لیکن۔۔۔۔"

## آپ محض ملحدین کو تبلیغ کر رہے ہیں۔ آخر اس میں کیا مصلحت ہے؟

اگرچہ اس بات کی نفی RichardDawkins.net کے رکن ملحدین (Converts' Corner) سے با آسانی ممکن ہے، اس کے باوجود اس الزام کے دیگر جوابات بھی میسّر ہیں۔ ایک تو یہ کہ ملحدین کی تعداد خاص طور پر امریکہ میں اس سے کہیں زیادہ ہے جتنا عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ گروہ خاص کر امریکہ میں پوشیدہ رہتا ہے۔ اور اسے اپنے خول سے باہر نکلنے کے لئے حوصلہ افزائی کی شدید ضرورت ہے۔ اگر میں شکریہ کے ان پیغامات سے اندازہ لگاؤں جو مجھے دورۂ شمالی امریکہ کے دوران ملے، تو ایسا لگتا ہے کہ میری، سام ہارس، ڈان ڈینیٹ، اور کریسٹوفر ہیچنز کی طرف سے فراہم کی جانے والی حوصلہ افزائی کی بہت قدر کی جاتی ہے۔

ملحدین کو مزید تبلیغ کرتے رہنے کی ایک خفیف سی وجہ یہ بھی ہے کہ شعور کی بیداری ایک مسلسل عمل ہے۔ جب حقوق نسواں کی جدوجہد کرنے والی خواتین صنفی امتیاز کی زبان کے بارے میں عوام کا شعور بیدار کرنے کی کوشش کر رہی تھیں، تو وہ اپنے درمیان عورتوں کے حقوق اور ان پر ہونے والی زیادتیوں کے متعلق اس سے کہیں پہلے سے پرچار کرتی رہی ہوں گی۔ کیونکہ اس شریف طبع گروہ کو بھی عام فہم زبان کے استعمال کے بارے میں سمجھانے کی ضرورت رہی ہو گی۔ ہم عورتوں کے حقوق اور ان کے استحصال کے بارے میں جتنے بھی پر اعتماد ہوگئے ہوں، غیر ارادی طور پر ہم پھر بھی ان لسانی اصولوں کو تسلیم کرتے رہے ہیں جن کی وجہ سے دنیا کی آدھی آبادی اپنے آپ کو بے دخل محسوس کرتی ہے۔

جنس پر مبنی "ضمائر" کو دیگر الفاظ کی طرح زبان سے خارج کر دینے کی سخت ضرورت ہے۔ اور اس کار خیر میں ملحد طبقے کو بھی اپنا کردار ادا کرنا ہو گا۔ ہمیں اپنے شعور کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ ملحدین اور دین دار دونوں ہی ایمان کے معاملے میں معاشرے کے بنائے ہوئے شائستگی اور احترام کے اصولوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں۔ میں معاشرے میں بچّوں کو ان کے والدین کے مذہبی خیالات کے مطابق لیبل کرنے کی عادت کو خاموشی سے قبول کر لینے کی روش کی نشاندہی کرواتے ہوئے نہیں تھکتا۔ ملحدین کو اس بے قاعدگی کے بارے میں اپنے شعور کو اجاگر کرنے کی خاص ضرورت ہے: قطع نظر اس سے کہ بچّوں کو ابھی اپنے مذہب یا اپنے والدین کے خیالات کو سمجھنے کی عمر ہی نہیں ہوتی، معاشرے میں والدین کے اپنے بچّوں پر اپنے مذہبی خیالات لادنے کے بارے میں عالمگیر رضامندی پائی جاتی ہے۔ "عیسائی بچّہ" نام کی کوئی جنس نہیں ہوتی؛ صرف عیسائی والدین کے بچّے ہوتے ہیں۔ ہمیں اس طرح کی طرز فکر کا ہر ممکن طور پر قلعہ قمع کرنا چاہیئے۔

### آپ بنیاد پرستوں پر تنقید کرتے ہیں، لیکن خود بھی اتنے ہی کٹّر ہیں۔

معاف کیجئے گا، ایسا کہنا بالکل درست نہیں ہے۔ ذہن کو تبدیل کرنے والے جوش و جذبے کی بنیاد پرستی سے کوئی مماثلت ممکن نہیں۔ کیونکہ بنیاد پرستی کسی کے ذہن میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتی۔ عیسائی لوگ جذباتی حد تک نظریۂ ارتقاء کے خلاف ہیں، جبکہ میں جذباتی حد تک اس کے حق میں ہوں۔ جذباتیت میں تو ہم برابر ہیں۔ اور کچھ لوگوں کے مطابق ہم دونوں ہی اپنے اپنے انداز سے بنیاد پرست ہیں۔ یاد نہیں آ رہا کس نے کہا تھا، لیکن جب دو مخالف خیالات کو ایک جیسی شدّت سے بیان کیا جاتا ہے تو ضروری نہیں کہ "حقیقت" ان دونوں انتہائی زاویوں کے درمیان ہو۔ کسی ایک جماعت کا بالکل غلط ہونا بھی ممکن ہے، اور دوسری جماعت کی جذباتیت کی دلیل بھی۔

بنیاد پرست یہ جانتے ہیں کہ ان کے عقائد کیا ہیں اور وہ اس بات سے بھی واقف ہیں کہ انہیں تبدیل نہیں کیا جاسکتا ہے۔ باب ۸ میں دیا گیا کرٹ وائس کا اقتباس دریا کو کوزے میں بند کرتا ہے: " ....اگر کائنات میں 'تخلیق' کے خلاف موجود تمام شواہد اکٹھے کر لئے جائیں، تو میں ان کو تسلیم کرنے میں سر فہرست رہوں گا، لیکن میں پھر بھی تخلیق پرست رہوں گا، کیونکہ الہام خدائی اس کا ہی اشارہ دیتا ہے۔ میرا ایسا ماننا اٹل ہے"۔ الہام کے ان بنیادی اصولوں سے جذباتی لگاؤ، اور ایک سچّے سائنسدان کے شواہد سے جذباتی لگاؤ میں موجود فرق پر جتنا بھی زور دیا جائے کم ہے۔ وائس جیسا بنیاد پرست اعلانیہ کہتا ہے کہ کائنات کے سارے شواہد بھی اس کا ذہن نہیں بدل سکتے۔ اس کے برعکس، سچّا سائنسدان، خواہ وہ کتنی ہی شدّت سے ارتقاء میں "یقین" رکھتا ہو، یہ ضرور جانتا ہے کہ اس کا ذہن بدلنے کے لئے اسے کیا درکار ہو گا :ثبوت و شواہد! جب جے بی ایس ہالڈین سے پوچھا گیا کہ ایسے کون سے ثبوت و شواہد ہیں جو نظریہ ارتقاء کی نفی کرتے ہیں، تو اس نے جواب دیا: 'قبل از کیمبریئین دور میں خرگوش کا قدیم ڈھانچہ'۔ یہاں میں کرٹ وائس کے منشور کے بالکل مخالف اپنا منشور مرتّب کرنا چاہوں گا: 'اگر کائنات میں موجود تمام ثبوت و شواہد تخلیق کے حق میں اشارہ کریں، تو میں اس نتیجہ کا اعتراف کرنے میں پہل کروں گا، اور اپنی فکر تبدیل کر لوں گا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تمام شواہد (جو وافر مقدار میں بھی میسّر ہیں) ارتقاء کے ہی حق میں ہیں۔ صرف ایک اسی بنیاد پر میں ارتقاء کے حق میں اتنے ہی جوش و جذبے سے بحث کرتا ہوں جتنا ارتقاء کے دشمن اس کی مخالفت میں کرتے ہیں۔ میرا جوش ثبوت و شواہدپر مبنی ہے؛ جبکہ ان کا جوش ثبوت و شواہد سے انکار پر مبنی ہونے کی وجہ سے حقیقتاً بنیاد پرست ہے۔

### میں خود بھی دہریہ ہوں، لیکن مذہب کہیں جانے والا نہیں۔ برداشت کیجئے۔

'آپ مذہب چھوڑنا چاہتے ہیں؟ کامیابی آپ کے قدم چومے! آپ کا خیال ہے آپ مذہب سے نجات حاصل کر سکتے ہیں؟ کس سیّارے پر رہ رہے ہیں آپ؟ مذہب ایک حقیقت ہے۔ چھوڑیئے بھی اب!' اگر یہ مایوس کن باتیں ذرا سی بھی تشویش کے لہجے میں کہی گئی ہوتیں تو میں شاید ان کا اثر لے لیتا۔ لیکن اس کے برعکس، ان لوگوں کا لہجہ یکسر فاتحانہ اور مسرور کن ہوتا ہے۔ اسے کج روی تو نہیں کہا جا سکتا۔ شاید "ایمان پر یقین" کہنا بہتر ہو گا۔ یہ لوگ خود تو مذہبی نہیں ہوتے، لیکن انہیں اس بات سے بہت راحت میسّر ہوتی ہے کہ دیگر لوگ مذہبی ہیں۔ اب میں منکرین کی آخری قسم کی طرف آتا ہوں۔

### میں خود دہریہ ہوں۔ لیکن مجھے لگتا ہے لوگوں کو مذہب کی ضرورت رہتی ہے۔

'آپ اس کی جگہ کیا رکھیں گے؟ آپ مرنے والوں کے لواحقین کو کیسے صبر کرنے کو کہیں گے؟ آپ اس ضرورت کو کیسے پورا کریں گے'؟

واہ! کیا احساس برتری سے بھرپور انکسار ہے! 'آپ اور میں تو بہت ذہین اور تعلیم یافتہ ہیں۔ ہمیں مذہب کی کیا ضرورت۔ لیکن عام لوگ، یہ نیم جاہل لوگوں کا جم غفیر، ان کو تو مذہب کی ضرورت ہے ناں'۔ مجھے ایک واقعہ یاد ہے کہ جب میں عوام میں سائنس کی مقبولیت کے سلسلے میں ایک اجتماع سے خطاب رہا تھا۔ تو میں نے مختصراً عوام کی نیم جہالت میں اضافہ کرنے کے خلاف اپنے خداش کا اظہار کیا۔ وقفۂ سوال کے دوران ایک صاحب نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اقلیتی گروہوں اور خواتین کو سائنس سے مانوس کرنے کے لئے شاید نیم جہالت کی یہ خوراک ضروری ہے۔ ان کے لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ حقیقی معنوں میں اپنے آپ کو آزاد خیال اور ترقّی پسند سمجھتے ہیں۔ میں بخوبی اندازہ کر سکتا ہوں کہ اس وقت مجمع میں موجود خواتین اور اقلیتوں پر کیا بیتی ہو گی۔

اب آیئے انسان کے ذہنی سکون کی ضرورت کی طرف واپس آتے ہیں۔ یقیناً یہ ضرورت حقیقی ہے۔ لیکن کیا آپ کو اس خیال میں کچھ بچپنا محسوس نہیں ہوتا کہ کائنات ہمیں "ذہنی سکون" مہیّا کرنے کی مجاز ہے؟ آیزاک آسیموو نے "جعلی سائنس" کے خلاف جو بات کہی تھی اس کا اطلاق مذہب پر بھی کیا جا سکتا ہے: 'جعلی سائنس کے کسی بھی حصّے کا معائنہ کیجئے تو آپ کو ایک حفاظتی چادر ملے گی، ایک انگوٹھا چوسنے کو ملے گا، ایک دوپٹّا پکڑنے کو ملے گا'۔ یہ بات بہت حیران کن ہے کہ عموماً لوگ یہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ ضروری نہیں کہ ہر وہ چیز جو آپ کے سکون اور تسلّی کا باعث بنے وہ سچ بھی ہو۔

اسی سے منسلک یہ فریاد بھی سنائی دیتی ہے کہ زندگی میں کسی 'مقصد' کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک کینیڈین نقّاد کے مطابق:

> ممکن ہے دہریے خدا کے بارے میں صحیح ہوں۔ کون جانے؟ لیکن قطع نظر اس سے کہ خدا ہے یا نہیں، یہ بات تو واضح ہے کہ انسانی روح میں کچھ تو ایسا ہے جو اس یقین کی طرف مائل کرتا ہے کہ زندگی کا کوئی مافوق الفطرت مقصد بھی ہے۔ رچرڈ ڈاکنز جیسے کٹّر اصول تجربی کے علمبردار (empiricist) سے امید کی جانی چاہیئے کہ وہ انسانی فطرت کے اس پہلو کا اعتراف کرے... کیا ڈاکنز کا یہ خیال ہے کہ حقیقت اور سکون کی تلاش میں انجیل کی بجائے فریب خدائی پڑھنے سے یہ دنیا زیادہ رحم دل ہو جائے گی؟

در حقیقت ہاں! کیونکہ آپ نے 'رحم دل' کی اصطلاح استعمال کی ہے، تو میں پھر کہتا ہوں کہ کسی بھی ایمان کی تسلّی پہچانے کی خاصیت اس کے سچ ہونے کے امکانات میں اضافہ نہیں کرتی۔ یہ بات سچ ہے کہ میں جذباتی تسلّی کی ضرورت سے انکار نہیں کرتا، اور میں یہ بھی دعویٰ نہیں کرتا کہ اس کتاب میں بیان کئے گئے دنیا کے خاکے میں مرحوم کے لواحقین کے لئے تسلّی اور دلاسے کا کوئی خاطر خواہ انتظام ہے۔ لیکن اگر مذہب سے حاصل ہونے والی تسلّی اس غیر ممکنہ اعصابی امر کی مرہون منّت ہے کہ ہمارا دماغ ہماری موت کے بعد بھی زندہ رہتا ہے، تو کیا آپ اس کا دفاع کرنا پسند کریں گے؟ خیر، میں آج تک جنازے میں کسی ایسے شخص سے نہیں ملا جو اس بات سے انکار کرے کہ جنازے میں کی گئی دعائیں اور عبادات مرحوم کی یاد میں کی گئی باتوں سے کہیں زیادہ اثر انگیز تھیں۔

فریب خدائی پڑھنے کے بعد برطانوی طبیب ڈاکٹر ڈیوڈ ایشٹن نے سنہ ۲۰۰۶ میں کرسمس کے روز اپنے ۱۷ سالہ بیٹے لوک کی اچانک موت کے بعد مجھے خط لکھا۔ لوک کی وفات سے کچھ ہی عرصہ پہلے لوک اور ڈیوڈ نے سائنس کے لئے میرے خیراتی ادارے کے بارے میں نیک خواہشات کا اظہار کیا تھا۔ جزیرہ Isle of Man پر اس کے جنازے کے بعد ڈیوڈ نے شرکاء سے درخواست کی کہ اگر کوئی لوک کی یاد میں کسی بھی قسم کی خیرات کی خواہش رکھتا ہو تو وہ میرے ادارے کو خیرات بھیج سکتا ہے، کیونکہ لوک کی بھی یہی خواہش ہوتی۔ تیس کے لگ بھگ جو چیک موصول ہوئے ان کی کل رقم ۲۰۰۰ برطانوی پاؤنڈ تھی، بشمول ان ۶۰۰ پاؤنڈ کے جو گاؤں کے شراب خانے میں جمع کئے گئے۔ یہ نوجوان یقیناً اپنے گاؤں میں بہت مقبول رہا ہو گا۔ جب میں نے جنازے کی تقریبات کی فہرست پڑھی، تو میرے آنسو ٹپک پڑے۔ میں نے اس کو اپنی ویبسائٹ RichardDawkins.net میں چھاپنے کی اجازت طلب کی۔ ایک سکاٹش پائپ بجانے والا مینکس کا نوحہ "ایلن والین" بجا رہا تھا۔ لوک کے دو دوستوں نے اس کی تعریف میں رسمی قصیدے پڑھے۔ ڈاکٹر ایشٹن نے ڈیلن تھامس کی نہایت عمدہ نظم "فرن ہل" پڑھی۔ ("آج جیسا کہ میں جوان اور بےفکرا تھا، سیب کی شاخوں تلے" ۔ گمشدہ جوانی کی کتنی اچھی تمثیل نگاری تھی)۔ یہ بتاتے ہوئے میرا دل بھر آیا ہے کہ اس کے بعد انہوں نے میری نظم Unweaving the Rainbow کے ہی ابتدائی مصرعے پڑھے، جو میں نے اپنے جنازے کے لئے مختص کر رکھے تھے۔

مجھے شک ہے کہ چند ایک کو چھوڑ کر، زیادہ تر لوگوں کے مذہب کے ساتھ منسلک رہنے کی واحد وجہ یہ نہیں کہ وہ دلاسے کے کام آتا ہے، بلکہ یہ کہ ہمارے تعلیمی نظام نے اپنا فرض خوش اسلوبی سے سر انجام نہیں دیا اور لوگوں کو احساس ہی نہیں ہونے دیا کہ غیرعقیدہ ہونا بھی ممکن ہے۔ زیادہ تر لوگ جو اپنے آپ کو تخلیقی سمجھتے ہیں یقینا اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ انہیں ڈارون کا حیران کن متبادل نظام ٹھیک طریقے سے پڑھایا ہی نہیں گیا۔ شاید اس ہتک آمیز روایت کے بارے میں بھی کچھ ایسا ہی کہا جاسکتا ہے کی لوگوں کو مذہب کی "ضرورت" ہے۔ ۲۰۰۶ کی ایک کانفرنس میں ایک ماہر بشریات (جو کہ "میں بھی دہریہ ہوں لیکن..." کا عمدہ نمونہ تھے) نے سابقہ اسرائیلی وزیر اعظم گولڈا میئر کا ایک اقتباس درج کیا کہ جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ کو خدا پر ایمان

ہے یا نہیں، تو انہوں نے جواب دیا: 'میں یہودی قوم پر ایمان رکھتی ہوں، اور یہودی قوم خدا پر ایمان رکھتی ہے'۔ ہمارے بشریات کے ماہر نے اس کو اپنی طرز سے پیش کیا: 'میرا لوگوں پر ایمان ہے، اور لوگوں کا خدا پر'۔ اس کے بر عکس میرا یہ ماننا ہے کہ 'مجھے لوگوں پر ایمان ہے، اور جب بھی لوگوں کی حوصلہ افزائی کی گئی کہ وہ آج کل میسّر تمام تر معلومات کے بارے میں اپنا ذہن استعمال کریں، بالعموم لوگوں نے خدا پر ایمان کو ترک کیا اور خوشگوار، کامیاب، بلکہ یوں کہیے کہ آزاد زندگیاں گزارتے رہے'۔

اس پیپر بیک ایڈیشن میں مجھے کچھ چیزیں بہتر کرنے اور چند چھوٹی موٹی غلطیوں کو درست کرنے کا موقع ملا جن کی نشاندہی جلد یہ اشاعت کے قارئین نے کی تھی۔

# دیباچہ

میری بیگم لالہ وارڈ کو بچپن میں اپنے سکول سے نفرت تھی اور انہیں سکول چھوڑ دینے کی شدید خواہش تھی۔ بیس پچیس سال کی عمر میں آخر کار ایک روز انہوں نے اپنے والدین کے سامنے اس شرمناک حقیقت کا اظہار کر ہی ڈالا۔ ان کی والدہ ششدر رہ گئیں: 'لیکن بیٹا! آپ نے ہمیں بتایا کیوں نہیں'؟ لالہ نے جواب دیا: 'کیونکہ مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ میں ایسا کر بھی سکتی ہوں'۔

مجھے شک ہے — بلکہ یقین ہے — کہ ایسے بہت سے لوگ ہیں جو کسی نہ کسی مذہب سے منسلک تو ہیں، لیکن اس پر یقین نہیں رکھتے، اس میں خوش نہیں ہیں، یا اس کے نام پر کئے جانے والے مظالم کی وجہ سے پریشان ہیں؛ ایسے لوگ جو اپنے سینوں میں اپنے پرکھوں کے مذہب کو چھوڑنے کی مبہم سی خواہش لئے جی رہے ہیں ۔ لیکن انہیں معلوم ہی نہیں کہ ایسا کرنا بالکل ممکن ہے۔ اگر آپ بھی ان میں سے ایک ہیں، تو یہ کتاب آپ ہی کے لئے ہے۔ اس کتاب کا اوّلین مقصد آپ کا شعور بیدار کرنا ہے۔ اس بات کا شعور کہ الحاد کا راستہ اختیار کرنا ایک شاندار اور دلیرانہ خواہش ہے۔ آپ کے لئے ملحد بننا عین ممکن ہے، ایک ایسا ملحد جو خوش، متوازن، با اخلاق اور علم و دانش سے بھرپور زندگی گذار سکتا ہے۔ بیداریٔ شعور کے سلسلے میں یہ میرا آپ کو پہلا پیغام ہے۔ اس کے علاوہ دیگر تین طریقوں سے بھی میں شعور کو بیدار کرنا چاہتا ہوں جن پر آئندہ بات کی جائے گی۔

جنوری ۲۰۰٦ میں چینل ۴ نے دو قسطوں پر مبنی میری ایک دستاویزی فلم دکھائی جس کا نام تھا 'Root of All Evil' یعنی' سارے فساد کی جڑ'۔ نام مجھے قطعاً پسند نہیں آیا۔ مذہب ' سارے ' فساد کی جڑ تو نہیں ہے۔ کوئی بھی چیز سارے فساد کی جڑ تو ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن چینل ۴ نے TV پر جو اشتہار دکھائے ان سے مجھے یقیناً خوشی ہوئی۔ نیو یارک کی فلک بوس عمارات کی تصویر کے نیچے یہ عبارت درج تھی: "تصور کیجئے! ایک ایسی دنیا کا جس میں مذہب نہیں"۔ تصویر میں Twin Towers، جو کے منہدم ہو چکے ہیں بدستور موجود تھے!

تو پھر آپ بھی مشہور گلوکار John Lennon کے ساتھ ایک ایسی دنیا کا "تصور" کیجئے جہاں کوئی مذہب نہ ہو، جہاں ۱۱ ستمبر یا ۷ جولائی کے خود کش حملے نہ ہوئے ہوں، نہ صلیبی جنگیں، نہ "جادوگرنیوں" کا شکار، نہ برصغیر کا بٹوارہ، نہ اسرائیل فلسطین تنازعہ، نہ سرب مسلم قتل عام، نہ یہودیوں پر مظالم، نہ غیرت کے نام پر قتل، اور نہ ٹی وی پر مذہب بیچ کر کروڑوں کمانے والے ('خداوند چاہتے ہیں کہ آپ اتنی خیرات دیں کہ آپ کو تکلیف ہونے لگے')۔ نہ طالبان بدّھا کے بتوں کو توپ سے اڑائیں ، نہ سرعام شاطم رسول کا سر قلم کیا جائے، نہ عورتوں کو تھوڑی سی بھی جلد دکھانے پر کوڑے مارے جائیں۔ از راہ گفتگو آپ سے یہ عرض کرتا چلوں کہ امریکہ میں Lennon کا یہ گیت Imagine کبھی کبھی اس مصرعے کے بغیر بھی گایا جاتا ہے کہ: "نہ ہی کوئی مذہب ہو"۔ بلکہ ایک آدھ بار تو اس کی جگہ باقاعدہ "اور مذہب ہو" بھی گایا گیا ہے۔

اگر آپ سوچتے ہیں کہ دہریت کے مقابلے میں الحاد یا مادیت پرستی (agnosticism) ایک معتدل اور بہتر روش ہے، اور دہریت مذہب کی طرح ایک "کٹر" رویہ ہے، تو شاید باب ۲ آپ کو باور کرا ئے کہ مفروضۂ خدائی یعنی The God Hypothesis بھی کائنات کے بارے میں محض ایک سائنسی مفروضہ ہی ہے اور ہر سائنسی مفروضے کی طرح اس کو بھی شکوک و شبہات کی کسوٹی پر پرکھا جانا چاہئے۔ اگر آپ کو سکھایا گیا ہے کہ فلاسف اور مذہبی علماء نے خدا پر ایمان لانے کے لئے نہایت ٹھوس دلائل فراہم کئے ہیں، تو آپ باب ۳ "خدائی کے حق میں دلائل" سے یقیناً محظوظ ہوں گے۔ کیونکہ اس باب میں یہ دلائل خاصے کمزور ثابت ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کا ماننا ہو کہ خدا کا وجود ناگزیر ہے، کیونکہ خدا کے بغیر دنیا کا وجود میں آنا ناممکن ہے۔ زندگی، اپنے بھرپور تنوّع کے ساتھ، کیونکر ممکن ہے، جبکہ ہر نوع کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ کوئی تو ہو گا اس کو ترتیب (design) دینے والا؟ باب ۴ "خدا کیوں نہیں ہے" شاید آپ کی کچھ راہ نمائی کر سکے۔ ترتیب کرنے والے یا معمار کو ثابت کرنا تو دور، ڈارون کے اصول ہائے قدرتی انتخاب (natural selection) میں ترتیب کے فریب نظر تک کی نہایت عمدہ اور جامع وضاحت کی گئی ہے۔ اگرچہ قدرتی انتخاب کی وضاحتیں عالم حیات تک محدود ہیں، یہ ہمارے شعور کو ان درجات تک ضرور لے جاتی ہیں جن کے سہارے ہم فلکیات کو سمجھنے کے نئے زاویے استوار کر سکتے ہیں۔ بیداریٔ شعور کے سلسلے میں یہ میرا آپ کو دوسرا پیغام ہے۔

شاید آپ سوچتے ہوں کہ اگر علمائے تاریخ و تمدن نے ہر معاشرے میں ایک یا ایک سے زائد خدا ہونے کے بارے میں اتنی تحقیق کی ہے تو ان کی بات میں کچھ تو دم ہو گا۔ اس سلسلے میں میں آپ کی توجہ باب ۵ کی طرف مبذول کرانا چاہوں گا جہاں اس مذہبیت کے ماخذ پر سیر حاصل بات کی گئی ہے۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ سوچتے ہوں کہ اخلاقیات کا جواز ڈھونڈنے کے لئے مذہبی عقائد کا ہونا لازمی شرط ہے؟ اچھا انسان ہونے کے لئے کیا خدا کی ضرورت نہیں ہے؟ باب ٦ اور ٧ میں اس مغالطے کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایمان سے بے بہرہ ہو جانے کے باوجود کیا آپ اب بھی یہ سوچتے ہیں کہ دنیا میں اچھائی کے لئے مذہب کی ضرورت ہے۔ باب ٨ آپ کو یہ سوچنے کی دعوت دے گا کہ کیوں مذہب دنیا کے لئے اتنی بھی اچھی چیز نہیں جیسا کہ آپ سمجھتے ہیں۔

اگر آپ خود کو اپنے آبا و اجداد کے مذہب میں پھنسا ہوا محسوس کرتے ہیں، تو ذرا سوچئے ایسا کیسے ہوا۔ اس کا جواب آپ کو عام طور پر بچپن میں دی گئی نظریاتی تعلیم میں پوشیدہ ملے گا۔ اگر آپ مذہبی انسان ہیں تو اس بات کا اغلب امکان ہے کہ آپ اپنے والدین کے مذہب سے ہی منسلک ہوں گے۔ اگر آپ امریکہ کی ریاست آرکنساس میں پیدا ہوئے ہیں تو آپ کے لئے عیسائیت حق ہے اور اسلام باطل۔ قطع نظر اس سے کہ آپ کے دماغ کا منطقی حصہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اگر آپ افغانستان میں پیدا ہوئے ہوتے تو آپ کے نظریات بالکل الٹ ہوتے۔ ظاہر ہے اگر آپ پیدا ہی افغانستان میں ہوئے ہیں تو اسلام بر حق ہے اور عیسائیت باطل۔

مذہب اور بچپن کے تجربات کا تجزیہ میں نے باب ٩ میں کیا ہے۔ اور یہیں میرا بیدارئ شعور کا تیسرا پیغام بھی ہے۔ ٹھیک جس طرح تحریک نسواں کے علمبردار "انسان" کی جگہ محض "آدمی" کے استعمال پر آگ بگولہ ہو جاتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ جب کوئی کسی بچے کو "عیسائی بچہ" یا "مسلمان بچہ" کہے تو لوگ اسی طرح غصے کا اظہار کیا کریں۔ آپ کہنا ہی چاہتے ہیں تو اس بچے کو عیسائی والدین کا بچہ کہئے؛ لیکن اگر آپ کسی کو عیسائی بچہ کہہ کر پکارتا سنیں تو اسے ٹوکیئے، اور سمجھایئے کہ جیسے بچے معاشیات یا سیاسیات پر رائے رکھنے سے قاصر ہوتے ہیں بالکل اسی طرح وہ مذہب کے بارے میں بھی رائے رکھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ کیونکہ میرا مقصد ہی آپ کا شعور بیدار کرنا ہے، اس لئے میں اس دیباچے اور باب ٩ میں اس بات کا ذکر کرنے میں کوئی عذر محسوس نہیں کرتا۔ اس بات کا جتنا بھی تذکرہ کیا جائے کم ہے، اور میں بھی بار بار یہ بات دہراؤں گا: وہ بچہ مسلمان بچہ نہیں بلکہ مسلمان والدین کا بچہ ہے۔ وہ بچہ ابھی یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ وہ مسلمان ہے یا نہیں۔ "مسلمان بچہ" اور "عیسائی بچہ" کی اصطلاحات بے معنی ہیں۔

باب ١ اور ١٠ از اوّل تا آخر پوری کتاب "مذہب" کا روپ دھارے بغیر قاری کو متعدد انداز میں حقیقی دنیا کی شان و شوکت سے متعارف کراتے ہوئے انسانی ذہن کی حوصلہ افزائی کی ذمہ داری نبھاتے ہیں، جو شاید مذہب صدیوں کی اجارہ داری کے باوجود بہ طریق احسن نہیں نبھا سکا۔

بیدارئ شعور کا میرا چوتھا پیغام دہریت پہ فخر کا ہے۔ دہریہ ہونا قطعاً شرم کی بات نہیں۔ بلکہ بہت فخر کا مقام ہے۔ کیونکہ دہریت صحت مند ذہنی آزادی کی علامت ہے، یا یوں کہیئے کہ ایک صحت مند ذہن کی۔ ایسے بہت سے لوگ ہیں جو من ہی من میں جانتے ہیں کہ وہ دہریے ہو چکے ہیں، لیکن اپنے خاندان والوں کے سامنے، اور کئی بار اپنے آپ سے بھی اعتراف کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ اس کی کچھ وجہ تو یہ ہے کہ "دہریہ" کی اصطلاح کے ساتھ خوف کا عنصر منسلک کر دیا گیا ہے۔ باب ٩ میں ہم نے مشہور زمانہ مزاحیہ اداکارہ جولیا سوینی (Julia Sweeny) کی زندگی کے اس واقعے کا بھی ذکر کیا ہے جہاں ان کے والدین کو جولیا کے دہریہ ہو جانے کی خبر اخبار پڑھتے ہوئے ملی۔ "خدا پر ایمان نہ رکھنا تو ایک بات ٹھہری"، ان کی والدہ چلّائی! "لیکن یہ کیا کہ دہریہ ہی ہو گئیں محترمہ"۔

اس موقع پر میں اپنے امریکی قارئین سے بالخصوص مخاطب ہونا چاہوں گا۔ کیونکہ امریکہ میں اس وقت مذہبیت کی گرفت بڑھتی جا رہی ہے۔ امریکی قانون دان وِنڈی کرامر (Wendy Kramer) شاید اتنا بھی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لے رہی تھیں جب انہوں نے کہا کہ "امریکہ میں مذہب کا مذاق اڑانا کسی سرکاری عمارت میں قومی پرچم کو آگ لگا دینے جتنا ہی خطرناک ہے"۔ امریکہ میں دہریوں کی حالت زار اس وقت کچھ ویسی ہی ہے جیسے آج سے پچاس سال پہلے ہم جنس پرستوں کی ہوا کرتی تھی۔ آج کے دور میں ایک ہم جنس پرست کا انتخابات میں منتخب ہو جانا اگرچہ مشکل ہے لیکن پھر بھی ممکن ہے۔ ١٩٩٩ میں Gallup کی ایک رائے شماری میں امریکیوں سے سوال پوچھا گیا کہ وہ عہدے کی مکمل اہلیت رکھنے والے کس امیدوار کو ووٹ دیں گے۔ نتائج سے پتہ چلا کہ خاتون امیدوار (٪ ٩٥)، رومن کیتھولک (٩٤٪)، یہودی (٩٢٪)، سیاہ فام (٩٢٪)، مارمن فرقے سے (٪ ٧٩)، ہم جنس پرست (٪ ٧٩) لوگوں کو قبول ہیں۔ لیکن دہریے صرف (٤٩٪) لوگوں کو ہی برداشت ہوں گے۔ ان اعداد سے صاف ظاہر ہے کہ ہمیں ابھی بہت لمبا سفر طئے کرنا ہے۔ لیکن جتنا عام طور پر سمجھا جاتا ہے، دہریے تعداد میں اس سے کہیں زیادہ ہو چکے ہیں، خصوصاً تعلیم یافتہ طبقے میں یہ روش انیسویں صدی میں ہی جڑ پکڑ چکی تھی، جب انگریز فلسفی جان سٹیوارٹ مل نے کہا تھا: "شاید دنیا یہ جان کر ششدر رہ جائے گی کہ اس کے بہترین دماغوں کی کتنی بڑی آبادی مذہب کے معاملے میں مکمل طور پر شک و شبہہ کی حامل ہے"۔

آج کے دور میں تو یہ حقیقت شاید پہلے سے بھی زیادہ مستند ہو گئی ہے۔ اور باب ٣ میں اس سلسلے میں ثبوت بھی فراہم کئے گئے ہیں۔ یہ ملحدین آپ

کی نظر سے اس لئے نہیں گزرتے کیونکہ یہ عام طور پر اپنی حقیقت عیاں نہیں کرتے۔ میری خواہش ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ ایسے لوگوں کو اپنے آپ کو معاشرے میں ظاہر کرنے کی ہمت ملے۔ بالکل ہم جنس پرستی کی تحریک کی طرح، جتنے لوگ کھلے عام اپنے دہریے ہونے کا اظہار کریں گے اتنا ہی لوگوں کو تحریک میں شمولیت کی تقویت ملے گی۔ پھر شاید تعداد اتنی بڑھ جائے کہ انہیں جھٹلانا مشکل ہو جائے۔

امریکی مردم شماری کے اعداد و شمار سے پتا چلتا ہے کہ دہریوں اور ملحدین کی تعداد یہودیوں سے قدرے زیادہ ہے۔ لیکن یہودیوں کے برعکس، جو کہ امریکہ میں ایک سیاسی طور پر مضبوط اور منظّم گروہ کی صورت میں موجود ہیں، یا تبلیغی عیسائیوں کے برعکس جن کے پاس بے انتہا سیاسی قوت ہے، دہریوں اور ملحدین کی عنان حکومت میں کوئی شنوائی نہیں ہے۔ دہریوں کو منظّم کرنا تو بالکل بلّیوں پر قابو پانے کے مترادف ہے۔ کیونکہ یہ آزادانہ سوچ رکھتے ہیں اور کسی کے احکامات قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی تعداد میں اضافہ کرنا ایک خوش آئند عمل ہو گا۔ آپ بلّیوں کو منظّم نہ بھی کر سکیں تو پھر بھی اس جم غفیر کا شور ہی تبدیلی لانے کے لئے کافی ہو گا۔

کتاب کے عنوان میں لفظ "delusion" یعنی "فریب" کے استعمال سے چند ماہرین نفسیات کو اختلاف ہے، جو اسے اپنے علم کی ایک مخصوص اصطلاح سمجھتے ہیں۔ ان میں سے تین نے تو مجھے ایک خط لکھ کر ایک نئے لفظ relusion کی تجویز بھی دی، جو کہ غالبا" مذہب اور فریب کے اختلاط سے بنایا گیا ہو گا۔ شاید یہ اصطلاح کبھی مقبول عام بھی ہو جائے۔ لیکن فی الوقت میں delusion یا فریب پر ہی اسرار کروں گا۔ اور اپنے اس اسرار کی توجیہہ دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ انگریزی لغت میں اس لفظ کے یہ معنی درج ہیں: ایک جھوٹا عقیدہ یا تاثر۔ مثال کے طور پر فلپ جانسن کا یہ حوالہ دیا گیا تھا کہ "ڈارون ازم انسان کے اس فریب سے نجات کی کہانی ہے کہ جس کے مطابق انسان کی قسمت کسی اور ارفع قوت کے ہاتھوں میں ہے"۔ میں یہ دیکھ کر محظوظ بھی ہوا کہ یہ وہی فلپ جانسن ہے جو آج کل امریکہ میں ڈارون ازم کے خلاف محاذ آرا ہے۔ اور اس کا یہ اقتباس سیاق و سباق سے علیحدہ لیا گیا ہے۔ امید ہے آپ اس بات کی طرف توجہ دیں گے۔ کیونکہ جب میں اپنی کتاب میں کسی مذہبی تصنیف کا حوالہ دیتا ہوں تو اسے بھی مجھے شکست دینے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ جملہ لکھتے وقت جانسن کی جو بھی نیت رہی ہو، مجھے اس کی حمایت کرنے میں کوئی اعتراض نہیں۔ Microsoft Word کے ساتھ فراہم کی گئی لغت میں "فریب" کی یہ تعریف بیان کی گئی ہے: "ثبوت و شواہد کی موجودگی میں ایک جھوٹے عقیدہ پر بدستور قائم رہنا، خاص طور پر ذہنی بیماری کی علامت کے طور پر"۔ تعریف کا پہلا حصہ تو مذہبی عقیدہ کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ کیا یہ ذہنی بیماری کی علامت ہے یا نہیں، اس سلسلے میں میں رابرٹ پرسگ کے اس جملے سے پوری طرح متفق ہوں کہ: اگر ایک انسان فریب کا شکار ہو تو اسے پاگل پن کہتے ہیں؛ جب بہت سے لوگ اس فریب کا شکار ہو جائیں تو اسے مذہب کہا جاتا ہے۔

اگر یہ کتاب میری امید کے مطابق ذہنوں میں تبدیلی لانے میں کامیاب رہتی ہے، تو بہت سے قاری جو اس کے مطالعہ سے قبل مذہبی ہیں اس کے اختتام تک دہریے ہو چکے ہوں گے۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ منطق کے خلاف شدید کٹر مذہبی لوگوں کی قوت مدافعت تو شاید نا قابل تسخیر ہے۔ کیونکہ یہ مدافعت برسوں کی مذہبی تعلیم پر مبنی ہوتی ہے، اور صدیوں میں تراشے ہوئے طریقۂ کار استعمال کرتی ہے۔ اس قسم کی کتاب کو کھولنے سے بھی منع کرنا ان لوگوں کی لا تعداد مدافعاتی تدابیر میں سے ایک نہایت ہی موثر تدبیر ہے۔ کیونکہ ایسی کتابیں تو یقیناً شیطان کی ہی کاروائی ہوتی ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ آزاد خیال لوگوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے جن کے بچپن کی تعلیم ان پر مکمل طور سے اثر انداز نہیں ہو سکی یا ان کی اپنی عقل سلیم اس حد تک ترقی کر چکی تھی کہ اس نے ایسی "تعلیم" کے مضر اثرات کو زائل کر دیا۔

اس کتاب کی تیاری کے ضمن میں میں بہت سے دوستوں اور رفقاء کا مرہون منت ہوں۔ میں یہاں سب کو خراج تحسین پیش نہیں کر سکتا۔ لیکن اپنے ایجنٹ جان براکمین، اور مدیر سالی گیمانارا (ٹرانس ورلڈ کی جانب سے) اور ایمون ڈولان (ہاوٹن مفلن کی جانب سے) کا بے حد شکر گزار ہوں، جنھوں نے کتاب کو نہایت حساس طریقے اور عقلی شعور کے ساتھ پڑھا، اور نہایت مفید تنقید اور تجاویز سے نوازا۔ ان کا میری کتاب پر ایسا بھرپور اعتماد میرے لئے نہایت حوصلہ افزارہا۔ جلیان سمرسیل نے اصلاح کے فرائض بخوبی سر انجام دئے۔ یہاں میں جیری کوئن، انڈرسین ٹامسن، الیزبتھ کارنویل، ارسلا گوڈ اینف، لاتھا مینن اور اعلیٰ معیار کی ناقد کیرن اوونز کا بھی شکر گزار ہوں، جن کی اس کتاب کی ہر ادھیڑ بن کی تفصیل سے وہ اتنی ہی واقف رہیں جتنا میں خود۔

میری کتاب دو قسطوں پر مبنی ٹیلی ویژن دستاویزی فلم "تمام برائیوں کی جڑ - The Root of All Evil" کی بھی مقروض ہے، جو میں نے ۲۰۰۶ میں برطانوی سٹیشن چینل فور پر دکھائی۔ میں ان سب لوگوں کا شکر گزار ہوں جو اس دستاویزی فلم کی تیّاری میں شامل رہے، جن میں ڈیبرا کڈ، رسل بارنز، تم کریگ، ایڈم پریسکاڈ، ایلین کلیمنٹس اور ھامش مائیکورہ شامل ہیں۔ IWC Media اور چینل فور بھی دستاویزی فلم سے اقتباسات استعمال کرنے کی

اجازت دینے پر میرے تشکّر کے مستحق ہیں۔ "تمام برائیوں کی جڑ" کو برطانیہ میں بہت پزیرائی ملی، اور آسٹریلین براڈکاسٹنگ کارپوریشن نے بھی اسے دکھایا۔ دیکھنا یہ ہو گا کہ آیا کوئی امریکی چینل اس فلم کو دکھائے گا یا نہیں[1]۔

یہ کتاب میرے ذہن میں بہت سالوں سے پنپ رہی تھی۔ اس دوران میں نے اپنے بیشتر خطبات اور جرائد و رسائل میں لکھے گئے مضامین میں بھی بہت سے خیالات کا اظہار کیا، جیسے کہ ہارورڈ میں دئے گئے Tanner Lectures۔ Free Inquiry میں چھپنے والے میرے کالم کے قارئین بہت سے خیالات سے پہلے سے ہی مانوس ہوں گے۔ اس لاجواب جریدے کے مدیر ٹام فلن کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ مجھے لکھنے کی تحریک اس وقت ہوئی جب اس نے مجھے کالم لکھنے کی دعوت دی۔ اس کتاب کی وجہ سے پیش آئے ہوئے ایک عارضی وقفے کے بعد اب میں دوبارہ کالم لکھنا شروع کروں گا، جہاں مجھے اس کتاب پر ہونے والی تنقید کا جواب دینے کا موقع بھی مل جائے گا۔

کئی اقسام کی وجوہات کی بنا پر میں ڈین ڈینٹ، مارک ہاؤسر، مائیکل سٹیراٹ، سیم ہیرس، ہیلن فشر، مارگریٹ ڈاونی، ابن ورّاق، ہرمائونی لی، ڈین بارکر، جوزفین والش، ائین بئیرڈ اور خاص طور پر جارج سکیلز کا تہہ دل سے ممنون و مشکور ہوں۔ آج کے دور میں ایسی کتاب اس وقت تک کامیاب تسلیم نہیں کی جاتی جب تک کہ وہ کسی ویبسائٹ کا موضوع، اور اضافی مواد، رد عمل، بحث، سوال اور جواب کا جرگہ نہ بن جائے — اور کون جانے مستقبل میں کیا ہو جائے۔ میری خواہش ہے کہ رچرڈ ڈاکنز ادارہ برائے منطق اور سائنس – Richard Dawkins Foundation for Reason and Science کی ویبسائٹ www.richarddawkins.net یہ ذمہ داری نبھا سکے گی۔ اور میں جوش ٹمونن کا شکر گزار ہوں جس نے اس ویبسائٹ کو کمال مہارت اور فنکاری سے تعمیر کیا۔

سب سے بڑھ کر میں اپنی بیگم لالہ وارڈ کا تہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جس نے نہ صرف مجھے بے یقینی کے تمام ادوار میں سہارا دیا، اور اصلاح کے مفید مشورے بھی دئے، بلکہ دو بار پوری کتاب بہ آواز بلند مجھے پڑھ کر بھی سنائی، تاکہ میں قارئین پر اس کے صوتی تاثر کا اندازہ کر سکوں۔ میں تمام مصنفین سے اس تکنیک کو استعمال کرنے کی سفارش کرتا ہوں۔ شرط یہ ہے کہ پڑھنے والا کوئی تربیت یافتہ اداکار ہو جس کی آواز اور کان زبان کے صوتی حسن کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

# باب ۱:ایک شدید مذہبی دہریہ

میں کسی ذاتی خدا کا تصور کرنے کی کوشش نہیں کرتا؛
میرے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اپنے حواس کی حدود کے مطابق دنیا کی ساخت و ہیئت کا احترام کرسکوں۔
(البرٹ آئنسٹائن)

## احترام مستحق

## Deserved Respect

لڑکا اپنی ٹھوڑی ہتھیلیوں پہ رکھے، گھاس پر لیٹا ہوا تھا۔ یکایک اس کو ایک عالم اصغر کی موجودگی کا شدّت سے احساس ہوا، بشمول تمام جڑوں، تنوں، حشرات الارض اور اربوں جراثیم کے جو اس عالم اصغر کی معیشت کی آبیاری کا کام خاموشی سے سر انجام دے رہے ہیں۔ ارض کی یہ خوردبینی دنیا اچانک پھیل کر کل کائنات میں سما گئی، اور اس لڑکے کے متوّجہ ذہن سے ہم آہنگ ہو گئی۔ اس لڑکے نے اس تجربے کو مذہبی زاویے ئے سے دیکھا اور بالآخر چند سال بعد اس نے رہبانیت کا راستہ اختیار کیا۔ وہ ایک Anglican راہب بن گیا اور ہمارے سکول میں علوم دینیات کا استاد مقرّر ہو گیا۔ میں اس استاد سے بہت مانوس تھا۔ میں ان ہی جیسے آزاد خیال اساتذہ کا شکر گزار ہوں کہ کسی نے کبھی بھی مذہب کو زبردستی میرے حلق سے نیچے اتارنے کی کوشش نہیں کی[*]۔

کسی زمانے میں، کسی مقام پر، یہ لڑکا میں بھی ہو سکتا تھا۔ کسی افریقی باغ میں رات کے وقت آسمان کو تکتا ہوا، کاسیوپیہ (Cassiopea)، اورآیون (Orion) اور دب اکبر (Ursa Major) کو دیکھ کر ورطۂ حیرت میں مبتلا، آکاش گنگا کی ان سنی موسیقی سے آب دیدہ، گل یاس کی مہک میں مخمور۔ ایک ہی احساس نے کیوں میرے استاد کو مذہب کی طرف اور مجھے دوسری سمت دھکیل دیا، اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔ سائنسدانوں اور عقلیت پسندوں میں اس سوال کا نیم روحانی جواب دینے کا رجحان خاصہ عام ہے۔ اس کا مافوق الفطرت عقائد سے کوئی تعلق نہیں۔ لڑکپن میں نہ میں اور نہ میرے استاد محترم ڈارون کی کتاب Origin of Species کی ان آخری مشہور سطور سے آگاہ تھے، جن میں اس نے "دریا کے الجھے ہوئے کنارے" کا ذکر کیا، جس میں کہیں شاخ پر پرندے چہچہا رہے ہیں، انواع و اقسام کے حشرات الارض اڑتے پھر رہے ہیں، اور گیلی مٹّی میں کیڑے رینگ رہے ہیں۔ اگر وہ ان سطور سے آگاہ ہوتے تو شاید وہ بھی مذہبی علوم کی بجایے ڈارون کے اس زاویے کے قائل ہوتے کہ "تمام عالم قوانین کے مطابق وجود میں آیا ہے"۔

> لہٰذا قدرت کی اس کشمکش میں، قحط سالی اور موت سے وہ سب سے ارفعٰ و اعلیٰ موضوع جنم لیتا ہے جس کا ہم تصور کر سکتے ہیں، یعنی اعلیٰ جانوروں کا وجود میں آنا۔ زندگی کے اس زاویے میں ایک عجیب جلال ہے، جس میں حیات کی ساری قوّتیں جو شاید چند، یا ایک، ابتدائی ذات میں نمودار ہوئی ہوں گی، اپنے پورے آب و تاب سے منظر عام پر ابھرتی ہیں۔ جہاں یہ کرۂ ارض قوانین کشش ثقل کے مطابق اپنے مدار میں جاری و ساری ہے، اور جس پر اتنے سادہ آغاز کے باوجود نہایت خوبصورت اور حیران کن اشکال کی افزائش و ارتقاء کا ایک لا متناہی سلسلہ آج تک جاری و ساری ہے۔

کارل سیگن اپنی کتاب "Pale Blue Dot" میں لکھتے ہیں:

> یہ کیوں کر ہوا کہ دنیا کے تمام مذاہب میں سے کسی نے بھی سائنس کو پرکھنے کے بعد یہ نہیں سوچا 'ارے! یہ کائنات تو اس سے بھی بڑی، شاندار، لطیف اور خوبصورت ہے جیسا ہمارے انبیاء نے بیان کیا'۔ اس کے برعکس وہ کہتے ہیں کہ "نہیں، نہیں۔ ہمارا خدا ایک چھوٹا خدا ہے لیکن ہم اس کو چھوٹا ہی رہنے دینا چاہتے ہیں"۔ کوئی بھی نیا یا پرانا مذہب جو

---

[*] ہمارا اسپورٹ سبق کے دوران اکثر اس کی توجہ بائبل کی بجائے فائٹر کمانڈ کی ولولوہ انگیز کہانیوں کی طرف مبذول کرا دیتا۔ وہ دوسری عالمی جنگ میں ایر فورس میں رہ چکا تھا۔

سائنسی دریافتوں کی بنیاد پر کائنات کی شان و شوکت پر اسرار کرتا عام مذاہب کے مقابلے میں کہیں زیادہ تعظیم اور احترام حاصل کر پاتا۔

سیگن کی ساری کتابیں اس ماورائی حیرت کی حدود کو چھوتی ہیں جن پر کبھی صرف مذہب کی اجارہ داری تھی۔ اپنی کتابوں کے بارے میں میری بھی یہی تمنّا ہے۔ اس لئے عموماً لوگ مجھے ایک شدید مذہبی انسان بھی کہتے ہیں۔ ایک امریکی طالبہ نے مجھے خط لکھا کہ اس نے اپنے پروفیسر سے پوچھا کہ اس کا میرے بارے میں کیا خیال ہے۔ پروفیسر نے جواب دیا کہ "وہ بضد ہے کہ سائنس اور مذہب کا سنگم ممکن نہیں، لیکن قدرت اور کائنات کے بارے میں اس کا روّیہ وجدانی ہے۔ میری نظر میں یہی مذہب ہے"۔ لیکن کیا "مذہب" درست اصطلاح ہے؟ میرے خیال میں تو نہیں ہے۔ اپنی کتاب "ایک حتمی نظریے کا خواب (Dreams of a Final Theory) میں طبیعیات کے نوبل انعام یافتہ سائنسدان اور دہریے سٹیفن وائینبرگ نے لکھا ہے:

> خدا کے بارے میں کچھ لوگوں کے خیالات اتنے کشادہ اور لچکدار ہوتے ہیں کہ انہیں کہیں بھی خدا دکھ جاتا ہے۔ اکثر ایسا سننے میں آتا ہے کہ 'خدا اوّل و آخر ہے' یا 'خدا ہماری بہتر فطرت ہے' یا 'خدا کائنات ہے'۔ یقیناً کسی بھی لفظ کی طرح 'خدا' کو کوئی بھی مطلب دیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ یہ کہنا چاہیں کہ 'خدا انرجی ہے' تو آپ کو خدا کوئلے کے ٹکڑے میں بھی مل جائے گا۔

وائینبرگ کا کہنا درست ہے۔ کہ اگر ہم لفظ خدا کو بالکل ناکارہ نہیں چھوڑنا چاہتے تو ہمیں اسے اس کے رسمی معنوں میں ہی استعمال کرنا چاہئے؛ یعنی ایک مافوق الفطرت خالق جو عبادت کے لائق ہے۔

آئنسٹائن کے مذہب اور اِس مافوق الفطرت خالق کے مذہب کے درمیان تفریق نہ کرنے کی وجہ سے ایک الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔ آئنسٹائن اپنی نگارشات میں اکثر اوقات 'خدا' کی اصطلاح کا استعمال کرتے ہیں (اور ایسا کرنے والے وہ واحد دہریے نہیں)، جو مومنین میں غلط فہمی پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے اور یہ مومنین فوراً آئنسٹائن کا اپنی جماعت میں شامل ہونے کا دعویٰ کر دیتے ہیں۔ سٹیفن ہاکنگ کے آخری ڈرامائی (یا شرارتی؟) جملے 'اور پھر ہم خدا کے ذہن کو سمجھنے میں کامیاب ہو جائیں گے' کا غلط مطلب لیا جاتا ہے۔ اس جملے نے لوگوں میں یہ غلط فہمی بھی پیدا کی کہ ہاکنگ ایک مذہبی انسان ہیں۔ "قدرت کی مقدّس گہرائی " (The Sacred Depth of Nature)میں ماہر خلیاتی حیاتیات (cell biologist) ارسلا گڈ انف ہاکنگ یا آئنسٹائن سے کہیں زیادہ مذہبی نظر آتی ہیں۔ انہیں گرجا گھر، مساجد اور مندر بہت پسند ہیں اور ان کی کتاب کے بے شمار حصّے ایسے ہیں جنہیں سیاق و سباق سے علیحدہ پڑھا جائے تو مافوق الفطرت مذہب کے حق میں اچھا خاصہ مواد جمع ہو جاتا ہے۔ وہ تو اپنے بارے میں اس حد تک کہتی ہیں کہ وہ ایک "مذہبی فطرت پرست "religious naturlist ہیں۔ لیکن ان کی کتاب کو احتیاط سے پڑھنے پر پتہ چلتا ہے کہ وہ اتنی ہی دہریہ ہیں جتنا میں۔

"فطرت پسند" ایک امنگ سے بھرپور اصطلاح ہے۔ مجھے یہ اصطلاح اپنے بچپن کے ہیرو ھیو لافٹنگ کے کردار ڈاکٹر ڈولٹل کی یاد دلاتی ہے (جس کی حرکات و سکنات HMS Beagle کے 'فلسفی' فطرت پسند سے مماثلت رکھتی ہیں)۔ بیشتر لوگوں کے لئے فطرت پسند کی اصطلاح کا آج بھی وہی مطلب ہے جو اٹھارویں اور انیسویں صدی میں تھا: یعنی فطری دنیا کا طالب علم۔ اس لحاظ سے زیادہ تر فطرت پسند پادری ہوا کرتے تھے۔ خود ڈارون بھی جوانی میں پادری بننے کے راستے پر چل نکلے تھے۔ اور ان کو قوی امّید تھی کہ پادری کی تساہل پسند زندگی میں ان کو اپنے محبوب مشغلے بھنوروں اور دھمس کے مطالعہ کے خوب مواقع میسّر ہوں گے۔ لیکن فلسفی 'فطرت پرست' کی اصطلاح کو یکسر مختلف انداز میں 'مافوق الفطرت پرست' کے متضاد کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ "دہریت: ایک مختصر تعارف(Atheism: A Very Short Introduction) " میں جولیان بگانی بیان کرتے ہیں: "بیشتر دہریوں کا ایمان ہے کہ کل کائنات میں صرف ایک ہی نوعیت کا مادہ ہےاور یہ مادہ طبیعیاتی ہے۔ اسی مادے سے تمام ذہن، خوبصورتی، احساسات، اور اخلاقیات — یعنی وہ تمام اجزاء جو انسانی زندگی میں رنگ بھرتے ہیں — جنم لیتے ہیں۔

انسانی احساسات اور خیالات دماغ کے اندر ان گنت طبیعیاتی اجزاء کے نہایت پیچیدہ باہم ربط سے جنم لیتے ہیں۔ فلسفیانہ فطرت پسند ہونے کے لحاظ سے دہریہ ایک ایسا شخص ہوتا ہے جو یہ مانتا ہے کہ طبیعیاتی دنیا سے آگے کچھ نہیں، قابل مشاہدہ کائنات کے پیچھے کوئی مافوق الفطرت تخلیقی ذہن پوشیدہ نہیں

ہے، کوئی روح نہیں جو انسانی جسم کے ختم ہونے کے بعد جاری رہتی ہے، اور کوئی معجزات نہیں ہیں — سوائے ان قدرتی کرشموں کے جن کے بارے میں ہماری معلومات ابھی ناکافی ہیں۔ اگر فطری دنیا کے بارے میں ہماری کمزور معلومات سے آگے کچھ ہے تو ہمیں امّید ہے کہ ہم کبھی نہ کبھی اسے سمجھ جائیں گے اور اسے دائرۂ فطرت میں لے آئیں گے۔ اگر ہم قوس قزح کے تانے بانے ادھیڑ بھی دیں تو وہ پہلے سے کم لطف اندوز نہیں ہو گا۔

دور حاضر کے سائنسی اکابرین کی نگارشات پر طائرانہ نظر ڈالئے تو ایسا لگتا ہے کہ سب مذہبی ہیں، لیکن تفصیلی جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ سب ہی دہریے ہیں۔ یہ بات آئنسٹائن اور ہاکنگ کے سلسلے میں تو یقیناً درست ہے۔ شاہی ماہر فلکیات اور رائل یل سوسائٹی کے صدر مارٹن ریس نے مجھے بتایا کہ وہ اب "دہریے" اینگلکن ہوتے ہوئے بھی گرجاگھر کا رخ کر لیتے ہیں.... محض قبیلے سے وفا داری کی خاطر۔ ان کا کوئی مذہبی عقیدہ نہیں ہے لیکن وہ بھی دیگر سائنس دانوں کی طرح کائنات کی اس شاعرانہ فطرت پرستی سے مرعوب ہوتے ہیں جن کا میں نے اوپر ذکر کیا۔ ٹی وی پر ایک حالیہ مباحثے میں میں نے اپنے قریبی دوست، بچّوں کے ڈاکٹر رابرٹ ونسٹن کو چیلنج کیا کہ ان کے یہودی عقائد بھی اسی نوعیت کے ہیں اور وہ حقیقت میں کسی غیر فطری شے میں یقین نہیں رکھتے۔ وہ اس بات کا اعتراف کرتے کرتے رک گئے (ویسے بھی ان کو میرا انٹرویو لینا تھا نہ کہ مجھے ان کا)[۲]۔ میرے اسرار کرنے پر انہوں نے اتنا اعتراف تو کر ہی لیا کہ ان کی یہودیت سے انہیں اپنی زندگی کو منظّم خطوط پر استوار کرنے کا اور ایک مثبت زندگی گزارنے کا موقع ملتا ہے۔ اگر مان بھی لیا جائے کہ ایسا ہی ہے تو اس سے ان مافوق الفطرت دعووٴں کی سچّائی پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایسے بہت سے دہریے دانشور ہیں جو بڑے فخر سے اپنے آپ کو یہودی کہتے ہیں اور قدیم روایات یا مقتول رشتہ داروں کے ساتھ وفا داری کی خاطر یہودی رسومات بھی ادا کرتے ہیں۔ لیکن اس میں کچھ عمل دخل اس تعظیم کا بھی ہے جو دنیا کے سب سے مشہور یہودی البرٹ آئنسٹائن کو نصیب ہوئی ہے۔ شاید وہ یقین نہ رکھتے ہوں لیکن، ڈانئیل ڈینیٹ سے جملہ مستعار لیتے ہوئے، "ایمان پر یقین رکھتے ہیں"[۳]۔

آئنسٹائن کے اس جملے کا کثرت سے حوالہ دیا جاتا ہے کہ "مذہب کے بغیر سائنس لنگڑی ہے اور سائنس کے بغیر مذہب اندھا"۔ لیکن آئنسٹائن نے تو یہ بھی کہا تھا کہ:

> آپ نے میرے مذہبی عقائد کے بارے میں جو کچھ بھی پڑھا وہ سب جھوٹ ہے، ایک ایسا جھوٹ جو بڑے منّظم طریقے سے دہرایا جاتا ہے۔ میں کسی ذاتی خدا پر یقین نہیں رکھتا اور اس بات سے میں نے کبھی انکار نہیں کیا بلکہ صاف الفاظ میں اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ اگر میرے اندر کچھ مذہبی ہے تو وہ دنیا کے نظام کے لئے ستائش ہے جو سائنس نے ہم پر ظاہر کیا ہے۔

ایسا نہیں لگتا کہ آئنسٹائن نے اپنی ہی بات کی نفی کر دی ہو؟ یا یہ کہ ان کے الفاظ کو سیاق و سباق سے علیحدہ بحث کے دونوں جانب استعمال کیا جا سکتا ہے؟ نہیں! - "مذہب" سے آئنسٹائن جو مراد لیتے تھے وہ اس لفظ کے عام استعمال میں آنے والے مطلب سے بہت مختلف ہے۔ یاد رکھئے کہ میں بدستور الہامی مذہب اور آئنسٹائن کے مذہب میں تمیز کرتا رہوں گا اور صرف مافوق الفطرت خداؤں کو ہی فریب کا نتیجہ کہوں گا۔

آئنسٹائن کے مذہب کو سمجھنے کے لئے ان سے کئے گئے چند مزید اقتباسات ملاحظہ کیجئے:

> میں شدید مذہبی حد تک لادین ہوں۔ شاید یہ ایک نیا مذہب ہی ہے۔

> میں نے کبھی قدرت کو کسی مقصد یا عمل کے لئے ذمّہ دار نہیں مانا۔ مجھے تو قدرت میں انسان کو عاجزی سکھنے والا ایک شاندار نظام نظر آتا ہے جسے ہم شاید ابھی پوری طرح سمجھ نہیں پائے۔ یہ صحیح معنوں میں ایک مذہبی احساس ہے، جس کا روحانیت سے کوئی لینا دینا نہیں۔

> ایک ذاتی خدا کا خاکہ میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا اور سچ پوچھئے تو کسی قدر معصوم لگتا ہے۔

آئنسٹائن کی وفات کے بعد سے مذہبی عذر خواہ اس جستجو میں کوشاں رہتے ہیں کہ کسی طرح انہیں "اپنا" ثابت کر سکیں۔ لیکن ان کے مذہبی ہم

عصروں کا ان کے بارے میں یکسر مختلف خیال تھا۔ ۱۹۴۰ میں آئنسٹائن نے ایک مشہور مقالہ لکھا جس میں انہوں نے اپنے بیان "میں کسی ذاتی خدا پر یقین نہیں رکھتا" کے بارے میں وضاحت دینے کی کوشش کی۔ اس جیسے دیگر بیانات نے خطوط کا ایک طوفان کھڑا کر دیا، اور کئی لوگوں نے ان کے یہودی ماخذ کی طرف بھی اشارہ کیا۔ درج ذیل اقتباسات میکس جامر کی کتاب "آئنسٹائن اور مذہب (Einstein and Religion) " سے ماخوذ ہیں، اور میں نے بھی آئنسٹائن کے مذہب کے بارے میں ان کے اپنے بیانات اسی کتاب سے لئے ہیں۔ کنساس سٹی کے رومن کیتھولک پادری اعظم (Bishop) نے کہا: 'بڑے افسوس کی بات ہے کہ ایک ایسا شخص جو صحیفۂ قدیم (Old Testament) کی قوم اور اس کی تعلیمات سے تعلق رکھتا ہے اس کی عظیم روایات کا منکر ہے'۔ اس تنقید میں دیگر کیتھولک پادری بھی شامل ہو گئے: 'ذاتی خدا کے علاوہ خدا کا کوئی اور تصوّر ممکن ہی نہیں۔۔۔ آئنسٹائن کو معلوم ہی نہیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ وہ صریحاً غلط ہے۔ کچھ لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ علم کی کسی ایک شاخ میں مہارت حاصل کر لینے سے ان کو اب تمام شاخوں پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کا حق حاصل ہو گیا ہے'۔ مذہب کے بارے میں اس تصوّر کو، کہ یہ بھی ان علوم میں شامل ہے جس میں مہارت کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے، جائز تنقید کا نشانہ بنانا ضروری ہے۔ غالباً اس پادری کو کبھی بھی پریوں کے پروں کے رنگوں اور ساخت کے بارے میں کسی "پریوں کے ماہر" سے رجوع کرنے کا خیال نہیں آیا ہو گا۔ یہ پادری، اور کنساس سٹی کا پادری اعظم، دونوں سمجھتے تھے کہ مذہبیت میں نابلد ہونے کی وجہ سے آئنسٹائن خدا کے تصوّر کو ٹھیک سے سمجھ ہی نہیں پائے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آئنسٹائن بہت اچھے سے سمجھتے تھے کہ وہ کس بات سے انکار کر رہے ہیں۔

ایک امریکی رومن کیتھولک وکیل جو ایک مذہبی اتحاد کے لئے وکالت کرتا تھا، نے آئنسٹائن کو خط لکھا:

> ہمیں آپ کے اس بیان پر شدید افسوس ہے... جس میں آپ نے ایک ذاتی خدا کے تصوّر کو تمسخر کا نشانہ بنایا۔ گزشتہ دس سالوں میں آپ کے اس بیان سے زیادہ کوئی چیز منظر عام پر نہیں آئی جس سے اس احساس کو تقویت ملی ہو کہ ہٹلر کا یہودیوں کو جرمنی سے بے دخل کرنے کے پیچھے کچھ ٹھوس وجہ ہی رہی ہو گی۔ آپ کے حق آزادئ رائے کا احترام کرتے ہوئے، مجھے پھر بھی یہ کہنا پڑے گا کہ آپ اس وقت امریکہ میں اختلاف کی ایک بہت بڑی وجہ ہیں۔

نیو یارک کے ایک یہودی پادری نے کہا: 'بلا شبہ آئنسٹائن ایک عظیم سائنسدان ہیں لیکن ان کے مذہبی عقائد یہودیت سے یکسر مختلف ہیں'۔

'لیکن'؟ **'لیکن'**؟ 'اور' کیوں نہیں؟

نیو جرسی میں علوم تاریخ کی ایک انجمن کے صدر کے لکھے گئے ایک خط میں یہ مذہبی ذہنیت اس بری طرح بے نقاب ہوئی کہ یہ خط بار بار پڑھے جانے کا مستحق ہے:

> ڈاکٹر آئنسٹائن، ہم آپ کے علم کی قدر کرتے ہیں، لیکن ایک چیز ہے جس کے بارے میں آپ لا علم ہیں: وہ یہ کہ خدا ایک روح ہے جو دوربین یا خوردبین سے نہیں دیکھی جا سکتی، جیسے انسانی خیالات اور جذبات دماغ کی جانچ کرنے سے تلاش نہیں کئے جا سکتے۔ سب جانتے ہیں کہ مذہب ایمان پر مبنی ہے، علم پر نہیں۔ ہر عقلمند انسان کبھی نہ کبھی مذہبی شبہات کا شکار ہو جاتا ہے۔ میرا اپنا ایمان کئی بار ڈگمگایا ہے۔ لیکن دو وجوہات کی بنا پر میں نے اپنے شکوک کا کبھی کسی سے ذکر نہیں کیا۔ (۱) مجھے ڈر تھا کہ میں کہیں اشارۃً بھی کسی کی امّیدوں اور زندگی کو نقصان نہ پہنچا دوں اور (۲) کیونکہ میں اس جملہ کے لکھنے والے سے اتّفاق کرتا ہوں کہ' ایسا شخص جو کسی دوسرے کے ایمان کو نقصان پہنچا سکتا ہے ایک ذلیل شخص ہو گا'.... ڈاکٹر آئنسٹائن، مجھے امّید ہے کہ آپ کی بات کا غلط حوالہ دیا گیا ہے اور آپ ان ان گنت امریکیوں کو جو آج بھی آپ کو عزّت دینا پسند کرتے ہیں کوئی نہایت خوشگوار پیغام دیں گے۔

کیسا تباہ کن انکشاف ہے اس خط میں! ہر جملہ عقلی اور اخلاقی بزدلی سے بھرا ہوا ہے!

'اوکلاہوما کی کالوری ٹیبرنیکل ایسوسی ایشن' کے بانی کا خط اس سے کم تر لیکن زیادہ حیران کن تھا:

> پروفیسر آئنسٹائن، مجھے یقین ہے کہ امریکہ کا ہر عیسائی آپ کو یہی جواب دے گا کہ "ہم خدا اور اس کے بیٹے عیسیٰ مسیح پر ایمان کو نہیں چھوڑیں گے۔ لیکن آپ کو ہم یہی پیغام دیں گے کہ' اگر آپ اس ملک میں رہنے والے لوگوں کے خدا پر ایمان نہیں رکھ سکتے تو بہتر ہو گا کہ آپ جہاں سے آئے ہیں وہیں واپس چلے جائیں'۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق اسرائیل کے لئے ایک رحمت اور نعمت بننے کی کوشش کی ہے۔ لیکن آپ کی شاطمانہ زبان کے ایک جملے نے آپ کے لوگوں کو جو نقصان پہنچایا ہے وہ اس محنت سے کہیں زیادہ ہے جو اسرائیل سے محبت کرنے والے عیسائیوں نے یہودیوں کے خلاف نفرت کو کم کرنے کے لئے کی ہے۔ پروفیسر آئنسٹائن، امریکہ کا ہر عیسائی آپ کو یک زبان ہو کر جواب دے گا کہ 'اٹھایئے اپنے احمقانہ اور مکّار نظریہ ارتقاء کو اور واپس اپنے ملک جرمنی کو لوٹ جایئے۔ یا پھر جن لوگوں نے آپ کو اپنے ملک سے بے دخل ہونے کے وقت پر خوش آمدید کہا تھا، ان کے ایمان کو خراب کرنا چھوڑ دیں'۔

آئنسٹائن کے تمام مذہبی ناقدین کا ایک بات پر اتّفاق تھا، کہ وہ ان میں سے نہیں تھے۔ وہ بار ہا ایسا تاثر دئے جانے پر برہمی کا اظہار کر چکے تھے کہ وہ توحید پرست تھے۔ تو کیا وہ والٹئیر کی طرح دین فطرت کے معتقد تھے؟ یا سپنوزا کی طرح اصنام پرست تھے اور جس کے فلسفے کے وہ مداح تھے: "میں سپنوزا کے خدا میں یقین رکھتا ہوں جو اپنے آپ کو وجودیت کی ہم آہنگی میں ظاہر کرتا ہے، نہ کے کسی عام خدا میں جو انسانوں کی زندگیوں اور قسمتوں میں دلچسپی لیتا ہے"۔

آیئے ذرا چند اصطلاحات کو دہرا لیتے ہیں۔توحید پرست ایک ایسے مافوق الفطرت ذہانت پر یقین رکھتے ہیں جو کائنات کی تخلیق کے کام کے مکمل ہو جانے کے بعد بھی موجود رہتا ہے اور اپنی مخلوق کے ارد گرد منڈلاتا ہے اور اس کی قسمت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ بیشتر فطری مذاہب میں یہ خدا انسانی امور میں بڑی تفصیل سے ملوث رہتا ہے۔ عبادت کا جواب دیتا ہے؛ گناہ معاف کرتا ہے؛ معجزات کر کے دنیا میں مداخلت کرتا ہے؛ اچھے اور برے فعل کے بارے میں پریشان رہتا ہے؛ اور جانتا ہے کہ ہم یہ افعال کب کرتے ہیں (یا کرنے کے بارے میں سوچتے بھی ہیں)۔ فطرت پرست بھی کائنات بنانے والی ایک مافوق الفطرت ذہانت پر یقین رکھتے ہیں، لیکن اس کا دائرہ کار ان قوانین تک محدود ہے جو اس نے اس کائنات کی تخلیق کے لئے استوار کئے ہیں۔ فطرت کا خدا تخلیق کے بعد کبھی دنیا میں مداخلت نہیں کرتا اور انسانی امور میں تو اسے یقیناً کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اصنام پرست تو بالکل کسی مافوق الفطرت خدا پر یقین نہیں رکھتے، اور خدا کی اصطلاح کو کائنات یا قدرت یا ان کے قوانین کے بارے میں بات کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ فطرت پرست کے خدا اور توحید پرستوں کے خدا میں یہ قدر مختلف ہوتی ہے کہ ان کا خدا دعا کا جواب نہیں دیتا، ہمارے خیالات نہیں پڑھتا اور اپنی مرضی کے معجزے کر کے ہماری زندگی میں مداخلت نہیں کرتا۔فطرت پرستوں کے خدا اور اصنام پرستوں کے خدا میں یہ فرق ہے کہ فطری خدا ایک کائناتی ذہانت ہے، جبکہ اصنام پرستوں کا خدا قوانین قدرت کے لئے ایک استعارہ یا شاعرانہ مترادف ہے. اصنام پرستی دہریت کی پرکشش شکل ہے، جبکہ فطرت پرستی توحید پرستی کی نیم گرم شکل ہے۔

اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کی آئنسٹائن کے یہ جملے کہ 'خدا خود کو نزاکت سے ظاہر کرتا ہے لیکن بدنیت نہیں' یا 'خدا جوا نہیں کھیلتا' یا 'کیا کائنات کی تخلیق میں خدا کے پاس کوئی چارہ تھا؟' اپنی ساخت میں اصنام پرست ہیں، فطرت پرست نہیں۔ اور توحید پرست تو قطعی نہیں ہیں۔ 'خدا جوا نہیں کھیلتا' کا درست ترجمہ تو یہ بنتا ہے کہ 'بے ترتیبی (randomness) کسی بھی چیز کے پس پردہ کار فرما نہیں ہوتی'۔ 'کیا کائنات کی تخلیق میں خدا کے پاس کوئی چارہ تھا؟' کا مطلب ہے 'کیا کائنات کسی اور طریقے سے بھی وجود میں آ سکتی تھی؟'۔ آئنسٹائن 'خدا' کی اصطلاح کو شاعرانہ استعارہ کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ سٹیفن ہاکنگ اور دیگر ماہرین طبیعیات نے بھی کبھی کبھی اپنی بات کو بیان کرنے کے لئے اسی مذہبی استعارہ کا سہارا لیا۔ پال ڈیویس کی کتاب "خدا کا ذہن (The Mind of God) آئنسٹائن کی اصنام پرستی اور فطرت پرستی کے درمیان میں ہے، جس کے لئے انہیں ٹمپلٹن انعام سے نوازا گیا، یہ ایک خطیر رقم ہے جو ہر سال کسی ایسے سائنسدان کو دی جاتی ہے جو مذہب کے بارے میں کچھ اچھی باتیں کہہ دیتے ہیں۔

میں آئنسٹائن کے ایک اور جملے میں ان کے مذہبی خیالات کو بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں: 'یہ شعور ہی مذہب ہے، کہ ہر قابل تجربہ چیز کے

پیچھے کوئی ایسی چیز ہے جو ذہن کی سمجھ سے بالاتر ہے اور جس کی خوبصورتی اور نزاکت ہم تک بلاواسطہ ایک دھندلی پرچھائی کی طرح پہنچتی ہے۔ اس انداز سے میں مذہبی ہوں'۔ اس انداز سے میں بھی مذہبی ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ 'جو ذہن کی سمجھ سے بالاتر ہے' کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ ہمیشہ بالا تر رہے گا۔ لیکن میں اپنے آپ کو "مذہبی" کہلوانا پسند نہیں کرتا کیونکہ یہ گمراہ کن ہے۔ بلکہ تباہ کن حد تک گمراہ کن ہے کیونکہ عام لوگوں کے ذہن میں 'مذہب' کی اصطلاح 'مافوق الفطرت' کے معنی رکھتی ہے۔ کارل سیگن نے اس موضوع پر کہا تھا: "..... اگر 'خدا' سے ہماری مراد وہ طبیعیاتی قوانین ہیں جو کائنات پر کار فرما ہیں، تو صاف ظاہر ہے کہ ایسا خدا جذباتی نقطہ نظر سے اطمینان بخش نہیں ہے..... قانون کشش ثقل کی عبادت کرنے کی کوئی تک نہیں بنتی"۔

دلچسپی کی بات یہ ہے کہ سیگن کے آخری نقطۂ بحث کو ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں، جب امریکہ کی کیتھولک یونیورسٹی کے پروفیسر ریورنڈ ڈاکٹر فلٹن جے شین نے آئنسٹائن کے خدا کو نہ ماننے کے دعوے پر ۱۹۴۰ میں بھرپور حملہ کیا۔ شین نے طنزیہ انداز میں سوال اٹھایا کہ کیا کوئی آکاش گنگا (Milky Way) کی خاطر اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہو گا؟ شین کو خیال تھا کہ وہ آئنسٹائن کے خلاف دلیل دے رہا ہے، ان کے حق میں نہیں، اور اس نے آگے چل کر یہ کہا: اس کے کائناتی (cosmical) مذہب میں بس ایک ہی غلطی ہے، کہ اس میں ایک s زیادہ ہے. (یعنی آئنسٹائن کا مذہب مضحکہ خیز ہے)۔ لیکن آئنسٹائن کے مذہب میں کچھ بھی مضحکہ خیز نہیں۔ بہر طور، میری خواہش ہے کہ ماہرین طبیعیات خدا کی اصطلاح کو اپنے مخصوص استعارہ کے طور پر استعمال کرنے سے گریز کریں۔ ان ماہرین کا استعارے والا، اصنام پرستی والا خدا اس مداخلت پسند، معجزے کرنے والے، ذہنوں کو پڑھنے والے، گناہ کی سزا اور دعا کا جواب دینے والے، انجیل اور ملّا و ربّی و پادری کے خدا سے ، اور عام زبان سے، کروڑوں میل دور ہے۔ جان بوجھ کر دونوں میں ابہام پیدا کرنے کی کوشش کرنا میری رائے میں دانشورانہ بغاوت کے مترادف ہے۔

## احترام غیر مستحق

## Undeserved Respect

میری کتاب کا عنوان، فریب خدائی (The God Delusion) کا آئنسٹائن یا دیگر سائنسدانوں کے خدا سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ پہلے اس خدا کو راستے سے ہٹا دیا جائے؛ اس "خدا" میں معاملات کو الجھا دینے کی بہت زیادہ قابلیت ہے۔ بقیہ کتاب میں اب میں صرف مافوق الفطرت خداؤں کے بارے میں ہی بات کروں گا، جن میں سے میرے قارئین کے لئے سب سے مانوس عہد نامہ قدیم کا خدا ہے۔ میں تھوڑی ہی دیر میں اس مدعے کی طرف آؤں گا۔ لیکن اس سے پہلے میں اس باب میں ایک اور مسئلے کی طرف جانا چاہتا ہوں جس پر توجہ نہ دی گئی تو وہ پوری کتاب پر حاوی ہو سکتا ہے۔ اس بار مسئلہ آداب کا ہے۔ ممکن ہے مذہبی پیشوا میری بات سے خفا ہو جائیں، اور انہیں ان صفحات میں اپنے پسندیدہ عقیدہ کے لئے خاطر خواہ احترام نظر نہ آئے۔ بڑے افسوس کی بات ہو گی اگر احترام کی یہ کمی ان کو مزید پڑھنے سے روکے، اس لئے میں یہیں اس مسئلے کا سدّ باب کرنا چاہتا ہوں۔

ہمارے معاشرے میں تقریباً سب لوگ، بشمول ملحد لوگوں کے، یہ فرض کرتے ہیں کہ مذہبی ایمان بالخصوص کمزور اور قابل زد ہے، جسے احترام کی ایک موٹی دیوار کے پیچھے حفاظت سے رکھنے کی ضرورت ہے، ایک خاص درجے کے احترام جو عموماً انسان ایک دوسرے کو بھی نہیں دیتے۔ ڈگلس ایڈمز نے اپنی وفات سے کچھ ہی عرصہ قبل کیمبرج یونیورسٹی میں ایک فی البدیع خطاب کیا تھا ، جسے میں لوگوں کے سامنے رکھنا بہت پسند کرتا ہوں:

> مذہب کے مرکز پر چند ایسے خیالات ہیں جنہیں ہم نہایت مقدّس سمجھتے ہیں، یا جو بھی کہیئے۔ اِس کا مطلب صرف اتنا ہے: 'یہ ایک ایسا خیال ہے جس کے بارے میں آپ کو کوئی بری بات کرنے کی اجازت نہیں ہے؛ بس، نہیں ہے! کیوں نہیں ہے؟ ..... کیونکہ نہیں ہے'!! اگر کوئی شخص کسی ایسی جماعت کے لئے ووٹ ڈالے جو آپ کو پسند نہیں تو آپ کو پورا اختیار ہے کہ آپ اس کے خلاف جتنا پسند کریں بحث کریں؛ ہر کسی کے پاس اپنا اپنا نقطہ نظر ہو گا لیکن کوئی بھی اس سے ناراض نہیں ہو گا۔ اگر کوئی کہتا ہے کہ ٹیکس بڑھنا یا گھٹنا چاہئے تو آپ اس سے بحث کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس اگر کوئی یہ کہے کہ 'مجھے ہفتہ کے روز بجلی کا بٹن نہیں دبانا چاہئے' تو آپ کہیں گے 'میں اس کا احترام کرتا ہوں'۔

ایسا کیوں ہے کہ لیبر پارٹی یا کنزرویٹیو پارٹی یا ڈیموکریٹ پارٹی یا ریپبلکن پارٹی کی حمایت کرنا جائز ہے، اقتصادیات کے مختلف ماڈل کی حمایت کرنا قابل قبول ہے، Macintosh استعمال کیا جائے یا Windows,۔۔ لیکن کائنات کے آغاز اور ممکنہ بنانے والے کے بارے میں رائے رکھنا.... نہیں، یہ مقدّس ہے؟ ... ہمیں عادت ہے کہ ہم مذہبی خیالات کے بارے میں سوال نہ اٹھائیں، لیکن رچرڈ کے ایسا کرنے پر جو شور و غوغا اٹھتا ہے وہ بہت دلچسپ ہوتا ہے! ہر کوئی ایک جنون کی کیفیت میں آ جاتا ہے، کیونکہ آپ کو ایسی باتیں کہنے کی اجازت ہی نہیں۔ لیکن ا اسی خیالات کو جب منطقی انداز سے دیکھیں تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس کو بھی بحث کا نشانہ نہ بنایا جائے..... سوائے اس کے کہ ہم نے مشترکہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ان موضوعات پر بحث نہیں کی جائے گی۔

مذہب کے حق میں ہمارے معاشرے میں احترام کی ایک عمدہ مثال ملاحظہ کیجئے، جو خاصی اہم بھی ہے۔ جنگ کے دنوں میں فوج میں بھرتی ہونے سے انکار کا آسان ترین راستہ ہے کہ آپ ضمیر کے نام پر اعتراض کر دیں۔ بھلے آپ ایک اخلاقیات کے انتہائی قابل فلسفی ہوں، آپ نے جنگ کی برائی کے خلاف پی ایچ ڈی کا انعام یافتہ مقالہ لکھا ہو، پھر بھی فوجی بھرتی کی کمیٹی ضمیر کے نام پر آپ کے اعتراض کی جانچ کے دوران آپ کے لئے کافی مشکلات پیش کرے گی۔ لیکن اگر آپ یہ اعلان کر دیں کہ آپ کوئیکر ( Quaker) ہیں، تو آپ کی اعتراض کی درخواست بغیر کسی حجت کے قبول کر لی جائے گی، چاہے آپ قریباً جاہل ہوں، آپ کو امن پسندی کی الف بے نہ آتی ہو، یہاں تک کہ کوئیکر مت کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہ ہو۔ تسلسل رائے کی دوسری حد پر نبرد آزما فریقین کے لئے مذہبی نام استعمال کرنے سے ایک بزدلانہ ہچکچاہٹ کا مظاہرہ دیکھنے میں آتا ہے۔ شمالی آئیرلینڈ میں جہاں فرقہ وارانہ لڑائی کم از کم ۲۰۰ سال سے جاری ہے، کیتھولک فرقے کے لئے نیشنلسٹ قوم پرست اور پروٹیسٹنٹ فرقے کے لئے اتحاد پسند یونینسٹ کا متبادل استعمال کیا جاتا ہے۔ لفظ "مذہب" کو سرے سے ہی "برادری" میں تبدیل کر دیا جاتا ہے، جیسے "برادریوں کے ما بین تنازعہ"۔ ۲۰۰۳ میں برطانوی امریکی مشترکہ حملے کے نتیجے میں شیعہ سنّی خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اگرچہ یہ صحیح معنوں میں ایک مذہبی فرقہ وارانہ تنازعہ ہے، لیکن انڈیپینڈنٹ (Independent) اخبار نے ۲۰ مئی ۲۰۰۶ کو پہلے صفحے پر اور مرکزی مقالے کی شہ سرخی میں اسے 'نسل کشی' کا نام دیا۔ اس سیاق و سباق میں لفظ 'نسل' کا استعمال بھی متبادل کے زمرے ہی آتا ہے۔ عراق میں جو ہو رہا ہے وہ در حقیقت 'مذہبی صفائی' ہے۔ نسل کشی کی اصطلاح سابقہ یوگوسلاویہ میں بھی مذہبی صفائی کے لئے متبادل کے طور پر ہی استعمال کیا گیا، جہاں آرتھوڈاکس سرب، کیتھولک کروٹ، اور بوسنیا کے مسلمانوں نے مذہبی بنیاد پر ایک دوسرے کا قتل عام کیا[۵]۔

میں نے پہلے بھی حکومت اور ذرائع ابلاغ میں اخلاقیات کی بحث میں مذہب کو بخشے جانے والے استحقاق پر توجہ مبذول کرائی ہے[۶]۔ جہاں بھی جنسی یا تولیدی مسائل کا تنازعہ پیدا ہو تا ہے، آپ خاطر جمع رکھئے کہ مختلف مذہبی گروہوں کے قائدین کو با اثر کمیٹیوں، یا ریڈیو اور ٹی وی مباحثوں میں خاطر خواہ نمائندگی حاصل ہو گی۔ میں یہ قطعاً تجویز نہیں کر رہا کہ ان لوگوں کی آوازوں کو دبانے کی کوشش کی جائے۔ لیکن میرا سوال یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ ایسے مسائل کے سلسلے میں ماہر اخلاقیات یا عائلی قوانین کے وکیل یا ڈاکٹر سے رجوع کرنے کی بجائے ان مذہبی لوگوں سے رجوع ہی کیوں کرتے ہیں، جیسے ان کے پاس کوئی تکنیکی مہارت موجود ہو گی؟

مذہب کے عجیب و غریب استحقاق کی ایک اور مثال ملاحظہ کیجئے۔ ۲۱ فروری ۲۰۰۶ کو امریکہ کی عدالت عظمیٰ نے فیصلہ سنایا کہ آئین کی رو سے نیو میکسیکو کا ایک چرچ نشہ آور دوا سے منسلک قانون سے مستثنیٰ ہے جبکہ اس قانون کا اطلاق ہر ایک پر ہوتا ہے[۷]۔ "سانترو اپیسریتا بنی فسینترے انیاو دے ویجیتال" کے وفا دار ممبران کا ایمان ہے کہ صرف ہواسکہ چائے پینے سے ہی انہیں خدا کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ہواسکہ چائے کے اجزاء میں ہذیان آمیز دوا "ڈائی میتھل ٹرپٹامین" شامل ہے۔ اس بات پر توجّہ فرمایئے کہ محض یہ عقیدہ ہونا ہی کافی ہے کہ ہواسکہ چائے خدا کو سمجھنے میں مدد کرتی ہے۔ انہیں اِس سلسلے میں ثبوت فراہم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کے برعکس ہمارے پاس وافر ثبوت موجود ہیں کہ کینابس (چرس) کینسر کے مریضوں کی کیموتھراپی کے دوران متلی اور تکلیف کی کیفیات کو کم کرنے میں مددگار ثابت ہوئی ہے۔ پھر بھی عدالت عظمیٰ نے ۲۰۰۵ میں فیصلہ دیا کہ تمام ایسے مریضوں کے خلاف وفاقی قانونی چارہ جوئی کی جاسکتی ہے جو طبی مقاصد کے لئے بھی چرس کا استعمال کرتے ہیں۔ (اس سے وہ مریض بھی مستثنیٰ نہیں جو ایسی ریاستوں میں رہتے ہیں جہاں چرس کے مخصوص استعمال کی قانونی اجازت ہے)۔ ہر صورت میں ترپ کا پتّہ مذہب ہی نکلتا ہے۔ سوچئے کہ مصوّروں کا کوئی گروہ یہ دعویٰ کرے کہ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ 'امپریشنسٹ" یا "سرّیالسٹ" تصاویر کو سمجھنے کے لئے انہیں ہذیان آمیز ادویات کی ضرورت ہے۔ لیکن جب ایک چرچ بالکل ایسا ہی

دعویٰ کرتا ہے تو اسے ملک کی سب سے اعلیٰ عدالت کی حمایت حاصل ہو جاتی ہے۔ مذہب کے طلسم میں اتنی طاقت ہے۔

اٹھارہ سال پہلے جریدہ نیو سٹیٹس مین (New Statesman) نے چھتّیس ادیبوں اور مصوّروں کو مشہور ادیب اور ناول نگار سلمان رشدی، جن کے خلاف ان دنوں ایک ناول لکھنے پر موت کا فتویٰ آ چکا تھا، کے حق میں لکھنے کے لئے آمادہ کیا۔ اس فہرست میں میں بھی شامل تھا۔ مسلمانوں کو پہنچائے گئے "دکھ" کے حق میں عیسائیوں اور چند بے دین گروہوں سے ملنے والی "ہمدردی" کی وجہ سے مجھے شدید غصّہ تھا جس کا اظہار میں نے ان الفاظ میں کیا:

> اگر نسلی امتیاز کی وکالت کرنے والے ہوش میں ہوتے تو یہ دعویٰ کرتے ۔ جو میرے خیال میں سچ ہی ہوتا کہ نسلی امتزاج ان کے مذہب کے خلاف ہے۔ یہ سن کر زیادہ تر مخالفین چپ چاپ گھر کو چلے جاتے۔ اور یہ کہنے کا کوئی فائدہ نہیں کہ یہ تقابل ناجائز ہے کیونکہ نسلی امتیاز کا کوئی منطقی جواز نہیں ہے۔مذہبی اعتقاد کا سارا مقصد، اس کی سب سے بڑی طاقت، اور اس کا طرّۂ امتیاز ہی یہی ہے کہ اسے منطقی جواز پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم سب کو اپنے تعصبات کا جواز پیش کرنا پڑتا ہے۔ لیکن کسی مذہبی انسان سے کہیئے کہ اپنے اعتقادات کا جواز سامنے لائے تو آپ پر اس کی 'مذہبی آزادی' کو پامال کرنے کا الزام عائد ہو جائے گا۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ کچھ اسی طرح کا اکیسویں صدی میں بھی ہو سکتا ہے۔ ۱۰ اپریل ۲۰۰۶ کی اشاعت میں لاس انجلیس ٹائیمز (Los Angeles Times) میں خبر چھپی کہ یونیورسٹیوں کے کیمپس پر متعدد عیسائی گروہوں نے یونیورسٹیوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی شروع کر دی ہے کہ ان کی یونیورسٹی امتیازی قوانین نافذ کر رہی ہے، جس کے تحت ان گروہوں پر ہم جنس پرستوں کو ہراساں اور پریشان کرنے پر پابندی عائد کی گئی تھی۔ مثال کے طور پر ۲۰۰۴ میں ۱۲ سالہ سکول کے طالب علم جیمز نکسن نے عدالت سے ایک قمیض پہننے کا حق حاصل کر لیا جس پر لکھا تھا کہ 'ہم جنس پرستی گناہ ہے، اسلام جھوٹ ہے، حمل گرانا قتل ہے ۔ کچھ باتیں سیاہ و سفید ہوتی ہیں'![8] سکول نے اسے وہ قمیض پہننے سے منع کیا، اور اس کے والدین نے سکول کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ اگر انہوں نے دوسری آئینی ترمیم کا سہارا لیا ہوتا تو ان کے مقدمے میں دم ہوتا۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے برعکس نکسن خاندان کے وکلا نے آئین میں دئے گئے حق آزادئ ایمان پر انحصار کیا۔ ان کے کامیاب مقدمے میں انہیں الائینس ڈیفنس فنڈ اف ایریزونا Alliance Defence Fund of Arizona کی حمایت حاصل رہی، جس کا مقصد ہی 'مذہبی آزادی کے لئے قانونی جنگ' لڑنا ہے۔

پادری رک سکاربورو نے عیسائی گروہوں کی طرف سے کئے گئے اس طرح کے قانونی دعوؤں کی حمایت میں، جن کا مقصد ہم جنس پرستوں اور دیگر گروہوں کے خلاف تعصب کے حق میں مذہب کو ایک قانونی جواز کے طور پر منوانے کے لئے جد و جہد کرنا ہے، اس کو اکّیسویں صدی کی تحریک شہری حقوق کا نام دیا ہے۔ 'عیسائیوں کو عیسائی بننے کے حق کے لئے لڑنا ہو گا'[9]۔ میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ اگر یہ لوگ اپنے حق گفتار کا دفاع کرنے کے لئے اٹھے ہوتے تو میں بھی بے دلی سے اس کی حمایت کر ہی دیتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے ۔ "عیسائی ہونے کا حق" در اصل "دوسروں کی ذاتی زندگیوں میں اپنی ٹانگ اڑانے کا حق" ہے۔ ہم جنس پرستوں کے خلاف تعصب کے دفاع میں اس قانونی مقدمے کو مذہب کی بنیاد پر تعصب کی مخالفت کا مقدمہ بنا کر پیش کیا گیا ہے! اور قانون اس لفظی شعبدہ بازی کا احترام کرتا نظر آتا ہے۔ آپ کو یہ کہنے کی اجازت نہیں کہ 'ہمیں ہم جنس پرستوں پر لعن طعن سے روکنے کی وجہ سے ہمارے تعصب کا حق پامال ہوتا ہے' لیکن یہ کہنے سے آپ کو کوئی نہیں روکے گا کہ 'ہمارا مذہبی حق پامال ہوتا ہے'۔ ذرا سوچئے! دونوں میں فرق ہی کیا ہے؟ ایک بار پھر، مذہب بازی مار جاتا ہے۔

اس باب کا اختتام میں ایک خاص کیس سٹڈی (case study) سے کروں گا، جو معاشرے کی طرف سے مذہب کو بے جا انسانی احترام سے بڑھا دئے جانے والے احترام پر روشنی ڈالنے کا کام کرے گا۔ یہ مضحکہ خیز واقعہ فروری ۲۰۰۶ میں پیش آیا، اور مزاح اور الم کی انتہاؤں کے درمیان آگے پیچھے ہوتا رہا۔ ستمبر ۲۰۰۵ میں ڈنمارک کے اخبار جلنڈ پوسٹن (Jyllands-Posten) نے مسلمانوں کے نبی محمد کے ۱۲ مزاحیہ خاکے چھاپے۔ اگلے تین ماہ میں ڈنمارک میں مقیم مسلمانوں کے ایک گروہ نے بڑے منظم انداز میں عالم اسلام میں غم و غصے کو بتدریج ہوا دی۔ اس گروہ کے سرغنہ دو امام تھے جنہیں کچھ سال قبل ڈنمارک کی حکومت نے اپنے ملک میں پناہ دی تھی[10]۔ سنہ ۲۰۰۵ کے اواخر میں یہ دونو ں بد خواہ انسان ڈنمارک سے مصر کی جانب ایک

کتابچہ لے کر روانہ ہوئے، جس کی نقلیں وہاں سے پوری اِسلامی دنیا میں پھیلا دی گئیں، خاص طور پر انڈونیشیا میں۔ اس کتابچے میں ڈنمارک میں مسلمانوں پر کئے جانے والے مظالم اور جلنڈ پوسٹن کے سرکاری اخبار ہونے کے بارے میں جھوٹ درج تھے۔ ان ۱۲ خاکوں کے علاوہ امام حضرات کی طرف سے ۳ خاکے اور بھی شامل کئے گئے تھے جن کے ماخذ کے بارے میں ابہام تھا اور جن کا یقیناً ڈنمارک سے کوئی تعلق نہ تھا۔ پہلے ۱۲ کے مقابلے میں یہ نئے ۳ خاکے واقعی بہت نازیبہ تھے یا ہوتے، اگر وہ واقعی محمد کے بارے میں ہوتے، جیسا کہ ان کے بارے میں الزام تھا۔ ان میں خاص طور سے نقصان دہ ایک ایسا خاکہ تھا جو در اصل خاکہ تھا ہی نہیں بلکہ ایک باریش آدمی کی تصویر تھی جس کے چہرےپر سور کا ناک الاسٹک بینڈ سے چڑھا دیا گیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد یہ پتا چلا کہ یہ تصویر Associated Press میں چھپی تھی اور ایک فرانسیسی آدمی کی تھی جس نے کسی گاؤں کے میلے میں سور جیسی آواز نکالنے کے مقابلے میں حصہ لیا تھا"۔ اس تصویر کا اسلام سے، محمد سے، یا ڈنمارک سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن ان دو تخریب کار امام حضرات نے تینوں کو بھی انہیں خاکوں سے منسلک کر دیا.... نتیجہ وہی ہوا جس کی امید کی جا سکتی تھی۔

بڑی احتیاط سے دکھ اور غم و غصہ جنگل کی آگ کی طرح پھیلا یا گیااور پانچ ماہ بعد پاکستان اور انڈونیشیا میں مظاہرین نے ڈنمارک کے جھنڈے (جو ان کو ملے کہاں سے؟) نظر آتش کئے اور ڈنمارک کی حکومت سے معافی کا مطالبہ کیا۔ (معافی کس بات کی؟ ڈنمارک کی حکومت نے نہ تو یہ خاکے بنائے تھے نہ نشر کئے تھے۔ ڈنمارک کے شہری ایک ایسے معاشرے میں رہتے ہیں جہاں ذرائع ابلاغ آزاد ہیں، جو شاید مسلم معاشروں میں رہنے والےلوگ مکمل طور پر سمجھ نہیں پاتے)۔ ناروے، جرمنی، فرانس اور امریکہ کے اخباروں نے بھی جلنڈ پوسٹن کی حمایت یت میں یہ خاکے چھاپے (اگرچہ برطانیہ کے اخباروں نے ایسا کرنے سے گریز کیا)۔ اس حرکت نے جلتے پر تیل کا کام کیا۔ سفارت خانوں اور قونصل خانوں پر حملے کئے گئے، ڈنمارک کی بر آمدات کا بائیکاٹ کیا گیا، ڈنمارک کے شہریوں، اور مغربی لوگوں کے ساتھ عموماً دھمکی بھرا سلوک روا رکھا گیا۔پاکستان میں عیسائی گرجا گھروں کو، جن کا ڈنمارک یا یورپ سے کوئی تعلق یا واسطہ بھی نہیں تھا نظر آتش کیا گیا۔ بنغازی (لبیا) میں بلوائیوں نے اطالوی سفارت خانے پر حملہ کیا جس میں ۹ لوگوں کی موت واقع ہوئی۔ جیسے جرمن گریئر نے لکھا، ' یہ لوگ ہنگامہ آرائی کو سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں اور مہارت بھی رکھتے ہیں'[۲]۔

ایک پاکستانی امام نے 'ڈینش خاکہ نویس' پر ا میلین ڈالر کا انعام رکھ دیا؛ بیچارہ شاید اس حقیقت سے بھی ناواقف تھا کہ خاکے ایک نہیں ۱۲ مختلف خاکہ نویسوں نے بنائے تھے، اور اس بات سے تو یقیناً واقف نہیں تھا کہ تین سب سے زیادہ دل شکن خاکے کبھی ڈنمارک میں چھپے ہی نہیں تھے۔ (از راہ گفتگو، یہ ا میلین ڈالر آنے والے کہاں سے تھے)؟ نائیجیریا میں بھی بلوا کرنے والوں نے عیسائی چرچ بھی جلائے اور مچیٹی (افریقی خنجر) سے (سیاہ فام نائیجرئین) عیسائیوں کا قتل کیا۔ ایک عیسائی کو ربڑ کے ٹائیر میں جکڑ کر، پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دی گئی۔ برطانیہ میں مظاہروں کی تصاویر میں مظاہرین نے بینر اٹھائے ہوئے تھے جن پر لکھا تھا 'اسلام کی توہین کرنے والو ں کو قتل کر دو'، 'اسلام کا تمسخر اڑانے والوں کو ذبح کر دو'، یورپ، تمہیں حساب دینا ہو گا؛ تباہی تمہاری طرف آ رہی ہے'، اور 'اسلام سے گستاخی کی سزا: سر تن سے جدا'۔ خوش قسمتی سے ہماری سیاسی قیادت ہمیں یاد دلانے کے لئے کوشاں تھی کہ اسلام امن اور رحمت کا دین ہے۔

ان واقعات کے کچھ عرصہ بعد صحافی اینڈریو ملّر نے'اعتدال پسند' مسلم سر اقبال سکرانی کا انٹرویو لیا[۳]۔ آج کے اسلامی معیار کے مطابق سکرانی بھلے ہی اعتدال پسند مانے جاتے ہوں، لیکن اینڈریو ملّر کی رپورٹ کے مطابق سکرانی آج بھی اپنے اس بیان پر قائم ہیں جو انہوں نے سلمان رشدی کے خلاف قتل کے فتوے کے وقت جاری کیا تھا کہ "موت شاید اس (رشدی) کے لئے بہت آسان راستہ ہو گی"۔ یہ ایک ایسا بیان ہے جو انہیں اپنے نڈر پیشرو برطانیہ کے سب سے با اثر مسلمان ڈاکٹر ذکی بداوی سے منفرد کرتا ہے، جنہوں نے سلمان رشدی کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ سکرانی نے ملّر کو بتایا کہ وہ ڈینش خاکوں کو لے کر بہت پریشان ہیں۔ ملّر بھی پریشان تھا، لیکن کسی دوسرے وجوہات کی بنا پر۔ 'مجھے اس بات پر بہت تشویش ہو رہی ہے کہ سکینڈنیویہ کے ایک نامعلوم سے اخبار میں چھپنے والے غیر مضحکہ خیز خاکوں پر ہونے والے ضرورت سے زیادہ ردّ عمل سے کہیں یہ ثابت نہ ہو جائے کہ اسلام اور مغرب میں صلح کا کوئی امکان نہیں۔ سکرانی کو برطانوی اخباروں کا یہ فعل بہت قابل ستائش لگا کہ انہوں نے وہ خاکے نہیں چھاپے، جس پر ملّر نے اس شک کا اظہار کیا کہ 'برطانوی اخباروں کا یہ تحمّل مسلمانوں کے حق میں کسی درد مندی کے جذبے کی بجائے صرف اپنے گھروں کی کھڑکیاں محفوظ رکھنے کی غرض سے تھا'۔

سکرانی نے مِلّر کو سمجھایا کہ 'مسلم دنیا میں نبی اسلام کی ذات کی تکریم اور ان سے محبت کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ جذبہ اپنے والدین سے، پیاروں سے اور بچّوں کی محبت سے بڑھ کر ہے۔ یہ عقیدے اور اسلامی تعلیمات کا بھی حصّہ ہے کہ نبی کریم کی شبیہ نہیں بنائی جاتی ہے'۔ ملر کے مشاہدے کے مطابق، یہ منطق اس مفروضے پر مبنی ہے کہ

> اسلامی اقدار باقی تمام تہذیبی اقدار پر حاوی ہیں۔ اور اسلام کا ہر پیروکار ایسا ہی مانتا بھی ہے، جیسا کہ ہر دوسرے مذہب کے پیروکارو ں کا ماننا ہے کہ صرف ان ہی کا مذہب واحد راستہ، سچ اور روشنی ہے۔ اگر لوگ ساتویں صدی کے ایک مبلّغ کو اپنے خاندانوں سے بھی زیادہ پیار کرنا چاہتے ہیں تو یہ ان کا حق ہے، لیکن اور کسی پر واجب نہیں کہ وہ اسے سنجیدگی سے لے....

ما سوائے اس کے اگر آپ اس کو سنجیدگی سے نہیں لیں گے اور مناسب عزت نہیں بخشیں گے تو آپ کو جسمانی طور پر اس حد تک ڈرایا دھمکایا جائے گا جس کی مثال قرون وسطٰی کے بعد کہیں نہیں ملتی۔ انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اتنے تشدّد کی کیا ضرورت ہے، (جیسا کہ ملر نے کہا) "اگر آپ میں سے کوئی بھی مسخرہ اپنی بات میں صحیح ہے تو خاکے بنانے والے تو ویسے ہی جہنّم میں جانے والے ہیں۔ ہے کہ نہیں؟ فی الحال، اگر آپ مسلمانوں کی ہتک کے بارے میں جذباتی ہونا ہی چاہتے ہیں تو شام اور سعودی عرب کے بارے میں ایمنسٹی انٹرنیشنل (Amnesty International) کی رپورٹ کیوں نہیں پڑھ لیتے"؟

مسلمانوں کی ظاہری 'تکلیف' اور اسلامی ممالک میں یہودی مخالف خاکوں کی ذرائع ابلاغ میں کھلے بندوں ترویج میں فرق کا مشاہدہ بہت سے لوگوں نے کیا ہے۔ پاکستان میں ڈنمارک والے خاکوں کے خلاف ہونے والے مظاہروں کی ایک تصویر میں ایک برقعہ پوش خاتون نے بینر اٹھا رکھا تھا جس پر لکھا تھا "خدا ہٹلر کو شاد رکھے"۔

اس سارے جذباتی شور شرابے میں مہذب آزاد خیال اخبارات نے واقعہ کی مذمت بھی کی اور آزادئ اظہار رائے کے بارے میں مناسب آوازیں بھی بلند کیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ انہوں نے مسلمانوں کے احساسات مجروح ہونے اور ان کی ہتک کے بارے میں 'احترام' اور 'ہمدردی' کا اظہار بھی کیا۔ یاد رکھئے کہ یہ 'تکلیف' اور 'دکھ' کسی انسان کے خلاف تشدّد یا جسمانی تکلیف پر مشتمل نہیں ہے: ایک اخبار پر روشنائی کے چند قطروں سے زیادہ کچھ نہیں، جسے ڈنمارک سے باہر کوئی جانتا بھی نہیں اگر ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اسے انتشار پھیلانے کے لئےاستعمال نہ کیا گیا ہوتا۔

میں کسی کو جانتے بوجھتے ہوئے بلا وجہ ذہنی تکلیف پہنچانے کے حق میں نہیں ہوں۔ لیکن عمومی طور پر لادین معاشروں میں مذہب کو حاصل غیر متناسب استحقاق مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ ہر سیاستداں کو اخبار میں اپنے مزاحیہ خاکے دیکھنے کی عادت ڈال لینی پڑتی ہے اور کوئی ان کے حق میں مظاہرے بھی نہیں کرتا۔ مذہب میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ ہم اسے ایک مخصوص استحقاق بخشتے ہیں؟ جیسا کہ ایچ ایل مینکن (H. L. Mencken) نے کہا: 'ہمیں ہر آدمی کے مذہب کا احترام کرنا چاہئے؛ لیکن صرف اسی طرح اور اسی حد تک جس حد تک ہم اس نظریے کا احترام کرتے ہیں کہ اس کی بیوی خوبصورت ہے اور بچّے قابل ہیں'۔

مذہب کے احترام کے اس بے نظیر گمان کی روشنی میں میں اس کتاب میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں کسی کی توہین کرنے کی بے جا کوشش نہیں کروں گا،

---

جب میری کتاب پیپر بیک اشاعت کے لئے تیار کی جارہی تھی تو اس 'احترام' کا ایک نہایت یت شاندار نمونہ نیو یارک ٹائیمز (New York Times) میں شائع ہوا۔ جنوری ۲۰۰۷ میں ایک جرمن مسلم خاتون نے اس بنیاد پر کہ شادی کے شروع سے ہی اس کا خاوند اس کو نہایت یت بے دردی سے مارتا پیٹتا تھا، تیز رفتار طلاق کا دعویٰ درج کیا۔ اگرچہ جج کرسٹا ڈاٹزونٹر نے دعوے کے حقائق سے انکار نہیں کیا، لیکن قرآن کا حوالہ دیتے ہوئے دعویٰ خارج کر دیا۔ اس قابل ذکر فیصلے میں، جو مسلم روایات اور یورپی قوانین کے اختلاف کی غمّازی بھی کرتا ہے، جج نے لکھا کہ دونوں مرد اور خاتون مراکش کی تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں، اور وہاں مرد کا اپنی بیوی کو پیٹنا ایک معمول کی بات ہے۔ قرآن ایسی زیادتی کی حمایت ت کرتا ہے (*New York Times,* ۲۳ March ۲۰۰۷ ) ۔ یہ حیران کن خبر مارچ ۲۰۰۷ میں منظر عام پر

لیکن مذہب کے ساتھ اس سے زیادہ مناسب سلوک روا نہیں رکھوں گا جو میں کسی اور چیز کے لئے نہ رکھ سکوں۔

---

آئی جب اس بیچاری خاتون کے وکیل نے اس بات سے پردہ اٹھایا۔ اس بات کو سراہنا پڑے گا کہ فرانکفرٹ کی عدالت نے جج ڈاٹز ونٹر کو اس مقدّمہ سے علیحدہ کر دیا۔ نیو یارک ٹائیمز نے اپنی خبر کے آخر میں اس تجویز کا حوالہ دیا کہ اس واقعہ سے دیگر زیادتی کا شکار مسلم خواتین کو مزید نقصان پہنچے گا: 'ان میں سے بہت سی خواتین پہلے ہی عدالت تک جانے سے ڈرتی ہیں۔ غیرت کے نام پر قتل کے کئی واقعات ہوئے ہیں، جن میں ترک مسلمان مردوں نے اپنی بیویوں کو قتل کیا ہے'۔ جج ڈاٹز ونٹر کے فیصلے کی وجہ 'تہذیبی حساسیت' بتائی گئی، لیکن آپ اس قسم کے روّیے کو ایک اور نام بھی دے سکتے ہیں: مربّیانہ توہین۔ 'ظاہر ہے ہم یورپی تو کبھی ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے، لیکن بیویوں کو زدوکوب کرنا 'ان کی تہذیب' کا حصہ ہے، ان کے مذہب میں اس کی اجازت ہے، اور ہمیں اس کا "احترام" کرنا چاہئے'۔

# باب ۲ : مفروضہ خدا

ایک دور کا مذہب اگلے دور میں ادبی تفریح کا سامان بن جاتا ہے۔ (رالف والڈو ایمرسن ۔ ادیب)

قدیم عہد نامے (Old Testament) کا خدا، بلا شبہ ادب کا سب سے ناگوار کردار ہے؛ اپنے حسد پر ناز کرنے والا؛ ایک قلیل، ظالم، کینہ پرور اور اپنی مرضی کرنے والا؛ انتقام کے نشے میں مخمور خونخوار نسل کش؛ عورتوں اور ہم جنس پرستوں سے نفرت کرنے والا، بچّوں کا، قوموں کا، بھائیوں کا قاتل، وبائیں پھیلانے والا، احساس برتری کا شکار، ظلم اور تکلیف سے لطف اندوز ہونے والا بد خواہ بدمعاش! بچپن سے ہی اس کے حق میں تعلیم ملنے کی وجہ سے ہم میں سے اکثر لوگ ان مظالم کی دہشت ناکی سے بے حس ہو چکے ہوتے ہیں۔ لیکن معصوم زاویۂ نگاہ رکھنے والے کسی بھولے انسان کی ان معاملات کے بارے میں سمجھ قدرے مختلف بھی ہو سکتی ہے۔ جب تک ایولن واہ اور ایک اور فوجی افسر نے ونسٹن چرچل کے بیٹے رینڈالف سے شرط نہیں لگائی تھی کہ وہ پوری انجیل دو ہفتوں میں پڑھ سکتا ہے، رینڈالف الہامی پیغامات سے مکمل طور پر لا علم تھا۔ 'افسوس کہ نتائج ہماری امید سے بالکل برعکس ہیں۔ اس نے آج سے پہلے انجیل نہیں پڑھی تھی اور اس وقت اس کے جوش اور مسرّت کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ بلند آواز میں اقتباسات پڑھ رہا ہے اور بات بات پر چلّا رہا ہے: "مجھے یقین ہے تمہیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ انجیل میں یہ لکھا ہوا ہے...." یا اپنی ران پر ہاتھ مار مار کر زور زور سے ہنستا اور کہتا ہے "یا خدا! یہ خدا بھی کس قدر چغد ہے"'[۱۴]۔رینڈالف سے کہیں زیادہ پڑھے لکھے امریکی صدر تھامس جیفرسن کے بھی یہی تاثرات تھے۔ ان کے مطابق موسیٰ کا خدا ایک "لاجواب کردار ہے"۔ من مانی کرنے والا ظالم، اور غیر منصف ۔

ویسے اتنے آسان حریف پر وار کرنا بھی کچھ غیر منصفانہ سا لگتا ہے۔ مفروضۂ خدائی کی ناکامی اور کامیابی کا دار و مدار نہ تو اس کی سب سے گھناؤنی شکل" یاھوے" (Yahweh) پر ہونا چاہئے اور نہ ہی اس کی بالکل دوسری شکل "معصوم و مظلوم عیسیٰ" پر۔ (سچ پوچھئے تو عیسیٰ کی یہ معصوم شبیہ خود عیسیٰ کی مرہون منت کم اور اس کے وکٹورین دور کے ماننے والوں کی زیادہ ہے۔ کیا مسز سی ایف الیکسینڈر (C. F. Alexander) کی یہ منظوم تنبیہ کہ "عیسائی بچّے سب ہوں، نرم رو، فرمانبردار اور اچھے، جیسا عیسیٰ تھا خود" کسی کی بھی طبیعت بگاڑنے کے لئے کافی نہیں؟ یہاں میں یاھوے، عیسیٰ، یا اللہ، یا پھر باعل، زیوس یا ووٹن (Ba'al, Zeus and Woten) جیسے کسی اور خدا کی خصوصیات پر حملہ نہیں کر رہا۔ بلکہ میں مفروضۂ خدائی کی ایک ایسی تعریف پیش کرنا چاہوں گا جو مدلّل بحث میں دفاع کے قابل ہو: "ایک ایسی مافوق الانسانیت ، مافوق الفطرت ذہانت جس نے دانستہ طور پر کائنات اور اس میں ہر شئے، بشمول انسان، کو ڈیزاین اور تخلیق کیا"۔ اس کتاب میں ایک مترادف زاویۂ نگاہ بھی پیش کیا جائے گا: "ایسی ذہانت جو اس قدر پیچیدہ ہو کہ کسی بھی شئے کی تخلیق کر سکے، ارتقاء کے ایک لمبے اور بتدریج خارجی عمل کے اختتام پر ہی وجود میں آ سکتی ہے"۔ تخلیقی ذہانت چونکہ ارتقاء کے نتیجے میں وجود میں آتی ہیں، اس لئے کائنات میں ان کا ظہور قدرے دیر بعد ہی ہوتا ہے۔ اور کائنات کی تخلیق کا سہرہ ان کے سر نہیں باندھا جا سکتا۔ لہذا اس تعریف کے مطابق خدا ایک فریب کی مانند ہے۔ آنے والے ابواب میں میں آپ کو یہ باور کرانے کی بھی کوشش کروں گا کہ یہ ایک نہایت نقصان دہ فریب ہے۔

چونکہ یہ مفروضہ شواہد کی بجائے نجی یادداشتوں کی مقامی روایات پر مبنی ہوتا ہے، اس لئے آپ کو قطعاً حیران نہ ہونا چاہئے کہ اس مفروضے کی اتنی قسمیں موجود ہیں۔ مؤرخین مذاہب کے مطابق مذہبیت کا سلسلہ قدیم حیوان پرستی سے شروع ہو کر یونانی، رومی اور نورسی (Norse) اصنام پرستی اور متعدد خداؤں کی عبادت سے ہوتا ہوا یہودیت ، عیسائیت اور اسلام کی وحدانیت پر ختم ہوتا ہے۔

## کثرت پرستی -شرک

یہ سمجھنا ذرا مشکل ہے کہ بہت سے خداؤں کی عبادت، یعنی کثرت پرستی، سے وحدانیت کی جانب سفر کو ایک واضح اور بتدریج ترقی کیوں فرض کر لینا چاہئے۔ اس مفروضے کی عوامی مقبولیت پر "میں مسلمان کیوں نہیں ہوں (Why I'm Not a Muslim)" کے مصنف ابن ورّاق نے اس خیال کا اظہار کیا کہ واحدانیت کی بھی قسمت میں یہی لکھا ہے کہ مزید ایک اور خدا کی نفی ہو جائے۔ کیتھولک انسائیکلوپیڈیا (Catholic Encyclopedia) شرک اور الحاد کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہوئے یوں رد کرتا ہے: "رسمی رجعت پسند الحاد خود اپنی تردید کرتا نظر آتا ہے، اور آج تک لوگوں کی کسی قابل ذکر تعداد کو اپنا معتقد بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ کثرت پرستی شرک، چاہے وہ عوامی نفسیات پر کتنا ہی راج کرتا ہو، کبھی سنجیدہ فلسفیوں کو اپنی جانب راغب نہیں کر پایا[۱۵]"۔

ماضی قریب تک وحدانی جنونیت (Chauvinism) انگلستان اور اسکاٹلینڈ کے قوانین صدقہ و خیرات کا اہم جزو تھی، جس کے باعث ٹیکس سے معافی کے معاملات میں مشرک مذاہب کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ ایسے ادارے جن کا مقصد وحدانی دین (Monotheism) کی ترویج ہے، ٹیکس دینے سے آزاد تھے، اور ان کو اس خوردبین جانچ پڑتال سے نہیں گزارا جاتا تھا جس سے لادین اداروں کو گزرنا پڑتا تھا۔ لہٰذا میرے دل میں یہ امنگ جاگی کہ کاش میں برطانیہ میں مقیم ہندو برادری کے کسی اہم رکن کو اس بات پر آمادہ کر سکوں کہ وہ سامنے آئے اور مشرک مذاہب کے خلاف گھمنڈ سے بھرپور اس امتیازی سلوک کے خلاف دیوانی عدالت میں دعویٰ درج کرے۔

اس سے بھی بہتر تو یہ ہے کہ کسی بھی ادارے کو مذہب کی بنیاد پر خیراتی قرار دینے کے نظام کو ہی ختم کر دیا جائے۔ انسانی معاشرے کو، بالخصوص امریکہ میں، ایسا کرنے سے بہت فائدہ پہنچے گا، جہاں چرچ کا پیسا بٹورنے اور ٹی وی پر جلوہ گر ہونے والے مذہبی مبلّغین کی جائدادوں میں اضافہ کرنے کی قابلیت بیہودگی کی معراج کو چھو رہی ہے۔ اورل رابرٹس (Oral Roberts) نامی ایک مبلّغ نے ایک بار ٹی وی پر اپنے چاہنے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ انہیں بشارت ہوئی ہے کہ اگر لوگوں نے انہیں آٹھ میلین ڈالر سے نہ نوازا تو ان کی موت واقع ہو جائے گی، جس کے ذمہ دار ظاہر ہے ان کے بیچارے معتقدین ہوں گے۔ اور اصل حیرانی کی بات یہ ہے کہ ان کا یہ پینترا کارگر بھی ثابت ہوا۔ آٹھ میلین۔ بغیر کوئی ٹیکس دئے ہوئے۔ ٹلسہ، اوکلاہوما (Tulsa, Oklahoma ) میں واقع ان کی "اورل رابرٹس یونیورسٹی" کی طرح خود اورل رابرٹس بھی آج تک کامیاب ہے۔ اس یونیورسٹی کی ۲۵۰ میلین ڈالر مالیت کی عمارات کو تعمیر کرنے کا حکم بھی خدا کی ہی طرف سے ان الفاظ میں نازل ہوا: "اپنے شاگردوں کو میری (خدا کی) آواز سننے کے لئے تیار کرو، اور دنیا کے ہر کونے میں بھیجو جہاں میری روشنی مدھم پڑ رہی ہے، جہاں میری آواز نہیں پہنچ پا رہی، جہاں میری رحمت کو لوگ نہیں جانتے ہیں۔ انہیں تم سے بھی زیادہ کامیابی حاصل ہو گی۔ اور یقیناً اس میں ہماری خوشی ہے"۔

لیکن جب میں اپنی معصوم خواہش سے روگردانی کرتا ہوں تو اس امکان کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میرا فرضی ہندو دوست شاید "جس کو ہرا نہ سکو اس کے دھندے میں شامل ہو جاؤ" کے رہنما اصول کا استعمال کرتے ہوئے خود بھی ایسی ہی دکان سجا لے۔ اس کا شرک در حقیقت شرک نہیں وحدانیت کا ایک بہروپ ہے۔ دیوتا تو ایک ہی ہے ۔ برہما خالق ہے ۔ وشنو محافظ ہے ۔ شوا تخریب کار ہے ۔ دیویاں سرسوتی، لکشمی اور پاروتی جو ان کی بیویاں ہیں ۔ مزید دیگر سینکڑوں ایسے دیوتا ہیں جو اصل میں صرف ایک خدا کے مختلف اوتار ہیں۔

عیسائیوں کو تو یہ لفظی شعبدہ بازی بہت بھانی چاہئے۔ مسئلہ تثلیث کے حق میں اور "آریائی بدعت (Arian Heresy )" جیسے متبادل خیالات کو دبانے میں تو قرون وسطیٰ میں روشنائی (اور خون) کی ندیاں بہا دی گئیں۔ اسکندریہ کے شہری آریوس (Arius ) نے چوتھی صدی عیسوی میں اس بات سے انحراف کیا کہ عیسیٰ خداوند کے مادے سے مادہ ہے، روح سے روح ہے۔ اب آپ سوچ رہے ہوں گے اس بات کا کیا مطلب ہے۔ مادہ؟ کیسا "مادہ"؟ "روح" سے کیا مراد ہے؟ ان سب کا ایک ہی جواب ہے؛ تقریباً "کچھ بھی نہیں"۔ اس کے باوجود اس تنازعہ نے عیسائیت کو قریب ایک صدی تک دو دھڑوں میں بانٹے رکھا، حتیٰ کہ شہنشاہ قسطنطین نے حکم نامہ جاری کر دیا کہ آریوس کی لکھی ہوئی تمام کتابیں جلا دی جائیں۔ بال کی کھال نکالنا تو ہمیشہ سے مذہب کا وتیرہ رہا ہے۔

کیا خدا تین حصّوں میں ہے؟ یا ایک میں تین خدا ہیں؟ کیتھولک انسایکلوپیڈیا اپنے مخصوص، پہلے سے طے شدہ، استدلال کے ایک شاہکار میں اس مسئلے کا حل یوں بیان کرتا ہے:

> خدا کی وحدت میں تین "اشخاص" ہیں، خداوند باپ، بیٹا، اور روح القدس۔ اور تینوں ایک دوسرے سے یکتا ہیں۔ لہٰذا،عقیدہ ایتھینز(Athanasian Creed) کے مطابق باپ خدا ہے، بیٹا خدا ہے اور روح القدس خدا ہے۔ اس کے باوجود تین خدا نہیں صرف ایک ہی خدا ہے"۔

جب اتنے سے بات نہیں بنتی تو یہ انسایکلوپیڈیا تیسری صدی کے فقیہ گریگوری المشہور "معجزہ گر" ( St. Gregory the Miracle Worker) سے اقتباس پیش کرتا ہے:

لہٰذا کچھ بھی خلق نہیں ہوتا۔ تینوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کا مرہون منّت نہیں۔ نہ ہی کچھ ایسا شامل کیا گیا جو پہلے کبھی موجود نہ ہو بلکہ بعد میں آیا ہو۔ لہٰذا خداوند باپ کبھی بیٹے کے بغیر نہیں تھا، نہ بیٹا روح القدس کے بغیر: اور یہ تثلیث ابدی، ناقابل رد و بدل، اور لا فانی ہے۔

گریگوری کو جن معجزات کی بدولت یہ لقب ملا ان میں یقیناً فصاحت اور راست گوئی شامل نہیں ہوں گے۔ گریگوری کی زبان میں مذہبی فقہا کی قدامت پسندی صاف جھلکتی ہے، جو پچھلی ۱۸ صدیوں میں بھی سائنس اور دیگر علوم کے مقابلے میں اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ تھامس جیفرسن نے جو عموماً ایسی باتوں کی نشاندہی میں مہارت رکھتے تھے، اس نے اپنے مخصوص انداز میں خوب کہا کہ 'نا قابل فہم تجاویز کے خلاف صرف 'تمسخر ہی کار آمد ہتھیار ہے'۔ اس سے پہلے کہ کسی خیال کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا جا سکے، اس کی انفرادیت کا یقین ہونا ضروری ہے؛ اور تثلیث کے بارے میں آج تک کوئی بھی شخص مکمل طور پر انفرادی تصّور کا اظہار نہیں کر سکا۔ یہ محض عیسیٰ کے نیم حکیم پادریوں کے جادوئی منتر ہیں'۔

ایک اور امر جس کا ذکر کئے بغیر میں نہیں رہ سکتا اس پر اعتمادی سے تعلق رکھتا ہے جس سے یہ مذہبی علماء عقاید کی باریکیوں پر بغیر ثبوت و شواہد کے سیر حاصل گفتگو کرتے ہیں۔ شاید مذہبی خیالات کے حق میں شواہد کی عدم موجودگی ہی ان علماء کو ہر ایسے شخص کی دشمنی پر آمادہ کر دیتی ہے جو ان سے کسی بھی موضوع، اور بالخصوص مسئلہ تثلیث کے بارے میں اختلاف رکھتا ہے۔

جیفرسن نے کالون ازم (Calvinism) کی تنقید میں نظریہ تثلیث کو تضحیک کا نشانہ بنایا۔ لیکن عیسائیت کی رومن کیتھولک شاخ میں تو شرک کی طرف جھکاؤ کا ایک عجیب و غریب عروج نظر آتا ہے۔ افلاک کی ملکہ میری (Mary, Queen of Heaven)، جن میں دیوی ہونے کی تمام خصوصیات پنہاں ہیں اور جن کے حضور کی جانے والی دعائیں اپنی عبدیت میں خدا سے تھوڑی ہی کم ہیں، ان کو بھی اس تثلیث میں شامل کر لینے سے تو شرک کے تمام لوازمات پورے ہوتے نظر آتے ہیں۔ جب ان کے ساتھ سینکڑوں ولیوں اور بزرگوں کو شامل کیا جاتا ہے، کہ جن کی قوّت شفاعت ان کو بھی نیم خدائی کے بلند مرتبے پر فائز کر دیتی ہے، تو دیوی دیوتاؤں کی یہ محفل ایک "دیو سبھا" کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ "کیتھولک کمیونٹی فورم (Catholic Community Forum)" نے۵،۱۲۰ بزرگوں[۲] کی فہرست جاری کی ہے جس میں ان کی مہارتیں بھی درج ہیں جیسے پیٹ کا درد، بد سلوکی کا نشانہ بننے والے، دبلے پن کے شکار، غیر قانونی ہتھیاروں کے بیوپاری، لوہار، ٹوٹی ہڈّیاں، بم ناکارہ کرنے والے، اسہال کی تکلیف، وغیرہ وغیرہ۔ دیگر یہ کہ ہمیں نو گروہوں میں مرتّب فرشتوں کے ان چار طائفوں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے: سیرافم، چرابم، تخت، قدرت، فضائل ، قوّتیں، حاکمین، رئیس الملائکہ ،اور دیگر عام فرشتے، بشمول ہمارے دیرینہ دوست محافظ فرشتے (Guardian Angels)۔ اس جعلی نمود و نمائش کے علاوہ مجھے کیتھولک دیو مالا میں جو چیز سب سے زیادہ مرعوب کرتی ہے وہ اس کے لکھنے والوں کی وہ بے پروا ادا ہے جس سے یہ داستان میں حسب ضرورت تفاصیل گھڑتے چلے جاتے ہیں۔ ہر تفصیل نہایت بے شرمی سے "ایجاد" کی جاتی ہے۔

پاپائے اعظم جان پال دوئم (Pope John Paul II) نے جتنے لوگوں کو "ولی" کے درجے سے نوازا اس کی تاریخ میں کہیں مثال نہیں ملتی۔ اور اسے کنواری مریم (Virgin Mary) سے تو خاص لگاؤ تھا۔ ۱۹۸۱ میں روم میں قاتلانہ حملے کے موقع پر اس کی مشرکانہ تمنّاؤں کو نہایت ڈرامائی انداز میں منظر عام پر آنے کا موقع ملا جب اس نے اپنے بچ جانے کا سہرا "خاتون فاطمہ (The Lady of Fatima)" (کنواری مریم کے کئی ناموں میں سے ایک) کے نام یہ کہتے ہوئے کر دیا کہ "مادرانہ شفقت بھرے ایک ہاتھ نے گولی کا رخ بدل دیا تھا"۔ میں سوچنے پر مجبور ہوں کہ مریم نے گولی کو مکمل طور پر ہی جان پال سے دور کیوں نہ رکھا؟ کچھ لوگ یقیناً ایسا سوچتے ہوں گے کہ کچھ خراج تحسین تو ان ڈاکٹروں اور جرّاحوں کے حصّے بھی آنا چاہئے جنہوں نے ۶ گھنٹے کی محنت سے جان پال کو جانبر کیا؛ شاید خاتون فاطمہ کی مادرانہ شفقت نے ہی ان کے ہاتھوں کی بھی رہ نمائی کی ہو گی۔ اس بحث کا مدّعا یہ ہے کہ گولی کو اپنے راستے سے ہٹانے والی محض مریم کی شفقت نہیں تھی بلکہ مریم بحیثیت خاتون فاطمہ کی شفقت تھی۔ غالباً اس مشکل وقت میں خاتون لورڈز، خاتون گواڈالوپ، خاتون میڈجوگرج، خاتون آکیتہ، خاتون زیتون، خاتون گرابندل، اور خاتون نوک (یہ مریم کے مزید نام ہیں) دیگر کاموں میں مصروف رہی ہوں گی۔

یونانی، رومی، اور وائیکنگ لوگ اس قسم کے دیو مالائی ابہامات کو کیسے سلجھاتے تھے؟ کیا وینس (Venus) ایفروڈائیٹ (Aphrodite) کا ہی دوسرا نام تھا یا یہ دونوں الگ الگ دیویاں تھیں؟ کیا تھور (Thor) اپنے ہتھوڑے سمیت، ایک الگ خدا تھا یا ووٹن (Woten) کا ہی ایک روپ تھا؟ کیا فرق پڑتا

ہے؟ زندگی مختلف تخیّلات میں فرق کرنے میں ضایع کرنے کے لئے بہت مختصر ہے۔ غفلت کے الزام سے بچنے کے لئے میں نے یہاں شرک کے موضوع پر خاصی تفصیل سے بات کی۔ لیکن آئندہ اس کتاب میں میں سب دیوتاؤں کو، خواہ وہ وحدانیت کے ہوں یا شرک کے، "خدا" ہی کہوں گا۔ مجھے اس بات کا بہ خوبی اندازہ ہے کی ابراہیمی خدا صریحاً ایک جارحانہ حد تک مذّکر خدا ہے۔ اور میں اپنی زبان میں اس روایت کو برقرار رکھوں گا۔ زیادہ تر نفیس فقہا خدا کو ماورائے جنس قرار دیتے ہیں۔ جبکہ تحریک نسواں والے تاریخی زیادتیوں کا ازالہ کرنے کی غرض سے خدا کو مؤنث گردانتے ہیں۔ لیکن آخر فرق کیا ہے ایک غیر موجود مذّکر خدا اور غیر موجود مؤنث خدا میں؟ میرا خیال ہے شاید تحریک نسواں کی الہیات کے چوراہے پر اس قدرے مزاحیہ ملاقات میں خدا کی جنس کے مقابلے میں خدا کا وجود ثانوی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ مذہب پر تنقید کرنے والوں کو خود اس تنقید کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے کہ وہ اپنی بحث میں قدیم مذاہب کی روایات اور نظریات کے ایک بیش بہا ذخیرے کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ سر جیمز فریزر کی "سنہری شاخ (The Golden Bough)"، پاسکال بائیر کی "مذاہب کی وضاحت(Religion Explained)"، یا سکاٹ اٹرآن کی "خدا پر اعتماد (In Gods We Trust)" جیسی علم بشریات سے بھرپور کتابوں میں توہمات اور رسومات کی کرشماتی ہیئت پر بڑی تفصیل سے کام کیا گیا ہے۔ ان کتابوں کو پڑھتے ہوئے آپ کو انسانی سادہ مزاجی اور بیوقوف بننے کی صلاحیت کے بارے میں بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

لیکن میری کتاب تمام مذاہب کی تنقید پر مبنی نہیں ہے۔ میں مافوق الفطرت مذاہب کی ہر صورت کے خلاف ہوں۔ لٰہذا میری نظر میں اس کتاب میں بحث کو آگے بڑھانے کا سب سے مؤثر طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ تمام تر توّجہ اس صورت پر مرکوز کر دی جائے جس سے ہمارے قارئین سب سے زیادہ واقف ہیں۔ وہ صورت جو ہمارے معاشرے پر سب سے زیادہ مضر انداز سے اثر انداز ہوئی ہے۔ میرے زیادہ تر قارئین کی پرورش دور حاضر کے ان تین (یا چار اگر آپ مارمن ازم (Mormonism) کو بھی شامل بحث کر لیں) بڑے مذاہب میں سے کسی ایک میں ہوئی ہو گی جو اپنا شجرہ کسی نہ کسی راستے سے دیو مالائی بزرگ ابراھیم سے جوڑتے ہیں۔ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے ان روابط کو مدّ نظر رکھنا فائدہ مند ہو گا۔

اس کتاب پر متوقّع ناقدانہ تبصروں کی پیش بندی کا یہ مناسب موقعہ ہے: "ڈاکنز جس خدا سے منکر ہیں اس سے تو میں بھی منکر ہوں۔ میں آسمان میں بیٹھے ہوئے کسی باریش بزرگ میں یقین نہیں رکھتا۔ اس بزرگ کا ذکر ہماری توجّہ اصل مدّعا سے ہٹا دیتا ہے ، اور اس کی سفید داڑھی جتنی لمبی ہے اتنی ہی اکتاہٹ کا باعث بھی ہے۔ بزرگی کی اس سادہ لوح تصویر کا مقصد ہی عوام کی توجّہ اس حقیقت سے ہٹانا ہے کہ نقّاد کا عقیدہ اس تصویر سے کچھ کم حماقت خیز نہیں۔ میں جانتا ہوں میرا نقّاد آسمان میں بیٹھے ہوئے کسی باریش بزرگ پر یقین نہیں رکھتا۔ تو پھر ہم اس خاکے پر مزید وقت ضایع نہیں کریں گے۔ میں خدا کے کسی ایک خاکے کو اپنا نشانہ نہیں بنا رہا۔ میں خدا کے تصوّر پر حملہ کرنا چاہتا ہوں،بشمول ان تمام مافوق الفطرت ہستیوں کے جو آج تک ایجاد ہوئی ہیں اور آج کے بعد بھی ایجاد ہوں گی ۔

## عقیدۂ توحید

> ہماری تہذیب میں سب سے بڑی ناقابل بیان برائی عقیدہ توحید ہے۔ کانسے کے زمانے میں لکھے گئے صحیفۂ قدیم سے تین انسانیت دشمن مذاہب نے جنم لیا ہے ۔ یہودیت، عیسائیت اور اسلام۔ یہ آسمانی خداؤں والے مذاہب ہیں۔ یہ صحیح معنوں میں پدرانہ ہیں۔ خدا ایک قادر مطلق باپ کی مانند ہے۔ اس کے نتیجے میں ۲۰۰۰ سال تک عورت ذات کو ان ممالک میں نفرت کا نشانہ بنایا گیا ہے جہاں یہ آسمانی خدا اور ان کے نائب مسلّط رہے ہیں۔ (گور وڈال ۔ Gore Vidal)

یہودیت ان تینوں ابراہیمی مذاہب میں سے سب سے قدیم، اور باقی دونوں کا اب و جد ہے۔ اوائل میں یہ ایک واحد اور شدید ناخوشگوار قبائلی خدا کا مسلک تھا، ایک ایسا خدا جس کو جنسی قواعد و ضوابط اور جلے ہوئے ماس کا خبط تھا، اور جو دیگر مدّ مقابل خداؤں پر اور اپنے محبوب صحرائی قبیلے کی برتری پر ناز کرتا تھا۔ فلسطین پر سلطنت روم کی حاکمیت کے دور میں ٹارسس کے رہائشی پال (Paul of Tarsus) نے ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی جو درحقیقت یہودیت کا ہی فرقہ تھا لیکن اس کا توحید اور انفرادیت پر اصرار قدرے کم تھا، اور جس کی دعوت کا ہدف یہودیوں کے علاوہ باقی اقوام بھی تھے۔ کچھ صدیوں بعد محمّد اور اس کے پیروکاروں نے یہودیت کی امتیازی اور انفرادی تنگ نظری کو مسترد کرتے ہوئے اس کی کٹّر تعلیمات کی طرف واپسی کا رخ

اختیار کیا، اور قرآن نامی ایک نئے الہامی صحیفے کی بنیاد پر ایک نئے مذہب کی نیو رکھی، جس میں دین کی تبلیغ کے لئے پہلی بار عسکری فتوحات کا سہارا بھی لیا گیا۔ یوں تو عیسائیت کی تبلیغ میں بھی عسکریت کا بہت اہم کردار رہا۔ پہلے جب رومی شاہنشاہ قسطنطین (Roman Emperor Constantine ) نے اسے ایک سنکی فرقے سے اٹھا کر سرکاری مذہب کا درجہ دیا، تو رومی تلواروں نے اس مذہب کو پھیلانے کا کام سر انجام دیا، پھر صلیبی جنگوں میں اس کو بزور طاقت راوج دیا گیا، اور رہی سہی کسر بعد ازاں یورپی حملہ آوروں اور نو آبادیاتی طاقتوں نے دنیا میں اس کے غلبے کے لئے بھر پور محنت کر کے پوری کر دی۔ میری بحث کے مقاصد کے لئے ان تینوں ابراہیمی مذاہب میں کوئی خاص فرق کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر میں خاص طور پر کسی مذہب کا نام نہ لوں تو آپ سمجھ لیجئے کہ میں عیسائیت کے بارے میں بات کر رہا ہوں، اور وہ بھی صرف اس لئے کہ میں اس مذہب سے سب سے زیادہ مانوس ہوں۔ میرے خیال میں ان کے درمیان مماثلت سے زیادہ ان کے فرق اہم ہیں۔ اور میں بدھ مت اور کنفیوشنزم (Confucianism ) جیسے دیگر مذاہب پر بالکل بھی توجّہ نہیں دوں گا۔ ویسے بھی میرے خیال میں یہ مذہب کم اور نظام اخلاق یا فلسفۂ حیات زیادہ ہیں۔

میں نے اس باب کے شروع میں مفروضۂ خدا کی جو تعریف لکھی تھی اس میں ابراہیمی خدا کو شامل کرنے کے لئے ہمیں اس تعریف کے دائرۂ کار کو وسیع کرنا پڑے گا۔ ابراہیمی خدا نے نہ صرف کائنات تخلیق کی، وہ ایک ذاتی نوعیت کا خدا ہے جو اس کائنات میں ہی یا شاید اس کے باہر رہتا ہے اور ان جملہ نازیبہ اور ناگوار انسانی خصوصیات کا حامل ہے جن کا میں نے پہلے ذکر کیا۔

والٹئیر (Voltaire ) اور تھامس پین (Thomas Penn ) کے فطری خدا کو ذاتی خصوصیات سے، خواہ وہ خوشگوار ہوں یا ناخوشگوار کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ صحیفۂ قدیم کے نفسیاتی مریض کے سامنے روشن خیال تحریک کا فطری خدا ایک یکسر اعلٰی و ارفع ہستی نظر آتا ہے، اپنی کائناتی تخلیق کے لائق ، انسانی مسائل سے لا تعلق، ہمارے ذاتی خیالات اور امّیدوں سے برتر، جسے نہ تو ہمارے چھوٹے چھوٹے گناہوں سے سروکار ہے اور نہ ہماری دبے لفظوں میں بڑبڑائی معافیوں سے کوئی علاقہ۔ فطری خدا طبیعیات (Physics ) کے تمام سائنسدانوں سے بڑا سائنسدان ہے، علم ریاضی کے ماہرین سے زیادہ ماہر ہے، اور ڈیزائن کرنے والوں کا ڈیزائنر ہے۔ وہ ایک ایسا قابل مہندس(Engineer) ہے جس نے کائنات کے تمام قوانین اور مستقل اقدار مرتّب کئے، ان کو نہایت باریک بینی اور دور اندیشی سے ترتیب دیا، بگ بینگ (Big Bang) کا دھماکہ کیا، اور اس کے بعد گوشہ نشینی اختیار کر کے ہمیشہ کے لئے غائب ہو گیا۔

زیادہ ایمان افروز ادوار میں فطری خدا کو ماننے والوں کو ملحدین کی ہی صف میں کھڑا کر دیا گیا۔ سوزن جیکابی اپنی کتاب "فری تھنکر: امریکہ میں سیکولرازم کی تاریخ Freethinkers: A History of American Secularism" میں تھامس پین کو دی گئی گالیوں کی ایک فہرست بھی فراہم کی ہے: "جوڈاس، سانپ، سور، پاگل کتّا، شرابی، جوں، حیوان، جھوٹا اور (بے شک) کافر"۔ سوائے تھامس جیفرسن کے، پین کو آخری وقت میں اس کے تمام سیاسی حواریوں نے اس کے عیسائیت مخالف رویے کی وجہ سے خیر آباد کہہ دیا تھا۔ زمانہ کیسی چال چل گیا کہ آج کے دور میں فطری خدا کو ماننے والوں کا تقابل ملحدین سے کیا جاتا ہے جبکہ شامل انہیں توحید پرستوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ آخر کار، ان کا بھی عقیدہ تو یہی ہے نا کہ کائنات کو کسی عظیم ذہانت نے ہی تخلیق کیا ہے۔

## لادینیت، بانیٔ قوم اور امریکی مذہب

عام طور پر یہ تصّور کیا جاتا ہے کہ امریکہ کے بانی فطرت پر یقین رکھتے تھے۔ یقیناً ان میں سے بہت سے تھے بھی۔ بلکہ یہاں تک قیاس کیا جاتا ہے کہ ان میں سے سب سے کٹّر فطری شاید ملحد ہی ہوں گے۔ مذہب کے موضوع پر ان کی تحاریر سے تو اس بات میں ابہام کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ اگر وہ آج کے دور میں ہوتے تو یقیناً ملحد ہی ہوتے۔ لیکن ان کے ذاتی مذہبی اعتقادات جو بھی رہے ہوں، ایک بات جس پر سب متّفق نظر آتے ہیں وہ ان کی لادینیت یا سیکولرازم (Secularism ) ہے۔ اب میں اسی موضوع پر بحث چھیڑنا چاہتا ہوں اور گفتگو کا آغاز سینیٹر بیری گولڈواٹر ( Barry Goldwater)کے ۱۹۸۱کے ایک خاصے حیران کن بیان سے کرنا چاہتا ہوں جہاں انہوں نے صدارتی انتخاب کا امّیدوار اور امریکہ میں قدامت پسندی کے علمبردار ہونے کے باوجود امریکہ کی سیکولر روایات کا دفاع کیا ہے:

مذہب کے علاوہ شاید ہی ایسا کوئی اور موضوع ہو جس پر لوگ اپنے من پسند نظریے سے ٹس سے مس ہونے کو بھی تیّار نہ

> ہوں۔ دوران بحث آپ شاید ہی عیسیٰ مسیح، خدا یا اللہ سے زیادہ طاقتور کسی دوست کو اپنے اتحاد میں شامل کر سکتے ہوں۔ لیکن ہر بڑے ہتھیار کی طرح، خدا کے نام کو بھی احتیاط اور کفایت سے استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ملک میں مذہب پرست سیاسی فرقوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اپنے اثر و رسوخ کے استعمال میں سمجھداری کا مظاہرہ نہیں کر رہے ہیں ۔ وہ سیاسی قائدین کو زبردستی اپنے منشور کی ۱۰۰ فیصد پاسداری پر مجبور کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کسی مذہبی گروہ سے کسی اخلاقی موضوع پر اختلاف کریں تو وہ واویلا مچاتے ہیں، اور آپ سے ووٹ یا مالی امداد واپس چھین لینے کی دھمکی دیتے ہیں۔ میں ملک کے طول و عرض پر پھیلے ان سیاسی مبلّغین سے عاجز آ چکا ہوں جو مجھے یہی سمجھاتے رہتے ہیں کہ اگر مجھے ایک اخلاقی شہری بننا ہے تو الف، بے، جیم یا دال پر ایمان لانا ہو گا۔ خود کو کیا سمجھتے ہیں یہ لوگ؟ معلوم نہیں انہوں نے اپنے اخلاقی اعتقادات مجھ پر مسلّط کرنے کا حق خود کو کہاں سے تفویض کر دیا؟ بحیثیت ایک قانون ساز کے میرا خون اور بھی زیادہ کھولتا ہے کیونکہ مجھے ہر ایسے مذہبی گروہ کی دھمکیاں برداشت کرنی پڑتی ہیں جو سمجھتا ہے کہ یہ اس کا حق ہے کہ وہ مجھے بتائے کہ مجھے سینیٹ میں اپنا ووٹ کیسے استعمال کرنا چاہئے۔ میں آج سب کو تنبیہ کر رہا ہوں: اگر وہ ہر امریکی کو قدامت پسندی کے نام پر اپنے اخلاقی اقدار کے طابع کرنے کی کوشش کریں گے تو میں ان کا ڈٹ کر مقابلہ کروں گا۔ [۱۷]

امریکہ میں دائیں دھڑے میں جو کہ عوام میں تاریخ کا اپنا نظریہ مقبول کرانا چاہتے ہیں، ریاست کے بانیوں (Founding Fathers) کے مذہبی اعتقادات کے سلسلے میں بہت دلچسپی پائی جاتی ہے۔ ان کے نظریات کے برعکس، طرابلس میں ۱۷۹۶ میں کئے گئے ایک معاہدے پرجس پر خود جارج واشنگٹن نے اور بعد ازاں جان ایڈمز نے ۱۷۹۷ میں دستخط کئے، اس بات کی وضاحت ان مندرجہ ذیل الفاظ میں کی گئی کہ ریاست ہائے متحدہ ایک عیسائی قوم کے طور پر استوار نہیں کی گئی ہے:

> چونکہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی بنیاد عیسائی مذہب پر نہیں رکھی گئی؛ اور چونکہ یہ ریاست مسلمانوں کے قوانین، مذہب اور امن و امان کے خلاف نہیں، اور چونکہ اس ریاست نے کبھی کسی مسلمان قوم کے خلاف جنگ یا محاذ آرائی نہیں کی، یہ عہد کیا جاتا ہے کہ مذہبی اختلافات کو کبھی بھی بہانہ بنا کر دونوں اقوام کے درمیان پائی جانے والی ہم آہنگی میں رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔

اس اقتباس کے شروع کے الفاظ آج کے واشنگٹن شہر میں کھلبلی مچا دینے کے لئے کافی ہیں۔ جبکہ ایڈ بکنر (Ed Buckner)[۱۸] نے وضاحت کی ہے کہ اپنے دور میں ان الفاظ سے نہ توعوام میں ناراضگی پائی گئی نہ سیاسی حلقوں میں۔

اکثر اس تضاد (Paradox) کی نشاندہی کی جاتی ہے کہ امریکہ جس کی بنیاد لادینیت پر رکھی گئی تھی، عیسائی دنیا میں سب سے زیادہ مذہبی ملک ہے، جبکہ برطانیہ میں، جہاں مذہب کو سرکاری حیثیت حاصل ہے اور جہاں کا سربراہ ریاست مذہبی پیشوا کا درجہ رکھتا ہے، سب سے کم مذہبی ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؛ سچ یہ ہے کہ مجھے معلوم نہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ برطانیہ صدیوں پر محیط کیتھولک اور پروٹسٹنٹ بین المذاہب خانہ جنگیوں اور قتل عام سے اکتا چکا ہے۔ یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ امریکہ تارکین وطن کا ملک ہے۔ یورپ میں اپنے وسیع خاندانوں کی بدولت حاصل آرام اور استحکام سے دور ہو جانے کی وجہ سے ان تارکین نے دیار غیر میں اس کمی کو پورا کرنے کی غرض سے اپنے من پسند مسلک کو بھرپور شدّت سے اپنا لیا۔ مجھے لگتا ہے یہ نقطہ تحقیق طلب ہے۔ بہر طور اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ امریکی اپنے مقامی چرچ کو، جو واقعی ایک وسیع و عریض خاندان جیسا ہی لگتا ہے، اپنی شناخت کا ایک اہم جزو سمجھتے ہیں۔

ایک مفروضہ یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ امریکی معاشرے کی مذہبیت کی اصل وجہ اس کا غیر مذہبی آئین ہے۔ چونکہ آئین غیر مذہبی ہے، اسی لئے مذہب پر کوئی سرکاری روک ٹوک نہیں۔ مذہب کی منڈی میں دکان لگا کر بیٹھے ہوئے یہ چرچ ایمان والوں اور ان سے ملنے والی مذہبی خیرات کے لئے ایک دوسرے سے روایتی کاروباری جارحیت سے مقابلہ کرتے ہیں۔ جو تکنیک صابن بیچ سکتی ہے وہ خدا بھی بیچ سکتی ہے۔ نتیجتاً امریکہ کے کم پڑھے لکھے طبقوں میں مذہب کو لے کر جنون کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس انگلینڈ میں سرکاری چرچ کے زیر سایہ مذہب کی پہچان تک ماند پڑ گئی ہے اور وہ محض ایک خوشگوار شغل بن کر رہ گیا ہے۔ جائیلز فریزر (Giles Fraser)جو ایک اینگلکن پادری بھی ہے اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں فلسفے کا استاد بھی، اس

نے روز نامہ گارڈئین (*Guardian* ) میں اس موضوع پر اپنے ایک مقالے میں جس کا ذیلی عنوان تھا، 'چرچ آف انگلینڈ (Church of England) میں خدا کو تو مذہب سے باہر کر دیا، لیکن کسی بھی بھرپور طریقۂ کار کے اپنے خطرات ہیں'، یہ لکھا:

> ایک دور تھا جب گاؤں کا پادری انگریز زندگی کا ایک لازمی جزو تھا۔ چائے پینے والا یہ بے ضرر سنکی، اپنے چمچماتے جوتوں اور ملائم ادب و آداب سمیت، ایک ایسے "مذہب" کا نمائندہ تھا جو کسی کو بھی بے آرم نہیں کرتا تھا۔ نہ تو یہ جذبۂ وجودیت سے سرشار ہو کر آپ کی آخرت سنوارنے کی ضد کرتا تھا، اور نہ ہی کسی اعلٰی قوّت کے نام پر ممبر سے جہاد کا اعلان کرتا یا سڑکوں پر بم نصب کرتا پھرتا تھا[۱۹]۔

( اس میں بیٹجمان "مقدّس باپ" (Betjeman's Our Padre ) کی جھلک نظر آتی ہے جسے میں نے باب اکے شروع میں مقتبس کیا تھا)۔ آگے چل کر فریزر کہتا ہے کہ "اس اچھے پادری نے لا تعداد انگریزوں کو عیسائیت کی وبا سے بچا لیا"۔ اپنے مقالے کے اختتام پر وہ گریہ و زاری کرتا ہے کہ چرچ آف انگلینڈ میں دوبارہ سے مذہب کے معاملے میں سنجیدگی کا مظاہرہ کرنے کا رجحان نظر آ رہا ہے۔ مقالے کے آخری جملے میں فریزر تنبیہ کرتا ہے کہ "خدشہ اس بات کا ہے کہ کہیں انگریز مذہبی جنونیت کے جن کو کہیں پھر سے اس کے صندوق سے آزاد نہ کر دیں جہاں وہ صدیوں سے مقیّد ہے"۔

مذہبی جنونیت کا جو جن پچھلے چند سال سے امریکہ میں کھلے عام دندناتا پھر رہا ہے، اس کو دیکھ کر بانیٔ قوم دہشت کا شکار ہو جاتے۔ قطع نظر اس سے کہ آیا اس موقع پر امریکہ کے مذہبی تضاد پر گفتگو کی جاسکتی ہے یا نہیں اور غیر مذہبی آئین پر الزام ڈالا جا سکتا ہے یا نہیں، اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ امریکہ کے بانی غیر مذہبی سیکولر تھے جو مذہب کو سیاست سے باہر رکھنے کے قائل تھے۔ یہ حقیقت ان کو ایسے لوگوں کی صف میں کھڑا کر دیتی ہے جو معاشرے میں مذہبی علامتوں کی مزاحمت کرتے ہیں، جیسے کہ سرکاری عمارتوں پر موسیٰ کے دس احکامات کے کتبے لگانا۔ اس قیاس میں ایک عجیب سا لطف ہے کہ کچھ بانیٔ قوم نے تو شاید فطری اعتقادات سے آگے الحاد کی جانب بھی قدم بڑھایا ہو گا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ ملحد یا پھر بھر پور دہریے رہے ہوں؟ جیفرسن کے اس بیان اور دور حاضر کے الحاد میں فرق کرنا تقریباً نا ممکن ہے:

> جملہ غیر ماڈی وجود ہائے کے بارے میں بات کرنا "کیفیت عدم" کے بارے میں بات کرنے جیسا ہے۔ انسانی روح، خدا، اور فرشتوں کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ غیر ماڈی ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ان کا وجود فرضی ہے۔ یا یوں کہئے کہ خدا 'نہیں' ہے، فرشتے 'نہیں' ہیں، روح 'نہیں' ہے۔ میں خواب اور وہم کی گہری کھائی میں چھلانگ لگائے بغیر ان کے ہونے کی کوئی دلیل نہیں دے سکتا۔ میں ان چیزوں کے بارے میں اپنے آپ کو تکلیف اور عذاب میں ڈالے بغیر کہ جن کے وجود کے بارے میں میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہیں، ان چیزوں میں اپنے آپ کو مصروف رکھنا پسند کرتا ہوں جن کا وجود ہے۔

کرسٹوفر ہچنز ( Christopher Hitchens) کا خیال ہے کہ جیفرسن اپنے دور میں بھی دہریے تھے جب دہریا ہونا بہت مشکل ہوا کرتا تھا۔ وہ جیفرسن پر لکھی گئی سوانح حیات "تھامس جیفرسن: امریکہ کا مصّنف" میں لکھتے ہیں:

> جیفرسن نے اپنے سیاسی حیات میں جس احتیاط کا مظاہرہ کیا، اس کی بنا پر ہمیں اس کے دہریے ے ہونے کے بارے میں اپنا فیصلہ محفوظ رکھنا پڑے گا۔ لیکن جیسا کہ اس نے ۱۷۸۷ کے اوائل میں اپنے بھتیجے پیٹر کار کو خط میں لکھا، ہمیں اس تحقیق کے ممکنہ نتائج سے قطعی خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ 'اگر (تحقیق کا یہ سلسلہ) اس نتیجے پر جا کر دم لے کہ خدا کا وجود نہیں ہے، تو آپ کواس خوشگوار احساس سے جو اس مشق کے دوران حاصل ہوتا ہے، یقیناً نیکی اور دوسروں کے ساتھ محبّت کی تقویت ملے گی۔

مجھے جیفرسن کی یہ ہدایت جو اس نے اسی خط میں پیٹر کو دی، بہت متاثر کرتی ہے:

> غلامانہ تعصّبات کے خوف کو اتار پھینکو جن کے نیچے کمزور ذہن سر نگوں بیٹھے ہیں۔ استدلال کو اس کے تخت پر بٹھا دو، اور ہر رائے، ہر حقیقت کو اس کے دربار میں پیش کر دو۔ خدا تک کے وجود پر بے باکی سے سوال اٹھاؤ؛ کیونکہ اگر کوئی خدا ہے تو وہ

بھی اندھے خوف کی بجائے استدلال کو خراج عقیدت پیش کرنے کے حق میں ہو گا۔

جیفرسن کے ایسے بیانات " عیسائیت انسان پر نازل ہونے والا سب سے فضول نظام تھا" مادّیت سے بھی اتنے ہی ہم آہنگ ہیں جتنے الحاد سے۔ پادریوں کی کلیسائیت کی طرف جیمز میڈسن کا بھر پور منفی روّیہ بھی اسی طرز پر ہے: "عیسائیت کے باقاعدہ سرکاری قیام کو قریب ۱۵صدیوں کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اوراب تک حاصل کیا ہوا ہے ؟ کلیسائیت میں آرام طلبی اور غرور؛ عوام میں جہالت اور غلامانہ چاپلوسی؛ اور دونوں میں توہم پرستی، تعصب، اور ظلم"۔ بینجامن فرینکلن کے جملے "گرجاگھروں کے مقابلے میں ساحل پر روشنی کے میناروں کی زیادہ افادیت ہوتی ہے" کے بارے میں بھی یہی تبصرہ کیا جا سکتا ہے۔ جان ایڈمز کے فقرے " کلیسائی کونسل کی خوفناک تحریکیں ...." سے ایسا لگتا ہے کہ وہ بھی کلیسائیت مخالف فطرتی تھا اور عیسائیت کے خلاف طنز آمیز تقریریں کرتا تھا۔ "جیسا کہ میں نے عیسائیت کو سمجھا ہے، یہ ایک الہام تھا، اور ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ الہام میں ہزاروں لاکھوں قصّے کہانیوں کی آمیزش نے عیسائیت اور یہودیت دونو ں مذاہب کو تاریخ کے سب سے خون ریز مذاہب بنا دیا ہے"! ایک اور خط میں جان ایڈمز نے جیفرسن کو لکھا کہ " جب میں صلیب کو دیکھتا ہوں تو رنج و غم کی اس علامت کے ناجائز استعمال پرخوف سے لرز اٹھتا ہوں۔ ذرا سوچئے اس علامت کے نام پر کیسے کیسے ظلم ڈھائے گئے ہیں"۔ آیا جیفرسن اور اس کے رفقا توحید پرست(theists) تھے، دین فطرت ( deists) کے معتقد تھے، مادیت پرست (agnostics) تھے یا دہریے (atheists)، وہ سیاست میں شدید حد تک غیر مذہبی بھی تھے، جن کا یہ ماننا تھا کہ صدر کے مذہبی خیالات کا ہونا یا نہ ہونا صدر کا ذاتی مسئلہ ہے۔ صحافی رابرٹ شرمن کی وہ رپورٹ، جس میں شرمن نے صدر جارج بش سے سوال کیا کہ وہ دہریے امریکیوں کو برابر کے شہری اور حب الوطن سمجھتے ہیں یا نہیں، پڑھ کر تمام بانیٔ قوم قطع نظر ان کے ذاتی خیالات ششدر رہ جاتے ہیں: "نہیں! میں نہیں سمجھتا کہ دہریوں کو برابر کے شہری یا حب الوطن سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ قوم خدا کی خدائی میں متّحد ہے"[20]۔ مان لیجئے کہ شرمن کی رپورٹ درست ہے (افسوس کہ یہ خبر اور کسی جریدے نے نہیں چھاپی اور شرمن نے ٹیپ ریکارڈر استعمال نہیں کیا) اور دہریے کی جگہ یہودی ، مسلمان یا سیاہ فام لکھ دیجئے۔ اس سے آپ کو اس امتیازی سلوک کا اندازہ ہو جائے گا جو آج کل امریکہ میں دہریوں کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ نیٹلی اینجیر کی کتاب "ایک تنہا دہریے کا اقبال جرم" ( Natalie Angier's 'Confessions of a lonely atheist) مصنّفہ کے بطور امریکی دہریوں کے احساس تنہائی کی ایک افسوس ناک داستان ہے۔ لیکن امریکی دہریوں کی تنہائی تعصّب سے جنم لینے والا ایک فریب نظر ہے۔ امریکہ میں دہریوں کی تعداد عام اندازے سے کہیں بڑھ کر ہے۔ جیسا کہ میں نے دیباچے میں بھی کہا ہے، امریکی دہریوں کی تعداد مذہبی یہودیوں سے زیادہ ہے، پھر بھی یہودی لابی واشنگٹن میں اپنے زبردست اثر و رسوخ کے لئے مشہور ہے۔ اگر امریکہ کے دہریے منظّم ہو جائیں تو ان کی پہنچ اس سے کہیں زیادہ ہو ۔

اپنی عمدہ کتاب "دہریا کائنات (*Atheist Universe*)" میں ڈیوڈ ملز ایک کہانی سناتے ہیں جو اگر سچ نہ ہوتی تو پولیس کے مظالم کی ایک مضحکہ خیز تصویر لگتی۔ ایک عیسائی "عامل" طبیب ایک "معجزوں کا جہاد" چلاتا تھا جو سال کے سال ملز کے آبائی شہر میں بھی آتا تھا۔ دیگر شعبدوں کے علاوہیہ "عامل" شوگر کے مریضوں کو اپنی انسولن (insulin) اور کینسر کے مریضوں کو اپنی کیموتھیراپی(chemotherapy) کی دوائیں پھینکنے اور معجزے کے لئے دعا کرنے کی ترغیب دیتا تھا۔ ملز نے لوگوں کو خبردار کرنے کے لئے ایک مظاہرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس نے پولیس کواپنے ارادے سے مطّلع کرنے، اور عامل کے معاونین سے بچاؤ کی غرض سے ان سے حفاظت طلب کرنے کی غلطی کر ڈالی۔ پہلے ہی پولیس افسر نے اس سے پوچھ لیا: تمہارا مظاہرہ عامل کے حق میں ہو گا یا مخالفت میں؟ جب ملز نے کہا کہ مخالفت میں ہو گا تو پولیس والا بولا کہ وہ خود عامل کے جلسے میں جانے کا ارادہ رکھتا ہے اور راستے میں ملز کے مظاہرے کے پاس سے گزرتے ہوئے خود ملز کے منہ پر تھوکنے کا بھی۔

ملز نے ایک دوسرے افسر کے ساتھ قسمت آزمانا چاہی۔ اس افسر نے کہا کہ اگر عامل کے چاہنے والوں نے ملز پر حملہ کیا تو وہ ملز کو 'خدا کے کام میں مداخلت' کرنے کے الزام میں گرفتار کر لے گا۔ ملز نے گھر جا کر اعلی افسروں سے فون پر رابطے کئے اور کوشش کی کہ شاید وہاں کوئی شنوائی ہو جائے۔ آخر کار اس کا رابطہ ایک سارجنٹ سے ہو گیا جس نے صاف الفاظ میں ملز کو کہا "بھاڑ میں جا! کوئی بھی کسی مردود دہریے کے دفاع کے لئے آگے نہیں آئے گا۔ اچھا ہی ہو کوئی تجھے اچھی طرح لہو لہان کر دے"۔ غالباً اس رات تھانے میں گرامر کے "فعل مطلق"، انسانی ہمدردی اور فرض شناسی میں کمی

---

[20] جریدہ "فری انکوائری" کے مدیر ٹام فلن نے اس نقطے کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے ('Secularism's breakthrough moment', *Free Inquiry* ۲۶: ۳, ۲۰۰۶, ۱۶–۱۷) اگر دہریے تنہا اور پسماندہ ہیں تو اس میں قصور ہمارا اپنا ہی ہے۔ اعداد و شمار کے اعتبار سے تو ہم ایک طاقت ہیں۔ اب ہمیں اپنی طاقت کے مطابق میدان میں آنا چاہئے۔

واقع ہو گئی ہو گی۔ ملز لکھتے ہیں کہ اس رات انہوں نے سات یا آٹھ پولیس اہلکاروں سے بات چیت کی ہو گی۔ ان میں سے کسی نے ان کی مدد نہیں کی، بلکہ الٹا کئی نے تو جبر و تشدّد کی دھمکیاں بھی دیں۔

ویسے تو دہریوں کے خلاف اس قسم کے تعصب بھرے قصّے عام سننے کو مل جاتے ہیں، لیکن اینٹی ڈسکریمینیشن سپورٹ نیٹورک (Anti-Discrimination Support Network (ADSN)) کی مارگریٹ ڈاؤنی نے فری تھاٹ سوسائٹی آف گریٹر فلاڈیلفیا (Freethought Society of Greater Philadelphia) کے ذریعے ان حرکات کا ایک نہایت منظّم ریکارڈ ترتیب دیا ہے[۲۱]۔ ان کی حادثات کی بنائی ہوئی ڈیٹا بیس برادری، سکول، کام کی جگہ، ذرائع ابلاغ، خاندان اور حکومتی ادارے کی حساب سے مرتّب کی گئی ہے، اور اس میں حراساں کرنے، نوکری سے برخاست کرنے، خاندان سے بے دخل کرنے اور قتل تک کی مثالیں شامل ہیں[۲۲]۔ ڈاونی کے مرتّب کردہ نفرت اور غلط فہمی کے شواہد سے اس بات کا یقین کرنا واقعی بہت آسان ہے کہ ایک سچّے دہریے کا امریکہ کے عوامی انتخاب میں کامیابی کے امکانات ناپید ہیں۔ امریکہ کے ایوان نمائندہ گان میں ۴۳۵ ممبران ہیں اور سینیٹ میں ۱۰۰ اگر یہ مان لیا جائے کہ ان میں سے اکثر عوام کی تعلیم یافتہ آبادی کا نمونہ ہیں تو شماریات کی رو سے یہ نا ممکن ہے کہ ان میں سے چند دہریے نہ ہوں۔ انہوں نے انتخابات میں جیتنے کے لئے یا تو جھوٹ بولا یا اپنے اندران احساسات کو چھپائے رکھا۔ اس عوام کو دیکھتے ہوئے جسے ان دہریے سیاستدانوں نے اپنے حق میں راضی کرنا ہوتا ہے کون ان کو غلط کہہ سکتا ہے؟ سب جانتے ہیں کہ کسی صدارتی امید وار کا اپنے الحاد کا اعتراف کرنا اس کے لئے سیاسی خودکشی ہو گا[§]۔

امریکہ میں دور حاضر کے سیاسی ماحول کو دیکھ کر جیفرسن، واشنگٹن، میڈسن، ایڈمز اور ان کے دیگر رفقاء ششدر رہ جاتے۔ خواہ وہ دہریے تھے، ملحد تھے، فطرت پسند یا عیسائی تھے، وہ ۲۱ویں صدی کے امریکہ میں مذہبی سیاست کو پروان چڑھتا دیکھ خوف کے عالم میں ضرور آ جاتے۔ شاید وہ آزاد ہندوستان کے غیر مذہبی بانیوں کی طرف زیادہ مائل ہوتے، خصوصاً گاندھی کی طرف (میں ہندو ہوں، میں مسلم ہوں، میں یہودی ہوں، میں عیسائی ہوں، میں گوتم بدھ کا بھگت ہوں) اور نہرو کی طرف جو خود دہریے تھے:

> ہندوستان اور باقی دنیا میں مذہب یا کم از کم باقاعدہ مذہب کے تماشے کو دیکھ کر میرا دل خوف سے بھر آتا ہے؛ میں اکثر اس کی مذمّت کرتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ یہ بالعموم اندھے اعتقاد، ردّ عمل، تعصبات، توہم پرستی، استحصال، اور ذاتی مفادات کے تحفّظ کی غمّازی کرتا ہے۔

گاندھی کے لا مذہب ہندوستان کے خواب (اے کاش! کہ بجائے بٹوارے اور مذہبی خونریزی کے اس خواب کو تعبیر ملی ہوتی) کی جو تعریف نہرو نے تحریر کی اسے پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ خود جیفرسن نے یہ الفاظ لکھے ہوں گے:

> ہم مذہب سے آزاد ہندوستان کی بات کرتے ہیں.... کچھ لوگ اس کو مذہب دشمنی سمجھتے ہیں۔ یہ تاثر غلط ہے۔ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ یہ ایک ایسی ریاست ہے جہاں سب مذاہب کو یکساں احترام اور مواقع حاصل ہیں؛ ہندوستان میں مذہبی رواداری کی تاریخ بہت پرانی ہے.... ہندوستان جیسے ملک میں، جہاں بہت سے مذاہب ایک ساتھ موجود ہیں، سوائے لا مذہب بنیاد کے کسی اور طریقے سے قومیت کی تعمیر ممکن ہی نہیں[۲۳]۔

ملحدوں کا خدا جسے عموماً امریکہ کے بانیوں سے منسلک کر دیا جاتا ہے، انجیل کے خوفناک دیو سے کہیں بہتر ہے۔ لیکن اس کے موجود ہونے کے امکانات بھی اتنے ہی کم ہیں جتنے انجیل کے خدا کے ہیں۔ خدا کا مفروضہ اپنی کسی بھی شکل میں قطعی غیر ضروری ہے[**]۔ مفرضہً خدائی بھی قوانین امکانات کی بنیاد پر مسترد ہونے والا ہے۔ باب ۳ میں خدا کے مبیّنہ ثبوت سے نمٹنے کے بعد میں باب ۴ میں قوانین امکانات کی بھی بات کروں گا۔ فی

---

[§] ۲۰۰۸ میں کیلیفورنیا کے ۱۳ویں ڈسٹرکٹ سے انتخاب لڑنے والے امیدوار پیٹ سٹارک نے کھلے عام اپنے دہریا ہونے کا اعلان کر دیا۔ (http://www.secular.org/news/pete_stark_۰۷۰۳۱۲.html). آئے امید کریں کہ اور سیاستدان بھی اس دلیری کا مظاہرہ کریں گے۔ آئے! چھلانگ لگا دیجئے۔ پانی تھوڑا ٹھنڈا ہے لیکن آپ کو تازہ دم کر دے گا۔

[**] جب نپولین نے مشہور عالم ریاضیات لاپلاس (Laplace) سے پوچھا کہ اس نے خدا کا ذکر کئے بغیر اپنی کتاب کیسے مکمل کر لی تو لاپلاس نے جواب دیا: "حضور! مجھے اس مفروضے کی ضرورت ہی نہیں پڑی"۔

الحال میں اپنی اور آپ کی توجہ ماڈیت اور اس سے منسلک اس غلط رجحان کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ خدا کے وجود کا ہونا یا نہ ہونا ایک ناقابل گرفت اور تاحیات سائنس کی پہنچ سے باہر رہنے والا سوال ہے۔

## الحاد کی عقلی مفلسی

وہ تن و مند عیسائی جو بچپن میں مجھے سکول کے منبر سے للکارا کرتا تھا اپنے جذبات کی رو میں بہتے ہوئے دہریوں کی ستائش کئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ کیونکہ دہریے کم از کم اپنے غلط عقائد کے ساتھ انصاف کرنے کا حوصلہ تو رکھتے تھے۔ لیکن یہ پادری ملحدوں کو بالکل برداشت نہیں کر پاتا تھا۔ ہلکے پھلکے، پھسپھسے، بے رونق، دونوں کشتیوں میں پاؤں رکھنے والے چرسی۔ وہ اپنے اس روّیے میں کسی حد تک درست بھی تھا، لیکن غلط وجوہات کی بنیاد پر۔ اسی بحر میں، کوینٹن ڈیلا بیدوئیر (Quentin de la Bédoyère) کے مطابق، کیتھولک تاریخ نگار ہیو راس ولیمسن راسخ العقیدہ دہریے کی اتنی ہی عزت کرتا تھا جتنی راسخ العقیدہ ایمان والے کی۔ اس کا غیض و غضب درمیان میں اوسط درجے کے ان لوگوں کے لئے مختص تھا جو نہ پورے دہریے تھے نہ پورے مذہبی"[24]۔

جہاں بحث کے دونوں اطراف فیصلہ کن ثبوت موجود نہ ہوں وہاں ماڈیت کی راہ اختیار کرنے میں کوئی مضایقہ نہیں ہے۔ یہ ایک استدلالی زاویہ ہے۔ جب کارل سیگن سے کائنات میں زندگی کے امکانات کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے بھی ماڈیت کا زاویہ ہی اختیار کیا۔ ان کے حتمی جواب دینے سے انکار پر سوال کرنے والے نے اسرار کیا کہ کم از کم یہ تو بتائیں کہ ان کا دل کیا کہتا ہے۔ سیگن کا دائمی جواب تھا: "میں کوشش کرتا ہوں کہ دل سے نہ سوچوں۔ جب تک تمام ثبوت و شواہد میسّر نہیں ہو جاتے، فیصلہ محفوظ رکھنے میں کوئی برائی نہیں"[25]! کرۂ ارض کے علاوہ کائنات میں دیگر زندگیوں کے وجود کے بارے میں بحث جاری ہے۔ دونوں اطراف نہایت جامع دلائل دئے جاسکتے ہیں۔ اور ہمارے پاس ابھی اتنے ثبوت ہی نہیں ہیں کہ سوال کو احتمال کی کیفیت سے آگے بڑھا سکیں۔ ایک طرح سے الحاد یا مادیت بہت سے سائنسی سوالوں کے لئے ایک مناسب موقف مہیا کرتا ہے، جیسے کہ پرمیئن دور' کے آخر میں کئی انواع حیات کی "فنا"(end-Permian mass extinction) کا واقعہ، جو حجریہ (fossils) کی تاریخ کا سب سے بڑا واقعہ ہے۔ ممکن ہے یہ فنا کسی شہاب ثاقب کے زمین پر گرنے سے ہوا ہو، جیسا کہ بعد میں آنے والے ڈائینوسار (Dinosaurs) کے فنا کے واقعہ کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ لیکن کسی دوسرے محرّک یا مجموعہ محرّکات کے کارفرما ہونے کے امکانات بھی اتنے ہی روشن ہیں۔ ان دونوں فنا کے واقعات کے بارے میں ماڈی رویّہ رکھنا قطعی جائز ہے۔ لیکن خدا کے متعلق سوال کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا اس سلسلے میں بھی مادیت جائز ہو گی؟ بہت سے لوگوں کی رائے میں ایسا ممکن ہے۔ بلکہ کچھ کا اصرار تو اس قدر زور دار ہوتا ہے کہ شک پڑتا ہے کہ یہ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہیں۔ کیا ان کا ایسا کرنا درست ہے؟

میں بحث کو ماڈیت پرستی کی دو اقسام میں تفریق سے شروع کرنا چاہوں گا۔ ایک تو ہے عارضی ماڈیت(TAP, or Temporary Agnosticism in Practice) جہاں اگرچہ سوال کے حتمی جواب کا وجود تو ہوتا ہے لیکن فریقین پھر بھی دو کشتیوں کے سوار رہتے ہیں کیونکہ یا تو انہیں ابھی تک ثبوت نہیں مل سکا، یا وہ مکمل طور سے ثبوت کو سمجھ نہیں پائے یا اسے وقت ہی نہیں دے سکے ہیں۔ پرمیئن فنا کے معاملے میں یہ ملحد رویّہ درست ہو گا۔ فنا کی وجہ ایک حقیقت پر مبنی ہے، جسے ہم کبھی نہ کبھی کھوج ہی نکالیں گے، اگرچہ ابھی وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے۔

دوسری قسم کی ماڈیت ایک مستقل اصولی ماڈیت (PAP (Permanent Agnosticism in Principle) ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔ یہ ماڈیت ان سوالوں کے لئے نہایت موزوں ہے جن کا جواب دینا ناممکن ہے خواہ ہم کتنے بھی شواہد اور ثبوت اکٹھے کر لیں، کیونکہ ان بحثوں پر ثبوت و شواہد کا اطلاق ہوتا ہی نہیں ہے۔ اس سوال کا وجود ہی مختلف سطح یا متعدد ابعاد (dimension) رکھتاہے، جو ثبوت و شواہد کی پہنچ سے دور ہے۔ اس کا ایک نمونہ وہ فلسفیانہ گتھی ہے کہ کیا آپ کو لال رنگ ویسے ہی دکھائی دیتا ہے جیسا مجھے دکھائی دیتا ہے۔ شاید آپ کا لال میرا سبز ہو، یا کوئی ایسا عجیب و غریب رنگ جو میں دیکھ ہی نہیں سکتا۔ فلسفی اس گتھی کو ایک ایسے سوال کے طور پر پیش کرتے ہیں جس کا جواب کبھی بھی نہیں دیا جاسکتا، چاہے کتنے ہی نئے ثبوت منظر عام پر آ جائیں۔ کچھ سائنسدان اور دانشور قائل ہیں کہ خدا کا سوال بھی اسی طرح ناقابل رسائی " مستقل اصولی مادیت" کی نوعیت کا ہے۔ ہم آگے چل کر یہ بھی دیکھیں گے کہ یہ ئنسدان اور دانشور کیسے یہ غیر منطقی نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں کہ خدا کے وجود کے ہونے اور نہ ہونے کے مفروضوں کے سچ ہونے کے امکانات برابر ہیں۔ میں جس زاویے کا دفاع کرنا چاہتا ہوں وہ بالکل مختلف ہے: خدا کے وجود کے بارے میں ماڈیت کا رویّہ صرف عارضی ماڈیت کے درجے میں ہی آ سکتا ہے۔ یا خدا کا وجود ہے، یا نہیں ہے۔ یہ ایک سائنسی سوال ہے، جس کا جواب ہمیں کبھی نہ کبھی مل ہی جائے گا، لیکن جس کے

امکانات کے بارے میں ہم آج بھی کچھ ٹھوس بیان دے سکتے ہیں۔

تصورات کی تاریخ میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں جہاں سائنس نے آخر کار ایسے سوالوں کے جواب ڈھونڈ نکالے جنہیں کبھی ماورائے سائنس سمجھا جاتا تھا۔۱۸۳۵ میں مشہور فرانسیسی فلسفی آگسٹ کومٹ (Auguste Compte) نے ستاروں کے بارے میں لکھا: 'ہم کبھی بھی کسی بھی ذریعے سے ستاروں کی کیمیائی اور معدنیاتی ساخت کا مطالعہ نہیں کر سکیں گے'۔ لیکن اس ی دور میں فرانہافر(Fraunhofer) نے اپنے آلہ شعاع ریزی (spectroscope) سے سورج کی کیمیائی ساخت کا معائینہ اور مطالعہ شروع بھی کر دیا تھا۔ اور دور حاضر کے ماہرین شعاع ریزی روزانہ کروڑ ہا میل دور کے ستاروں کا معائینہ کر کے کومٹ کی مادّیت کو غارت کرتے پھرتے ہیں[۲۶]۔ فلکیات کے بارے میں کومٹ کی مادّیت کو جو بھی کہہ لیں، اس قصّے سے ایک سبق تو ضرور اخذ کیا جا سکتا ہے، کہ مادّیت کی ابدی سچّائی کا ڈھنڈورا پیٹنے سے پہلے ہمیں تھوڑا ہوش سے کام لینا چاہئے۔ پھر بھی، جب کبھی خدا کے مفروضے کی بات آتی ہے تو بہت سے فلسفی اور سائنسدان بخوشی ایسا ہی کرتے ہیں، اور ان میں سر فہرست مادّیت کی اصطلاح کے خالق ٹی ایچ ہکسلے( T. H. Huxley) خود ہیں[۲۷]۔

اپنی ذات پر کئے گئے حملے کے دفاع کے دوران ہکسلے نے مادّیت کی اصطلاح ایجاد کرنے کی وجہ بھی بیان کی۔ کنگز کالج لندن کے پرنسپل، ریورینڈ ڈاکٹر ویس نے ہکسلے کی 'ڈرپوک مادّیت' پر اپنا غصّہ نکالتے ہوئے کہا تھا:

> وہ اپنے آپ کو ملحد کہتا ہو گا، لیکن اس کا اصل نام بہت پرانا ہے ۔ وہ کافر ہے؛ مذہب کو نہ ماننے والا۔ کافر کے لفظ میں شاید کچھ ناگواری اور تکلیف کا تاثر نمایاں ہے۔ اور شاید ہونا بھی چاہئے۔ ایک انسان کا یوں کھلے بندوں کہنا کہ وہ عیسیٰ مسیح پر ایمان نہیں رکھتا اس کی طبیعت کے لئے تکلیف دہ ہے، اور ہونا بھی چاہئے۔

اب ہکسلے اس قسم کے طعنے کو آسانی سے در گزر کرنے والوں میں سے نہیں تھا، لہذا ۱۸۸۹ میں انہوں نے بھی اسی شدّت سے جوابی کاروائی کی (اگرچہ انہوں نے کبھی روایتی ادب و آداب کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا، لیکن"ڈارون کا وفا دار" ہونے کے ناطے انہوں نے وکٹورین طنز آمیزی کا بھی بھرپور مظاہرہ کیا)۔ بلآخر، ڈاکٹر ویس کو جامع انداز سے کیفر کردار تک پہنچا لینے کے بعد، ہکسلے نے اس مسئلہ پر بھی اپنا قلم اٹھایا کہ وہ آخر ملحد کی اصطلاح تک پہنچے کیسے۔ ان کا مشاہدہ تھا کہ کئی دانشور:

> بڑے پراعتماد رہتے تھے کہ وہ ایک خاص طرح کے "عرفان" (gnosis) کی منزل پر پہنچ چکے ہیں ۔ کہ انہوں نے کسی قدر کامیابی سے وجودیت کا مسئلہ حل کر لیا ہے؛ جبکہ مجھے خاصہ یقین تھا کہ میں نے ایسا نہیں کیا، اور یہ کہ اس مسئلے کا حل ممکن ہی نہیں ہے۔ ھیوم (Hume) اور کانٹ (Kant) کے فلسفوں کی روشنی میں اس نقطۂ نظر کا دفاع کرنے کی گستاخی نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے اس کے بارے میں سوچا، اور اپنے زاویے کو بیان کرنے کے لئے ایک موزوں لفظ ایجاد کیا جو حالت عرفان کی ضد تھا، یعنی "agnostic"، یا ملحد۔

آگے چل کر ہکسلے اپنی اس تقریر میں کہتے ہیں کہ ملحد کا کوئی عقیدہ نہیں ہوتا، منفی بھی نہیں:

> الحاد در اصل عقیدہ نہیں ایک طریقہ ہے جس کا جوہر ایک واحد قانون کے زبردست اطلاق میں پنہاں ہے.... مثبت الفاظ میں قانون یہ ہے: مسائل دانش میں کسی اور بات کا لحاظ کئے بغیر صرف اپنی عقل پہ سہارا کیجئے، جہاں تک وہ آپ کا ساتھ دے۔ منفی الفاظ میں: ایسے نتائج کے حتمی ہونے کا ڈھونگ مت کیجئے جن کا مظاہرہ یا تو کیا نہیں گیا، یا کیا نہیں جا سکتا۔ میری نظر میں الحاد کا عقیدہ یہی ہے، اور اگر انسان اس پر ثابت قدم رہے تو وہ بغیر شرمسار ہوئے کائنات کا سامنا کر سکتا ہے، قطع نظر اس سے کہ مستقبل میں اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

ایک سائنسدان کے منہ سے نکلنے والے یہ بڑے باوقار الفاظ ہیں، اور ہم ہکسلے پر آسانی سے تنقید نہیں کر سکتے۔ لیکن خدا کے وجود کو ثابت کرنے یا نہ کرنے کی حتمیّت پر توجّہ پرکوز کرتے ہوئے ہکسلے شاید امکانات کے اس سمندر کو نظر انداز کر گئے تھے۔ محض یہ بات کہ ہم کسی چیز کے وجود کو نہ تو

ثابت کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس کا انکار کر سکتے ہیں، وجود اور لاوجود کو برابر کھڑا نہیں کر سکتی۔ مجھے لگتا ہے کہ ہکسلے بھی اس بات سے اختلاف نہ کرتے، اور مجھے شک ہے کہ اگرچہ انہوں نے اختلاف کی غرض سے منطق کی قلابازیاں لگائیں ہوں، ان کا مقصد کسی اور نقطے پر فتح حاصل کرنا ہی رہا ہو گا۔ ایسا ہم سب نے کبھی نہ کبھی کیا ہی ہو گا۔

ہکسلے کے بر عکس میرا یہ ماننا ہے کہ خدا کا وجود بھی کسی مفروضے کی طرح ایک سائنسی مفروضہ ہی ہے۔ اگرچہ حقیقت میں اس کا معائنہ بہت مشکل ہے، پھر بھی اس کو اسی طرح عارضی مادّیت کے خانے میں رکھا جا سکتا ہے جیسے پرمیئن اور کریٹیشیئس ( Cretaceous) واقعات فنا کے تنازعات کو رکھا جاتا ہے۔ خدا کے وجود کا ہونا یا نہ ہونا کائنات سے منسلک ایک ایسا امر ہے جس کی دریافت اگر حقیقتاً ممکن نہیں تو کم از کم منطقی طور پر ضرور ممکن ہے۔ اگر خدا کا وجود ہوتا، اور وہ اپنے آپ کو ظاہر کرنے کا ارادہ کرتا، تو خود خدا ہی اس بحث کو حتمی طورپر، دھوم دھڑکے کے ساتھ، اپنے حق میں ختم کر دیتا۔ اگر خدا کے وجود یا لاوجود کی بحث کسی ایک طرف ثابت نہ بھی ہو سکی، تو بھی موجودہ شواہد اور انسانی فہم و فراست ہمیں یہی اشارہ کرتے ہیں کہ خدا کے ہونے کے امکانات ۵۰ فیصد سے کہیں کم ہیں۔

تو آیئے پھر تسلسل امکانات (Spectrum of Probabilities) کے بارے میں ذرا سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہیں، اورخدا کے وجود سے متعلق انسانی دلائل کو اس تسلسل پر تیقّن کی دو مخالف انتہاؤں کے بیچ رکھتے ہیں۔ یوں تو یہ تسلسل حدود سے پاک اور ہموار ہے، لیکن اس میں سات نمایاں سنگ میل دیکھے جا سکتے ہیں۔

۱. شدید مذہبی۔ خدا کا امکان ۱۰۰ فیصد۔ فلسفی کارل گسٹاف جنگ کے الفاظ میں: "میرا ایمان ہی نہیں، مجھے علم بھی ہے"۔

۲. وافر امکانات، لیکن ۱۰۰ فیصد سے کم۔ قریب قریب مذہبی۔ "میں وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا، لیکن خدا پر میرا ایمان ہے، اور میں اسی مفروضے کے تحت اپنی زندگی گزارتا ہوں"۔

۳. امکانات ۵۰ فیصد سے زیادہ، لیکن بہت زیادہ نہیں۔ تکنیکی اعتبار سے مادّیت پسند لیکن مذہب کی طرف جھکاؤ۔ " میں مشکوک تو ہوں، لیکن میرا جھکاؤ خدا پر ایمان کے حق میں ہے۔

۴. ۵۰ فیصدامکانات۔ مکمل غیر جانبدارانہ مادّیت پسند۔ "خدا کے وجود کے ہونے یا نہ ہونے کے امکانات لگ بھگ برابر ہی ہیں"۔

۵. ۵۰ فیصدسے کم لیکن بہت کم نہیں۔ تکنیکی اعتبار سے مادّیت پسند، جس کا جھکاؤ الحاد کی طرف ہے۔ "میں نہیں جانتا کہ خدا ہے یا نہیں، لیکن میرے شبہات خاصے شدید ہیں"۔

۶. بہت کم امکانات، لیکن صفر سے کچھ زیادہ۔ قریب قریب دہریا۔ "میں وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن خدا کے وجود کے امکانات کم ہی ہیں، اور میں اپنی زندگی اسی مفروضے کے تحت گزارتا ہوں کہ خدا نہیں ہے"۔

۷. شدید دہریا۔ "مجھے معلوم ہے کہ خدا نہیں ہے، جس یقین سے جنگ کو معلوم ہے کہ خدا ہے"۔

اگر ساتویں قسم میں بہت لوگ پائے جائیں تو مجھے بہت حیرانی ہو گی۔ میں نے تو یہ قسم صرف پہلی قسم، جس کی آبادی کثیر ہے، کے ساتھ توازن کی غرض سے فہرست میں شامل کر لی ہے۔ یہ مذہب کی خاصیت ہے کہ مذہبی انسان بغیر کسی مناسب وجہ کے ایک عقیدے کا حامل ہو سکتا ہے، جیسے کہ جنگ (Jung) تھا۔ (جنگ کا یہ بھی ماننا تھا کہ اس کی الماری میں پڑی ہوئی کچھ کتابیں بغیر کسی وجہ کے ایک دم دھماکے سے پھٹ جاتی تھیں)۔ دہریے کا کوئی عقیدہ نہیں ہوتا، اور منطق انسان کو اعتماد کی وہ حد پار کرنے میں مدد نہیں کر پاتی جہاں وہ حتمی طور پر کسی چیز کے نہ ہونے کا دعویٰ کر سکے۔ اس لئے ساتویں قسم تقریباً خالی ہی رہتی ہے جبکہ پہلی قسم کھچا کھچ فدائین سے بھری رہتی ہے۔ میں اپنے آپ کو چھٹی قسم میں گنتا ہوں، لیکن میرا کچھ رجحان ساتویں کی جانب بھی ہے۔ میں مادّیت پسند ہوں توصرف اس حد تک کہ میں باغ میں پریوں کی موجودگی سے منحرف ہوں۔

امکانات کا یہ تسلسل عارضی مادّیت کو بیان کرنے کے لئے بہت کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ ذہن مستقل اصولی مادّیت کو بھی تسلسل امکانات وجود خدا کے بیچوں بیچ ۵۰ فیصد کے نقطے پہ لا کھڑا کرنے پر اکساتا ہے، لیکن ایسا کرنا درست نہیں ہے۔ اصولی ملحدوں کا ماننا ہے کہ ہم خدا کے وجود کے بارے میں

نہ اثبات میں حتمی طور پر کچھ کہہ سکتے ہیں اور نہ نفی میں۔ چونکہ ان لوگوں کے لئے اس سوال کا جواب ممکن ہی نہیں ہے اس لئے انہیں اپنے آپ کو تسلسل امکانات میں سرے سے شامل ہی نہیں کرنا چاہئے۔ یہ امر کہ میں جان ہی نہیں سکتا کہ آپ کا لال رنگ میرا سبز رنگ ہے دونوں میں سے کسی بھی رنگ کے امکان کو پھر بھی ۵۰ فیصد نہیں بناتا۔ یہ سوال ہی اس قدر بے معنی ہے کہ اس کو "امکان" کی عزت سے نوازا ہی نہیں جاسکتا۔ بہر طور، وجود خدا کے سوال کے ناقابل جواب ہونے سے اس وجود کے برابر امکانات کی عقلی چھلانگ ایک ایسا غلط العام ہے جس سے ہماری ملاقات اس کتاب میں آگے چل کر بھی ہو گی۔

اس غلطی کو'بار ثبوت' کے طور پر بھی پیش کیا جاتا ہے، جس کا ایک نہایت لطیف مظاہرہ برٹنڈ رسل (Bertrand Russell) نے خلائی چائے دانی کی تمثیل میں کیا ہے[۲۸]۔

اکثر کٹر لوگ یوں بات کرتے ہیں جیسے یہ مذہب پر شک کرنے والے کی ذمّہ داری ہے کہ وہ موصول عقائد کو غلط ثابت کرے، نہ کہ ان عقائد کے ماننے والے کی کہ وہ انہیں سچ ثابت کرے۔ یہ غلط ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ زمین اور مریخ کے درمیان ایک چائے دانی بیضوی مدار میں سورج کے گرد گھوم رہی ہے، اور ساتھ میں یہ بھی دعویٰ کر دوں کہ چائے دانی اتنی چھوٹی ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ دوربین سے بھی نہیں دیکھی جا سکتی، تو کوئی میرے دعوے کو غلط ثابت نہیں کر سکے گا۔ لیکن اگر میں ساتھ میں یہ بھی کہوں کہ کیونکہ میرے دعوے کو غلط ثابت نہیں کیا جا سکتا، اس لئے یہ انسانی عقل کے لئے ناقابل برداشت ہے کہ اس دعوے پر شک کیا جائے، تو یقیناً میرے بارے میں یہی سوچا جائے گا کہ میں اول فول بک رہا ہوں۔ اگر اس چائے دانی کا ذکر قدیم صحیفوں میں مل جائے، اتوار کو بچّوں کو مدرسے میں پڑھایا جاتا ہو، اور سکول میں بچّوں کے دماغوں میں ڈالا جاتا ہو، تو اس کے وجود کو ماننے سے ہچکچانے کو سنکی پن کی علامت کہا جائے گا اور نہ ماننے والے کو دور حاضر میں کسی ذہنی امراض کے ماہر، اور پرانے وقتوں میں کسی جابر مذہبی تفتیشی افسر کی توجہ کا مستحق بنا دیگا۔

ہم ایسا کہنے میں وقت ضایع نہیں کریں گے، کیونکہ ظاہر ہے کوئی بھی (کم از کم جتنا ہم جانتے ہیں) چائے دانیوں کی عبادت نہیں کرتا ۔ لیکن اصرار کرنے پر ہم یہ کہنے سے بالکل نہیں ہچکچائیں گے کہ ہمارا پختہ ایمان ہے کہ یقیناً خلاء میں کوئی چائے دانی سورج کے گرد گردش نہیں کر رہی۔ لیکن حقیقی معنوں میں تو ہمیں صرف چائے دانی کے بارے میں ملحد ہونا چاہئے: ہم حتمی طور پر ثابت نہیں کر سکتے کہ چائے دانی کا وجود نہیں ہے۔ اصل میں ہم "چائے دانی مادّیت" سے "چائے دانی الحاد" کی طرف سفر کر رہے ہیں۔

ایک دوست جو یہودی ماحول میں پلا بڑھا تھا اور آج بھی اپنی میراث کے ساتھ وفاداری نبھاتے ہوئے سبت (sabbath) کی چھٹی اور دیگر یہودی روایات کو مناتا ہے، اپنے آپ کو "دانتوں کی پری والا ملحد(tooth fairy agnostic)" کہتا ہے۔ اس کی نظر میں خدا کے ہونے کے امکانات اتنے ہی ہیں جتنے دانتوں کی پری کے۔ آپ دونوں ہی مفروضوں کو غلط ثابت نہیں کر سکتے، اور دونوں کے امکانات ایک جتنے ہی ناپید ہیں۔ وہ اتنا ہی "لا مذہب" ہے جتنا "لا پری" ہے۔ اور دونوں ہی کے بارے میں ملحد، جتنا ہونا ممکن ہے۔

رسل کی چائے دانی ایسی ان گنت چیزوں کی نمائندگی کرتی ہے جن کا وجود قابل فہم تو ہے لیکن ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ عظیم امریکی وکیل کلارنس ڈیرو (Clarence Darrow)نے کہا تھا: 'جیسے میں بچّوں کی کہانی کے کردار "موٹی بطخ" کو نہیں مانتا بالکل ویسے ہی خدا کو بھی نہیں مانتا'۔ صحافی اینڈرو ملر کا کہنا ہے کہ کسی بھی مذہب پر بیعت کر لینا یہ مان لینے سے کم یا زیادہ عجیب نہیں ہے کہ دنیا معیّن (rhombus) شکل کی ہے جسے اسمرالڈا اور کیتھ نامی دو قوی ہیکل سبز جھینگے اپنے چمٹی نما اعضاء میں اٹھائے کائنات میں لئے جا رہے ہیں[۲۹]۔ ان فلسفیانہ شعبدوں میں میرا پسندیدہ وہ ان دیکھا، ان سنا، ان چھوا "یک سنگھا" (افسانوی جانور) ہے جس کے وجود کو غلط ثابت کرنے کی مشق بچّے ہر سال کیمپ کوئیسٹ (Camp Quest) میں کرتے ہیں ۔

---

شاید میں کچھ پہلے ہی بول گیا۔ ۵ جون ۲۰۰۵ اخبار "انڈیپنڈنٹ آن سنڈے" نے یہ خبر چھاپی: "ملیشیا کے حکام نے کہا ہے کہ مذہبی فرقے نے چائے دانی نما مکان تعمیر کر کے پلیننگ قوانین کی خلاف ورزی کی ہے۔ .See also BBC News at http://news.bbc.co.uk/۲/hi/asia-pacific/۴۲۹۲۰۳۹.stm

کیمپ کوئیسٹ امریکی موسم گرما کے کیمپ کی اس خوبصورت روایت کو ایک نئی سمت میں لے جاتا ہے۔ دوسرے ایسے کیمپوں سے بالکل مختلف، جو مذہبی تعلیمات یا سکاوٹنگ پر مبنی ہوتے ہیں، کینٹکی کی رہنے والے ایڈون اور ہیلن کیگن کے لگائے ہوئے اس کیمپ کو لادین انسان دوست لوگ چلاتے ہیں، جہاں بچّوں کو کھلی فضا میں روایتی سر گرمیوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے خود سے سوچنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ اس طرح کے کیمپ اب ٹینیسی، منیسوٹا، مشیگن، اوہایو اور کینیڈا میں بھی لگائے جا رہے ہیں۔(www.camp-quest.org)

ایک اور خدا جو آج کل انٹرنٹ پر بہت مقبول ہے ۔ اور جس کو ثابت کرنا اتنا ہی نا ممکن ہے جتنا یاہوے یا کسی اور خدا کو ۔ فلائینگ سپگیٹی مانسٹر ( Flying Spaghetti Monster) یا اڑنے والا سوئیاں نما دیو ہیکل ہے۔ اس کے متعدد متعقدوں کے مطابق ان کو اپنے سوّیوں کے دھاگے سے چھوا بھی ہے[30]۔ مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ فلائینگ سپگیٹی مانسٹر کا صحیفہ چھپ چکا ہے[31] اور بہت کامیاب رہا ہے۔ میں نے خود سے تو نہیں پڑھا۔ لیکن کسی کو صحیفہ پڑھنے کی کیا ضرورت ہے، جب ہمیں معلوم ہی ہے کہ یہ سچ ہے؟ ویسے آپ کو بتاتا چلوں کہ فرقہ بندی ناگزیر تھی، اور اس مذہب میں بھی شروع ہو گئی ہے۔ "فلائینگ سپگیٹی مانسٹر کا اصلاح شدہ چرچ (Reformed Church of the Flying Spaghetti Monster)" معرض وجود میں آ چکا ہے[32]۔

ان سب عجیب و غریب مثالوں کا مقصد یہ ہے کہ اگرچہ ان میں سے کسی کو بھی غلط ثابت نہیں کیا جا سکتا، پھر بھی کوئی ان کے وجود کے امکان کو نہ ہونے کے امکان کے برابر نہیں رکھتا۔ رسل کا مدعا یہ ہے کہ بار ثبوت ایمان رکھنے والوں پر ہے، ایمان نہ رکھنے والوں پر نہیں۔ اس سے منسلک میرا مدعا یہ ہے کہ چائے دانی (سپگیٹی مانسٹر، اسمرالڈا اور کیتھ، یک سنگھا وغیرہ) کے ہونے پر شرط لگانا نہ ہونے پر شرط لگانے کے برابر نہیں۔

کسی سمجھدار انسان کو ایسا نہیں لگتا کہ مدار میں گھومتی چائے دانی اور دانت والی پریوں کے وجود کو ثابت نہ کرسکنا کسی مزیدار بحث کو اختتام تک پہنچانے میں مدد نہیں دیتا۔ ہم میں سے کوئی بھی اس بات کو اہم نہیں سمجھتا کہ ان لاکھوں ہزاروں چیزوں کو غلط ثابت کیا جائے جو ایک زرخیز اور زندہ دل تخیّل ایجاد کر سکتا ہے۔ جب بھی کوئی مجھ سے میرے الحاد کے بارے میں پوچھتا ہے تو میں سوال کرنے والے کو یہ بتاتے ہوئے بہت محظوظ ہوتا ہوں کہ میں زیوس، اپالو، آمن را، متھراس، بال، تھور، ووٹن ، سنہرے بچھڑے، اور سپگیٹی مانسٹر کے معاملے میں تو دہریا ہی ہوں ، لیکن ایک قدم مزید آگے جاتا ہوں۔

ہم سب اپنا حق سمجھتے ہیں کہ ان خداؤں کے بارے میں مکمل لادینیت کی حد تک شدید شکوک و شبہات کا اظہار کریں ۔ یک سنگھے، دانت والی پری، قدیم یونان، روم اور مصر کے خدا، اور ناروے کے وائیکنگ کے بارے میں تو اب کوئی پروا بھی نہیں کرتا۔ لیکن جب ابراہیمی خدا کی بات آتی ہے تو پروا کرنی پڑتی ہے، کیونکہ جن لوگوں کے ساتھ ہم اس کرّۂ ارض پر رہتے ہیں ان میں سے بیشتر اسی خدا پر یقین رکھتے ہیں۔ رسل کی چائے دانی کی مثال سے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ابراھیمی خدا پر یقین کا ہر جگہ موجود ہونا ۔ بمقابل چائے دانی پر یقین کے۔ منطقی طور پر تو اس کے بار ثبوت کو منکرین پر منتقل نہیں کرتا، اگرچہ سیاسی بار ثبوت کو ضرور منتقل کرتا ہے۔ آپ کا خدا کی غیر موجودگی کو ثابت نہ کر سکنا معمولی بات سمجھا جاتا ہے، کیونکہ ہم حتمی طور پر تو کسی بھی چیز کی غیر موجودگی کو ثابت نہیں کر سکتے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ خدا کے وجود کو ثابت کیا جاسکتا ہے یا نہیں (نہیں کیا جاسکتا)، بلکہ یہ ہے کہ اس کے وجود کے امکانات کتنے ہیں۔ اور یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے۔ کچھ نا قابل ثبوت چیزوں کے امکانات دوسری ناقابل ثبوت چیزوں سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ خدا کو تجزیے سے مبرّا قررار دینے کی کوئی دجہ نہیں ہے۔ اور یہ مان لینے کی تو یقیناً کوئی وجہ نہیں کہ خدا کو نہ تو ثابت کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کا انکار کیا جاسکتاہے، اس لئے خدا کے وجود کے امکانات ۵۰ فیصد ہیں۔ آگے چل کر ہم آپ کو یہ بھی دکھائیں گے کہ ایسا کیوں نہیں ہے۔

## غیر ہم آہنگ حاکمیت

## Non-overlapping Magisteria – NOMA

جیسے کیلے تسلسل امکانات کے بیچوں بیچ غیر جانبدار الحاد کے ظاہری دفاع میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے، توحید پرست بھی دوسری جانب سے، کچھ ایسے ہی وجوہ کی بنا پر اسی طرح کرتے ہیں۔ عالم دین السٹر مک گراتھ (Alister McGrath) نے اس کو اپنی کتاب "ڈاکنز کا خدا: جین، میم، اور زندگی کی ابتداء (*Dawkins' God: Genes, Memes and the Origin of Life*) کا مرکزی مدعا بنایا ہے۔ میرے سائنسی کاموں کی ایک خاطر خواہ منصفانہ تعریف کے بعد مک گراتھ کے پاس تنقید کا ایک یہی ناقابل فراموش لیکن شرمناک حد تک کمزور نقطہ بچتا ہے کہ خدا کے وجود کو ثابت نہ کر سکنا ممکن نہیں۔ صفحہ در صفحہ جیسے میں مک گراتھ کی کتاب پڑھتا گیا، میں نے محسوس کیا کہ میں حاشیے میں جگہ جگہ "چائے دانی" لکھتا جا رہا

ہوں۔ مک گراتھ بھی ہکسلے کا نام لیتے ہوئے یہ لکھتا ہے کہ: "ہکسلے وحدانیت اور دہریت دونوں ہی کی بلا جواز و ثبوت رجعت پسند بیان بازی سے اتنا اکتا چکے تھے کہ انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ خدا کا مسئلہ سائنسی بنیادوں پر حل ہو ہی نہیں سکتا"۔

اس کے بعد مک گراتھ سٹیفن جے گولڈ (Stephen J. Gould) کو اسی زاویہ سے مقتبس کرتا ہے: "اپنے تمام رفقاء کی جانب سے ہزاروں ل لاکھوں دفعہ (کالج کے اجتماع سے لے کر تحقیقی مقالے تک) دہرانا چاہتا ہوں: سائنس جائز طریقوں سے خدا کی کائنات پر ممکنہ حاکمیت کا فیصلہ صادر کر ہی نہیں سکتی۔ ہم تیقن سے نہ تو اثبات کی بات کرتے ہیں نہ نفی کی؛ ہم بحیثیت سائنسدان اس نقطے پر روشنی ڈال ہی نہیں سکتے"۔ گولڈ جملے کے پر اعتماد ڈانٹ والے لہجے کے باوجود سمجھ نہیں آتا، اس کا جواز کیا ہے؟ بحیثیت سائنسدان ہم خدا پر تبصرہ کیوں نہ کریں؟ اور رسل کی چائے دانی یا فلائینگ سپگیٹی مانسٹر بھی سائنس کی شک سے بھرپور دلچسپی سے آزاد کیوں نہ رہیں؟ جیسا کہ میں ابھی تھوڑی دیر میں مزید بحث کروں گا، ایک کائنات جس پر کوئی خالق قادر ہے اس کائنات سے یکسر مختلف ہو گی جس پر کوئی قادر نہیں ہے۔ یہ مسئلہ سائنس کے لئے اہم کیوں نہیں ہے؟

اپنی کتاب "ادوار کی چٹّان (Rock of Ages[§§])" میں گولڈ زمین و آسمان کے قلابے ملانے کے اپنے فن کو تمام حدود سے آگے لے گیا ہے۔ یہاں اس نے الفاظ کا یہ نیا مجموعہ تراشا: "غیر ہم آہنگ حاکمیت ہائے ۔ Non-overlapping Magisteria – NOMA" جس کو ان الفاظ میں بیان کیا:

> سائنس کی کل حاکمیت عملی اور تجرباتی دائرہ کار تک محدود ہے: کائنات کس مادّے سے بنی ہے (حقیقت) اور اس طرح کیوں چلتی ہے (نظریہ)۔ مذہب کی حاکمیت ازلی مسائل اور اخلاقیات پر محیط ہے۔ یہ دونوں حاکمیتیں ایک دوسرے میں دخل انداز نہیں ہوتیں، اور نہ ہی تمام سوالات کا جواب دینے کی سکت رکھتی ہیں (مثال کے طور پر فنون لطیفہ اور خوبصورتی کی حاکمیت)۔ کہاوت ہے کہ سائنس چٹّان کے دور سے تعلق رکھتی ہے اور مذہب ادوار کی چٹّان سے؛ سائنس بتاتی ہے کہ سماوات کیسے چلتے ہیں اور مذہب بتاتا ہے کہ سماوات (مطلب جنّت) تک کیسے پہنچا جائے۔

سننے میں کتنا بھلا لگتا ہے، جب تک آپ اس پر ایک لحظہ دھیان نہیں دے لیتے۔ کیا ہیں یہ سوال جن کی محفل میں مذہب تو ایک باعزّت مہمان ہے جبکہ سائنس کو سوتیلے رشتہ دار کی طرح خاموشی سے محفل چھوڑنی پڑتی ہے؟

کیمبرج یونیورسٹی کے مایہ ناز ماہ فلکیات مارٹن ریس جن کا میں نے پہلے بھی ذکر کیا، اپنی کتاب "ہمارا خلائی مسکن Our Cosmic Habitat" کے شروع میں دو "ازلی" سوال اٹھاتے ہیں اور ان کا غیر ہم آہنگ حاکمیتوں کے تناظر میں جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ 'سب سے اہم راز یہی ہے کہ کسی بھی چیز کا وجود کیوں ہے۔ تسویات (equations) میں روح کس نے پھونکی اور ان کی بنیاد پر ایک حقیقی سماوات کی تخلیق کی؟ ایسے سوالات سائنس کی پہنچ سے باہر ہیں، اور فلسفیوں اور علماء دین کے دائرہ کار میں آتے ہیں'۔ لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر یہ سوالات سائنس کی پہنچ سے باہر ہیں تو یقیناً فلاسفہ اور فقہاء کی دسترس سے بھی باہر ہیں (اور مجھے لگتا ہے کہ فلسفی دوست مارٹن ریس سے قطعاً خوش نہ ہوئے ہوں گے کہ ان کو علماء دین کے ساتھ نتھی کر دیا جائے)۔ میں اس سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا علماء دین کی کوئی حاکمیت ہے بھی یا نہیں؟ مجھے آج بھی جب آکسفورڈ میں اپنے کالج کے ایک وارڈن کا جملہ یاد آتا ہے تو میں بہت محظوظ ہوتا ہوں: "مجھے شدید حد تک شک ہے کہ دین کا علم کوئی علم بھی ہے یا نہیں"۔

فلکیات سے جڑے گہرے سوالات کے سلسلے میں علماء دین ایسی کون سی مہارت کا اظہار کر سکتے ہیں جو سائنسدان نہیں کر سکتے۔ اپنی ایک اور کتاب میں میں نے آکسفورڈ کے ایک ماہر فلکیات کا اقتباس درج کیا جنہوں نے میرے ایسے ہی ایک 'گہرے' سوال کے جواب میں کہا: 'ہاں! اب ہم سائنس کی حاکمیت سے نکل کر مذہب کی حاکمیت کی طرف بڑھ گئے ہیں۔ یہاں مجھے سوال اپنے عزیز دوست معلّم صاحب کو سونپ دینا چاہئے'۔ اس وقت میری حاضر جوابی غارت ہو گئی اور میں یہ جواب نہ دے سکا جو بعد میں میں نے کتاب میں درج کیا: 'معلم ہی کیوں؟ مالی کیوں نہیں؟ یا باورچی کیوں نہیں'؟ سائنسدان ایسے سوالوں کے بارے میں علماء دین کے عزائم کے لئے اتنا سعادتمندانہ روّیہ کیوں استووار رکھتے ہیں جن کا جواب دینے کے لئے یہ علماء اتنے ہی

---

[§§] انجیل کا ایک باب جس میں انبیاء کی عمروں اور ادوار کا ذکر ملتا ہے۔

نا اہل ہیں جتنے سائنسدان ؟

یہ ایک ناگوار سی کہاوت ہے (اور زیادہ تر کہاوتوں کے مقابلے میں سچ بھی نہیں ہے) کہ سائنس اپنے آپ کو "کیسے" کے سوالات میں مصروف رکھتی ہے جبکہ مذہب ہی "کیوں" کا جواب دے سکنے کی قابلیت رکھتا ہے۔ یہ "کیوں" والا سوال آخر ہوتا کیا ہے؟ ضروری نہیں کہ ہر وہ سوالیہ جملہ جس میں کیوں کا لفظ آتا ہے ایک جائز جملہ ہو۔ یک سنگھے کھوکھلے کیوں ہوتے ہیں؟ ہر سوال جواب کا مستحق نہیں ہوتا، جیسا کہ یہ سوال "یک سنگھے کھوکھلے کیوں ہوتے ہیں"۔ تجرید کا رنگ کیا ہوتا ہے؟ امید کی بو کیسی ہوتی ہے؟ میرے قواعد کے اصولوں کے مطابق کوئی جملہ بنا لینے سے وہ جملہ معنی خیز نہیں ہو جاتا، اور نہ سنجیدہ توجّہ کا مستحق اور نہ ہی سائنس کے کسی سوال کا جواب دینے میں ناکامی مذہب کو جواب تراشنے کا اہل کر دیتی ہے۔

شاید کچھ ایسے گہرے اور معنی خیز سوال ہیں جن کا جواب ہمیشہ سائنس کی دسترس سے باہر رہے گا۔ شاید نظریہ مقادیر برقیات ( quantum theory) اس وقت بھی گہرے ترین سوالوں کے جوابات کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ لیکن اگر سائنس کسی ازلی سوال کا جواب نہیں دے پا رہی تو کوئی اس کا یہ مطلب کیسے نکال سکتا ہے کہ مذہب یہ جواب دے پائے گا؟ میرے خیال میں نہ آکسفورڈ کے نہ کیمبرج کے ماہر فلکیات ایسا مانتے تھے کہ علماء دین کسی ایسی صلاحیت کے مالک ہیں جو انہیں ان سوالوں کے جواب دینے کے قابل بنا دیتی ہے جو سائنس بھی نہیں حل کر پا رہی؟ مجھے لگتا ہے دونوں ماہرین ایک بار پھر ضرورت سے زیادہ خوش اخلاقی کا ثبوت دے رہے تھے: علمائے دین کے پاس کسی اور بات کے بارے میں کہنے کو کچھ نہیں ہے؛ چلئے ان کو خوش کرنے کے لئے ایک دو ایسے سوال پکڑا دیتے ہیں جن کا جواب نہ تو کوئی دے سکا ہے نہ کبھی دے سکتا ہے۔لیکن اپنے ماہر فلکیات دوستوں کے برعکس میں ان کو اس قسم کی رعایت دینے کے حق میں نہیں۔بائبل کی تاریخ یا ادب وغیرہ کے مقابلے میں میں نے آج تک علم ادیان کے "علم" ہونے کے حق میں کوئی جواز نہیں دیکھا۔

اسی طرح ہم سب اتّفاق کر سکتے ہیں کہ سائنس کا ہمیں اخلاقیات پر درس دینے کے استحقاق کو بھی شدید مسائل کا سامنا ہے۔ لیکن کیا گولڈ چاہتے ہیں کی ہمارے لئے صحیح اور غلط میں تمیز کرنے کا حق مذہب کو تفویض کر دیا جائے؟ اگر مذہب کے پاس انسانی عقل و دانش کو کچھ دینے کے لئے نہیں ہے تو کیا اس کا مطلب یہ لے لیا جائے کہ مذہب کو یہ حق دے دیا گیا ہے کہ وہ ہمیں بتائے کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟ اور ویسے بھی، کونسا مذہب؟ وہ جس میں ہم پلے بڑھے ہیں؟ ہم انجیل کی کونسی کتاب کے کس باب کو پڑھیں، کیونکہ وہ بھی تو متفق نہیں ہیں اور ان میں سے کئی تو شدید گھناؤنے ہیں؟ انجیل کے الفاظ کو لغوی معنوں کی حد تک پڑھنے والوں (literalists) میں سے کتنے ایسے ہوں گے جنہوں نے انجیل کو اس حد تک پڑھا ہو گا کہ وہ جان سکیں کہ اس کتاب کے مطابق زنا، سبت کی چھٹی کے دن لکڑیاں جمع کرنا، یا والدین کے ساتھ گستاخی ایسے فعل ہیں جن کی سزا موت ہے؟ اگر ہم ڈیوٹرانومی اور لیوٹیکس – Deutronomy and Leviticus (انجیل کے حصے) سے انکار کر دیں (جیسا کہ آج کل مہذب لوگ کرتے ہیں) تو ہم مذہبی اخلاقیات کے انتخاب کے لئے کس معیار پر بھروسہ کریں؟ یا پھر ہم دنیا کے تمام مذاہب کا جائزہ لیں کہ کس کی تعلیمات ہمیں مناسب لگتی ہیں؟ اگر ہم ایسا بھی کر لیں تو بھی یہ سوال تو ہمیں پوچھنا ہی پڑے گا کہ مذہب کا انتخاب بھی کس معیار کی بنیاد پر کیا جائے۔ اور اگر مختلف مذاہب کی اخلاقیات میں تمیز اور انتخاب کرنے کے لئے ہمارے پاس رہنما اصول اور معیار میسّر ہیں ہی تو پھر بچولئے کو فارغ ہی کیوں نہ کر دیں اور مذہب کے بغیر ہی اخلاقیات کے اصولوں کا انتخاب کر لیں؟ میں باب ۷ میں ان سوالات کی طرف واپس لوٹوں گا۔

میں مان ہی نہیں سکتا گولڈ نے "ادوار کی چٹّان" میں جو کچھ لکھا وہ س پر یقین بھی رکھتا ہو گا۔ جیسا میں اکثر کہتا ہوں، ہم سب نے کبھی نہ کبھی کسی طاقتور حریف کو خوش کرنے کی غرض سے اس کے ساتھ ضرورت سے زیادہ اچھا رویّہ رکھا ہو گا، اور مجھے لگتا ہے گولڈ نے بھی "ادوار کی چٹّان" میں یہی کچھ کیا ہو گا۔ یہ امر قابل فہم ہے کہ گولڈ کی یہ واضح بیان دینے کی نیت رہی ہو کہ سائنس کو خدا کے وجود کے بارے میں کچھ نہیں کہنا ہے: "ہم تیقّن سے نہ تو اثبات کی بات کرتے ہیں نہ نفی کی؛ ہم بحیثیت سائنسدان اس نقطے پر روشنی ڈال ہی نہیں سکتے". یہ بھرپور طور پر مستقل اصولی مادّیت کی ہی شکل ہے۔ اس بات کا مطلب ہے کہ سائنس اس سوال کے امکانات کے بارے میں بھی کوئی بیان نہیں دے سکتی۔ بڑے پیمانے پر مقبول یہ فریب (زیادہ تر لوگ اس کو منتر یا وظیفے کی طرح پڑھتے تو ہیں لیکن اکثر نے اس کے بارے میں اپنے ذہنوں پر زور نہیں دیا ہو گا) "مادّیت کی غربت" کی غمازی کرتا ہے۔ واضح رہے کہ گولڈ کوئی نیم گرم ملحد نہیں تھا بلکہ بھرپور الحاد کی طرف مائل تھا۔ اگر خدا کے بارے میں کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا تو اس نے کس بنیاد پر یہ بیان دیا؟

مفروضۂ خدائی یہ اشارہ کرتا ہے کہ ہم جس حقیقت کے مکین ہیں اس میں کوئی مافوق الفطرت محرک بھی مقیم ہے جس نے اس کائنات کو ترتیب دیا ہے اور (مفروضے کی بیشتر نقول کے مطابق) اس کو برقرار رکھتاہے، اور ایسے معجزات کے ذریعے مداخلت کرتا ہے جو در حقیقت اس کے اپنے بنائے ہوئے ناقابل مداخلت قوانین فطرت کی خلاف ورزی ہیں۔ رچرڈ سوائین برن، برطانیہ کے ایک معرروف عالم دین ہیں، انہوں نے اپنی کتاب ''کیا خدا ہے Is There a God ؟'' میں کمال وضاحت کا مظاہرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> وحدانیت پرست خدا کے بارے میں یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس میں ہر بڑی اور چھوٹی چیز کو تخلیق کرنے، حفاظت کرنے اور تباہ کرنے کی طاقت ہے۔ وہ اجسام کو حرکت دے سکتا ہے اور جو چاہے کروا سکتا ہے۔ وہ سیاروں کو اسی طرح حرکت دے سکتا ہے جیسا کیپلر نے دریافت کیا تھا، یا بارود کو ماچس دکھائے جانے پر دھماکا کر سکتا ہے۔ یا وہ سیاروں کو ہمارے مشاہدے سے بالکل مختلف طریقے سے بھی حرکت دے سکتا ہے اور مختلف حالات میں کیمیائی اجزاء کے دھماکے بھی کر سکتا ہےاور ہونے سے روک بھی سکتا ہے۔ خدا قوانین فطرت کے طابع نہیں ہے۔ وہ انہیں بناتا ہے اور اگر وہ چاہے تو انہیں بدل بھی سکتا ہے اور عارضی طور پر روک بھی سکتا ہے ۔ جیسا کہ وہ چاہے۔

بہت ہی آسان ہے! نہیں؟ یہ جو کچھ بھی ہے، غیر ہم آہنگ حاکمیت سے بہت دور ہے۔ وہ اس کے علاوہ کچھ بھی کہیں، لیکن جو سائنسدان غیر ہم آہنگ حاکمیت کے فلسفے سے اتّفاق کرتے ہیں، ان کو کم از کم یہ تو ماننا چاہئے کہ وہ کائنات جس میں ایک مافوق الفطرت ذہین خالق موجود ہے اس کائنات سے مکمل طور پر مختلف ہو گی جس میں ایسا خالق نہیں ہے۔ ان دونوں کائنات میں اصولی فرق اس سے زیادہ بنیادی نہیں ہو سکتا، اگرچہ اس فرق کو جانچنا بہت مشکل ہے۔یہ بات اس دل فریب اطمینان بخش دعوے کی بیخ کنی کرتی ہے کہ سائنس کو مذہب کی مرکزی حیثیت کے بارے میں مکمل طور پر خاموش رہنا چاہئے۔ کسی مافوق الفطرت ذہین خالق کی موجودگی یا غیر موجودگی واضح طور پر ایک سائنسی سوال ہے، جس کا جواب شاید ابھی طے نہیں ہوا۔ اور یہی حال ان ساری معجزاتی کہانیوں کا بھی ہے جن پر مذاہب اپنے کروڑ ہا پیروکاروں کو مرعوب کرنے کے لئے انحصار کرتے آئے ہیں۔

کیا عیسیٰ مسیح کا کوئی انسانی باپ تھا؟ یا مریم عیسیٰ کی پیدائش کے وقت کنواری ہی تھی؟قطع نظر اس بات سے کہ اس سوال کو طے کرنے کے لئے مناسب شواہد باقی بچے ہیں یا نہیں، یہ صریحاً ایک سائنسی سوال ہے جس کا جواب اصولی طور پر صرف ہاں یا نا میں ہی دیا جا سکتا ہے۔ کیا عیسیٰ نے مردہ لعذر (Lazarus) میں جان ڈال دی تھی؟ کیا عیسیٰ خود ہی صلیب پر موت کے تین دن بعد پھر سے زندہ ہو گیا تھا؟ ہر ایسے سوال کا جواب ہے، چاہے ہم اسے دریافت کر سکیں یا نا کر سکیں، اور وہ جواب خالصتاً ایک سائنسی جواب ہے۔اگر ہمارے ہاتھ کبھی ایسے کارآمد شواہد لگ گئے، تو اس مسئلے کا حل نکالنے کے لئے ہمیں جو طریقہ کار استعمال کرنا ہو گا وہ بھی خالصتاً سائنسی ہی ہو گا۔ اس مدعے کو اگر ذرا ڈرامائی رخ دیا جائے تو ہم کچھ ایسے غیر معمولی حالات کا تصوّر کر سکتے ہیں جن میں طبّی آثار قدیمہ کے ماہرین DNA دریافت کر لیتے ہیں جو یہ ثابت کرتا ہے کہ واقعی عیسیٰ کا کوئی حیاتیاتی باپ نہیں تھا۔ کیا آپ ایسے مذہبی عذر خواہوں اور عالموں کا تصوّر کر سکتے ہیں جو کندھے اچکا کر ایسا کچھ کہیں ''تو کیا ہوا؟ سائنسی ثبوت کا مذہبی مسائل سے کیا لینا دینا؟ یہ غلط حاکمیت ہے۔ ہمیں صرف اخلاقیات کے ابدی سوالات سے سروکار ہے۔ نہ DNA اور نہ ہی کوئی سائنسی ثبوت اس مسئلے پر کسی بھی طرح سے اثر انداز ہو سکتے ہیں''۔

یہ خیال بھی ایک مذاق ہے! آپ شرط لگا سکتے ہیں کہ اگر ایسا کوئی سائنسی ثبوت علماء کے ہاتھ لگ جائے تو وہ اس کی فاتحانہ تشہیر میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ غیر ہم آہنگ حاکمیت کی عوامی مقبولیت کا راز ہی یہی ہے کہ مفروضۂ خدائی کے حق میں کوئی ثبوت نہیں ہے۔ جس لمحہ علماء کو کمزور ترین ثبوت بھی حاصل ہو گیا وہ کسی تاخیر کے بغیر غیر ہم آہنگ حاکمیت کے فلسفے کو کھڑکی سے باہر پھینک دیں گے۔ نفیس علماء کو چھوڑ کر جو ایسا نہیں کرتے (اور وہ بھی اپنے غیر نفیس پیروکاروں کی آبادی میں اضافہ کرنے کی غرض سے ان کو معجزات کے قصے سنانے سے گریز نہیں کرتے)، مجھے شک ہے کہ یہ مبیّنہ معجزے زیادہ تر لوگوں کے ایمان کی سب سے اہم وجہ ہیں؛ اور معجزے اپنی تعریف ہی کے مطابق سائنس کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

ایک طرف تو رومن کیتھولک چرچ غیر ہم آہنگ حاکمیت کے فلسفے کی طرف مائل نظر آتا ہے، اور دوسری طرف ولی کا رتبہ حاصل کرنے کے لئے معجزات کے ہونے کو ایک نہایت اہم قابلیت قرار دیتا ہے۔ بلجئیم کا مرحوم بادشاہ ولی کے رتبے کا امیدوار ہے، کیونکہ اس نے اسقاط حمل کی مخالفت کی تھی۔ سنجیدہ تحققیات کی جا رہی ہیں کہ اس کی موت کے بعد اس سے مانگی گئی دعاؤں کے نتیجے میں کوئی معجزات عمل میں آئے یا نہیں۔ میں مذاق نہیں کر

رہا بالکل ایسا ہی ہے۔ اور یہ ولیوں سے منسلک قصّوں کے لئے عام بات ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ سب کچھ چرچ کے زیادہ تعلیم یافتہ حلقوں کے لئے کسی قدر شرمندگی کا باعث ہوتا ہو گا۔ ایسے تعلیم یافتہ حلقے بدستور کیتھولک چرچ میں کیوں شامل رہتے ہیں میرے لئے ویسا ہی معمّہ ہے جیسے علماء دین کے معمّے ہوا کرتے ہیں۔

جب گولڈ کے سامنے معجزات کے یہ قصے رکھے جاتے ہوں گے تو غالباً ان کا جواب کچھ یوں ہوتا ہو گا۔ غیر ہم آہنگ حاکمیت کا فلسفہ ایک دو طرفہ سودا ہے۔ جس لمحہ مذہب سائنس کے میدان میں قدم رکھ کر دنیائے حقیقت میں معجزات کے ساتھ مداخلت کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ اس انداز سے مذہب ہی نہیں رہتا جس کا دفاع کرنے کا گولڈ خواہاں ہے، اور اس کا دوستانہ معاہدہ ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ چرچ یا مسجد میں آنے والے عبادت گزار اس معجزات سے پاک مذہب کو نہیں پہچانتے جس کا دفاع گولڈ کرتا ہے۔ ان کے لئے یہ مذہب خاصہ مایوس کن ہو گا۔ ایلیس کے اس جملے کو استعمال کرتے ہوئے جو اس نے Wonderland میں گرنے سے پہلے اپنی بہن کی کتاب کے بارے میں کہا 'ایسے خدا کا کیا فائدہ جو نہ تو معجزے کرتا ہے اور نہ دعائیں سنتا ہے'؟ 'عبادت' کی وہ مزاحیہ تعریف یاد کیجئے جو ایمبروس بئیرس نے کی: 'یہ مانگنا کہ قوانین قدرت ایک مدعی کے حق میں منسوخ کر دیئے جائیں جو اس کا مستحق نہ ہونے کا معترف بھی ہے'۔ ایسے کئی کھلاڑی ہیں جن کا یہ ماننا ہے کہ خدا ان کو کامیابی میں مدد کرتا ہے ۔ ایسے مخالفین کے مقابلے میں جو ان سے کسی طور قابلیت میں کم تر نہیں ہیں۔ گاڑی چلانے والے ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ مانتے ہیں کہ خدا ان کو گاڑی کھڑی کرنے کی خالی جگہ تلاش کرنے میں مدد کرتا ہے ۔ اور غالباً اسی وقت کسی اور سے یہ جگہ چھین بھی لیتا ہے۔ وحدانیت کا یہ انداز بہت مقبول ہے، اور غیر ہم آہنگ حاکمیت کے فلسفے جیسی کسی معقول چیز سے مرعوب ہونے والا نہیں۔

بہر طور ہم گولڈ کی پیروی میں اپنے مذہب کو مداخلت سے پاک کسی قلیل حد تک لے آتے ہیں: نہ کوئی معجزات، نہ خدا سے ذاتی رابطے، نہ طبیعیات کے اصولوں میں مداخلت، اور نہ ہی سائنس کے دائرہ کار میں کوئی دخل اندازی۔ زیادہ سے زیادہ کائنات کے آغاز کے بارے میں تھوڑی سی فطری معلومات تاکہ وقت آنے پر ستارے، عناصر، کیمیا، سیّارے اور پھر حیات کا ارتقاء ہو سکے۔ اتنی علیحدگی تو یقیناً مناسب ہو گی۔ یقیناً غیر ہم آہنگ حاکمیت اتنی سادہ اور عام مذہب کا متحمل تو ہو ہی سکتی ہے؟

آپ ایسا سوچنے میں حق بجانب ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اگر ہم غیر جانبدارانہ نگاہ سے دیکھیں تو ایک غیر مداخلت پسند خداجو ابراہیمی خدا سے کہیں کم تشدد پسند اور اناڑی خدا ہے، پھر بھی ایک سائنسی مفروضہ ہی ہے۔ میں اپنے مدعے پر واپس آتا ہوں: ایک کائنات جس میں چند آہستہ سے ارتقاء کرتی ہوئی حیات کے علاوہ ہم بالکل اکیلے ہیں، اس کائنات سے بہت مختلف ہے جس کا کوئی ازلی رہنما محرّک ہے جس کی ذہین ترتیب اس کائنات کے وجود کی ذمہ دار ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ حقیقت میں کائنات کی یہ تفریق اتنی آسان نہیں ہے۔ پھر بھی، نظریہ کامل ترتیب میں کچھ بہت ہی خاص بات ہے، اور کچھ ایسی ہی جاذبیت اس کے واحد متبادل یعنی عمل ارتقاء میں بھی ہے۔ ان کے درمیان فرق تقریباً ناقابل مفاہمت ہے۔ صرف عمل ارتقاء ہی ایسی ہستیوں کے بارے میں جامع وضاحت دیتا ہے جن کے ہونے کے امکانات کی کمزوری ان کے وجود کو تقریباً ناپید بنا دیتی ہے۔ اور جیسا کہ میں باب ۴ میں دکھاؤں گا، اس بحث کا حاصل مفروضۂ خدا کے لئے قریب قریب جان لیوا ہی ثابت ہوتا ہے ۔

## دعا کا عظیم تجربہ

معجزات کے بارے میں ایک دلچسپ اگر چہ قابل رحم تحقیق کی گئی جس کا نام رکھا گیا "دعا کا عظیم تجربہ ۔ The Great Prayer Experiment "اور جس کا مقصد یہ دریافت کرنا تھا کہ ایا مریضوں کے لئے کی گئی دعا ان کی صحتیابی میں کردار ادا کرتی ہے یا نہیں۔ عموماً عبادت گاہوں میں اور ذاتی حیثیت میں مریضوں کے لئے دعائے خیر مانگی جاتی ہے۔ ڈارون کا رشتہ دار فرانسس گالٹن وہ پہلا شخص تھا جس نے سائنسی بنیاد پر اس موضوع پر تحقیق کی کہ لوگوں کے لئے دعا کا عمل با اثر ہے یا نہیں۔ اس نے اس بات کا مشاہدہ کیا کہ ہر اتوار کے روز پورے برطانیہ کے چرچوں میں لوگ با جماعت شاہی خاندان کے افراد کی صحت کے لئے دعا مانگتے ہیں۔ اس لحاظ سے تو ان کو ہمارے مقابلے میں جن کے لئے صرف ان کے عزیز و اقارب ہی دعا کرتے ہیں، غیر معمولی طور پر صحت مند ہونا چاہئے°°°۔ گالٹن نے جائزہ لیا اور اخذ کیا کہ دونوں صورتوں میں کوئی شماریاتی فرق نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان

---

°°° آکسفورڈ میں جب میرے کالج کے وارڈن کا انتخاب ہوا تو کالج کے فیلوز نے مسلسل تین رات کھانے کے بعد ان کے لئے دعا کی اور شراب نوشی کی (ایک انگریزی رسم)۔ تیسرے طعام کے بعد وارڈن نے فرمایا: "اب تو میں بہت ہی اچھا محسوس کر رہا ہوں"۔

کی نیت تمسخر اڑانے کی ہی رہی ہو۔ کیونکہ ایک موقع پر اس نے زرعی زمین کے مختلف ٹکڑوں پر بہتر اور تیز رو فصل کی دعا بھی کی۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔

حالیہ دور میں مایا ناز ماہر طبیعیات رسل سٹینارڈ (برطانیہ کے تین مشہور مذہبی سائنسدانوں میں سے ایک) نے ٹمپلٹن فاؤنڈیشن کے سرمایے کی مدد سے کی جانے والی ایک تحقیق کی حوصلہ افزائی کی ہے جس کا مقصد یہ تجرباتی طریقے استعمال کرتے ہوئے اس سوال پر غور کرنا ہے کہ بیمار لوگوں کے لئے دعا کرنے سے ان کی صحت بہتر ہوتی ہے[۳۳]۔

ایسے تجربات اگر صحیح طرز پر کئے جائیں، تو انہیں "دہرا اندھا" ہونا ہو گا، اور اس شرط کا پورے طریقے سے خیال رکھا گیا ہے۔ مریضوں کو بغیر کسی ترتیب کے دو گروہوں میں بانٹا گیا، ایک تجرباتی گروہ جس کے لئے دعائیں مانگی گئیں، اور ایک پابند گروہ جس کے لئے کوئی دعا نہیں مانگی گئی۔ ڈاکٹروں، مریضوں، تیمارداروں اور تجربہ کرنے والوں میں سے کسی کو علم نہیں تھا کہ کونسے مریض کس گروہ میں ہیں۔ صرف دعا مانگنے والوں کو ان مریضوں کے نام بتا دئے گئے تھے جن کے لئے دعا کرنی تھی۔ اگر یہ بھی نہ کیا جاتا تو وہ دعا کیونکر مانگ سکتے۔ لیکن اس بات کا پھر بھی خیال رکھا گیا کہ انہیں صرف پہلا نام اور خاندانی نام کا پہلا حرف ہی بتایا جائے۔ بظاہر خدا کو مریض کا بستر تلاش کر سکنے کے لئے اتنی معلومات کو کافی سمجھا گیا۔

ایسے تجربات کرنے کا خیال بھی تمسخر کے خطرے سے پاک نہیں، اور اس منصوبے کو بھی اس کے جائز حصے کے تمسخر سے نوازا گیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے باب نیو ہارٹ نے اس پر مزاحیہ خاکہ بنایا تو نہیں تھا، لیکن مجھے نہ جانے کیوں اس کی آواز کچھ یوں سنائی دیتی ہے:

> کیا کہا آپ نے، مالک؟ آپ میری علالت دور نہیں کر سکتے کیونکہ میں پابند گروہ میں ہوں؟ ... اوہ اچھا اچھا میں سمجھا۔ میری خالہ کی دعائیں کافی نہیں تھیں۔ لیکن مالک وہ ساتھ والے بستر میں ایوانز صاحب ... کیا کہا مالک؟ ایوانز صاحب کو ہر روز ا ایک ہزار دعائیں موصول ہو رہی ہیں؟ لیکن مالک ایوانز صاحب تو ایک ہزار لوگوں کو تو جانتے تک نہیں ہیں.... اوہ، اچھا۔ انہوں نے تو "جان ای" کے نام کی دعائیں کی تھیں۔ لیکن آپ کو کیسے پتا کہ وہ دعائیں جان ایلسور تھی کے لئے نہیں تھیں؟ .... اوہ اچھا۔ آپ نے اپنے عالم الغیب سے دریافت کر لیا کہ دعائیں کس جان ای کو ملنی ہیں۔ لیکن مالک....

بہادری سے تمسخر کو نظر انداز کرتے ہوئے محققین ثابت قدم رہے، اور باسٹن کے قریب واقع Mind/Body Medical Institute کے ماہر امراض قلب ڈاکٹر ہربٹ بینسن کی قیادت میں ٹمپلٹن فاؤنڈیشن کے ۲٫۴ ملین ڈالر بھی خرچ کر ڈالے۔ کچھ عرصہ قبل ٹمپلٹن فاؤنڈیشن نے ایک پریس ریلیز میں بیان دیا تھا کہ 'ڈاکٹر بینسن کا یہ ماننا ہے کہ طبّی ماحول میں مداخلاتی دعاؤں کے اثر کے بارے میں ثبوت و شواہد میں اضافہ ہو رہا ہے'۔ لہذا یہ امر باعث تسکین تھا کہ تحقیق محفوظ ہاتھوں میں ہے، اور شکوک کی مداخلت کا کوئی خطرہ نہیں۔ ڈاکٹر بینسن اور ان کی ٹیم نے چھ ہسپتالوں میں ۱٫۸۰۲ مریضوں کا جائزہ لینا شروع کیا جن کے دل کے آپریشن کئے جا چکے تھے۔ مریضوں کو تین گروہوں میں بانٹ دیا گیا۔ گروہ ۱ کے لئے دعائیں کی گئیں لیکن انہیں بتایا نہیں گیا۔ گروہ ۲ کو کوئی دعا نہیں ملی اور انہیں بھی نہیں بتایا گیا۔ گروہ ۳ کے لئے دعا کی گئی اور انہیں بتا بھی دیا گیا۔ گروہ ۱ اور ۲ کو دعا کی افادیت کے لئے پرکھا گیا، جبکہ گروہ ۳ کو ان نفسیاتی اور جسمانی اثرات کے لئے پرکھا گیا جو اپنے لئے کی گئی دعاؤں کے بارے میں جاننے کے نتیجے میں ظاہر ہو سکتے ہیں۔

تین چرچوں کی جماعتوں سے دعائیں کروائی گئیں۔ ایک منیسوٹا میں تھا، ایک میساچوسٹس میں اور ایک مسوری میں، لیکن سب ان ہسپتالوں سے فاصلے پر تھے جہاں مریض رکھے گئے تھے۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا گیا، دعا کرنے والوں کو صرف مریضوں کا پورا نام اور خاندانی نام کا پہلا حرف بتایا گیا تھا۔ یہ ایک اچھی تجرباتی عادت ہے کہ جہاں تک ممکن ہو کہ منصوبے کے تمام تجربات کے لئے ایک ہی معیار رکھا جائے، اس لئے یہاں تمام دعاؤں میں یہ الفاظ شامل کروائے گئے: "کامیاب آپریشن اور مشکلات سے آزاد جلد از جلد صحتیابی"۔

تجربات کے نتائج اپریل ۲۰۰۶ میں American Heart Journal میں پیش کئے گئے اور بالکل واضح تھے۔ جن مریضوں کے لئے دعا کی گئی اور جن کے لئے دعا نہیں کی گئی ان میں کوئی فرق نہ نکلا۔ حیرانی کی بات ہے ۔ البتہ جن مریضوں کو معلوم تھا کہ ان کے لئے دعا کی گئی ہے اور جن کو معلوم نہیں تھا، ان میں ضرور فرق تھا، لیکن برعکس سمت میں۔ جن مریضوں کو معلوم تھا کہ ان کے لئے دعا کی گئی ہے، ان کو دوسرے مریضوں کے مقابلے میں واضح حد تک زیادہ مشکلات کا سامنا ہوا۔ کیا خدا اس حماقت خیز منصوبے سے اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے کے لئے ان لوگوں کو ہلکی سی مار لگا رہا تھا؟ اس بات

کے امکانات شاید زیادہ روشن ہیں کہ جس گروہ کو دعاؤں کے بارے میں معلوم تھا وہ مزید اضافی ذہنی دباؤ سے دوچار ہو گئے: تجربات کرنے والے اس "کارکردگی کے بارے میں پریشانی (performance anxiety)" کی اصطلا لاح کا استعمال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر چارلز بیتھیا کے مطابق 'ہو سکتا ہے دعا کے بارے میں معلومات نے ان مریضوں میں تشویش پیدا کر دی ہو کہ کیا میں اتنا بیمارں ہو ں کہ ان کو میرے لئے دعا کی ٹیم بلانی پڑ گئی' ۔ آج کل کے مقدمے بازی کے شوقین معاشرے میں کیا ہم یہ امید رکھیں کہ جن مریضوں کو اپنے لئے کی جا رہی تجرباتی دعاؤں کے بارے میں جاننے کے نتیجے میں قلبی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا وہ ٹمپلٹن فاونڈیشن کے خلاف اجتماعی دیوانی مقدمہ دائر کر سکتے ہیں؟

آپ کو قطعاً حیران نہ ہونا چاہئے کہ علماءدین نے اس تحقیق کی مخالفت کی کیونکہ وہ پریشان تھے کہ اس کے نتائج مذہب کو تضحیک کا نشانہ بنانے کے کام آئیں گے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے عالم دین رچرڈ سوائین برن نے تحقیقاتی منصوبے کی ناکامی کے بعد لکھتے ہوئے کہا کہ منصوبہ اس لئے ناکام ہوا کیونکہ خدا دعاؤں کا جواب اسی صورت میں دیتا ہے کہ وہ نیک نیتی سے کی گئی ہوں ۔ کسی ایک شخص کے مقابلے میں کسی دوسرے شخص کے لئے صرف اس لئے دعا کرنا کہ اس کا نام کسی دوہرے اندھے تجربے میں دعا کے حق میں نکل آیا تھا مناسب نہیں ہے۔ خدا کو چال سمجھ آ جاتی۔ باب نیو ہارٹ کا نام لے کر میں نے جو مزاح کیا اس کا مقصد یہی واضح کرنا تھا، اور سوائین برن بھی یہ کہنے میں حق بجانب ہے۔ وہ خدا کی بنائی دنیا میں دکھ اور تکلیف کی توجیہ پیش کرتا ہے:

> میری تکلیف مجھے اپنی بہادری اور صبر کا مظاہرہ کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اور آپ کو میری تکلیف کے ساتھ ہمدردی دکھانےاور اس کا مداوا کرنے کا موقع دیتی ہے۔ اور معاشرے کو یہ فیصلہ کرنے کا موقعہ دیتی ہے کہ وسائل کس طبی تحقیق پر خرچ کئے جائیں اور کس پر نہ کئے جائیں۔ اگر چہ ہمارے اچھے خدا کو ہماری تکلیف کا بہت افسوس ہوتا ہے ، لیکن اس کا اوّلین مقصد ہے کہ ہر شخص صبر، ہمدردی، اور فراخدلی کے جذبات کا مظاہرہ کر سکے، اور اس طرح ایک اخلاقی کردار اپنا سکے۔ کچھ لوگوں کو اپنی ہی خاطر بیمار ہونے کی اشد ضرورت ہوتی ہے اور کچھ لوگوں کو اس لئے بیمار ہو جانے کی اشد ضرورت ہوتی ہے کہ کچھ دوسرے لوگ چند اہم مسائل میں انتخاب کر سکیں۔ کچھ لوگوں کو صرف اسی سے راغب کیا جا سکتا ہے کہ وہ اہم فیصلے کر سکیں۔ جبکہ اور لوگوں کے لئے بیماری اتنی کار آمد نہیں ہوتی۔

یہ واہیات توجیہ جو بہت اچھے انداز سے مذہبی ذہنیت کی غمّازی کرتی ہے، مجھے ایک موقعے کی یاد دلاتی ہے جب میں سوائین برن اور آکسفورڈ کے ایک ہم عصر پیٹر ایٹکنز کے ساتھ ٹی وی پر ایک مباحثے میں شریک ہوا۔ ایک موقع پر سوائین برن نے ہولوکاسٹ (جنگ عظیم دوئم میں نازی فوج کے ہاتھوں یہودیوں کا قتل عام) کی یہ وضاحت پیش کرنے کی کوشش کی کہ اس ظلم نے یہودیوں کو بہادری اور عظمت دکھانے کا ایک اعلٰی موقع عطا کیا۔ پیٹر ایٹکنز نہایت غصے میں غرّایا: جہنم میں جلو تم !

سوائین برن کے مقالے میں آگے چل کر اس مذہبی منطق کی ایک اور شاندار مثال ملتی ہے۔ وہ تجویز کرتا ہے کہ اگر خدا اپنے وجود کا ثبوت دینا چاہتا تو اس کے پاس ایک تحقیق کی صحتیابی کی شماریات میں رد و بدل کرنے سے بہتر ذرائع بھی موجود تھے۔ اگر خدا کا وجود ہوتا اور وہ ہمیں قائل کرنا چاہتا تو وہ دنیا کو عظیم معجزات سے بھر دیتا۔ لیکن پھر سوائین برن نے اپنا اصل جوہر دکھایا: "ویسے ہی خدا کے ہونے کے ثبوت کی بات ہے، اور بہت زیادہ شاید ہمارے لئے اچھا نہ ہو"۔ بہت زیادہ شاید ہمارے لئے اچھا نہ ہو! دوبارہ پڑھیں۔ **بہت زیادہ شاید ہمارے لئے اچھا نہ ہو۔** رچرڈ سوائین برن حال ہی میں برطانیہ میں مذہبی تدریس کے ایک نہایت معتبر عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں، اور برٹش اکادمی کے فیلو بھی ہیں۔ اگر آپ عالم دین کی تلاش کر رہے ہیں تو اس سے زیادہ ممتاز عالم آپ کو نہیں ملے گا۔ شاید آپ کو عالم کی ضرورت نہیں۔

---

Richard Swinburne, in *Science and Theology News*, ۷ April ۲۰۰۶, http://www.stnews.org/Commentary-۲۷۷۲.htm.

یہ گفتگو نشریات میں سے تلف کر دی گئی۔ سوائین برن کا یہ بیان اس کی ذہنیت کی غمّازی کرتا ہے اور اس کا اندازہ اسی طرح کے ایک جملے سے کیا جا سکتا ہے جو اس نے اپنی ۲۰۰۴ میں چھپنے والی کتاب "خدا کا وجود The Existence of God۔" میں ہیروشیما پر گرائے جانے والے ایٹم بم کے بارے میں کہا: "فرض کر لیجئے اس بم کے نتیجے میں ایک شخص کم زخمی ہوتا۔ تو بہادری اور ہمدردی دکھانے کا ایک موقع کم ہو جاتا۔۔۔۔"

سوائن برن وہ واحد عالم دین نہیں تھا جس نے تحقیق کی ناکامی کے بعد اس سے ہاتھ دھو لئے ہوں۔ نیو یارک ٹائمز نے ریوریںڈ (بزرگ پادری) ریمنڈ لارنس کو یہ بیان کرنے کے لئے اپنے صفحات میں جگہ دی کہ مذہبی رہنماؤں نے کیوں سکھ کا سانس لیا ہو گا کہ دعاؤں کی افادیت کے ثبوت نہیں مل سکے"[۳۴]۔ اگر بینسن کی تحقیق کے نتائج دعا کے حق میں آئے ہوتے تو کیا لارنس کوئی دوسرا راگ الاپ رہا ہوتا؟ شاید نہیں۔ لیکن آپ اطمینان رکھئے کہ بہت سے دوسرے مذہبی رہنماؤں نے ضرور ایسا کیا ہوتا۔لارنس کا مقالہ اس جملے کے لئے یادگار سمجھا جانا چاہئے: "حال ہی میں میرے ایک رفیق کار نے مجھے ایک تعلیم یافتہ دیندار خاتون کے بارے میں بتایا جس نے ایک ڈاکٹر پر پیشہ ورانہ بد چلنی کاالزام لگایا۔ ڈاکٹر نے خاتون کے خاوند کے آخری دنوں میں اس کے لئے دعائیں نہیں کی تھیں"۔

دیگر علماء نے بھی تحقیق کی تنقید میں غیر ہم آہنگ حاکمیت متاثر لوگوں کے ہاتھ میں ہاتھ ملا لئے کہ یہ تحقیق در اصل سرمائے کا زیاں ہے کیونکہ مافوق الفطرت عوامل ویسے ہی سائنس کی پہنچ سے باہر ہیں۔ لیکن ٹمپلٹن فاؤنڈیشن نے جب اس تحقیق پر سرمایہ ی لگایا تو انہوں نے اس حقیقت کی نشاندہی کر لی تھی کہ کم از کم اصولی طور پر تو دعاؤں کی افادیت سائنس کی دسترس میں ہے۔ ایک دوہرا اندھا تجربہ کیا جا سکتا ہے اور کیا گیا۔ اس کا نتیجہ دعا کے حق میں بھی آ سکتا تھا۔ اور اگر آ جاتا تو کیا آپ تصوّر کر سکتے ہیں کہ کوئی بھی عالم دین اس تحقیق کو اس بنیاد پر رڈ کر دیتا کہ سائنس کا مذہبی امور پر اطلاق ہی نہیں ہوتا؟ بالکل نہیں!

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس تحقیق کے منفی نتائج ایمان سے بھرپور لوگوں کو ورغلانے میں ناکام رہیں گے۔ مسوری عبادت کدہ ( Missouri Prayer Ministry) جہاں اس تحقیق کی کچھ دعائیں کی گئی تھیں، کے ڈائریکٹر باب بارتھ نے یہ کہا: 'ایمان سے سرشار کوئی بھی شخص یہی کہے گا کہ یہ تحقیق دلچسپ ہے، لیکن ہم تو ایک عرصے سے دعا مانگتے آئے ہیں، ہم نے دعا کو اثر کرتے دیکھا ہے، ہم جانتے ہیں کہ دعا اثر کرتی ہے، دعا اور روحانیت پر تو تحقیق ابھی شروع ہوئی ہے'۔ صحیح ہے! ہمیں اپنے ایمان سے پتہ ہے کہ دعا کام کرتی ہے۔ لہٰذا اگر ثبوت دعا کی افادیت کو ثابت نہ بھی کر سکے تو ہم اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے، تا وقتیکہ ہمیں اپنی مرضی کے نتائج حاصل نہ ہو جائیں۔

## نیول چیمبرلین دبستان ارتقاء پسندان

غیر ہم آہنگ حاکمیت پر یقین رکھنے والے سائنسدانوں کی ممکنہ در پردہ نیت کہ مفروضۂ خدائی سائنس کے طابع نہیں ہو پا رہا۔ ایک مخصوص امریکی سیاسی منصوبہ بندی کا حصہ ہے، اور اس کا محرّک نظریہ تخلیق ہے۔ امریکہ کے کچھ حصوں میں سائنس ایک منظّم، سیاست سے منسلک اور وسائل سے مالامال حزب اختلاف کے زیر عتاب ہے۔ اور نظریہ ارتقاء کی تعلیم ان کا اوّلین ہدف ہے۔ اگر سائنسداں طبقہ اپنے آپ کو خطروں کا شکار محسوس کر رہا ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، کیونکہ تحقیق کی زیادہ تر رقوم حکومت سے آتی ہیں، اور منتخب نمائندگان تعلیم یافتہ ووٹر کے ساتھ ساتھ جاہل اور متعصب عوام کی بھی جواب دہ ہوتے ہیں۔

ایسے خطرات کے جواب میں ایک دفاعی نظریہ ارتقاء کی انجمنیں بھی وجود میں آ گئی ہیں، جن میں ہراول دستے میں "قومی ادارہ سائنسی تعلیم ۔ National Center for Science Education (NCSE)" جس کی قیادت یوجین سکاٹ کر رہی ہیں۔ سکاٹ سائنس کے حق میں انتھک کام کرنے والی ایک کارکن ہے جس نے حال ہی میں خود بھی ایک کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ہے "ارتقاء بمقابلہ تخلیق ۔ Evolution vs Creationism "۔ ادارے کے اہم سیاسی مقاصد میں سمجھدار مذہبی لوگوں کو ملنا اور راغب کرنا شامل ہے: چرچ کے ایسے عام ممبران جن کے لئے عمل ارتقاء کی کوئی اہمیت نہیں اور جو اس کو اپنے اعتقاد کے لئے غیر متعلق سمجھتے ہیں، یا کسی عجیب و غریب طریقے سے اس میں اپنے اعتقاد کے لئے تقویت بھی تلاش کر لیتے ہیں۔ اور دفاعی نظریۂ ارتقاء کی یہ انجمنیں ایسے ہی مذہبی لوگوں کے سامنے اپنا پیغام رکھنا چاہتی ہے، چاہے وہ علماء دین ہوں یا عام غیر دقیانوسی مومن ہوں جو نظریہ تخلیق کی وجہ سے شرمندگی محسوس کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ نظریہ ان کے مذہب کی بدنامی کا باعث ہے۔ اور ان کے خیال میں ایسا کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ غیر ہم آہنگ حاکمیت کی حمایت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے اور اس بات پر اتفاق کر لیا جائے کہ مذہب کو سائنس سے کوئی خطرہ نہیں، کیونکہ سائنس کا مذہب کے دعوؤں سے کوئی تعلق نہیں۔

فلسفی مائیکل روز نیول چیمبرلین گروہ ارتقاء پسندان کا ایک اور روشن ستارہ ہے۔ روز اخبارات اور کمرۂعدالت دونوں میں نظریہ تخلیق کا شدید مخالف

ہے[۳۵]۔ وہ دہریا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن امریکی جریدہ پلے بوائے(Playboy) میں چھپنے والے اپنے مقالے میں اس نے یہ رویہ اختیار کیا:

> ہم جیسے لوگ جو سائنس سے محبت کرتے ہیں، ہمیں یہ اعتراف کرنا چاہئے کہ ہمارے دشمن کا دشمن ہمارا دوست ہے۔ اکثر ارتقاء پسند لوگ، خصوصاً لادین ارتقاً پسند، اپنا بہت سا وقت ممکنہ اتحادیوں سے الجھنے میں ضایع کر دیتے ہیں۔ ملحدین ہمدرد عیسائیوں کو بحث میں ہرانے میں زیادہ اور تخلیق کے حامیوں کی مخالفت پر کم وقت صرف کرتے ہیں۔ جب پاپائے اعظم جان پال دوئم نے ڈارون کے نظریے کے حق میں سچ لکھا تو ڈاکنز کا رد عمل یہ تھا کہ پاپائےاعظم دوغلہ ہے وہ سائنس کے معاملے میں مخلص نہیں ہو سکتا، اور ڈاکنز کسی کٹر مگر سچّے بنیاد پرست سے بات کرنے کو ترجیح دے گا۔

روز نے سائنسدانوں کی جدوجہد کا ہٹلر کے خلاف جنگ سے جو ظاہری تقابل کیا ہے، میں اسے حربوں کے نقطۂ نظر سے سمجھ سکتا ہوں: 'ونسٹن چرچل اور روسویلٹ سٹالن اور کمیونزم کو پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن انہیں اس حقیقت کا اعتراف تھا کہ ہٹلر کے خلاف جنگ میں انہیں سٹالن کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ہر طور کے ارتقاء پسند بھی نظریہ تخلیق کے خلاف متحد ہو سکتے ہیں'۔ لیکن میں اپنے رفیق کار اور شکاگو کے ماہر جینیات (genteticist) جیری کوئین کے حق میں بولنا چاہوں گا جس نے لکھا کہ روز:

> دراصل اس تنازعہ کی حقیقت سمجھ نہیں پا رہا۔ یہ صرف ارتقاء بمقابلہ تخلیق نہیں ہے۔ ڈاکنز اور ولسن (ہارورڈ یونیورسٹی کے ماہر حیاتیات ای او ولسن) جیسے سائنسدانوں کے لئے اصل جنگ منطق اور توہم پرستی کے درمیان ہے۔ سائنس منطق کی صرف ایک طرز ہے، جبکہ مذہب توہم پرستی کی سب سے عام قسم ہے۔ نظریہ تخلیق محض اس زاویے کی ایک علامت ہے جسے وہ اپنا اصل دشمن سمجھتے ہیں: مذہب، جبکہ مذہب نظریہ تخلیق کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے، نظریۂ تخلیق مذہب کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا[۳۶]۔

نظریۂ تخلیق کے ماننے والوں کے ساتھ میری ایک قدر تو مشترک ہے۔ میری طرح، اور چیمبرلین گروہ سے مختلف، تخلیق کے ماننے والے غیر ہم آہنگ حاکمیت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ سائنس کے جداگانہ میدان کی عزت کرنا تو در کنار، تخلیق پسند تو سائنس کو ضرب لگانے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور اپنے مقاصد کے لئے گھٹیے ہتھکنڈوں کا استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ تخلیق پسندوں کے وکلاء بھی امریکہ کے چھوٹے چھوٹے شہروں میں ایسے اتقاء پسندوں کو نشانہ بناتے ہیں جو دہریے ہیں۔ مجھے بہت دکھ سے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس ضمن میں میرا نام بھی کئی بار استعمال کیا گیا ہے۔ یہ ایک نہایت موئثر حربہ ہے کیونکہ غیر منظم انداز سے منتخب جیوری میں ایسے لوگوں کی شمولیت کا امکان بہت روشن ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ دہریے لوگ دراصل زمین پر اترے ہوئے شیطان ہیں، جو اپنی برائی میں بچّہ بازوں اور دہشت گردوں کے ہم پلّہ ہیں (انہیں دور حاضر کی سیلم کی جادوگرنیاں یا مکارتھی کے کیمونسٹ کہا جا سکتا ہے)۔ کوئی بھی تخلیق پسند وکیل مجھے کٹہرے میں کھڑا کرتے ہی یہ سوال پوچھ کر اپنا مقدمہ جیت سکتا ہے: "کیا آپ کا عمل ارتقاء کا علم آپ کے دہریا بننے کے فیصلے پر اثر انداز ہوا"؟ مجھے ہاں میں جواب دینا پڑتا اور ایک ہی جھٹکے میں جیوری کی نظر میں گر جاتا۔ اس کے برعکس قانونی طور پر تو لادین دھڑے کی جانب سے صحیح جواب یہ ہونا چاہئے کہ "میرے مذہبی عقائدمیرا ذاتی مسئلہ ہیں۔ نہ ہی ان کا اس عدالت سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی میری سائنس سے"۔ میں صدق دل سے ایسا کہہ نہیں سکتا، اور اس کی وجہ میں آپ کو باب ۴ میں بتاؤں گا۔

روزنامہ گارڈین کی صحافی میڈلن بنٹنگ نے ایک مقالہ لکھا جس کا عنوان تھا "ذہین ترتیب (intelligent design) یہ گروہ رچرڈ ڈاکنز کے لئے خدا کا کیوں شکر گزار ہے[۳۷]"۔ ایسا کوئی اشارہ نہیں کہ اس نے مائیکل روز کے علاوہ کسی اور سے مشورہ کیا ہو، اور ایسا لگتا ہے کہ یہ مقالہ روز نے ہی لکھا ہے[§§§]۔ ڈین ڈینٹ نے "انکل ریمس" سے اقتباس درج کرتے ہوئے خاطر خواہ جواب دیا:

> میں اس خیال سے بہت محظوظ ہوتا ہوں کہ دو برطانوی ۔ میڈلن بنٹنگ اور مائیکل روز ۔ امریکی لوک کہانیوں کے ایک عظیم دھوکے کی زد میں آ گئے۔ (ذہین ترتیب (intelligent design) کا گروہ رچرڈ ڈاکنز کے لئے خدا کا کیوں شکر گزار ہے؛

---

[§§§] یہی بات نیو یارک ٹائمز میں ۲۲ جنوری ۲۰۰۶ کو چھپنے والے معتبر صحافی جوڈتھ شولیوٹز کے ایک مقالے کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے "جب علوم کائنات ٹکراتے ہیں"۔ جنرل منٹگمری کا جنگ کا اوّلین اصول تھا "ماسکو پر چڑہائی مت کرنا"۔ شاید سائنس کی صحافت کا بھی ایک اوّلین اصول ہونا چاہئے: "مائیکل روز کے علاوہ بھی کسی کا انٹرویو کرلینا چاہئے"۔

مارچ ۲۷)۔ جب بھیڑیا خرگوش بھائی کو پکڑ لیتا ہے تو وہ درخواست کرتا ہے: "براہ مہربانی، بھیڑیے بھائی! کچھ بھی کیجئے لیکن مجھے سفید جھاڑیوں کے اس جھنڈ میں مت پھینکئے گا"!۔ جہاں وہ بھیڑیے کے ہاتھوں پھینکے جانے کے بعد حفاظت سے بیٹھ جاتا ہے۔جب امریکی تشہیر باز (propagandist) ولیم ڈمبسکی طنز آمیز لہجے میں ڈاکنز کو لکھتا ہے کہ وہ (ڈاکنز) ذہین ترتیب کے گروہ کے لئے اپنی خدمات کو جاری رکھے، تو بنٹنگ اور روز اس کے جھانسے میں آ جاتے ہیں! "ارے ارے! بھائی بھیڑیے، آپ کا راست دعویٰ کہ ارتقائی حیاتیات ایک تخلیقی خدا کو غلط ثابت کرتی ہے، کمرہٗ جماعت میں حیاتیات کی تعلیم کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ کیونکہ ایسی تعلیم دینا مذہب اور سائنس کی علیحدگی کو پامال کرتا ہے"! بالکل صحیح۔ آپ کو علم الحیات (physiology) کے ساتھ بھی نرمی برتنی چاہئے، کیونکہ اس کا دعویٰ تو یہ ہے کہ کنواری عورت سے بچّہ پیدا نہیں ہو سکتا[۳۸]۔

پی زیڈ مائیرز نے اس سارے مسئلے پر، بشمول خرگوش بھائی اور سفید جھاڑیوں کے جھنڈ کے ذکر کے، بڑی تفصیل سے بحث کی ہے، اور آپ اس کے Pharyngula بلاگ سے مزید معلومات کے لئے رجوع کر سکتے ہیں[۳۹]۔

میں یہ نہیں کہہ رہا کہ میرے وہ دوست جو صلح جوئی پر یقین رکھتے ہیں کسی طرح سے بد دیانت ہیں۔ اگر چہ میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انہوں نے صحیح طور سے اس کے بارے میں غور نہ کیا ہو اور وہ اپنے اندرونی اختلافات پر مصالحت سے کام لیتے ہوں، لیکن ہو سکتا ہے وہ واقعی نظریہ غیر ہم آہنگ حاکمیت پر یقین رکھتے ہوں۔ اس بات پر فی الحال مزید وقت ضایع کرنے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن کوئی بھی شخص جو سائنسدانوں کے مذہبی امور پر اشاعت شدہ بیانات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو اس کو سیاق و سباق کو نہیں بھولنا چاہئے: وہ لاشعوری تہذیبی جنگیں جو اس وقت امریکہ کو چیر رہی ہیں۔ نظریہ غیر ہم آہنگ حاکمیت پر مبنی صلح جوئی سے ہم آگے آنے والے ابواب میں دوبارہ متعارف ہوں گے۔ فی الحال ہم مادّیت اور اس امکان کی طرف لوٹتے ہیں کہ اپنی جہالت اور خدا کے وجود کے بارے میں بے یقینی کو کم کیا جائے۔

## سبز بونے

فرض کیجئے برٹرنڈ رسل کی کہانی میں خلاء میں چائے دانی کی بجائے حیات ہوتی ۔ جس کے بارے میں سیگن نے کہا تھا کہ وہ دل کی آواز نہیں سن سکتے۔ ہم اس کو بھی غلط ثابت نہیں کر سکتے، اور ہمارے پاس جو واحد منطقی راستہ بچتا ہے وہ الحاد کا ہے۔ لیکن یہ مفروضہ اب خفیف یا غیر سنجیدہ نہیں۔ ہم فوراً ہی شدید غیر امکان سے ہمکنار نہیں ہو جاتے۔ ہم نا مکمل شواہد کو بنیاد بناتے ہوئے ایک نہایت دلچسپ بحث کر سکتے ہیں، اور ایسے تمام شواہد کی فہرست بھی بنا سکتے ہیں جن سے ہمارا ابہام کم ہو سکے۔ اگر ہماری حکومت ایسی دوربینیں ایجاد کرنے میں ایک خطیر رقم خرچ کرتی جو خلاء میں گھومتی ہوئی چائے دانی دیکھ سکیں، تو ہمیں بہت غصہ آتا۔لیکن ہم غیر زمینی مخلوق کی تلاش (Search for Extraterrestrial Intelligence – SETI) میں ریڈیو دوربینیں بناتے ہیں جو آسمانوں میں اس امید میں گھورتی ہیں کہ کہیں کوئی باشعور غیر زمینی مخلوق کا اشارہ ملے، اور اس مقصد کے لئے سرکاری ذرایع بھی استعمال کرتے ہیں۔

میں نے کارل سیگن کی دل کی آواز نہ سننے والی بات کو بہت سراہا۔ لیکن ہم ٹھنڈے دماغ سے یہ اندازہ ضرور لگا سکتے ہیں کہ ہمیں غیر زمینی مخلوق کے امکانات کا حساب لگانے کے لئے کن معلومات کی ضرورت ہے۔ (اور سیگن نے ایسا کیا بھی)۔ ہم شروعات میں اپنی جہالت اور بے خبری کے عوامل کی ایک فہرست بنا سکتے ہیں، جیسے "ڈریک کا تسویہ (Drake's Equation)" جو امکانات جمع کرتا ہے۔ ڈریک کا تسویہ یہ کہتا ہے کہ کائنات میں تہذیبوں کے جداگانہ ارتقاء کے امکانات کا تخمینہ لگانے کے لئے آپ کو سات اعداد کو آپس میں ضرب دینا ہو گی۔ ان میں ستاروں کی تعداد، ان ستاروں کے گرد زمین جیسے سیّارے اور ایسا ہونے کے امکانات شامل ہیں۔ باقی چار کا ذکر کرنے کی اس لئے ضرورت نہیں کیونکہ ساتوں ہی اعداد ایسے ہیں جو یا تو نا معلوم ہیں یا ان کے تخمینہ میں غلطی کا بہت زیادہ احتمال ہے۔جب بہت سے ایسے اعداد کو آپس میں ضرب دی جائے جن کے بارے میں معلومات تقریباً ناپید ہوں تو نتیجے ۔ یعنی غیر زمینی تہذیبوں کے تخمینے میں غلطی کا احتمال اتنا شدید ہو گا کہ الحاد اگر واحد قابل یقین زاویہ نہیں کم از کم منطقی ترین زاویہ تو ضرور ہو گا۔

ڈریک کے تسویہ کے ۱۹۶۱ میں لکھے جانے سے لے کر آج تک ان سات نامعلوم اعداد کے بارے میں ہماری معلومات میں خاصہ اضافہ ہوا ہے۔

اس وقت ہمارے مشاہدے میں ایک سورج کے گرد گھومتے ہوئے سیّاروں کا یہ واحد نظام تھا۔ اس کے علاوہ مشتری اور زحل کے سیارہ نما نظام ہی موجود تھے۔کائنات میں دوسرے ستاروں کے گرد گھومنے والے نظام کے بارے میں ہمارے اندازے صرف علمی نمونوں اور "عامیانہ پن کے اصول" پر مبنی تھے: یہ احساس(جس کو کوپرنیکس، ھبل، اور دیگر سائنسدانوں پر کئے گئے مظالم نے جنم دیا) کہ ہم جس جگہ پر پائے جاتے ہیں اس کے بارے میں کچھ خاص ہونے کے امکانات کم ہیں۔ بشریت کا اصول (anthropic principle) عامیانہ پن کے اصول کو کسی قدر غیر موثر بنا دیتا ہے (باب ۴ دیکھئے): اگر ہمارا سیّارتی نظام واقعی کائنات میں اکیلا ہوتا تو ہم، ایسی ہستیاں ہونے کی بنا پر جو ایسے موضوعات کے بارے میں سوچ سکتے ہیں، یہیں پائے جاتے۔ ہمارے وجود کا ہونا ہی اس بات کی تعین کر دیتا کہ جس جگہ ہم پائے جاتے ہیں وہ قطعاً عامیانہ نہیں ہے۔

لیکن آج کل کائنات میں حیات کے امکان کے لگائے جانے والے اندازےعامیانہ پن کے اصول پر نہیں براہ راست شواہد پر ہیں۔ آگسٹ کومپٹ کے کائنات کے نظریوں کو غلط ثابت کرنے والی "سپیکٹرو سکوپ" ایک بار پھر وار کرتی ہے۔ ہماری دور بینیں تو بس چند ستاروں کے گرد گردش کرنے والے سیّاروں کو ہی براہ راست دیکھ پاتی ہیں۔ لیکن گردش کرتے ہوئے سیّاروں کی کشش ثقل اپنے ستارے کے مقام پر اثر انداز ہوتی ہے، اور سپیکٹروسکوپ ستارے کی روشنی میں ڈاپلر ردو بدل (Doppler Shift) کو محسوس کر سکتی ہے۔ اس طریقہ کار کو استعمال کرتے ہوئے آج ہم ۱۴۷ ستاروں کے گرد گھومتے ہوئے ۱۷۰ سیّاروں کے بارے میں جانتے ہیں[۲]، اور جب تک آپ یہ کتاب پڑھیں گے یہ اعداد یقیناً بڑھ چکے ہوں گے۔ ابھی تک تو وہ صرف دیو ہیکل "مشتری" نما سیّارے ہیں، کیونکہ صرف اتنے بڑے سیّاروں کی کشش ہی تاروں کی روشنی پر اتنا قابل ذکر اثر ڈال سکتی ہے جسے ہماری سپیکٹروسکوپ محسوس کر سکے۔

ڈریک تسویہ کے نا معلوم اعداد میں سے کم از کم ایک عدد کے بارے میں ہماری معلومات میں مقداری طور پر بہتری آئی ہے۔اس بہتری سے ہمیں تسویہ کے ممکنہ نتیجے کے بارے میں اپنے الحاد میں کچھ خفیف سی کمی کرنے کی تقویت ملتی ہے۔ ہمیں اب بھی دوسرے سیّاروں پر زندگی کے امکان کے بارے میں ملحد ہی ہونا پڑے گا ۔ لیکن تھوڑا کم، کیونکہ اب ہم تھوڑے کم جاہل ہیں۔ سائنس الحاد کے بت کو ذرّہ ذرّہ اس انداز سے توڑتی ہے، جس سے کے انکار میں کیمٹے نے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ میرا مدعا یہ ہے کہ کیمٹے، گولڈ اور دیگر سائنسدانوں کے پرہیزی رجحان کے باوجود خدا کے وجود کا سوال اصولی اور دائمی طور پر سائنس کی دسترس سے باہر نہیں ہے۔ جیسے ستاروں کی اصلیت، ویسے ہی ان کے گرد گھومتی زندگی کے امکان پر، سائنس الحاد کی زمین میں احتمالی چور رستے بناتی چلی جاتی ہے۔

میں نے مفروضہ خدائی کی جو تعریف لکھی اس میں "فوق البشر ۔ superman " اور "مافوق الفطرت ۔ supernatural " جیسے الفاظ استعمال کئے تھے۔ ان میں فرق واضح کرنے کے لئے، تصوّر کیجئے کہ ایک SETI ریڈیو دور بین خلاء سے کہیں ایک سگنل پکڑ لیں جس سے بلا شبہ ثابت ہو جائے کہ ہم کائنات میں اکیلے نہیں ہیں۔ یہ سوال بھی غیر اہم نہیں کہ ہمیں کس قسم کا سگنل اس کو بنانے والی ذہانت کے بارے میں قائل کرنے کے لئے کافی ہو گا۔ چلئے اس سوال کو اس کے سر پر کھڑا کر کے دیکھتے ہیں۔ اگر ہم کائنات میں سنتے ہوئے کانوں کو اپنی موجودگی کی تشہیر کرنا چاہیں، تو ہم کیا کریں گے؟ با ترتیب برقی مقناطیسی شعاؤں یا "تالیں" ( rythmic electromagnetic pulses) سے کام نہیں چلے گا۔ ماہر ریڈیو فلکیات (radio astronomer) جوسلن بیل برنیل جنہوں نے ۱۹۶۷ میں پہلا پلسار (بہت تیزی سے گھومتا ہوا ستارہ جو ریڈیو لہروں کی تالیں خارج کرتا ہے) دریافت کیا ۔ وہ اس کی ۱۳۳ء۱ سیکنڈ کی دورانیہ معیاد کی باقاعدگی سے اتنی متاثر تھی کہ اس نے مذاقاً اس کا نام Little Green Men – LGM (سبز بونے) رکھ دیا۔ کچھ عرصہ بعد اسے آسمان کے کسی دوسرے کونے میں مختلف دورانیہ کا ایک اور پلسار ملا، جس کی وجہ سے اس کے سبز بونوں کے مفروضے کا اختتام ہو گیا۔ کئی غیر ذہین واقعات بھی " تال ترازو (metronome) " کے مطابق چلنے والی تالیں پیدا کر لیتے ہیں، جیسے کہ درختوں کی لہراتی ٹہنیاں، پانی کے قطرے، خود سے مرتب رد عمل کے وقفے، اور گھومتے اور گردش کرتے اجرام فلکی۔ ہماری اپنی کہکشاں میں ۱۰۰۰ سے زیادہ پلسار دریافت ہو چکے ہیں، اور ان سب کے بارے میں یہی مانا جاتا ہے کہ یہ گھومتے اور ریڈیائی توانائی خارج کرتے ہوئے نیوٹران ستارے ہیں جن کی روشنی مینار کی شعاؤں کی طرح پھیلتی ہے۔ایک ایسے ستارے کے بارے میں سوچ کر بڑا عجیب سا لگتا ہے جو سیکنڈ کے حساب سے اپنے محور پر گھوم رہا ہے (تصوّر کیجئے اگر آپ کا ایک دن ۲۴ گھنٹے کی بجائے ۱۳۳ء۱ سیکنڈ کا ہو)۔ لیکن نیوٹران ستاروں کی تو ساری ہی باتیں عجیب و غریب ہیں۔ بات یہ ہے کہ اب ہم پلسار کو کسی ذہانت کی نہیں بلکہ عام طبعیات کی کار فرمائی کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔

اس کا مطلب ہے عام تالیں کائنات میں کسی کو ہماری ذہین موجودگی کی اطلاع کے لئے ناکافی ہیں۔ عموماً مفرد اعداد (prime numbers) کو پسندیدہ نسخہ مانا جاتا ہے کیونکہ ایسے کسی طبعیاتی عمل کا ہونا مشکل ہے جو ایسے اعداد پیدا کر سکیں۔فرض کیجئے کہ چاہے مفرد اعداد کے ذریعے یا کسی اور طریقے سے، SETI کو غیر زمینی ذہانت کے ناقابل شکست شواہد میسّر آ جائیں، اور اس کے ساتھ معلومات اور حکمت و دانائی کا ایک بے پناہ ذخیرہ بھی حاصل ہو جائے، جیسا فریڈ ہوئیل نے A for Andromeda اور کارل سیگن نے Contact میں لکھا۔ ہمیں کیسے جواب دینا چاہئے؟ ایک قابل معافی رد عمل تو یہ ہو گا کہ اس کی پرستش شروع کر دی جائے، کیونکہ کوئی بھی تہذیب جو اتنے بڑے فاصلے پر اپنا پیغام نشر کر سکنے کی قابلیت رکھتی ہو یقیناً ہم سے اعلٰی ہو گی۔ اگر نشریات کے موقع پر وہ تہذیب ہم سے زیادہ ترقی یافتہ نہیں بھی تھی تو ان کے اور ہمارے درمیان فاصلے سے یہی اخذ کیا جا سکتا ہے جب تک ان کا پیغام ہم تک پہنچے گا وہ ہم سے لاکھوں سال آگے نکل چکے ہوں گے۔ یا ناپید ہو چکے ہوں گے۔

چاہے ہم کبھی ان تہذیبوں کے بارے میں جان پائیں یا نہیں، کائنات میں کہیں نہ کہیں ایسی تہذیبوں کی موجودگی کا امکان روشن ہے جو فوق البشر ہے، اور کسی مذہبی عالم کے وہم و گمان سے کہیں زیادہ خدائی صفات کی مالک ہے۔ ان کی تکنیکی کامیابیاں ہمیں ایسے ہی مافوق الفطرت لگیں گی جیسے ہماری کامیابیاں کسی دور جہالت کے انسان کو لگیں گی جو ۲۱ صدی میں پہنچ گیا ہو۔ لیپ ٹاپ، موبائیل فون، ہائیڈرو جن بم، یا جمبو جٹ ہوائی جہاز کو دیکھ کر اس کا رد عمل قابل دید ہو گا۔ جیسا کہ آرتھر سی کلارک نے اپنی کتاب Third Law میں لکھا تھا: 'کوئی بھی خاطر خواہ حد تک ترقی یافتہ ٹیکنالوجی دیکھنے میں جادو سے فرق نہیں لگتی'۔ ہماری ٹیکنالوجی کے معجزات زمانہ قدیم کے لوگوں کے لئے اتنے ہی حیران کن ہوتے جتنا کہ موسیٰ کے دریا کو چیرنے کا قصّہ یا عیسیٰ مسیح کے پانی پر چلنے کا قصّہ۔ SETI کی خلائی مخلوق ہمیں ویسے ہی خدا لگتے جیسے کبھی یورپی تبلیغی وفد لگتے ہوں گےجب وہ پتھر کے زمانے کی تہذیبوں کے پاس اپنی بندوقیں، دور بینیں، ماچس، اور گرہن کی پیش گوئی کرنے والی جنتریاں لے کر پہنچے (اور جس عزت افزائی کا انہوں نے بھر پور ناجائز فائدہ اٹھایا)۔

تو پھر کس طور وہ SETI سے دریافت ہونے والی خلائی مخلوق ہمارے لئے کسی خدا سے کم ہو گی؟ کس طرح وہ فوق البشر تو ہوں گے لیکن مافوق الفطرت نہیں؟ ایک بہت ہی اہم طور سے جو اس کتاب کی روح ہے۔ خداؤں اور خدا جیسا دکھنے والی خلائی مخلوق میں ایک نہایت اہم فرق ان کی خصوصیات میں نہیں بلکہ ان کے مقام ساخت کا ہے ۔ ایسے وجود جو ذہانت کی حد تک پیچیدہ ہوں صرف عمل ارتقاء کا نتیجہ ہی ہو سکتے ہیں۔ وہ ہم سے پہلی ملاقات کے وقت جتنے بھی خدا جیسے دکھتے ہوں، ان کی شروعات اس حال میں نہیں ہوئی ہو گی۔ ڈانئیل گالوئے جیسے سائنس فکشن لکھنے والوں نے یہ تجویز کیا ہے (اور مجھے نہیں سمجھ آتی کہ میں ان کو کیسے غلط ثابت کر سکتا ہوں) کہ ہم کمپیوٹر پر بنائی ہوئی کسی عارضی دنیا میں رہتے ہیں، جو ہم سے کسی بہت ہی زیادہ ترقی یافتہ تہذیب نے اپنے کمپیوٹر میں بنائی ہے۔ لیکن اس عارضی دنیا کے بنانے والے بھی کہیں سے آئے ہوں گے۔ ممکنات کے قوانین ان کے کسی کم پیچیدہ اب و جد کے بغیر یکا یک اس پیچیدہ حالت میں وجود میں آ جانے کے خلاف ہیں۔ غالباً وہ بھی اپنے وجود کے لئے ڈارون کے بتائے ہوئے کسی ارتقائی عمل کے مرہون منت ہیں۔ ڈانئیل ڈینیٹ کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے[۱۴]: 'کسی crane کی مانند ارتقاء کا درجہ بہ درجہ مجموعی عمل نہ کہ آسمانی کانٹہ (sky hook) جو ایک دم آخری درجے کو اوپر کھینچ لے. آسمانی کانٹے اور دیگر خدا سب جادوئی منتر ہیں۔ یہ کوئی توضیحی کام انجام نہیں دیتے بلکہ جتنی وضاحت دے سکتے ہیں اس سے زیادہ وضاحت خود ان کو درکار ہوتی ہے۔ قدرتی انتخاب سب سے بڑی crane ہے ۔ اس نے حیات کو ابتداء کی سادگی سے اٹھایا اور خوبصورتی، پیچیدگی اور بظاہر ترتیب کی ان بلندیوں پر پہنچا دیا جن کی چکاچوندھ آج ہمیں خیرہ کرتی ہے۔ یہ بات باب ۴ "کیوں یقیناً خدا نہیں ہے" کا غالب موضوع رہے گی۔ لیکن میرے خدا کو نہ ماننے کی اصل وجہ کی تفصیل میں جانے سے پہلے میں اپنی ذمہّ داری سمجھتا ہوں کہ تاریخ میں خدا پر ایمان کی جتنی بھی دلیلیں پیش کی گئی ہیں ان کو رد کر دوں۔

# باب ۳: وجود خدا کے حق میں دلائل

ہمارے تدریسی اداروں میں مذہبی علوم کی کوئی جگہ نہیں ہونی چاہئے۔ (تھامس جیفرسن)

مذہبی علماء صدیوں سے خدا کے وجود کے حق میں دلائل پیش کر رہے ہیں اور اس کار خیر میں انہیں دیگر ایسے لوگوں کی حمایت حاصل ہے جنہوں نے "عقل سلیم" کی اصطلاح کا غلط مطلب سمجھ لیا ہے۔

## تھامس آکوئیناس کے ثبوت

اگرچہ تھامس آکوئیناس کے رتبے کے پیش نظر میں یہ کہتے ہوئے کچھ جھجھک محسوس کر رہا ہوں، لیکن آکوئیناس نے ۱۳ ویں صدی میں خدا کے وجود کے سلسلے میں جو "ثبوت" لکھے ان سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا، بلکہ ان دلائل کا کھوکھلا پن با آسانی ظاہر ہو جاتا ہے۔ پہلے تین تو ایک ہی بات کو مختلف انداز سے کہنے کے طریقے ہیں، اوران کا جواب ایک ساتھ دیا جا سکتا ہے۔ تمام "ثبوت" الٹی چال کے پیش نظر لکھے گئے ہیں ۔ ہر جواب ایک اور سوال کو جنم دیتا ہے اور یہ لا متناہی سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

۱. **ساکت محرّک** ۔ (*The Unmoved Mover*) ۔ کسی سابقہ محرّک کے بغیر کوئی چیز حرکت میں نہیں آتی۔ اس منطق کے نتیجے میں ہم الٹے قدموں ایک "الٹ چال" پر چل پڑتے ہیں، جس سے فرار پانے کے لئے ہمیں "خدا" کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔اور ہم کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کہیں تو کسی نے سابقہ محرّک کے بغیر پہلی حرکت کی ہو گی۔ محرّک کے بغیر حرکت کر سکنے والی یہ جنس "خدا" ہے۔

۲. **'بے سبب' علّت** ۔ (*The Uncaused Cause*)۔ کوئی چیز خود سے اپنا سبب نہیں ہوتی۔ ہر اثر کا کوئی سابقہ سبب ہوتا ہے۔ اور ہم پھر الٹ چال کی طرف دھکیل دئے جاتے ہیں۔ اس تسلسل کا اختتام پہلے سبب (First Cause) پر ہوتا ہے، اور یہ پہلا سبب خدا ہے۔

۳. **سماوات سے دلیل** ۔ (*The Cosmological Argument*) ۔ ایسا کوئی وقت رہا ہو گا جب کسی مادی شے کا وجود نہیں تھا۔ لیکن اب چونکہ ماڈی کائنات موجود ہے، کوئی غیر ماڈی ہستی پہلے سے موجود ہوئی ہو گی جس نے اس ماڈی کائنات کو بنایا۔ اور اس ہستی کو ہم خدا کہتے ہیں۔

کیا، ایک عالم الغیوب خدا، جوجانتا ہے حال مستقبل کا،

کر سکتا ہے مظاہرہ ایسی قدرت مطلق کا؟

کہ وہ اپنی ہی مستقبل کی مرضی بدل دے؟

آیئے لا متناہی الٹ چال اور اس کے اختتام تک پہنچنے کے لئے خدا کا نام لینے کی عدم ضرورت کی طرف واپس چلتے ہیں۔ اس سے زیادہ کفایت شعاری تو یہ ہو گی کہ ہم Big Bang کے نقطۂ واحد یا کسی اور ان دیکھے طبیعیاتی عمل کو اس تمام کار فرمائی کا ذمّہ دار ٹھہرا دیں۔ اس کو 'خدا' کہنا نہ صرف مدد گار نہیں بلکہ فساد برپا کرنے والی غلط فہمیوں کا موجب بھی ہے۔ ایڈورڈ لیئر کی کتاب "چورا چورا تکّے کباب بنانے کے بے تکے نسخے (Nonsense Recipe for Crumboblious Cutlets)" میں قاری کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ 'گائے کے گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لے اور، انہیں چھوٹا چھوٹا کاٹ کر، مزید آٹھ نو بار چھوٹا چھوٹا کاٹ لے'۔ ایسی کچھ الٹ چالیں تو اپنے طبیعیاتی انجام کو پہنچ جاتی ہیں۔ گئے وقتوں کے سائنسدان سوچا کرتے تھے کہ اگر سونے کو اس کے چھوٹے ترین ٹکڑے میں کاٹ دیا جائے تو اس کے بعد کیا ہو گا۔ ایسا کیوں ممکن نہیں ہو گا کہ اس چھوٹے ترین ٹکڑے کو آدھا کیا جاسکے اور یوں سونے کا مزید ایک چھوٹا دانا بنا لیا جائے۔ اب یہاں تو الٹ چال یقیناً ایٹم پر آ کر رک جاتی ہے۔ سونے کا چھوٹا ترین دانا ایک نیوکلئیس ہے جس میں ۷۹ پروٹان اور اس سے کچھ مزید نیوٹران موجود ہیں، جن کے گرد ۷۹ الیکٹران کا ایک جمگھٹا ہے۔ اگر آپ سونے کو اس حد سے زیادہ کاٹنے کی کوشش کریں گے تو جو بھی آپ کو حاصل ہو گا وہ سونا نہیں ہو گا۔ ایٹم آپ کو 'چورا چورا تکّہ کباب' کی طرز کی الٹ چال پر ایک طبیعیاتی حد فراہم کرتا ہے۔ اس کے برعکس یہ قطعاً واضح نہیں کیا جا سکتا کہ خدا کا ہونا آکوئیناس کی بنائی ہوئی الٹ چال پر اس قسم کی کوئی حد فراہم کرپاتا ہے۔ چلئے آکوئیناس کی فہرست پر آگے بڑھتے ہیں۔

۴. **درجات سے دلیل** ۔ (*The Argument from Degree*) ۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ دنیا کی چیزوں میں فرق ہے۔ مثال کے طور پر، اچھائی یا کمال کے درجات ہیں۔ لیکن ہم ان درجات کی پہچان کسی آخری حد کمال یا حد غایت (perfection) سے موازنہ کی بنیاد پر ہی کر سکتے ہیں۔ انسان چونکہ اچھے بھی ہو سکتے ہیں اور برے بھی، لہٰذا یہ حد انسانوں پر مبنی نہیں ہو سکتی۔ کوئی اور حد غایت ہو گی، جو درجہ کمال کا معیار متعیّن کرتی ہے، اور ہم اس حد کو خدا کہتے ہیں۔

یہ کیسی دلیل ہے؟ یوں تو آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ لوگ بدبو کے مختلف درجات پر ہوتے ہیں لیکن ان کی بدبو کے درجے کا اندازہ بدبو کی حد کمال سے موازنہ کر کے ہی کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا حد کمال بدبو کے کسی دائمی وجود کا ہونا لازم ہے اور اسے ہم خدا کہہ سکتے ہیں۔ اگر آپ کو بدبو کا ذکر ناگوار گزرے تو کسی اور صفت کا استعمال کر لیجئے اور اتنے ہی حماقت خیز نتیجے پر پہنچ جایئے۔

۵. **ترتیب سے دلیل** ۔ (*The Teleological Argument, or Argument from Design*) ۔ دنیا میں تمام چیزیں، خصوصاً عالم حیات، اشارہ کرتی ہیں کہ ان کو مرتّب (design) کیا گیا ہے۔ کوئی بھی چیز مرتّب نہیں دکھ سکتی اگر وہ حقیقتاً مرتّب نہ ہو۔ لہٰذا ان کو کوئی ترتیب دینے والا ہو گا۔ اور وہ خدا ہے[****]۔ آکوئیناس نے تیر کی مثال دی تھی جو اپنے ہدف کی طرف گامزن ہے، لیکن شاید حدّت پسند طیّارہ شکن میزائل کی مثال بہتر رہتی۔

تمام دلیلوں میں سے صرف ترتیب سے دلیل ہی ہے جو آج بھی استعمال ہو رہی ہے۔ اور اس کے استعمال کرنے والوں کو کامل یقین ہوتا ہے کہ یہ ملحد کو ڈھیر کرنے کے لئے کافی اور موزوں ہے۔ اوائل عمری میں جب ڈارون نے یہ دلیل ولیم پیلی کی کتاب "فطری الٰہیات" (William Paley's *Natural Theology*) میں پڑھی تو وہ بھی بہت مرعوب ہوئے۔ پیلی کی بد قسمتی کہئے کہ بڑی عمر کے ڈارون نے اس دلیل کی دھجّیاں بکھیر دیں۔ شاید کسی کے استدلال نے کبھی اس سے پہلے مقبول عوام ایمان کو اس بے دردی سے تباہ نہ کیا ہو جیسا ڈارون نے "ترتیب سے دلیل" کے ساتھ کیا۔ یہ اس قدر غیر متوقع تھا۔ ڈارون کی وجہ سے آج یہ کہنا درست نہیں کہ کوئی بھی چیز مرتّب نہیں دکھ سکتی اگر وہ حقیقتاً مرتّب نہ ہو۔ قدرتی انتخاب کے نتیجے میں ہونے والا ارتقاء اپنی انتہا درجے کی پیچیدگی اور نفاست کی وجہ سے دیکھنے میں ترتیب سے مشابہ لگتا ہے۔ اور ترتیب کے اس عکس میں وہ اعصابی نظام بھی شامل ہے جو دیگر روز مرّہ کے کاموں کے علاوہ حصول مقاصد کی حکمت عملی کا اظہار کرتا بھی نظر آتا ہے جس سے چھوٹے سے چھوٹا کیڑا بھی محض تیر نہیں ایک حدّت پسند میزائل لگتا ہے۔ میں باب ۴ میں اس "ترتیب سے دلیل" پر مزید گفتگو کروں گا۔

## وجودیت کی دلیل اور قیاس پر مبنی دیگر دلائل

خدا کے وجود کے دلائل دو اقسام میں بانٹے جاسکتے ہیں۔ ایک تو وہ جو تجربے یا مشاہدے سے پہلے بنائے جاتے ہیں، یعنی قیاس پر مبنی ہیں۔ اور دوسرے وہ جو تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر بنائے جاتے ہیں۔ انہیں تجرباتی دلائل کہہ سکتے ہیں۔ تھامس آکویناس کے پانچوں دلائل تجرباتی قسم کے ہیں، کیونکہ وہ دنیا کے مشاہدے پر مبنی ہیں۔ قیاس پر مبنی دلائل میں سب سے مشہور سینٹ آنسلم آف کینٹربری نے ۱۰۷۸ میں پیش کیا اور جسے بعد ازاں دیگر فلسفیوں نے اپنے اپنے انداز میں استعمال کیا۔ آنسلم کی دلیل کا ایک عجیب پہلو یہ بھی تھا کہ یہ دلیل انسانوں کی جانب مخاطب نہیں تھی بلکہ خود خدا سے ایک دعا کی صورت میں مخاطب تھی۔ (آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ جو ہستی دعا سن سکتی ہے اسے اپنے ہی وجود پر قائل کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہو گی)۔

آنسلم کا کہنا تھا کہ ایک ایسی ہستی کا قیاس ممکن ہے جس سے بڑی کسی ہستی کا قیاس ممکن نہ ہو۔ ایک ملحد بھی ایسی ہستی کا خیال اپنے ذہن میں لا سکتا ہے، اگرچہ حقیقی دنیا میں وہ اس خیال سے انکار کرے گا۔ لیکن آندلم کے مطابق ایک ہستی جس کا دنیا میں وجود نہیں اس اعتبار سے کامل (perfect) نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ہمارے سامنے ایک اختلاف آ کھڑا ہوا ہے.... پس ثابت ہوا کہ خدا ہے!

میں آپ کے لئے اس بچکانہ دلیل کا بچّوں کی ہی زبان مں ترجمہ کر دیتا ہوں:

'میں شرط لگاتا ہوں میں خدا کو ثابت کر سکتا ہوں'۔

'لگی شرط'۔

---

[****] یہاں مجھے وہ دائمی قیاس مطلق (immortal syllogism) یاد آ رہا ہے جو سکول کے زمانے میں میرے ایک ہم جماعت نے جومیٹری کے سبق کے دوران ایک "اقلیدسی ثبوت" میں زبردستی شامل کر دیا تھا: مثلث ABC مساوی الساقین 'نظر' آتا ہے، لہٰذا ...

' چلو پھر! سب سے کامل در کامل چیز کا تصوّر کرو'۔

'اچھا پھر'؟

'کیا یہ کامل در کامل چیز اصل ہے ؟ کیا اس کا وجود ہے'؟

'نہیں۔ یہ تو صرف میرے ذہن میں ہے'۔

'لیکن اگر وجود ہوتا تو یہ چیز کمال کی انتہا پر ہوتی۔ کیونکہ حقیقی معنوں میں کامل چیز تو کسی ایسی چیز سے زیادہ اچھی ہوتی ہے نا جس کا تم صرف تصوّر کر سکتے ہو۔ دیکھا میں نے ثابت کر دیا نا کہ خدا ہے۔ ملحد تو سارے ہوتے ہی احمق ہیں'!

میں نے 'احمق' کا لفظ سوچ سمجھ کر استعمال کیا تھا۔ آنسلم نے انجیل کے بھجن نمبر(۱۴ Psalm) ۱۴ سے اقتباس درج کیا تھا جس میں لکھا ہے 'احمق نے اپنے دل میں کہا ہے کوئی خدا نہیں ہے'، اور شرارتاً اپنے فرضی ملحد کو احمق کہا:

> لہٰذا احمق بھی قائل ہے کہ کم از کم قیاس کی حد تک تو کچھ ایسا موجود ہے جس سے بہتر کسی چیز کا تصوّر نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ جب وہ یہ جملہ سنتا ہے تو اسے جملہ سمجھ آتا ہے۔ اور جو سمجھ آسکتا ہے قیاس کی حد تک اس کا وجود بھی ہے۔ اور یقیناً وہ جس سے بہتر کسی چیز کا قیاس نہیں کیا جاسکتا صرف قیاس میں موجود نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اگر ہم یہ مان سکتے ہیں کہ ایسی چیز کا قیاس میں تصوّر کیا جا سکتا ہے تو اس چیز کا حقیقت میں ہونے کا تصوّر بھی کیا جا سکتا ہے، کیونکہ حقیقت قیاس سے بڑی ہے۔

مجھے اس خیال سے بھی گھن آتی ہے کہ ایسی لفظی پہیلیوں کا سہارا لے کر ایسے اہم نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں، اس لئے میں احمق جیسے الفاظ کے بیجا استعمال سے گریز کرتا ہوں۔ برٹرنڈ رسل (جو یقیناً احمق نہیں تھا) نے کہا تھا کہ 'اس بات پر قائل ہو جانا آسان ہے کہ وجودیت کی دلیل ناکارہ ہے، لیکن یہ دریافت کرنا مشکل ہے کہ آخر یہ دلیل ناکارہ کیوں ہے'۔ جوانی میں رسل بھی کچھ عرصے کے لئے اس دلیل کے قائل ہو گئے تھے:

> مجھے وہ لمحہ اچھی طرح یاد ہے جب ۱۸۹۴ میں ایک دن ٹرینیٹی لین میں چلتے ہوئے مجھے یکایک سمجھ آگیا (یا میرا خیال ہے کہ سمجھ آ گیا) کہ وجودیت کی دلیل بالکل درست ہے۔ میں تمباکو کا ڈبّہ لینے نکلا تھا؛ واپسی پر میں نے ایک دم اسے ہوا میں اچھالا اور پکڑتے ہوئے نعرہ لگایا: "ارے واہ! وجودیت کی دلیل تو بالکل ٹھوس ہے"۔

میں سوچتا ہوں کہ رسل نے یہ کیوں نہیں کہا کہ "وجودیت کی دلیل" قدرے منطقی ہے۔ کائنات کے بارے میں اتنے اہم سچ محض لفظوں کے کھیل سے عیاں ہو جانا ضرورت سے کچھ زیادہ ہی آسان دکھتا ہے۔ میرے خیال میں مجھے زینو کے اختلافات کو سلجھانے پر توجہ دینی چاہئے"۔ زینو کے ثبوت سمجھنے میں اس کے ہم عصر یونانیوں کو کافی دشواری پیش آتی تھی، جیسے کہ آکیلیس (Achilles) کبھی بھی کچھوے کو کیوں نہ پکڑ سکے گا ۔ لیکن ان میں اتنی سمجھ تھی کہ انہوں نے پھر بھی یہ نتیجہ نہیں نکالا کہ آکیلیس کبھی کچھوے کو پکڑ ہی نہیں سکتا۔ انہوں نے اس کو ایک "اختلاف" کا نام دے دیا اور آنے والے ماہرین ریاضی پر یہ ذمہ داری ڈال دی کہ اس کا حل بتائیں۔ رسل خود بھی اس قابل تھے کہ سوچ سکیں کہ آکیلیس کے کچھوا پکڑنے میں ناکامی کے جشن میں تمباکو کا ڈبہ کیوں نہیں اچھالا جانا چاہئے۔ لیکن اسی احتیاط کا مظاہرہ انہوں نے آنسلم سلسلے میں کیوں نہیں کیا؟ مجھے شک ہے کہ ایک انصاف پسند ملحد ہونے کی وجہ سے وہ آنسلم کی دلیل سے بھی قائل ہونے کو تیّار ہو گئے ہوں گے اگر دلیل کی منطق کا یہی تقاضہ ہو ۔ یا شاید جواب رسل کی اپنی ہی ۱۹۴۶ کی تصنیف میں موجود

---

زینو کی اختلافات اتنے مشہور ہیں کہ محض ایک حاشیے میں ان کے بارے میں سیر حاصل بات نہیں ہو سکتی۔ آکیلیس کچھوے سے ۱۰ گنا تیز بھاگ سکتا ہے، اس لئے اس نے کچھوے کو ۱۰۰ گز تک پہلے بھاگنے کی اجازت دے دی۔ جب آکیلیس ۱۰۰ گز بھاگ چکا تو کچھوا اس سے ۱۰ گز آگے تھا۔ اب آکیلیس ۱۰ گز بھاگا تو کچھوا ا گز آگے تھا۔ پھر آکیلیس ا گز بھاگا اور کچھوا ۱۰/ا گز آگے تھا... اور یونہی لامتناہی حد تک، حتیٰ کہ آکیلیس کبھی بھی کچھوے کو نہیں پکڑ پایا۔

فلسفی اینٹونی فلیو کے اپنے آخری دنوں میں الحاد سے انحراف میں بھی شاید ہم کچھ اسی نوعیت کے تاثرات دیکھ سکتے ہیں۔ فلیو کے اعلان نے انٹرنیٹ پر دھوم مچادی کہ وہ کسی قسم کے خدا پر ایمان لے آیا ہے۔ اس کے مقابلے میں رسل ایک بہت بڑا فلسفی تھا جسے ریاضی کے لئے نوبل انعام سے بھی نوازا گیا تھا۔ فلیو کو شاید ٹمپلٹن انعام (Templeton Prize) سے نوازا جائے (جو حیات کی روحانی سطحات کے سلسلے میں دی جانے والی خدمات کے لئے دیا جاتا ہے)۔ اس عظیم مرتبے کی جانب فلیو نے پہلا قدم تو اسی وقت اٹھالیا جب اس نے ۲۰۰۶ میں 'Phillip E. Johnson Award for Liberty and Truth' قبول کر لیا۔ یہ انعام سب سے پہلے فلپ جانسن نے خود اپنے آپ کو ہی دیا۔ جانسن ایک وکیل ہے جس کا طرّہ، امتیاز یہ ہے کہ وہ 'نظریہ عاقل ترتیب Intelligent Design' کی 'میخ دار حکمت عملی wedge strategy' کے

ہے جو انہوں نے وجودیت کے نظریے کو ریزہ ریزہ کرنے کے کئی سال بعد لکھی:

> اصل سوال یہ ہے: کیا ہم کسی ایسی چیز کے بارے میں سوچ سکتے ہیں جس کے بارے میں محض سوچنے کے عمل سے ہی وہ وجود میں آجائے؟ ہر فلسفی اس سوال کا جواب اثبات میں ہی دینا چاہے گا، کیونکہ فلسفیوں کا تو کام ہی چیزوں کو مشاہدے کے بغیر صرف 'سوچ' کر دریافت کرنا ہے۔ اگر جواب 'ہاں' ہے تو خالص قیاس سے مادی حقیقت تک ایک پل ڈالا جا سکتا ہے۔ ورنہ نہیں۔

اس کے برعکس ایسی منطق کے بارے میں جہاں حقیقی دنیا سے ذرّہ بھر مواد میسّر نہ ہونے کے باوجود اتنے ہمہ گیر نتیجے اخذ کر لئے جاتے ہوں، میرا اپنا رد عمل ایک گہرے شبہے کی صورت میں نمودار ہوتا۔ شاید میرے اس روّیے سے صرف اتنا ہی اشارہ ملتا ہے کہ میں فلسفی نہیں، سائنسدان ہوں۔ کئی صدیوں سے فلسفی "وجودیت کی دلیل" کو سنجیدگی سے لیتے رہے ہیں، حق میں بھی اور اختلاف میں بھی۔ ملحد فلسفی جے ایل میکی نے اپنی کتاب "الحاد کا معجزہ ۔ the Miracle of Atheism by J. L. Mackie " میں اس موضوع پر بڑی مدلل بحث کی ہے۔ اور میں یہ بات تعریفاً کہہ رہا ہوں کہ فلسفی ایک ایسا شخص ہوتا ہے جو کسی سوال کے جواب میں محض عقل سلیم (common sense) پر اکتفا نہیں کرتا۔

"وجودیت کی دلیل" کی سب سے حتمی تردید ڈیوڈ ہیوم (۷۶–۱۷۱۱) اور ایمانویل کانٹ (۱۸۰۴–۱۷۲۴) نے کی۔ کانٹ نے آنسلم کی فریبی چال کو پکڑ لیا کہ 'وجود عدم وجود سے زیادہ کامل ہے'۔ امریکی فلسفی نارمن میلکم نے اسی بات کو یوں بیان کیا: 'یہ نظریہ کہ "وجود" کامل ہے ایک بے حد عجیب و غریب نظریہ ہے۔ اس بات کی تو سمجھ آ سکتی ہے کہ اگر میرے مستقبل کے مکان میں سرد موسم سے بچاؤ کے لئے موصلیت (insulation) ہو گی تو وہ اس مکان سے بہتر ہو گا جس میں موصلیت نہ ہو۔ لیکن اس جملے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے کہ میرا مکان ایک بہتر مکان ہو گا اگر اس کا وجود ہو، برعکس اس کے کہ اس کا وجود نہ ہو'؟[۴۲] آسٹریلیائی فلسفی ڈگلس گاسکن نے آنسلم کو ثبوت کے ایک ستم ظریف مضحکہ خیز نقل بنائی جو اب موجود تو نہیں لیکن جس کو کوینزلینڈ یونیورسٹی کے ولیم گرے نے از سر نو یوں بیان کیا:

۱. دنیا کی تخلیق وہ سب سے انوکھی کامیابی ہے جس کا آپ تصوّر کر سکتے ہیں۔
۲. کسی کامیابی کی خوبی (ا) اس کی اپنی خصوصیت اور (ب) خالق کی قابلیت کے امتزاج کا نتیجہ ہوتی ہے۔
۳. خالق کی قابلیت میں معزوری جتنی زیادہ ہو، کامیابی اتنی ہی حیران کن ہوتی ہے۔
۴. خالق کی سب سے خوفناک معزوری اس کے وجود کا نہ ہونا ہے۔
۵. لہٰذا اگر ہم یہ مان لیں کہ کائنات کو کسی ایسے خالق نے بنایا ہے جس کا وجود ہے، تو ہم اس سے بھی بڑی ایک ہستی کا تصوّر کر سکتے ہیں جس نے وجود میں ہوئے بغیر ہی کائنات کو تخلیق کر دیا۔
۶. لہٰذا، ایک خدا جس کا وجود ہے ایسی کسی بڑی ہستی سے بڑا نہیں ہو سکتا جس کے وجود کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا ہے، کیونکہ اس سے بڑا ہیبت ناک اور ناقابل، یقیناً خدا وہی ہو سکتا ہے جس کا وجود نہ ہو۔
۷. لہٰذا خدا نہیں ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ در حقیقت گاسکن نے یہ ثابت نہیں کیا کہ خدا کا وجود نہیں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ گاسکن دانستہ طور پر مزاحیہ ہو رہا تھا۔ اس کو سمجھ آ گیا تھا کہ وجود خدا جیسا اہم سوال محض الفاظ کی صفائی کے مظاہروں سے نہیں سلجھایا جا سکتا۔ اور 'وجود' کو 'کمال' کے مظہر کے طور پر

---

بانی ہیں۔ فلیو اس انعام کا دوسرا حقدار بنے گا۔ انعام دینے والی یونیورسٹی کا نام ہے BIOLA, the Bible Institute of Los Angeles۔ انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا فلیو کو اندازہ بھی ہے کہ اس کا استعمال کیا جا رہا ہے؟ ملاحظہ کیجئے

Victor Stenger, 'Flew's flawed science', *Free Inquiry* ۲۵: ۲, ۲۰۰۵, ۱۷–۱۸;

www.secularhumanism.org/index.php?section=library&page=stenger_۲۵_۲.

استعمال کرنا اس دلیل کی کئی خامیو ں میں سے ایک معمولی سی خامی لگتی ہے۔ میں واقعہ کی تفصیل تو بھول چکا ہوں، لیکن ایک بارمیں نے وجودیت کی دلیل کو استعمال کر کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ خنزیر اڑ سکتے ہیں، اور ایسا کرنے میں علماء دین اورر فلسفیوں کے کسی مجمعے کو خوب ناراض کر دیا تھا۔ جس کے بعد مجھے غلط ثابت کرنے کے لئے انہیں "ممکنات اور ضروریات کی منطق" Modal Logic کا سہارا لینا پڑ گیا۔

قیاس پر مبنی دیگر دلائل کی طرح وجودیت کی دلیل مجھے آلڈس ہکسلے کے مقالے "بحث در بحث ۔ Point Counter-point " کے بوڑھے کی یاد دلاتی ہے جس نے ریاضی پر مبنی خدا کے وجود کا ثبوت تلاش کر لیا:

> آپ اس فارمولے کو جانتے ہیں جس میں 'م' کو صفر پہ تقسیم کیا جائے تو جواب 'لا محدود' نکلتا ہے، جس میں 'م' کوئی بھی مثبت نمبر ہو سکتا ہے؟ تو پھر اس تسویہ کے دونوں اطراف کو صفر سے ضرب دے کر کے اس کو مزید آسان شکل میں کیوں نہ ڈھال لیا جائے؟ یوں ہمارے پاس اس کی نئی شکل آ جاتی ہے کہ 'م' برابر ہے 'لامحدود' ضرب 'صفر'۔ یا یوں کہئے کہ ایک مثبت نمبر 'لامحدود' ضرب 'صفر' کے برابر ہے۔ کیا یہ ایک لا محدود طاقت کی جانب سے کائنات کی صفر میں سے تخلیق کا مظاہرہ نہیں کرتا؟ کرتا ہے نا؟

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انلائیٹمنٹ (Enlightenment) کے انسائیکلوپیڈیا نگار ڈڈیرو اور سویزرلینڈ کے ریاضی دان یولر کی مشہور بحث کی کہانی شبہات کا شکار ہے۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ ملکہ کیتھرین نے جس میں مذہبی یولر نے ملحد ڈڈیرو کے سامنے یہ سوال رکھا: " حضوراً! $(a + b^n)/n = x$، لہٰذا خدا ہے! اب دیجئے جواب "! قصہ سنانے کامقصد یہ ہے کہ ڈڈیرو ریاضی دان نہیں تھا، اس لئے اسے تذبذب کے عالم میں بحث سے دستبردار ہونا پڑا۔ لیکن، جریدے (۱۹۴۲) *American Mathematical Monthly* میں بقول بی ایچ براؤن کے چھپنے والے بیان کے مطابق ڈڈیرو ایک قابل ماہر ریاضی تھا اور اس کے اس "سائنس (یہاں ریاضی) کی چکاچوند" کی دلیل کی بنیاد پر بحث ہار جانے کے امکانات نا پید ہیں۔ جریدہ "ملحد کائنات ۔ Atheist Universe " میں ڈیوڈ ملز نے اپنے ایک ریڈیو انٹرویو کا متن چھاپا ہے جو ایک مذہبی نمائندے نے لیا تھا۔ اس نے طبیعیات کے قانون تحفظ مادے اور توانائی ( Law of Conservation of Mass-Energy) کو بروئے کار لاتے ہوئے "سائنس کی چکا چوندھ" کا ایک نہایت ناکارہ نمونہ پیش کیا: 'چونکہ ہم سب ماڈے اور توانائی سے بنے ہیں، کیا یہ اصول ایک لافانی حیات میں ایمان کو تقویت نہیں بخشتا؟ ملز نے میرے مقابلے میں کسی قدر صبر و تحمّل اور تمیز کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا: 'ہماری موت کے بعد ہمارے جسم کے ایٹم اور اس کی توانائی کہیں کھو نہیں جاتے۔ لہٰذا ہم لافانی ہیں'۔

زندگی میں کئی تجربات ہونے کے باوجود میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس سے زیادہ احمقانہ خواہشمندی پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ لیکن میں نے ایسے کئی زبردست 'ثبوت' ایک نہایت مزاحیہ فہرست میں جمع کئے ہیں، (http://www.godlessgeeks.com/LINKS/GodProof.htm) جس کا نام ہے "خدا کے وجود کے تین سو سے زائد ثبوت ۔ Over Three Hundred Proofs of God's Existence"۔ ثبوت نمبر ۳۶ سے شروع کرتے ہوئے، ان میں سے آدھا درجن بہت ہی مضحکہ خیز نمونے پیش ہیں:

۳۶. **نامکمل تباہی سے دلیل:** ہوائی جہاز کے گرنے سے ۱۴۳ مسافر اور عملہ جاں بحق ہو گئے۔ لیکن ایک تین سالہ بچہ زندہ بچ گیا جس کے صرف تین چوتھائی جسم پر جلنے کے زخم تھے۔ لہٰذا خدا ہے۔

۳۷. **ممکنہ دنیاؤں سے دلیل:** اگر چیزیں مختلف طریقے سے بنائی گئی ہوتیں تو دنیا مختلف ہوتی۔ جو ہمارے لئے بہت بری ہوتی۔ لہٰذا خدا ہے۔

۳۸. **بھرپور جذبے سے دلیل:** میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں! میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں! میں خدا رکھتا ہوں! میں رکھتا ہوں! میں رکھتا ہوں! میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں! لہٰذا خدا ہے!

۳۹. **ایمان کی کمی سے دلیل:** دنیا میں زیادہ تر لوگ عیسائیت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور شیطان ایسا ہی چاہتا تھا۔ لہٰذا خدا ہے۔

۴۰. **بعد از موت تجربات سے دلیل:** محترم "الف" الحاد کی حالت میں فوت ہوئے۔ اب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے۔ لہٰذا خدا ہے۔

۴۱. **جذباتی بلیک میلنگ سے دلیل:** خدا تو تم سے پیار کرتا ہے۔ تم اتنے کٹھور کیسے ہو سکتے ہو کہ اس پر ایمان نہ لا سکو؟ لہٰذا خدا ہے۔

## خوبصورتی سے دلیل

ٹمپلے کے ناول کے ایک اور کردار نے خدا کے وجود کو گراموفون پر بیٹھوون (Beethoven) کی دھن string quartet no. ۱۵ in A minor (*'heiliger Dankgesang'*) بجا کر ثابت کیا۔ سننے میں یہ بہت ناقابل یقین لگتا ہے، لیکن یہ ایک بڑی مقبول عام دلیل ہے۔ مجھے اس بات پر اتنی بار للکارا جا چکا ہے کہ میں نے حساب ہی رکھنا چھوڑدیا ہے: 'تو پھر آپ شیکسپئیر کے شہ پاروں کا کیا جواز پیش کریں گے'؟ (یہاں حسب منشا آپ موسیقار شوبرٹ یا مصّور مائیکل اینجلو کا نام بھی لکھ سکتے ہیں)۔ اس دلیل سے آپ بھی اتنے واقف ہوں گے کہ مجھے تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس دلیل کے پس پردہ منطق کبھی بیان نہیں کی جاتی۔ اور آپ اس کے بارے میں جتنا سوچتے ہیں یہ آپ کو اتنی ہی کھوکھلی نظر آنے لگتی ہے۔ بیٹھوون کی آخری کچھ دھنیں شاندار ہیں۔ اور شیکسپئیر کی چودہ مصروں والی غزلیں (sonnets) بھی۔ وہ جب بھی شاندار ہیں اگر خدا ہے اور جب بھی اگر خدا نہیں ہے۔ یہ خدا کے وجود کو ثابت نہیں کرتیں؛ یہ صرف بیٹھوون اور شیکسپئیر کے وجود کو ثابت کرتی ہیں۔ ایک بہت بڑے موسیقار کا قول ہے: 'اگر آپ کے پاس سننے کے لئے موزارٹ ہے، تو پھر خدا کی کیا ضرورت ہے'؟

مجھے ایک بار ریڈیو پروگرام Desert Island Disks پر مہمان کے طور پر دعوت دی گئی۔ پروگرام میں مجھے یہ بتانا تھا کہ اگر آپ کسی جزیرے پر پھنس جائیں تو آپ اپنے ساتھ موسیقی کے کونسے آٹھ ریکارڈ لیجانا پسند کریں گے۔ میری فہرست میں باخ کی *Mache dich mein Herze rein* ۔ انٹرویو لینے والا یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ملحد ہوتے ہوئے میں نے ایک مذہبی دھن کا انتخاب کیوں کیا۔ یہ تو وہی بات ہو گئی کہ یہ جانتے ہوئے کہ کیتھی اور ھیتھکلف کا کوئی وجود نہیں آپ "ووتھرنگ ہائیٹس" نامی شہرہ آفاق ناول سے کیسے لطف اندوز ہو سکتے ہیں؟

لیکن میں ایک اضافی نقطہ بھی پیش کر سکتا تھا، اور جو ہر اس موقع پر پیش کیا جانا چاہئے جہاں فنون لطیفہ کے کسی شاہکار کا سہرا مذہب کے سر باندھ دیا جائے۔ آخر بڑے بڑے فنکاروں کو بھی روزی کمانی ہوتی ہے، لہٰذا انہیں جو بھی کام مل جائے وہ پکڑ لیتے ہیں۔ مجھے کوئی شک نہیں کہ رافائیل اور مائیکل اینجلو عیسائی ہی تھے ۔ ان کے دور میں دوسرا کوئی متبادل تھا ہی نہیں ۔ لیکن یہ بات بالکل ضمنی ہے۔ بے پناہ دولت نے چرچ کو فنون لطیفہ کا سب سے اہم سرپرست بنا دیا تھا۔ اگر تاریخ کچھ مختلف رہی ہوتی اور مائیکل اینجلو کو سسٹین چیپل کی چھت کی بجائے سائنس کے ایک بہت بڑے عجائب گھر کی چھت پر تصویر کشی کا کام سونپا گیا ہوتا، تو کیا اس کا وہ فن پارہ اتنا ہی متاثر کن نہ ہوتا؟ افسوس کہ ہم بیٹھوون کی "میسوزوک راگنی ۔ Mesozoic Symphony" یا موزارٹ کی "پھیلتی کائنات ۔ The Expanding Universe" کبھی نہیں سن سکیں گے۔ اور کتنی شرم کی بات ہے کہ ہم ہیڈن کے "ارتقاء کا راگ ۔ The Evolution Oratorio" سے محروم رہیں گے ۔ لیکن یہ کمی ہمیں ہیڈن کی ہی Creation سے محظوظ ہونے سے تو نہیں روکتی۔ اس بحث کو اگر دوسرے رخ سے لیا جائے تو (جیسا کہ میری بیگم مجھے ڈراتی ہیں) کیا ہوتا اگر چرچ شیکسپئیر کو اپنے لئے کام کرنے کا ٹھیکہ دے دیتا۔ یقیناً ہم ہیملٹ، کنگ لئیر اور میکبیتھ سے محروم رہ جاتے۔ اور بدلے میں کیا ملتا؟ خوابوں کا سامان؟ پھر دیکھتے رہئے خواب ۔

اگر کوئی منطقی دلیل اعلیٰ فن پاروں کے وجود کو خدا کے وجود سے منسلک کرتی بھی ہے تو اس کے حامیوں نے کبھی اس کی وضاحت نہیں کی۔ سب تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہ خود بخود واضح ہے، جبکہ درحقیقت قطعاً ایسا نہیں ہے۔ شاید اسے ترتیب سے دلیل کی ایک اور مثال کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے: شوبرٹ کا موسیقار دماغ ناممکنات کا ایک کرشمہ ہے، شاید ریڑھ دار جانوروں کی آنکھ سے بھی زیادہ یا شاید اس روئیّے کی وجہ یہ قابلیت سے حسد ہے؛ ہمّت کیسے ہوئی کسی اور انسان کی اتنی اعلیٰ موسیقی، شاعری، یا تصویر تخلیق کرنے کی، جبکہ میں نہیں کر سکتا؟ ضرور کسی خدا نے ہی کیا ہو گا۔

## ذاتی تجربے سے دلیل

میرے کالج کے ہم عصروں میں سے ایک شخص نہایت ہوشیار اور سمجھدار تھا اور مذہبی رجحانات رکھتا تھا۔ ایک بار وہ سکاٹلینڈ کے جزیروں میں کیمپنگ کرنے چلا گیا۔ رات کے اندھیرے میں اس کی اور اس کی خاتون دوست کی آنکھ ایک آواز کی وجہ سے کھل گئی ۔ شیطان کی آواز! شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی؛ یقیناً شیطانی آواز ہی تھی۔ میرا دوست وہ واقعہ کبھی نہ بھول سکا، اور اس نے رہبانیت اختیار کر لی۔ میں جوان تھا، اور اس کہانی سے بہت مرعوب ہوا۔ میں نے یہ کہانی روز اینڈ کراؤن ان، آکسفورڈ میں ماہرین حیوانیات کی ایک محفل میں سنائی۔ ان میں سے دو تجربہ کار ماہر پرند تھے، اور وہ دونوں خوب ہنسے اور یک آواز چلّائے: مینکس شئیرواٹر! پھر ان میں سے ایک نے میری معلومات میں یہ بتا کر اضافہ کیا کہ او نام کے پرندے کی شیطانی چیخوں کی وجہ سے یہ دنیا کے مختلف کونوں میں شیطانی پرندے کے نام سے جانا جاتا ہے۔

بہت سے لوگ خدا میں اس لئے یقین رکھتے ہیں کیونکہ ان کو لگتا ہے کہ انہوں نے خدا ، یا ایک فرشتے کو، یا نیلے لباس میں کسی کنواری کو، اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یا وہ ان کے دماغوں میں ان سے مخاطب ہوتا ہے۔ ذاتی تجربے سے یہ دلیل صرف ان لوگوں کو ہی قائل کرتی ہے جو ایسے ذاتی تجربے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن کسی اور کے لئے، اور خاص کر کسی ایسے شخص کے لئے جوانسانی نفسیات کے علم سے واقفیت رکھتا ہو، بالکل بیکار ثابت ہوتی ہیں۔

آپ کہتے ہیں آپ کو ذاتی طور پر خدا کا تجربہ ہوا ہے؟ ایسا ہے تو پھر ایسے بھی لوگ ہیں جن کو ذاتی طور پر ایک گلابی رنگ کے ہاتھی کا تجربہ ہوا ہے، لیکن وہ شاید آپ کو مرعوب نہ کر سکے۔ یارک شائیر میں عورتوں کا قاتل پیٹر سٹکلف دعویٰ کرتا تھا کہ اسے عیسیٰ مسیح کی آوازسنائی دیتی ہے جو اسے عورتوں کو قتل کرنے کی تاکید کرتی ہے۔ سٹکلف کو عمر قید کی سزا ہوئی۔ امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کا بیان تھا کہ خدا نے ان کو عراق پر کشور کشائی کا حکم دیا تھا۔ (افسوس اس خدا نے صدر بش کو ایسا کوئی اشارہ نہ دیا کہ عراق میں بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار ہیں ہی نہیں)۔ ذہنی امراض کے اداروں میں مقید مریض یہ سمجھتے ہیں کہ وہ نپولین یا چارلی چیپلین ہیں، یا سارا زمانہ ان کے خلاف سازش میں ملوث ہے، یا وہ اپنے خیالات براہ راست دوسرے لوگوں کے ذہنوں میں نشر کر سکتے ہیں۔ ہم ان کی بات سن تو لیتے ہیں لیکن ان کے ان اندرونی طور پر ظاہر ہوتے ہوئے عقائدکو سنجیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے، کیونکہ زیادہ تر لوگ ایسے عقائد کو نہیں مانتے۔ مذہبی تجربات ان لوگوں کے تجربات سے صرف اس حد تک ہی مختلف ہوتے ہیں کہ ان کے ماننے والے لاتعداد ہوتے ہیں۔ میرا دوست سام ہیرس کچھ بہت ہی سکی نہیں ہو رہاتھا جب اس نے اپنی کتاب "عقائد کا اختتام ۔ End of Faith" لکھا :

> ہمارے پاس ایسے لوگوں کے لئے نام ہوتے ہیں جو ایسے عقائد رکھتے ہوں جن کا کوئی منطقی جواز نہیں ہوتا۔ جب ان کے عقائد بہت ہی مقبول عام ہوں تو انہیں مذہبی کہا جاتا ہے؛ ورنہ "پاگل"، نفسیاتی حالت" یا "فریب" کہتے ہیں.... واقعی اعداد میں ہی ہوشمندی ہے۔ اس کے باوجود یہ محض تاریخ کا ایک حادثہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں اس کو تو معمول کی بات سمجھا جاتا ہے کہ کائنات کا خالق آپ کے نجی خیالات بھی سن سکتا ہے جبکہ یہ کہنا کہ وہ آپ کی کھڑکی پر بارش کی بوندوں کی ٹپ ٹپ کے ذریعہ آپ سے کلام کرتا ہے آپ کے ذہنی مریض ہونے کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا اگرچہ مذہبی لوگ تو پاگل نہیں ہوتے، ان کے عقائد یقیناً پاگل ہوتے ہیں۔

باب ۱۰ میں میں واہمہ اور ہذیان کے موضوع کی طرف پھر لوٹوں گا۔

انسان کا دماغ بڑی اعلیٰ پائے کی سمولیشن سافٹویئر (simulation software) چلاتا ہے۔ ہماری آنکھیں ہمارے دماغ کو اصلیت کی سچی تصاویر نہیں بھیجتیں۔ نہ ہی دیانتداری سے واقعات کی فلم بناتی ہیں۔ ہمارا دماغ ایک نقشہ تعمیر کرتا ہے جو لمحہ بہ لمحہ تسلسل کے ساتھ تازہ اور جدید ہوتا رہتا ہے۔ ایسا نقشہ جس کی تعمیر ہماری نظر کی رگ پر تیرتی ہوئی بجلی کی لہروں میں چھپے کوڈ (code) کے ذریعے ہوتی ہے، لیکن یہ ٹکڑا بہ ٹکڑا تعمیر ہی نظر کے دھوکے آپ کو بڑے اچھے طریقے سے اس امر کی یاد کراتے ہیں[۴۳]۔ فریب نظر کا ایک اہم طبقہ، جس کی ایک مثال Necker Cube ہے، اس لئے پیدا ہوتے ہیں کیونکہ دماغ کو حواس کی جوعام معلومات فراہم کی جاتی ہیں وہ حقیقت کے دو متوازن نمونوں کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ دماغ کے پاس دونوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کی کوئی وجہ نہیں ہوتی، اس لئے وہ باری باری دونوں کا استعمال کرتا ہے جس کے نتیجے میں ہم ایک اندرونی نمونے سے دوسرے نمونے کے بیچ پلٹتے رہتے ہیں۔ ہم جو منظر دیکھ رہے ہوتے ہیں وہ صریحاً پلٹ کر کچھ اور ہی بن جاتا ہے۔

ہمارے دماغ کی سمولیشن سافٹویئر چہرے اور آوازیں بنانے میں بہت ماہر ہے۔ میری کھڑکی میں آئنسٹائن کے چہرے کی ایک شبیہ پڑی رہتی ہے۔ سامنے سے دیکھو تو بالکل ٹھوس سر لگتی ہے۔ لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ جب اس کو پیچھے یعنی کھوکھلی طرف سے دیکھو تو وہاں سے بھی ٹھوس ہی لگتی ہے اور ہمیں بڑا عجیب سا احساس ہوتا ہے۔ دیکھنے والا جیسے اس کے گرد گھومتا ہے اسے لگتا ہے کہ شبیہ اس کا تعقب کر رہی ہے۔ اور اس ہلکے پھلکے انداز سے نہیں جیسے مونا لیزا کی آنکھوں کے بارے میں مشہور ہے۔ یہ کھوکھلی شبیہ واقعی ایسی لگتی ہے جیسے ہمارا تعقب کر رہی ہے۔ جن لوگوں نے یہ فریب نظر پہلے نہیں دیکھا ہوتا ان کے لئے یہ بہت متاثر کن ہوتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ عجیب یہ ہے کہ اگر اس شبیہ کو گھومنے والی ٹیبل پر رکھ دیا جائے تو سامنے سے دیکھنے والوں کو لگتا ہے کہ شبیہ صحیح سمت مڑ رہی ہے، جبکہ کھوکھلی طرف سے دیکھنے والوں کو محسوس ہو تا ہے کہ یہ غلط طرف مڑ رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جب آپ ایک طرف سے دوسری طرف کی تبدیلی کو دیکھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نمودار ہونے والا حصہ غائب ہوتے ہوئے حصے کو "نگل" رہا ہے۔ اور کبھی آپ کھوکھلی طرف کے بالکل قریب آ جانے کے باوجود اس کے کھوکھلے پن کو نہیں دیکھ پاتے۔ جب آپ کھوکھلے پن کو دیکھتے ہیں تو منظر پھر پلٹتا ہے، جو واپس بھی لوٹ سکتا ہے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ شبیہ کی ساخت میں تو کوئی چال ہے نہیں۔ کوئی بھی کھوکھلی شبیہ چلے گی۔ چال تو ساری دیکھنے والے کے دماغ میں ہے۔ دماغ کی اندرونی سمولیشن سافٹویئر کو معلومات فراہم ہوتی ہیں کہ نظر کے سامنے ایک چہرہ ہے، یا شاید صرف دو آنکھیں، ایک ناک اور ایک منہ جو تقریباً صحیح جگہ پر ہیں۔ ان قلیل معلومات کے ملنے کے بعد باقی ساری کارستانی دماغ خود دکھاتا ہے۔ چہرے کی سمولیشن سافٹویئر اپنا کام شروع کرتی ہے اور باوجود اس بات کے کہ آنکھوں کے سامنے ایک شبیہ ہے، وہ چہرے کا ایک مکمل ٹھوس خاکہ بناتی ہے۔ نظر کو شبیہ کے غلط طرف مڑنے کا دھوکہ اس لئے ہوتا ہے کیونکہ کھوکھلی شبیہ جسے دماغ ٹھوس شبیہ سمجھ رہا ہے کے بارے میں نظر کی معلومات کو سمجھنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ گردش کو غلط سمت میں جاتا ہوا سمجھ لیا جائے[۴۴]۔ ہوائی اڈوں پر ریڈار کی گھومتی ہوئی ڈش کو دیکھتے ہوئے بھی نظر ایسا ہی دھوکا کھاتی ہے۔ جب تک دماغ کا اندرونی نمونہ پلٹتا نہیں ہے، ہمیں ایک ناقص نمونہ غلط سمت میں گھومتا ہوا نظر آتا ہے۔

میں نے اتنی طویل بات دماغ کی سمولیشن سافٹویئر کی طاقت کی وضاحت کرنے کے لئے کی ہے۔ اس میں 'درشن' کروانے اور 'ملاقات' کروانے کی بے پناہ قوت ہوتی ہے۔ بھوت، فرشتے یا کنواری مریم کی سمولیشن بنانا اس سافٹویئر کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اور صوتی اثرات کے بارے میں بھی یہی کہا جاسکتا ہے۔ جب ہم کوئی آواز سنتے ہیں تو وہ پوری وفاداری سے صوتی رگ پر سفر کرتی ہوئی دماغ تک نہیں پہنچتی، جیسے کوئی مہنگا میوزک سسٹم ہو۔ دماغ بصریات کی طرح آواز کے لئے بھی مسلسل آنے والی نئی صوتی معلومات کی بنیاد پر نمونے تیار کرتا ہے۔ اسی لئے ہم پیتل کے باجے (clarinet) کی آواز میں صاف ستھرے سروں کی بجائے پیتل کی غرّاہٹ سنتے ہیں۔ سرون کے مختلف امتزاج کی وجہ سے شہنائی کی آواز میں لکڑی کی کھنک سنائی پڑتی ہے جبکہ بانسری میں بانس کی سرسراہٹ۔ اگر آپ احتیاط سے sound synthesiser میں واحد سروں کو فرداً فرداً شامل کرتے جائیں تو شروع میں تو دماغ ان کو علیحدہ علیحدہ ہی سنے گا، جب تک کہ اس کی سمولیشن سافٹویئر آوازوں کو "سمجھ" نہ جائے، جس کے بعد دماغ آپ کو صرف بانسری ہی سنائی دے گی۔ حروف علت (vowels) اور حروف صحیح (consonants) کی آوازیں بھی ہمارے دماغ میں اسی طرح تعمیر ہوتی ہیں، اور اس سے بھی اعلیٰ درجے پر مرکّب صوتیات اور الفاظ۔

بچپن میں میں نے ایک بار ایک بھوت کی آواز سنی: مردانہ آواز جو کچھ بڑبڑا رہی تھی، جیسے عبادت میں ہو۔ میں تقریباً الفاظ سن سکتا تھا، جو بہت سنجیدہ اور پختہ طرز پر تھے۔ میں نے قدیم مکانوں میں پادریوں کی راہ داریوں کی کہانیاں سن رکھی تھیں، اور میں تھوڑا خوف زدہ تھا۔ لیکن میں بستر سے باہر نکلا اور آواز کی سمت روانہ ہوا۔ جیسے میں آواز کے قریب آتا گیا، آواز اونچی ہوتی گئی۔ اور پھر یکایک میرے دماغ میں "پلٹ" گئی۔ میں اب اتنے قریب آ چکا تھا کہ آواز کی حقیقت کو پہچان سکوں۔ باہر کی تیز ہوا چابی کے سوراخ میں سے گزرتے ہوئے ایک ایسی آواز پیدا کر رہی تھی جسے میرے دماغ کی سمولیشن سافٹویئر نے سنجیدہ مردانہ آواز کا نمونہ بنانے کے لئے استعمال کیا۔ اگر میں جلد متاثر ہو جانے والا بچّہ ہوتا تو شاید الفاظ اور مکمل جملے بھی "سنتا"۔ اور اگر سونے پہ سہاگہ میری تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی ہوتی تو کون جانے ہوا نے مجھے اس رات کیا کیا سنایا ہوتا۔

اسی عمر میں، ایک اور موقع پر، میں نے ساحل سمندر پر ایک معمولی سے مکان کی کھڑکی میں ناقابل بیان بد اندیشی سے بھرے ایک بڑے اور گول سے چہرے کو دیکھا۔ کچھ خوف کی حالت میں میں نے اس کی طرف قدم بڑھائے حتٰی کہ میں اس کے اتنے قریب آ گیا کہ اس کی حقیقت کو پہچان سکوں۔ پردوں کی ترتیب سے چہرے سے مشابہت رکھنے والا ایک نقشہ سا بن گیا تھا۔ چہرہ، اور اس کی بد اندیشی، ایک خوفزدہ بچّے کے دماغ کی اختراع تھے۔ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ کو متقی لوگوں نے ٹوین ٹاورز سے اٹھتے دھویں میں شیطان کی شکل دیکھی: ایک توہم جس کے در پردہ ایک تصویر تھی جو انٹرنیٹ پر چھپی اور جس کو خوب پھیلایا گیا۔

انسان کا دماغ نمونے بنانے میں بڑی مہارت رکھتا ہے۔ جب ہم سو جاتے ہیں تو اسے خواب کہا جاتا ہے۔ جاگتے لمحوں میں اسے تخیل، اور جب یہ بہت ہی تفصیلی ہو تو ہذیان یا فریب خیال کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ باب ۱۰ میں دکھایا جائے گا، جن بچّوں کے فرضی "دوست" ہوتے ہیں وہ کئی بار ان کو دیکھتے بھی ہیں جیسے کہ وہ اصلی ہوں۔ اگر ہم سادہ مزاج ہیں تو بہ آسانی اس بہکاوے میں آ جائیں گے کہ ہم نے کسی بھوت، فرشتے یا خدا کو دیکھا ہے۔ اور اگر ہم جواں سال کیتھولک خاتون ہیں تو کنواری مریم کو دیکھا ہے۔ ایسی بصارتیں بھوتوں، فرشتوں، خداؤں اور کنواریوں کی موجودگی کے سلسلے میں مناسب بنیاد مہیا نہیں کرتیں۔

بڑے پیمانے پر دیکھے جانے والے بصیرت کے واقعات درگزر کرنے مشکل ہوتے ہیں، جیسے کہ ۱۹۱۷ کی رپورٹ جس کے مطابق پرتگال کے فاطمہ میں ستّر ہزار لوگوں نے سورج کو آسمان سے اتر کر اس جم غفیر پر گرتے دیکھا[۴۵]۔ اس بات کی وضاحت کرنا آسان نہیں کہ ستّر ہزار لوگوں نے ایک ہی ہذیان

کیسے دیکھا۔ لیکن یہ ماننا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے کہ یہ واقعہ پیش آیا لیکن فاطمہ کے باشندوں کو چھوڑ کر باقی دنیا میں کسی نے اسے نہیں دیکھا۔ جبکہ فاطمہ والوں نے نہ صرف اسے دیکھا بلکہ اسے شمسی نظام کی تباہی کے طور پر محسوس بھی کیا جس میں تمام لوف نہایت تیزی سے خلاء میں پھینکے گئے۔ ڈیوڈ ہیوم نے معجزات کو پرکھنے کا جو معیار بنایا تھا یہاں اس کا ذکر مناسب ہو گا: 'معجزے کو ثابت کرنے کے لئے کوئی گواہی بھی کافی نہیں اگر وہ گواہی ایسی ہو کہ اس کا جھوٹا ہو سکنا اس معجزے سے بھی زیادہ معجزاتی ہو جسے وہ ثابت کر رہی ہے'۔

شاید یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ ستر ہزار لوگ ایک ساتھ مفت کا شکار ہو گئے ہوں، یا ایک ساتھ ایک جھوٹ میں ملوث ہوں۔ یا یہ کہ تاریخ سے اس اندراج میں غلطی ہو گئی ہو کہ سورج نے آسمان میں رقص کیا تھا۔ یا انہوں نے راب دیکھا (ان سب کو سورج کو تکتے رہنے کے لئے کہا گیا تھا اور یقیناً اس سے ان کی بینائی پر اچھا اثر نہیں پڑا ہو گا)۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی ظاہری لاممکنات متبادل وضاحت سے زیادہ ممکن ہیں: کہ دنیا اپنے مدار سے ایک طرف کھینچ دی گئی، نظام شمسی تباہ ہو گیا، اور فاطمہ کے علاوہ یہ کہیں نہیں دیکھا گیا۔ میرا مطلب ہے، پرتگال اتنا بھی الگ تھلگ نہیں ہے[§§§§]۔

خداؤں اور دیگر مذہبی تجربات کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ کو ایسا تجربہ ہوا ہے تو آپ اس کو سچ مانتا ہوا پائیں گے۔ لیکن یہ امید نہ رکھئے گا کہ ہم بھی آپ کی ہاں میں ہاں ملا دیں گے، خصوصاً اگر ہمیں دماغ اور اس کے حرکات کی ذرا سی بھی سمجھ بوجھ ہے۔

## الہامی صحیفوں سے دلیل

آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو خدا کے وجود کے بارے میں صحیفوں میں پائے جانے والے ثبوت سے قائل ہو جاتے ہیں۔ ایک عام دلیل، جو سی ایس لویس سے منسوب ہے (جنہیں شاید تھوڑا دھیان رکھنا چاہئے تھا) کچھ یوں چلتی ہے کہ اگر عیسیٰ خدا کا بیٹا ہونے کا دعوی کرتا تھا تو یا تو وہ سچ کہہ رہا تھا یا وہ دیوانہ تھا یا پھر جھوٹا۔ اس بات کے تاریخی شواہد نہ ہونے کے برابر ہیں کہ عیسیٰ نے کبھی ربانی (divine) ہونے کا دعوی کیا ہو۔ لیکن اگر شواہد مضبوط بھی ہوتے ہیں تو یہ تین ممکنہ متبادل صورت بھی مضحکہ خیز حد تک ناکافی ہیں۔ ایک چوتھا امکان، جو حقیقتاً اتنا واضح ہے کہ اس کا ذکر بھی ضروری نہیں ہونا چاہئے، یہ کہ عیسیٰ واقعی مغالطے کا شکار ہو گیا تھا، اکثر لوگ ہو جاتے ہیں۔ خیر جیسا کہ میں نے کہا، اس بات کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں کہ عیسیٰ نے کبھی یہ سوچا ہو کہ وہ ربّانی ہے۔

بہت سے ایسے لوگ جو کسی بات کے تحریری ثبوت سے قائل ہو جاتے ہیں یہ سوالات نہیں پوچھتے کہ 'کس نے لکھا، اور کب'؟ 'اس کو کیسے پتہ تھا کہ کیا لکھنا ہے'؟ 'کیا اپنے وقت میں راقم نے اپنی بات کا وہی مطلب سمجھا تھا جو ہم آج سمجھتے ہیں'؟ 'کیا راقم غیر جانبدار شاہد تھا یا اس کا کوئی مقصد تھا جس کی وجہ سے اس کی بات میں جانبداری کی آمیزش ہو گئی ہو'؟ انیسویں صدی سے علماء دین بہت مضبوط اور جامع بحث کر رہے ہیں کہ انجیل کی مختلف کتابوں کو حقیقی دنیا کے تاریخی واقعات کی قابل اعتبار روایات کے طور پر قبول نہیں کیا جا سکتا۔ سب کتابیں عیسیٰ کی وفات اور پال کے خطوط کے بہت بعد لکھی گئیں، اور ان خطوط میں بھی کہیں عیسیٰ کی سوانح کے مبینہ واقعات کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ کئی نسلوں تک خطا کے پتلے کاتب ان کتابوں کی نقل در نقل بناتے رہے (باب ۵ دیکھئے)، جن کے اپنے بھی مذہبی مقاصد ہوا کرتے تھے، حتی کہ یہ کتابیں بچوں کے کھیل "چینی سرگوشی" سے زیادہ کچھ نہ رہیں۔

مذہبی مقاصد کی بنا پر کہانی میں مذہبی رنگ بھرنے کی ایک بہت اعلیٰ مثال عیسیٰ کی بیت اللحم میں پیدائش اور اس کے فوراً بعد بادشاہ ہیراد (Herod) کے حکم پر معصومین کے قتل عام کا واقعہ ہے۔ عیسیٰ کی وفات کے کئی سال بعد جب انجیل کی کتابیں لکھی گئیں تو کسی کو معلوم نہیں تھا کہ عیسیٰ کی ولادت کہاں ہوئی تھی۔ عہد نامہ قدیم (Old Testament) کی ایک پیش گوئی (میکا ۵:۲) کی بنیاد پر یہودی اس بات کی امید لگا کر بیٹھے تھے کہ جس مسیحا کے وہ ایک عرصے سے منتظر ہیں وہ بیت اللحم میں پیدا ہو گا۔ اس پیش گوئی کے تناظر میں جان کی کتاب خاص طور پر اس امر کا ذکر کرتی ہے کہ اس کے بیت اللحم میں پیدا نہ ہونے پر یہودی بڑے حیران ہوئے تھے: 'کچھ نے کہا یہ مسیح ہے۔ لیکن کچھ نے کہا کہ مسیح کو تو گلیل (Galilee) سے نہیں آنا تھا؟ کیا کلام میں یہ نہیں لکھا تھا کہ عیسیٰ داؤد کے بیج سے ہو گا، اور بیت اللحم سے آئے گا، جہاں کا داؤد تھا'؟ ۔

متی (Matthew) اور لوکا (Luke) نے اس مسئلے کو ایک مختلف نظر سے دیکھنے کی کوشش کی۔ اور ضد کی کہ عیسیٰ بہر طور بیت اللحم میں ہی پیدا ہوا ہو گا۔ لیکن وہ اس کو بیت اللحم میں مختلف راستوں سے پہنچاتے ہیں۔ متی کے مطابق تو مریم اور یوسف ہمیشہ سے بیت اللحم میں ہی تھے اور انہوں نے ناصرہ (Nazareth) میں قیام عیسیٰ کی پیدائش کے بہت عرصہ بعد مصر سے واپسی کے دوران کیا، جہاں وہ ہیراد کے معصوموں کے قتل عام سے پناہ کی خاطر

---

[§§§§] اگرچہ میری بیگم کے والدین پیرس میں ایک بار ایک ہوٹل میں ضرور ٹھہرے تھے جس کا نام *Hôtel de l'Univers et du Portugal* تھا۔

فرار ہوئے تھے۔ اس کے برعکس لوکا تسلیم کرتا ہے کہ مریم اور یوسف ناصرہ میں عیسیٰ کی پیدائش سے پہلے سے قیام پزیر تھے۔ تو پھر انہیں پیش گوئی پوری کرنے کے لئے اس فیصلہ کن گھڑی میں بیت اللحم کیسے لایا جائے؟ لوکا کہتا ہے کہ جس دور میں کیرانس (Quirinius) شام کا گورنر تھا، شہنشاہ روم آگسٹس نے حکم جاری کیا کہ لگان کے سلسلے میں مردم شماری کروائی جائے، اور ہر شخص 'اپنے آبائی شہر' کو واپس لوٹ جائے۔ یوسف 'داؤد کی نسل' سے تھا، اور 'داؤد چونکہ بیت اللحم سے تعلق رکھتا تھا، لہٰذا یوسف کو بھی داؤد کے شہر بیت اللحم ہی جانا تھا۔ لوکا کو یہ حل مناسب لگا ہو گا۔ سوائے اس کے کہ تاریخی اعتبار سے یہ مکمل طور پر بے معنی ہے، جس کی نشاندہی اے این ولسن نے Jesus میں، روبن لین فوکس نے The Unauthorised Version میں اور دیگر مصنفین نے اپنی کتابوں میں کی ہے۔ اگر داؤد کا وجود تھا بھی تو وہ مریم اور یوسف سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے زندہ رہا ہو گا۔ رومیوں نے یوسف کو ایک ایسے شہر میں جانے کی ضد کیوں کی ہو گی جہاں اس کا کئی اب و جد ایک ہزار سال پہلے رہتا تھا؟ یہ ایسے ہی ہے جیسے مجھ سے کہا جائے کہ اگر میں اپنا شجرہ نسب 'سینیور ڈاکین' سے ملا سکوں جو "ولیم فاتح" کے ساتھ آیا تھا اور یہیں بس گیا، تو مردم شماری کے فارم پر شہر کے خانے میں مجھے 'ایشبی ڈی لا زوش' لکھنا ہو گا۔

مزید براں لوکا نہایت بے ڈھنگے انداز سے ایسے واقعات کا ذکر کر کے جن کی تصدیق غیر جانبدار مؤرخین کر سکتے ہیں، تاریخوں کے معاملے میں شدید کوتاہی کا مرتکب پایا جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ گورنر کیرانس کے حکم کے مطابق ایک مرد شماری ہوئی تھی، لیکن اس کا حکم شہنشاہ آگسٹس نے نہیں دیا تھا، مرد شماری مقامی تھی، اور سب سے اہم بات، سنہ ۶ عیسوی میں ہیراد کی موت کے کئی سال بعد ہوئی تھی۔ لین فوکس یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ لوکا کی کہانی تاریخی اعتبار سے ناممکن اور اندرونی طور پر بے ربط ہے؛ پھر بھی اسے لوکا کی حالت زار اور میکا کی پیش گوئی پوری کرنے کی خواہش سے ہمدردی تھی۔

رسالہ Free Inquiry کے ۲۰۰۴ کے شمارے میں اس اعلیٰ رسالے کے مدیر ٹام فلن نے ایسے مقالے جمع کئے جن میں کرسمس کی ہر دل عزیز کہانی کے اندرونی تضادات اور نقائص کی نشاندہی کی گئی تھی۔ متی اور لوکا، جو عیسائیت کے تبلیغیوں میں سے واحد دو ایسے ہیں جنہوں نے عیسیٰ کی ولادت کا ذکر بھی کیا ہے کہ تضادات کی فہرست خود فلن نے مرتّب کی[٦٦]۔ رابرٹ گلولی دکھاتے ہیں کہ کس طرح عیسیٰ کی کہانی سے منسلک اہم نکات جیسے کہ مشرق میں ستارے کا دکھانا، کنواری مریم سے بچّے کی پیدائش، بادشاہوں کا بچّے کی تعظیم کرنا، معجزات، مصلوب ہونا، دوبارہ زندہ ہونا اور پھر اٹھائے جانا۔ سب کے سب دوسرے مذاہب سے مستعار لئے گئے ہیں جو اس دور میں بحیرہ رُوم اور مشرق قریب میں پنپ رہے تھے۔ فلن کا ماننا ہے کہ متی کے یہودی قارئین کے لئے مسیحی پیشگوئیاں (داؤد کے شجرہ سے تعلق، بیت اللحم میں ولات) پوری کرنے کی خواہش لوکا کی عیسائیت کو غیر یہودیوں میں مقبول کروانے کی کوشش میں یونانی مذاہب کی روایات (کنواری سے پیدائش، بادشاہوں کی عبادت) کو شامل کرنے کے عمل سے متصادم ہو گئی تھی۔ نتیجتاً پیدا ہونے والے تضادات روز روشن کی طرح عیاں ہیں لیکن معتقدین انہیں باقاعدگی سے نظر انداز کر دیتے ہیں۔

نفیس عیسائیوں کو اس بات پر قائل ہونے کے لے آئیرا گرشون (مشہور موسیقار) کی ضرورت نہیں کہ 'انجیل میں جو پڑھتے ہو/ نہیں ضروری کے ایسا ہی ہو"۔ لیکن دنیا میں بہت سے غیر نفیس عیسائی بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ "ضروری ہے کہ ایسا ہی ہو"۔ جو انجیل کو بہت سنجیدگی سے تاریخ کا سچا اور درست نوشتہ مانتے ہیں اور اسے اپنے مذہبی عقائد کا ثبوت سمجھتے ہیں۔ کیا یہ لوگ، جو اس کتاب کو لفظ بہ لفظ سچ تسلیم کرتے ہیں کبھی اس کو کھولتے نہیں ہیں؟ انہیں یہ تضادات نظر کیوں نہیں آتے؟ کیا ایسے لغت پرستوں کو اس بات سے پریشانی نہیں ہونا چاہئے کہ متی تو داؤد اور یوسف کے درمیان ۲۸ نسلیں گنتا ہے جبکہ لوکا ۴۲ گنتا ہے؟ سونے پہ سہاگا، دونوں فہرستوں کے ناموں میں کوئی ہم آہنگی نہیں ہے! ویسے بھی، اگر عیسیٰ کنواری کے بطن سے پیدا ہوا تھا، تو یوسف کا شجرہ نسب بے معنی ہو جاتا ہے اور صحیفہ قدیم کی پیشگوئی کو پورا کرنے کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا کہ مسیح داؤد کے گھرانے سے تعلق رکھے گا۔

امریکی ماہر انجیلیات (bible scholar) بارٹ ایہرمین نے اپنی کتاب "صحیفہٗ جدید کو کس نے اور کیوں بدلا حقیقت کیا ہے؟ ۔ The Story Behind Who Changed the New Testament and Why The" میں صحیفہٗ جدید کو لاحق عدم یقینی سے پردہ اٹھاتے ہیں[*****]۔ کتاب کے دیباچے میں پروفیسر ایہرمین بڑے جذباتی انداز میں اپنے تعلیمی سفر کا ذکر کرتے ہیں جو انجیل پر ایمان رکھنے والے ایک بنیاد پرست سے شروع ہو کر پر تفکّر شکوک پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ ایک ایسا سفر جس کا سب سے اہم محرّک صحیفوں کے میلان خطا ہونے کا شدید احساس ہے۔ جیسے جیسے وہ امریکی یونیورسٹیوں میں ترقی کی منزلیں طے کرتے رہے ۔ ان کا سفر بالکل کم تر "موڈی بائبل انسٹی ٹیوٹ" سے ہوتے ہوئے "ویٹن کالج" (جو درجے میں تھوڑا بلند تو تھا مگر پھر بھی

---

[*****] میں نے دانستہ طور پر اس کتاب کے لئے یہ ذیلی عنوان منتخب کیا، کیونکہ میں صرف اسی بات کے بارے میں پر اعتماد ہوں۔ میرے پاس اس کتاب کی جلد جو لندن کے ناشر Continuum نے چھاپی تھی کا عنوان ہے "یہ کس کا کلام ہے؟۔ ?Who's Word is It"۔ میں اس جلد میں ایسا کچھ بھی نہیں ڈھونڈ پایا جو یہ ثابت کر دے کہ یہ وہی کتاب ہے جو سان فرانسسکو کے ناشر Harper نے " عیسیٰ سے غلط حوالے۔ Misquoting Jesus" کے نام سے چھاپی تھی۔ میرا خیال ہے کہ یہ ایک ہی کتاب ہے؟ لیکن ناشرین ایسی حرکتیں کیوں کرتے ہیں؟

قدامت پسند ٹی وی کے مبلّغ بیلی گراہم کی درس گاہ بھی تھا) کے بعد "پرنسٹن تھیولاجیکل سیمینار" پر ختم ہوا، اور ہر منل پر ان کو اسی معنی خیز تنبیہ کا سامنا رہا کہ وہ خطرناک ترقی پسندی کے مقابلے میں اپنی بنیاد پرست عیسائیت کا دامن نہیں بچا پائیں گے۔ ایسا ہی ہوا؛ اور ہم، ان کے قارئین، اس وجہ سے ان کے علم سے فیض یاب ہو پائے۔ مذہبی تنقید کی دیگر فرحت بخش روایت شکن کتابوں میں لین فوکس کی *The Unauthorised Version* اور یاق برلنربراو کی "لا دین انجیل: لادین لوگوں کو مذہب کو سنجیدگی سے کیوں لینا چاہئے ۔ *The Secular Bible: Why Nonbelievers Must Take Religion Seriously* " قابل ذکر ہیں۔

وہ چار شرعی انجیلی کتابیں جو سرکاری انجیل میں اپنی جگہ بنا پائیں ایک قدرے بڑی فہرست سے ۔ جن میں تھامس، پیٹر، نکاڈمس، فلپ، بارتھولیو، اور میری ماگڈلین کی انجیلیں شامل ہیں ۔ تقریباً صوادیدی طور پر ہی چن لی گئی تھیں[۴]۔ ان میں سے کچھ کتابیں، جو اپنے دور کی مشکوک انجیلیں مانی جاتی تھیں، وہ کتابیں ہیں جن کا ذکر تھامس جیفرسن نے اپنے بھتیجے کو لکھے گئے خط میں کیا ہے:

> صحیفہ جدید کے بارے میں بات کرتے ہوئے میں یہ بتانا بھول گیا تھا کہ تمہیں مسیح کی ساری سوانح پڑھنی چاہیے، خصوصاً وہ جن کے بارے میں خدّام دین کی کونسل نے فیصلہ کیا کہ یہ جعلی مبلّغین کی ہیں، جیسے انہوں نے اور کتابوں کے بارے میں فیصلہ کیا کہ وہ حقیقی بلّغین کی ہیں۔ کیونکہ یہ جعلی مبلّغین بھی وحی کا اتنا ہی دعوٰی کرتے تھے جتنا حقیقی بلّغین، اس لئے تمہیں ان دونوں کے دعووں کے ما بین اپنی عقل سے فیصلہ کرنا ہو گا۔

جو انجیلی کتابیں حتمی فہرست میں جگہ نہیں بنا پائیں انہیں خدام دین نے اس بنا پر خارج کیا کہ ان میں موجود کہانیاں ان کہانیوں سے بھی زیادہ شرمناک حد تک ناممکن تھیں جو چار شرعی کتابوں میں درج تھیں۔ مثال کے طور پر تھامس کی انجیل طفولیت (The Infant Gospel of Thomas) میں ایسے کئی واقعات درج ہیں جن میں ننھا عیسیٰ اپنی جادوئی قوتوں کا بیجا استعمال کرتا نظر آتا ہے۔ کبھی دوستوں کو بکری بناتا ہے، تو کبھی گیلی مٹّی کو پرندہ، اور کبھی بڑھئی کے کام میں اپنے والد کا ہاتھ بٹانے کی غرض سے شرارتاً لکڑی کے ٹکڑے کو لمبا کر دیتا ہے ۔ جواباً یہ کہا جائے گا کہ تھامس کی انجیل کے بچکانہ معجزات پر تو ویسے بھی کسی کا ایمان نہیں ہے۔ لیکن چار شرعی کتابوں پر ایمان لانے یا نہ لانے کی اتنی ہی وجہ ہے جتنی بقیہ جعلی کتابوں پر لانے کی۔ سب کو افسانے کا درجہ حاصل ہے اور سب حقائق کے معاملے میں اتنی ہی مشکوک ہیں جیسے کنگ آرتھر اور اس کے امراء کے کہانیاں۔

ان چار شرعی کتابوں میں جو تفاصیل مشترک ہیں وہ تقریباً سب کی سب ایک ہی اصل ذریعہ سے لی گئی ہیں۔ یا مارک کی انجیل یا ایسا کوئی گمشدہ مسودہ جو مارک پر مبنی ہے۔ چار شرعی مبلّغوں کے بارے میں کوئی نہیں جانتا، لیکن یہ بات پکّی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی عیسیٰ کو ذاتی طور پر نہیں ملا اور نہ جانتا تھا۔ ان کی زیادہ تر تصانیف سچی تاریخ دانی کا نمونہ نہیں بلکہ صحیفۂ قدیم کی کہانیوں کا چربہ تھیں، کیونکہ انجیل کے لکھنے والے اس بات پر متفق تھے کہ صحیفہ قدیم کی پیش گوئیاں عیسیٰ کی زندگی سے پوری ہوتی نظر آنی ضروری ہیں۔ جیسا کہ لندن یونیورسٹی کے پروفیسر جی اے ویلز نے اپنی کتاب "کیا عیسیٰ کا وجود تھا۔ Did Jesus Exist " میں ثابت کرنے کی کوشش کی، عیسیٰ کے سرے سے نہ ہونے کے بارے میں سنجیدگی سے بحث تو کی جا سکتی ہے، لیکن ایسا کرنا زیادہ مقبول نہیں ۔

اگرچہ عیسیٰ کے وجود کے امکانات روشن ہیں، معتبر مذہبی محققین صحیفۂ جدید (اور یقیناً صحیفۂ قدیم) کو تاریخی واقعات کے بارے میں قابل اعتبار ر چشمہ معلومات نہیں سمجھتے۔ لہٰذا میں کسی قسم کے خدا کے حق میں ثبوت پیش کرنے کے لئے مزید اس کتاب کا سہارہ نہیں لوں گا۔ تھامس جیفرسن کے دور

---

ای این ولسن عیسیٰ کی سوانح میں اس نظریے پر بھی شک کا اظہار کرتا ہے کہ یوسف بڑھئی تھا بھی یا نہیں۔ یونانی زبان کے لفظ *tekon* کے معنی بڑھئی کے ہی ہیں، لیکن یہ آرامک زبان کے لفظ *naggar* کا ترجمہ ہے، جس کے لغوی معنوں میں کاریگر اور عالم دونوں شامل ہیں۔ یہ ان کئی تراجم میں سے صرف ایک ہے جو انجیل کو اپنی زد میں لئے رکھتے ہیں، اور جن میں سے سب سے زیادہ مشہور یسیعاہ کے عبرانی لفظ almah (جوان عورت) کا یونانی ترجمہ Parthenos (کنواری) ہے۔ بظاہر مترجم کی ایک معمولی سی غلطی نے ایک ایسے ابہام کو جنم دیا جسے بڑھا چڑھا کر عیسیٰ کی ماں کے کنوارے ہونے کی مضحکہ خیز داستان میں بدل دیا گیا! تعمیری غلط ترجموں میں اس کا حریف صرف ایک ہی دو ترجمہ ہے، اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ بھی کنواریوں سے تعلق رکھتا ہے۔ ابن ورّاق نے بڑے مزاحیہ انداز میں یہ توجیہ پیش کی ہے کہ ہر شہید مسلمان کو بہتّر کنواری حوروں کے وعدے کی حقیقت یہ ہے کہ یہ "شفاف سفید انگور" کا غلط ترجمہ ہیں۔ کاش کہ یہ بات زبان زد عام ہوتی تو خود کش بمباروں کے کتنے ہی معصوم متاثرین کی جانیں بچ جاتیں۔ ( Ibn Warraq, ('Virgins? What virgins?', *Free Inquiry* ۲۶: ۱, ۲۰۰۶, ۴۵–۶.

اندیش الفاظ میں، جو انہوں نے جان ایڈمز کو لکھے، 'وہ دن بھی آئے گا جب خداوند کریم سے ایک کنواری کی کوکھ سے عیسٰی کی حیران کن پیدائش کو اس دیو مالائی کہانی کے برابر رکھ دیا جائے گا جہاں عقل و دانش کی دیوی منروا مشتری (Jupiter) کے دماغ میں پیدا ہوتی ہے۔

ڈین براؤن کا ناول The Da Vinci Code اور اس پر مبنی فلم کلیسائی حلقوں میں زبردست تنازعات کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ عیسائیوں کو راغب کیا جا رہا ہے کہ فلم کا بائیکاٹ کریں اور دیکھنے والوں کا راستہ روکیں۔ شروع سے آخر تک یہ ناول من گھڑت، ایجاد کردہ فکشن ہے۔ اور اس خاصیت میں، بالکل الہامی کتابوں جیسا ہی ہے۔ دونوں میں صرف اتنا فرق ہے کہ الہامی کتابیں قدیم فکشن ہیں اور یہ ناول جدید فکشن ہے!

## معتبر مذہبی سائنسدانوں سے دلیل

دنیائے علم و دانش کے اکابرین کی اکثریت عیسائی مذہب پہ ایمان نہیں رکھتی، لیکن روزی چھن جانے کے خوف سے اس سچ کو عوام سے چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ (برٹرینڈ رسل)

'نیوٹن مذہبی تھا۔ آپ کون ہوتے ہیں اپنے آپ کو نیوٹن، گیلیلیو، کیپلر وغیرہ سے برتر سمجھنے والے؟ اگر خدا ان سب کے لئے کافی تھا تو پھر آپ کس کھیت کی مولی ہیں'؟ اگر چہ اس قدر بھدّی دلیل کی صحت پر کوئی مثبت اثر تو نہیں پڑتا، پھر بھی عذر خواہ اس فہرست میں ڈارون کا نام بھی شامل کر لیتے ہیں، جن سے منسلک بستر مرگ پر عیسائیت قبول کرنے کی جھوٹی افواہیں پرانی بد بو کی طرح اس وقت سے گردش میں رہتی ہیں جب سے ایک 'لیڈی ہوپ' (یعنی محترمہ امید) نے دانستہً ڈارون کے بارے میں ایک اندوہ ناک کہانی مشہور کر دی جس میں ڈارون تکیے سے سر لگائے اپنے آخری دنوں میں انجیل کے صحیفۂ جدید کے اوراق کا مطالعہ کرتے ہیں اور قبول کرتے ہیں کہ نظریہ ارتقاء غلط ہے۔ باب کے اس حصے میں میں صرف سائنس دانوں پر ہی توجہ دوں گا کیونکہ جو لوگ اپنے مدعا کے حق میں معروف لوگوں کے نام نکال کر لاتے ہیں وہ عموماً سائنسدانوں کے ناموں کا ہی سہارا لیتے ہیں۔

نیوٹن واقعی مذہبی ہونے کا دعوٰی کرتے تھے۔ اور انیسویں صدی تک غالباً سارے یہی دعوٰی کرتے رہے، جب گزشتہ صدیوں کے مقابلے میں مذہب کا اظہار کرنے کے معاشرتی اور عدالتی دباؤمیں کچھ کمی واقع ہوئی اور اسے ترک کرنے کے لئے پہلے سے زیادہ سائنسی مدد میسّر آ گئی۔ ویسے بحث کے دونوں اطراف برعکس رویے دیکھنے کے مواقع بھی ملتے رہے ہیں۔ جیسا کہ جیمز ہاٹ نے اپنی کتاب "کفر کے ۲۰۰۰ سال: مشہور لوگ جنھوں نے شک کرنے کی ہمت کی ۔ *Years of Disbelief: Famous People with the Courage to Doubt* ۲۰۰۰ " میں دکھایا ہے، ڈارون کے دور سے پہلے بھی، ہر کوئی مذہبی نہیں تھا۔ اور کچھ ممتاز سائنسدان ڈارون کے بعد بھی مذہب پر بدستور یقین کرتے رہے۔ ہمیں اس وقت بھی مائیکل فیراڈے کی پر خلوص عیسائیت پر شک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے جبکہ انہیں ڈارون کے کام کے بارے میں پتا چل چکا ہو گا۔ وہ سانڈیمانئین فرقے کے حامی تھے، جو انجیل کی لغوی تشریح پر ایمان رکھتے تھے، ہر نئے معتقد کے پیر رسمی انداز میں دھوتے تھے، اور خدا کی رضا جاننے کے لئے فال نکالتے تھے۔ ڈارون کی کتاب Origin of Species کی اشاعت کے ایک سال بعد ۱۸۶۰ میں فیراڈے اس فرقے کے امام چنے گئے اور ۱۸۶۷ میں اپنی وفات تک اس منصب پر قائم رہے۔ تجربوں کے شوقین فیراڈے کے ہم عصر جیمز کلارک میکسویل بھی اتنے ہی پکے عیسائی تھے۔ اور برطانوی طبیعیات کے عظیم ستون لارڈ کیلون بھی اتنے ہی کٹّر عیسائی تھے۔ کیلون نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ وقت کی قلّت نظریہ ارتقاء کو غلط ثابت کرتی ہے۔ اس عظیم ماہر حرکیات حررہ (thermodynamics) کے غلط حساب کے مطابق سورج کسی قسم کی آگ ہے جس کا ایندھن ہزاروں میلین سال میں نہیں بس چند میلین سال میں ختم ہوجائے گا۔ ظاہر ہے کیلون کو جوہری توانائی کے بارے میں معلوم نہیں ہو گا۔ خوش قسمتی سے برطانوی مجلس کے ۱۹۰۳ کے اجلاس میں چارلز ڈارون کے دوسرے بیٹے سر جارج ڈارون کو اپنے والد کے نظریے کا دفاع کرنے کا موقع ملا۔ اس نے میڈم کیوری کی ریڈیم کی دریافت کو استعمال کرتے ہوئے تا وقت حیات لارڈ کیلون کے حساب کو غلط ثابت کر دیا۔

بیسویں صدی میں مذہب پر یقین رکھنے والے عظیم سائنسدانوں کی تعداد میں کمی تو واقع ہوئی لیکن وہ مکمل طور پر ناپید نہیں ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ دور حاضر میں مذہبیت کا اعتراف کرنے والے سائنسدان آئنسٹائن کی طرز پر مذہبی ہیں، جس کے بارے میں میں نے باب ۱ میں بحث کی تھی کہ یہ لفظ "مذہب"

---

مجھے بھی بستر مرگ پر عیسایت کی طرف لوٹ جانے کی پیش گوئیوں سے نوازا جاتا رہا ہے۔ یہ پیش گوئیاں ایک اسلوب باقاعدگی سے دہرائی جاتی ہیں (مثال کے طور پر دیکھئے Steer ۲۰۰۳)، اور ہر پیشگوئی فریب کے نئے بادلوں پر اڑتی ہوئی یہ دعوٰی لے کر آتی ہے کہ وہ مزاحیہ بھی ہے اور پہیلی بھی۔ شاید مجھے اپنے کمرے میں کہیں ٹیپ ریکارڈر چھپا کر رکھنا چاہئے تا کہ اپنی بعد از مرگ عزت کی حفاظت کر سکوں۔ اس پر لالہ وارڈ لقمہ دیتی ہیں: 'یہ بستر مرگ کا جھنجھٹ ہی کیوں پالتے ہیں آپ؟ اگر عزت کا سودا کرنا ہی ہے تو اپنی زندگی میں ہی کر لیجئے تا کہ کم از کم ٹیمپلٹن انعام تو مل سکے۔ بعد میں بھلے بڑھاپے کے مالیخولیا کو مورد الزام ٹھہرا دینا'۔

کا غلط استعمال ہے۔ پھر بھی، آج کے دور میں بھی اعلیٰ پائے کے کچھ سائنسدان ایسے ہیں جو حقیقتاً اور روایتی معنوں میں مذہبی ہیں۔ دور حاضر کے برطانوی سائنسدانوں میں وہی تین نام چارلس ڈکنز کے کسی ناول کی وکلاء کی کمپنی کے نام کی طرح بار بار سامنے آتے ہیں: پی کاک، سٹینارڈ اور پولکنگہارن۔ تینوں نے یا تو ٹیمپلٹن انعام جیتا ہوا ہے یا ٹیمپلٹن فاؤنڈیشن کے بورڈ کے رکن ہیں۔ ان سے ذاتی اور غیر ذاتی بحثوں کے بعد میں مکمل طور سے ہکا بکا محسوس کرتا ہوں؛ ان کے کسی آفاقی قانون دان پر اعتقاد سے نہیں، بلکہ عیسائیت کی تفصیل پر اعتقاد سے: جیسے کہ عیسیٰ کا جی اٹھنا، اس کا انسانوں کے گناہوں کی معافی دلوانا وغیرہ۔

امریکہ میں بھی اس جیسی مثالیں موجود ہیں، جیسے کہ فرانسس کولنز، جو Human Genome Project[§§§§§] کی امریکی شاخ کے سربراہ ہیں۔ لیکن برطانیہ کی ہی طرح یہاں بھی یہ لوگ اپنی کمیابی کی وجہ سے مشہور ہیں اور تدریس کی دنیا میں حیرانی کا باعث بھی۔ ۱۹۹۶ میں میں نے کیمبرج کے باغ 'کلریئر' میں جینوم پراجیکٹ کے بانی اور میرے دوست ڈاکٹر جم واٹسن کا انٹرویو کیا، جو گریگور مینڈل کی زندگی پر بننے والے BBC کی ایک دستاویزی فلم میں شامل کیا گیا جس کا مدیر میں تھا۔ ظاہر ہے مینڈل ایک مذہبی شخص اور سینٹ آگسٹائین کے سلسلے کا راہب تھا: لیکن یہ انیسویں صدی کا واقعہ ہے، جب نوجوان مینڈل کے لئے اپنے سائنسی شوق پورے کرنے کا بہترین راستہ یہ تھا کہ وہ راہب بن جائے۔ اس کے لئے یہ ایک تحقیقاتی عطیہ کی مانند تھی۔ میں نے واٹسن سے پوچھا کہ کیا وہ چند مذہبی سائنسدانوں کو جانتے ہیں۔ اس نے جواب دیا: 'تقریباً کسی کو بھی نہیں۔ کبھی کبھار ایسے لوگوں سے ملاقات ہو جاتی ہے تو میں کچھ شرمندہ سا ہو جاتا ہوں کیونکہ آپ تو جانتے ہیں ۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ کوئی بھی وحی کے ذریعے سچ کو قبول کر سکتا ہے'۔

فرانسس کرک، جو واٹسن کے ساتھ اس سارے سالماتی جینیاتی انقلاب (molecular genetics revolution) کے بانی ہیں، انہوں نے چرچل کالج ، کیمبرج سے اس وقت استعفیٰ دے دیا جب کالج کی انتظامیہ نے کالج کے کسی محسن کے ایما پر کالج میں ایک عبادت گاہ تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ انٹرویو کے دوران اپنافرض نبھاتے ہوئے میں نے واٹسن سے پوچھا کہ واٹسن اور کرک کے برعکس کچھ لوگوں کو سائنس اور مذہب میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا کیونکہ ان کے مطابق سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ چیزیں کیسے چلتی ہیں اور مذہب ہمیں سمجھاتا ہے کہ ان چیزوں کا مقصد کیا ہے۔ واٹسن نے پلٹ کر جواب دیا: 'میرے خیال میں ہمارا کوئی مقصد نہیں ہے۔ ہم صرف ارتقاء کا نتیجہ ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ "افسوس! اگر آپ کی زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں تو آپ کی زندگی تو بہت ویران ہو گی"۔ لیکن میں تو صرف دوپہر کی ضیافت کے بارے میں سوچ رہاہوں'۔ اور وہ ضیافت واقعی بہت عمدہ ثابت ہوئی۔

جدید ممتاز مذہبی سائنسدانوں کو تلاش کرنے کی عذر خواہوں کی کوششوں میں ان کی گھبراہٹ اور کھوکھلے پن کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے ۔ مجھے صرف ایک ایسی ویب سائٹ مل سکی جس میں صرف چھ ایسے نوبل انعام یافتہ سائنسدانوں کے نام تھے جو عیسائیت پر بھی پکّا یقین رکھتے تھے، جبکہ دنیا میں نوبل انعام پانے والے سائنسدانوں کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ مزید تفتیش پر پتا چلا کہ ان چھ میں سے چار نے تو کبھی نوبل انعام جیتا ہی نہیں؛ اور ایک سائنسدان ایسا ہے جو محض معاشرتی تعلقات کی خاطر عبادت گاہ میں جاتا ہے۔ بنجامن بیت حلامی نے اس موضوع پر اس سے زیادہ منظّم تحقیق کی، جس میں یہ بات سامنے آئی کہ سائنس اور ادبیات میں نوبل انعام پانے والوں میں لادینیت کا ظہور اپنی اپنی قومیت کے مقابلے میں قابل ذکر حد تک نمایاں ہے[۴۸]۔

مشہور جریدے Nature میں ۱۹۹۸ میں چھپنے والی لارسن اور وِٹھیم کی تحقیق میں یہ بات سامنے آئی کہ جن امریکی سائنسدانوں کو ان کے ہم عصروں نے نیشنل سائنس اکادمی کے رکن منتخب کرنے کے قابل سمجھا، ان میں سے صرف ۷ فیصد کا کسی ذاتی خدا پر یقین ہے[۴۹]۔ لادین اور دہریے لوگوں کی یہ بہتات عام امریکی آبادی کے مذہبی رجحانات کے بالکل برعکس ہے، جس میں ۹۰فیصد لوگ کسی مافوق الفطرت ہستی پر ایمان رکھتے ہیں۔ قدرے کم جانے پہچانے امریکی سائنسدانوں کا تناسب، جو اکادمی کے رکن منتخب نہیں ہوئے، ان اعداد کے بیچ میں کہیں ہے۔ یہاں بھی کسی مذہب کے ماننے والے سائنسدان لادین سائنسدانوں سے کم ہیں، لیکن ان کی تعداد لگ بھگ ۴۰فیصد کے قریب ہے۔ میری امیدوں کے عین مطابق، امریکی سائنسدان امریکی آبادی سے کم مذہبی ہیں، اور مایا ناز سائنسدان بالکل مذہبی نہیں ہیں۔ قابل ذکر امر یہ ہے کہ امریکی عوام کی مذہبیت اور امریکی دانشوراشرافیہ کی لادینیت ایک دوسرے سے بالکل مخالف سمت میں ہیں[۵۰]۔

یہ کسی قدر دلچسپی کی بات ہے کہ نظریہ تخلیق کی حامی سب سے بڑی ویبسائٹ Answers in Genesis لارسن اور وِٹھیم کی تحقیق کا حوالہ دیتی ہے، لیکن اس بات کے ثبوت کے طور پر نہیں کہ شاید مذہب میں کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے، بلکہ اپنے اندرونی اختلافات میں ان تخلیق پسندوں کے خلاف ہتھیار کے طور پر جو یہ کہتے ہیں کہ نظریہ ارتقاء مذہبی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سکتا ہے۔ Answers in Genesis 'قومی ادارہ برائے سائنس اپنی موت تک

---

[§§§§§] اس کو وہ غیر سرکاری پراجیکٹ نہ سمجھا جائے جسے وہ زیرک (اور لادین) سائنسدان کریگ وینٹیر چلا رہا ہے۔

لادین ہے[51] کی شہ سرخی کے تحت لکھے گئے مقالے میں لارسن اور وٹھیم کے خط کے آخری پیرائے کو بڑے فخر سے نقل کرتا ہے:

> جس وقت ہم اپنی تحقیق کے نتائج مرتب کر رہے تھے، قومی ادارہ برائے سائنس نے ایک کتابچہ جاری کیا کہ سکولوں میں نظریہ ارتقاء کیسے پڑھایا جائے، جو کہ امریکہ میں مذہبی عیسائیوں اور سائنسدان طبقے کے درمیان چپقلش کا باعث ہے۔ کتابچہ اپنے قارئین کو یقین دلاتا ہے کہ 'خدا کے وجود کے سلسلے میں سائنس غیر جانبدار ہے'۔ ادارے کے صدر بروس ایلبرٹس کہتے ہیں کہ ' اس ادارے کے کئی معتبر ممبران جو ارتقاء میں یقین رکھتے ہیں، ماہرین حیاتیات ہیں، لیکن ذاتی زندگی میں مذہبی بھی ہیں '۔ ہماری تحقیق کہتی ہے کہ حالات اس سے برعکس ہیں۔

ایسا گمان ہوتا ہے کہ ایلبرٹس نے ان ہی وجوہات کی بنا پر غیر ہم آہنگ حاکمیت کا سہارا لیا جن کا ذکر میں نے 'نیول چیمبرلین دبستان ارتقاء پسندان' میں کیا تھا (باب ۲ ملاحظہ کیجئے)۔ برطانیہ اور دولت مشترکہ (بشمول کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، انڈیا، پاکستان، انگریزی خواں افریقہ وغیرہ) میں امریکی ادارے کا متبادل ادارہ رائیل سوسائٹی ہے۔ جس سے یہ کتاب چھپنے جا رہی ہے ، سوسائٹی میں میرے ہم عصر الزبتھ کارنویل اور مائیکل سٹیراٹ سوسائٹی کے ممبران کے مذہبی رجحانات کے بارے میں ایک مزید تفصیلی تحقیق مرتب کر رہے ہیں۔ تحقیق کے تفصیلی نتائج کچھ تاخیر سے نشر کئے جائیں گے، لیکن انہوں نے مجھ پر کرم فرمائی کرتے ہوئے مجھے ابتدائی نتائج چھاپنے کی اجازت دی ہے۔ انہوں نے رائے کے درجات مرتب کرنے کے لئے لائیکرٹ ٹائپ سات نکاتی معیاری تکنیک استعمال کی ہے۔ تمام ۱،۰۷۴ ممبران جن کے پاس ای میل ایڈریس ہے کے ساتھ رابطہ کیا گیا اور ان میں سے ۲۳ فیصد نے جواب دیا، جو کہ اس نوعیت کی تحقیق کے لئے ایک مناسب عدد ہے۔ ان کے سامنے مختلف سوال رکھے گئے۔ مثلاً 'میں ایک ذاتی خدا میں یقین رکھتا ہوں، جو لوگوں میں دلچسپی لیتا ہے، دعائیں سنتا اور ان کے جواب دیتا ہے، گناہ اور غلطیوں پر غور کرتا ہے، اور انصاف کرتا ہے'۔ ایسے ہر سوال کے لئے انہیں ۱ (مکمل اختلاف) سے لیکر ۷ (مکمل اتفاق) تک اپنے رجحان کا درجہ بیان کرنا تھا۔ ان نتائج کا لارسن اور وٹھیم کی تحقیق سے موازنہ کرنا ذرا مشکل ہے کیونکہ انہوں نے اپنے محققین کو صرف تین درجات پر رجحان بیان کرنے کے لئے کہا تھا، لیکن عمومی طور پر نتائج ایک ہی سمت اشارہ کرتے ہیں۔ امریکی ادارے کے ممبران کی طرح رائل سوسائٹی کے ممبران کی بھاری اکثریت بھی لادین اور دہریہ ہے۔ صرف ۳ء۳ فیصد ممبران نے سوال سے مکمل اتفاق کیا (درجہ ۷) جبکہ ۷۸ء۸ فیصد کو شدید اختلاف تھا (درجہ ۱)۔ اگر ہم درجہ ۶ اور ۷ کو معتقد کا نام دے دیں اور درجہ ۱ اور ۲ کو لادین کہیں تو ہمیں لارسن اور وٹھیم کی طرح ۲۱۳ لادین اور ۱۲ معتقد ملتے ہیں۔ اور جیسا کہ بیت حلامی اور آرگائیل نے بھی محسوس کیا، کارنویل اور سٹیراٹ نے دیکھا کہ حیاتیاتی سائنسدانوں میں لادین ہونے کا رجحان طبیعیاتی سائنسدانوں سے تھوڑا سا زیادہ تھا۔ بقیہ تفصیلات اور مکمل تحقیق کے لئے آپ ان کے پیپر کی اشاعت کا انتظار کر سکتے ہیں[52]۔

ادارہ برائے سائنس اور رائل سوسائٹی کی اشرافیہ سے آگے بڑھتے ہوئے، ہم اس سوال کا ثبوت تلاش کرنا چاہتے ہیں کہ کیا دہریے عوام میں بھی زیادہ تر بہتر تعلیم یافتہ اور ذہین طبقات میں پائے جاتے ہیں؟ مذہبیت اور تعلیمی معیار یا مذہبیت اور ذہانت کے درمیان شماریاتی تعلق پر کئی تحقیقاتی مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ "ہم یقین کیسے کرتے ہیں: سائنس کے دور میں خدا کی تلاش۔ *How We Believe: The Search for God in an Age of Science* " میں مائیکل شرمر امریکی آبادی کے بلا ترتیب چنے گئے ایک بہت بڑے طبقے کے جائزے کا ذکر کرتا ہے جو اس نے اور اس کے رفیق کار فرینک سلووے نے کیا۔ ان کی تحقیق کے بہت سے دلچسپ نتائج میں یہ دریافت بھی شامل تھی کہ واقعی مذہبیت کا تعلیم سے منفی تعلق ہے (زیادہ تعلیم یافتہ لوگ کم مذہبی ہوتے ہیں)۔ مذہبیت سائنس سے دلچسپی اور سیاسی آزاد پسندی سے بھی منفی طور پر تعلق رکھتی ہے۔ یہ نتائج قطعاً حیران کن نہیں ہیں، اور نہ ہی یہ نتیجہ کہ لوگوں کی مذہبیت کا ان کے والدین کی مذہبیت سے مثبت رابطہ ہے۔ ماہرین عمرانیات نے برطانوی بچوں کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ دریافت کیا کہ ۱۲ میں سے صرف ۱ بچہ اپنے والدین کے مذہبی اعتقادات سے منحرف ہوتا ہے۔

جیسا کہ آپ توقع کر سکتے ہیں، مختلف محققین چیزوں کو مختلف طریقوں سے جانچتے ہیں، اس لئے ان کے تحقیقاتی کام کا موازنہ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ تفتیش کرنے کے خواہش مند لوگ مابعد تجزیہ (meta-analysis) کی تکنیک کا سہارا لیتے ہیں، جس میں کسی موضوع پر شائع کئے گئے تمام مقالوں کو نتائج کی بنیاد پر گن لیا جاتا ہے۔ میرے علم میں مذہبیت اور ذہانت کے موضوع پر صرف ایک ہی مابعد تجزیہ ہے جو پال بیل نے ۲۰۰۲ میں مینسا میگزین[53] میں چھاپا تھا۔ بیل نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ۱۹۲۷ سے لے کر آج تک کی گئی ۴۳ جائزوں میں سے سوائے چار کے باقی سب میں مذہبیت اور ذہانت / تعلیم کے

درمیان منفی تعلق پایا گیا۔ یعنی جتنا زیادہ کسی کی ذہانت یا تعلیم کا معیار بڑھتاہے، اتنا ہی اس شخص کے مذہبی عقائد رکھنے کے امکانات کم ہوتے چلے جاتے ہیں ۔

مابعد تجزیات فطرتاً ہی ان تحقیقات سے کم مخصوص ہوں گے جو اس مابعد تجزیہ میں شامل کی گئیں۔ ان خطوط پر مزید تحقیقات کرائی جانی چاہئے ، اور اعلٰی مرتبے کے اداروں کے ممبران پر بھی تحقیق ہونی چاہئے ، جیسے کہ قومی ادارے، یا نوبل، کرافورڈ، فیلڈز، کیوٹو، کاسموس وغیرہ جیسے انعامات جیتنے والے سائنسدان۔ میری خواہش ہے کہ اس کتاب کے مستقبل میں چھپنے والے شماروں میں ایسی تحقیق کے نتائج بھی شامل کئے جا سکیں۔ موجودہ تجزیات سے ایک نتیجہ تو یقیناً اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مذہبی عذر خواہوں کے لئے بہتر ہو گا کہ کم از کم سائنسدانوں کی حد تک وہ معتبر اور قابل تعریف خواتین و حضرات سے دلیل کے سلسلے میں اپنے روایتی جوش و خروش کی بجائے خاموشی اختیار کریں۔

## پاسکال کی شرط

عظیم فرانسیسی ریاضی دان بلیز پاسکال کا خیال تھا کہ خدا کے نہ ہونے کے امکانات کے بارے میں شبہات کتنے ہی شدید کیوں نہ ہوں، غلط اندازے لگانے کی سزا اس سے زیادہ ہی ہو گی۔ بہتر ہے کہ آپ خدا میں یقین کر لیں کیونکہ اگر آپ صحیح ہوں گے تو آپ کو ابدی راحت اور آسائش میسر آئے گی، اور اگر آپ غلط ہوئے تو آپ کا کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ اس کے برعکس، اگر آپ نے خدا پر ایمان نہ رکھنے کا فیصلہ کیا اور آپ کا اندازہ غلط نکلا تو آپ کو ہمیشہ ہمیش کے لئے جہنم کی آگ میں جھونک دیا جائے گا، جبکہ غلط ہونے میں آپ کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بظاہر یہ نہایت آسان فیصلہ نظر آتا ہے۔ آپ کو خدا پر یقین کرنا ہی چاہیئے۔ لیکن اس دلیل میں کچھ واضح طور سے عجیب ہے۔ یقین کا فعل ایسا نہیں ہے جسے آپ کسی حکمت عملی کے تحت کر سکیں۔ کم از کم یہ ایسا فعل تو نہیں ہے جس کی نیت کی جا سکے۔ میں چرچ جانے کا فیصلہ کر سکتا ہوں؛ میں نیقیائی عقیدے (Nicean Creed) کا ورد بھی کر سکتا ہوں، اور انجیلوں کے ایک انبار پر قسم بھی کھا سکتا ہوں کہ میں ان میں لکھے ایک ایک لفظ کو مانتا ہوں۔ لیکن اگر میں یقین نہیں رکھتا تو ان حرکات میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جو مجھے حقیقی طور پر یقین کے طرف مائل کر سکے۔ پاسکال کی شرط ایمان کا ڈھونگ کرنے کے حق میں دلیل سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتی۔ اور بہتر ہی ہے کہ جس خدا میں آپ ایمان کا اظہار کر رہیں ہیں وہ علم الغیب رکھنے والا نہ ہو، ورنہ وہ آپ کے ڈھونگ کے آر پار دیکھ لے گا۔ کسی ایسے فعل پر یقین کر لینا جس کو کرنے کا فیصلہ آپ ہی نے کیا ہے ایک احمقانہ خیال ہے جس کو ڈگلس ایڈمز نے *Dirk Gently's Holistic Detective Agency* میں یہ دکھا کر اچھا خاصا مذاق اڑایا ہے کہ آپ کے ایما پر یقین کرنے کے لئے ایک بجلی سے چلنے والا سادھو خرید سکتے ہیں۔ سب سے اعلٰی ماڈل کے اشتہار میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ 'یہ آپ کے لئے ایسی باتوں پر بھی یقین کر لے گا جن پر سالٹ لیک سٹی (مارمن فرقے کا مرکز) میں بھی کوئی یقین نہ کرے گا'۔

ویسے بھی، ہم اس خیال کو اتنی آسانی سے کیوں تسلیم کر لیتے ہیں کہ خدا کو خوش کرنے کی خاطر وہ ایک حرکت جو آپ کو لازماً کرنی ہے وہ ہے کہ آپ اس پر ایمان لائیں۔ ایمان لانے میں ایسی کیا خاص بات ہے؟ کیا اس کا برابر امکان نہیں کہ خدا ہماری رحم دلی ، سخاوت ، عاجزی یا خلوص کا صلہ دے گا؟ اگر خدا ایک سائنسدان ہوا جو سچ کے لئے جستجو کرنے کو سب سے افضل نیکی سمجھتا ہو؟ اور واقعی، اس کائنات کا ترتیب کار سائنسدان کے علاوہ اور ہو ہی کون سکتا ہے؟ برٹرینڈ رسل سے پوچھا گیا کہ اگر مرنے کے بعد آپ کا خدا سے سامنا ہو گیا اور خدا نے پوچھا کہ آپ نے اس پر ایمان کیوں نہیں لایا، تو آپ کیا کہیں گے؟ 'رسل نے جواب دیا: خاطر خواہ ثبوت نہیں تھے خدا، خاطر خواہ ثبوت نہیں تھے'۔ کیا خدا پاسکال کی ڈرپوک شرط کے مقابلے میں رسل کے دلیرانہ شکوک کی قدر نہ کرتا (اور اس دلیرانہ امن پسندی کی، جس کی وجہ سے رسل کو پہلی جنگ عظیم کے دور میں جیل کی ہوا کھانی پڑی)؟ اور اگرچہ ہم یہ تو نہیں بتا سکتے کہ خدا کا جھکاؤ کس جانب ہوتا، ہمیں پاسکال کی شرط کی نفی کرنے کے لئے یہ جاننے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یاد رکھئے ہم ایک شرط کی بات کر رہے ہیں ، اور پاسکال خود اس بات کا معترف تھا کہ اس کی شرط کے ممکنات بہت قلیل ہیں۔ کیا آپ اس بات کی آس لگائیں گے کہ خدا آپ کے ایمان کے ڈھونگ کو (یا حقیقی ایمان کو) حقیقی شک پسندی کے اوپر ترجیح دے گا؟

اچھا چلئے! یوں سوچئے کہ مرنے کے بعد آپ کی جس خدا سے ملاقات ہو گی وہ قدیم شامی تہذیب فونیشیا کا خدا بآل ہو، اور وہ اتنا ہی جلن کا مارا ہو جتنا اس کا عبرانی دشمن یاہوے تھا۔ ایسی صورت میں کسی خدا کے حق میں پاسکال کی شرط لگانے کی بجائے بہتر نہ ہو گا کہ خدا کے نہ ہونے پر ہی لگا دی جائے؟ حقیقت میں دیکھا جائے تو دنیا میں (مختلف مذاہب کے) خداؤں کی بہتات پاسکال کی شرط کی منطق کو ہی ناقص بنا دیتی ہے۔ جب پاسکال نے یہ شرط پیش کی تو شاید وہ مزاح کا سہارا لے رہا تھا، جیسے اس وقت میں شرط کی منطق کو رد کرتے ہوئے کر رہا ہوں۔ لیکن میں کئی بار ایسے لوگوں سے ملا ہوں، خصوصاً کسی لیکچر کے بعد سوال و جواب کے وقت، جو پاسکال کی شرط کو خدا کے وجود کے حق میں سنجیدہ دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں، اس لئے یہاں اس پر کچھ وقت صرف کرنا مناسب تھا۔

کیا کسی پاسکال مخالف شرط کے بارے میں بحث کرنا ممکن ہے؟ فرض کیجئے کہ ہم از راہ بحث مان لیں کہ کسی خدا کے ہونے کا کوئی قلیل سا امکان ہے۔ اس کے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر آپ خدا کے نہ ہونے پہ شرط لگائیں تو آپ کے ایک بھرپور زندگی گزارنے کے امکانات زیادہ روشن ہیں بہ نسبت کہ آپ اس کے ہونے پہ شرط لگا بیٹھیں اور اپنا قیمتی وقت اس کی عبادت میں، اس کے نام پہ قربانیاں دینے میں، اس کے لئے لڑنے اور مرنے وغیرہ میں برباد کر دیں۔ میں یہاں اس سوال کو مزید نہیں کریدوں گا، لیکن جب ہم آنے والے ابواب میں مذہبی عقائد اور رسومات سے منسلک شر پہ گفتگو کریں گے تو قارئین شاید اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا پسند کریں۔

## بیزائی منطق کے دلائل

## Baysian Arguments

میرے خیال میں سٹیفن انون نے *The Probability of God* میں خدا کو ثابت کرنے کی غرض سے بیزائی منطق سے جو دلیل دی ہے وہ میری نظر سے گزرنے والی تمام ایسی کاوشوں میں سب سے عجیب و غریب ہے۔ میں اس کو کتاب میں شامل کرنے سے پہلے کچھ دیر ہچکچاتا بھی رہا۔ کیونکہ یہ سب سے کمزور بھی ہے اور قدیم نہ ہونے کی وجہ سے کسی قسم کے تقدّس سے بھی عاری ہے۔ اس کے باوجود اینون کی کتاب کو ۲۰۰۳ میں اشاعت کے وقت خاصی پزیرائی ملی، اور کم از کم اس میں چند وضاحتی تانے بانے آپس میں ملانے کا موقع تو ملتا ہی ہے۔ مجھے اس کے عزائم سے ہمدردی ہے کیونکہ جیسا کہ میں نے باب ۲ میں لکھا تھا، خدا کا وجود کم از کم ایک سائنسی مفروضے کے طور پر ضرور قابل تفتیش ہے۔ اور ویسے بھی انون کے وجود خدا کے امکان پر ایک عدد چپکانے کی شیخ چلّی نما کاوش بہت دل آویز تھی۔

کتاب کے ذیلی عنوان "حتمی سچ کو ثابت کرنے کا ایک آسان حساب ۔ A Simple Calculation that Proves the Ultimate Truth" میں ناشر کی مداخلت کے تمام خواص موجود ہیں، کیونکہ کتاب میں اس ذیلی عنوان کی خود اعتمادی کہیں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ کتاب کو تراکیب کے مجموعہ کے طور پر دیکھنا بہتر ہو گا، تھامس بیز کے کلیہ (Bayes' Theorem) کی آسان وضاحت جس میں خدا کے وجود کو ایک خوش مزاج مثال کے طور پر شامل کیا گیا ہو۔ انون خدا کی جگہ کسی فرضی قتل کو بھی اتنی ہی کامیابی سے مثال کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔ تفتیشی افسر تمام شواہد جمع کرتا ہے۔ ریوالور پر انگلیوں کے نشان مسز پی کاک کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ اپنے شک کا تعین کرنے کے لئے اس پر شماریاتی امکان کا ایک عدد لگا دیجئے۔ لیکن پروفیسر پلم کے پاس مسز پی کاک کو پھنسانے کے لئے محرّک تھا۔ اب آپ مسز پی کاک پر شک کے شماریاتی امکان میں سے اتنی قدر گھٹا دیں۔ طب قانونی کے شواہد (forensic evidence) بتاتے ہیں کہ اس بات کا ۷۰ فیصد امکان ہے کہ گولی بہت فاصلے سے نہایت مہارت سے چلائی گئی ، لہٰذا قاتل کوئی ایسا شخص تھا جس نے فوجی تربیت حاصل کر رکھی تھی۔ کرنل مسٹرڈ پر شک کے شماریاتی عدد کو بڑھا دیجئے۔ ریورنڈ گرین کے پاس قتل کا سب سے قرین قیاس محرّک ہے[******]۔ اس کردار پر شک کے شماریاتی امکان کو بڑھا دیجئے۔ لیکن مقتول کی جیکٹ سے ملنے والا بال تو مس سکارلٹ کا ہی ہو سکتا ہے.... وغیرہ وغیرہ۔ تفتیشی افسر کے دماغ میں ذاتی تاثرات کی بنا پر پیدا ہونے والے کئی امکانات اسے مختلف سمتوں میں کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسے بیز کے کلیے کی مدد سے کسی فیصلے پر پہنچ جانا چاہئے۔ یہ کلیہ ریاضی کا استعمال کرتے ہوئے امکانات کے مختلف اندازوں کو یکجا کر کے ایک حتمی نتیجہ نکالنے کی کوشش کرتا ہے، جس کے شماریاتی امکانات کا اپنا بھی ایک عدد ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ نتیجے کا معیار ان اعداد کے معیار پر منحصر ہے جو کلیے کے حساب میں ڈالے جائیں۔ یہ اعداد بشمول ان تاثرات سے منسلک شکوک کے ذاتی تاثرات پر مبنی ہوتے ہیں ۔ یہاں "کچرا اندر کچرا باہر" کے اصول کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور انون کے خدا کی مثال کے سلسلے میں "اطلاق" بہت ہلکا لفظ ہے۔

انون اقتصادی خطرات سے نپٹنے کے لئے مشاورت دیتا ہے (risk management consultant) اور اپنے کام میں دیگر شماریاتی طریقوں کے مقابلے میں بیزائی تخمینے کو ترجیح دیتا ہے۔ اپنی کتاب میں بیز کے کلیے کے مظاہرے کے لئے کسی قتل کی تفتیش کا ذکر کرنے کی بجائے اس نے انسانیت کے سب سے مشکل معمے پر ہاتھ ڈالا ہے، یعنی خدا کا وجود۔ منصوبے کے مطابق مکمل بے یقینی سے شروعات کرتے ہوئے اس نے خدا کے ہونے یا نہ ہونے کو برابر برابر ۵۰ فیصد امکان سے نوازنے کا فیصلہ کیا۔ پھر اس نے چھ حقائق کی فہرست بیان کی جو اس کے خیال میں اس مسئلے پر اثر انداز ہو سکتے ہیں، اور ہر ایک کو ایک

---

[******] برطانیہ جہاں یہ کھیل Cluedo ایجاد ہوا، یا آسٹریلیا، نیو زی لینڈ، انڈیا اور ہر ایسے ملک میں جہاں یہ کھیل بکتا ہے اس کردار کا نام "ریورنڈ" (پادری) گرین ہی ہے۔ لیکن شمالی امریکہ میں اس کا نام بدل کر مسٹر گرین رکھ دیا گیا۔ یہ ہو کیا رہا ہے بھئی؟

اعدادی وزن (numerical weightage) دیا، انہیں بیزائی کلیے میں ڈالا اور دیکھا کہ نتیجتاً کیا عدد سامنے آتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ یہ چھ اعداد پیمائش کی ہوئی مقداریں نہیں ہیں بلکہ انون کی ذاتی ترجیحات ہیں، جنہیں تجربے کی خاطر اعداد میں ڈھال دیا گیا ہے۔ یہ چھ حقائق درج ذیل ہیں:

۱. ہم سب میں اچھائی کی حس موجود ہے۔
۲. لوگ برے کام کرتے ہیں (ہٹلر، سٹالن، صدام حسین)
۳. قدرت برے کام کرتی ہے (زلزلے، سونامی، طوفان)
۴. چھوٹے موٹے معجزات ہو سکتے ہیں (میری کھوئی ہوئی چابیاں مل گئیں)
۵. بڑے معجزات ہو سکتے ہیں (عیسیٰ مسیح دوبارہ زندہ ہو گئے)
۶. لوگوں کو مذہبی تجربات ہوتے ہیں۔

اس بچکانہ بیزائی دوڑ میں جہاں خدا کبھی سب سے آگے نکلتا ہے، کبھی پیچھے رہ جاتا ہے، اور پھر اپنے شروع کے ۵۰ فیصدعدد تک پہنچ جاتا ہے، انون کے آخری اندازے کے مطابق اس کے ہونے کا امکان ۶۷ فیصد نکلتا ہے۔ یہاں انون ایک صوابدیدی فیصلہ کرتا ہے کہ ۶۷ فیصد کافی نہیں ہے، اور وہ "ایمان" کا عنصر متعارف کرواتے ہوئے خدا کے وجود کے امکان کو ۹۵ فیصد تک بڑھا دیتا ہے۔ سننے میں مذاق لگتا ہے لیکن اس نے حقیقتاً ایسا ہی کیا۔ کاش میں آپ کو بتا سکوں کہ اس نے اس حرکت کی کیا توجیہ پیش کی، لیکن کہنے کو کچھ بھی تو نہیں ہے۔ میں نے اس قسم کی بے معنی حرکتیں کئی بار دیکھی ہیں، جب میں نے ذہین اگر چہ مذہبی سائنسدانوں سے شواہد کی غیر موجودگی میں اپنے عقائد کے دفاع کرنے کی درخواست کی ہے: 'میں تسلیم کرتا ہوں کہ کوئی ثبوت یا شواہد نہیں ہیں۔ اسی لئے تو اسے ایمان کہتے ہیں" (یہ جملہ ایک بد مزاج تیقّن سے اور عذر و مدافعت سے پاک لہجے میں ادا کیا جاتا ہے)۔

حیران کن طور پر انون کے چھ "حقائق" میں ترتیب سے دلیل شامل نہیں ہے، نہ آکویناس کے پانچ "ثبوت"، اور نہ ہی وجودیت کی کوئی اور دلیل۔ اس کو ان کی کوئی پروا نہیں۔ اس کے خدا کے شماریاتی تخمینے میں ان کا رتّی برابر بھی عمل دخل نظر نہیں آتا۔ ایک قابل ماہر شماریات کی طرح وہ ان پر بحث کر کے انہیں خارج کر دیتا ہے۔ میرے خیال میں یہ بات اس کے حق میں ہی جاتی ہے، اگر چہ اس کی ان کو خارج کرنے کی وجوہات میری وجوہات سے مختلف ہیں۔ لیکن جن دلائل کو وہ اپنے بیزائی دروازے کے راستے اندر آنے کی اجازت دیتا ہے وہ بھی اتنے ہی کمزور ہیں۔ انون امکانات کے وزن کے بارے میں جو ذاتی فیصلے کرتا نظر آتا ہے وہ شاید میرے ذاتی فیصلوں سے فرق ہوں۔ تو پھر ذاتی تاثرات کی پروا ہی کیوں کی جائے؟ وہ سمجھتا ہے کہ ہم میں صحیح اور غلط میں تمیز کرنے کی حس خدا کے ہونے کا اشارہ دیتی ہے جبکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس حس کی موجودگی کا اس کے شروع کے ۵۰-۵۰ کے اندازے پر کوئی اثر نہیں پڑ نا چاہئے۔ باب ۶ اور ۷ میں میں آپ کو دکھاؤں گا کہ کیسے اچھے اور برے میں تمیز کی حس کے کسی مافوق الفطرت ہستی کے وجود سے تعلق ہونے کی کوئی خاطر خواہ دلیل ممکن نہیں۔ جیسے ہمارے بیٹھوون کی موسیقی سے لطف اندوز ہونے کی حس بلا شرکت خدا موجود ہے، اسی طرح اچھے ،برے کی تمیز کی حس بھی موجود ہے (اگرچہ اس پر عمل کرنے یا نہ کرنے کی ترغیب شاید نہیں ہے)۔

اس کے برعکس انون کہتا ہے کہ برائی کا وجود (خصوصاً قدرتی برائیاں جیسے زلزلے اور سونامی وغیرہ) خدا کے وجود کی نفی کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ یہاں انون کا اندازہ مجھ سے بالکل مختلف ہے لیکن بہت سے علماء دین کے خیالات سے مماثلت رکھتا ہے۔ اثبات عدل الٰہی (برائی کی موجودگی میں خدا کی الٰہیت کے ثبوت پیش کرنا) علماکی راتوں کی نیند حرام کر دیتاہے۔ فلسفے کی مستند و معتبر کتاب *Oxford Companion to Philosophy* برائی کے مسئلے کو 'روایتی توحید پرستی کے خلاف سب سے طاقتور اعتراض' سمجھتی ہے۔ لیکن یہ اعتراض صرف ایک "اچھے" خدا کے خلاف ہے۔ "اچھائی" کی صفت مفروضہ ٔخدا کی تعریف کا حصہ نہیں ہے، محض ایک قابل قبول اضافہ ہے۔

اس بات کو تسلیم کرنے کی ضرورت ہے کہ مذہبی ذہنیت رکھنے والے لوگ جس بات کو سچ سمجھنا چاہتے ہیں اور حقیقی سچ کے درمیان تفریق نہیں کر پاتے۔ لیکن کسی نفیس معتقد کے لئے برائی کے مسئلے کو زیر کرنا بچکانا حد تک آسان ہے۔ محض کسی نفرت انگیز خدا کا تصوّر کر لیجئے ۔ جیسا کہ صحیفۂ قدیم میں پایا جاتا ہے۔ اور اگر آپ کو ایسا کرنا گراں گزرتا ہے تو کوئی مدمابل خدا ایجاد کر لیجئے اور اس کا نام شیطان رکھ دیجئے، اور دنیا میں پائی جانے والی ساری برائی کا الزام اس کی آپ کےاچھے خدا سے جنگ پر لگا دیجئے۔ یا اس سے بھی نفیس حل ۔ ایک ایسے خدا کا خاکہ تراش لیجئے جسے عام انسانوں کے دکھوں پر توجہ دینے کا وقت نہیں کیونکہ وہ اس سے بڑھ کر کسی کام میں مصروف ہے۔ یا ایک ایسا خدا جو انسان کی تکلیف سے لا تعلق تو نہیں ہے لیکن ایک منظّم، با قانون کائنات

میں فیصلے کی آزادی کی قیمت سمجھتا ہے۔ علماء ان جیسی کئی پر فریب توجیہات کو قبول کرتے اور پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

ان وجوہات کی بنا پر اگر میں انون کی بیزائی مشق کو دہراتا، تو نہ تو میرا جھکاؤ برائی کے مسئلہ کی طرف ہوتا اور نہ ہی اخلاقی تحفظات کی طرف ، لیکن میں اس نقطے پر مزید وقت صرف نہیں کرنا چاہتا، کیونکہ مجھے ذاتی رائے سے کوئی سروکار نہیں، خواہ وہ انون کی ہو یا میری اپنی۔

اس سے ایک بہت طاقتور دلیل ہے جو ذاتی رائے پر انحصار نہیں کرتی، اور وہ ہے غیر اغلبیت کی دلیل۔ یہ واقعی ہمیں٥٠ فیصد الحاد "سے دور لے آتی ہے۔ توحید پرستوں کی رائے میں ایمان کی طرف اور میری رائے میں دہریت کی طرف۔ میں اس کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں۔ ساری دلیل اس سوال پر مبنی ہے: "خدا کو کس نے بنایا"؟ جو سوچنے سمجھنے والے لوگ اکثر خود ہی دریافت کر لیتے ہیں۔ منظّم پیچیدگی کو سمجھنے کے لئے ایک ترتیب کار خدا کا تصوّر استعمال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جو خدا اتنی پیچیدہ تخلیق کر سکتا ہے ، اس کا اپنی تخلیق جتنا یا اس سے زیادہ پیچیدہ ہونا ناگزیر ہے۔ اور پھر ہمیں اس خدا کی پیچیدگی کی وضاحت مانگنی پڑے گی۔ خدا ہمارے سامنے ایک لامتناہی "الٹ چال" کھڑی کر دیتا ہے جس سے اس کا اپنا فرار ناممکن ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ میں اگلے باب میں دکھاؤں گا، اگرچہ خدا کے وجود کی نفی ممکن نہیں، لیکن اس کے وجود کے امکانات کا ناپید ہونا ثابت کرنا مشکل نہیں ہے۔

# باب ۴: حتمی طور پر ایسا کیسے کہا جا سکتا ہے کہ خدا نہیں ہے؟

مختلف مذاہب کے پنڈت پروہت مولوی سائنس کی ترقی سے خوفزدہ ہیں جیسے جادوگرنیاں صبح کی روشنی سے ڈرتی تھیں، اور ان کے فریب کے تسلط کے بکھر جانے کی خبر لانے والی (سائنس) کو غصّے سے آنکھیں دکھاتے ہیں۔ (تھامس جیفرسن)

## حتمی بوئنگ ۷۴۷

خدا کے حق میں تمام دلائل میں سے سب سے اہم دلیل غیر اغلبیت سے دلیل ہے۔ "ترتیب سے دلیل" کے بہروپ میں یہ خدا کے وجود کے حق میں دور حاضر کی سب سے مقبول عام دلیل ہے اور حیران کن بات یہ ہے کہ کئی دہریے بھی اس کے قائل کرنے کی طاقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہ واقعی ایک نہایت مضبوط اور لاجواب دلیل ہے۔ لیکن شاید وحدانیت پسندوں کی نیت سے بالکل متضاد۔ غیر ممکنات سے دلیل کو اگر صحیح طریقے سے استعمال کیا جائے تو یہ خدا کے وجود کے نہ ہونے کو ثابت کرنے کے بہت ہی قریب آ جاتی ہے۔ میں خدا کے نہ ہونے کے اسے شماریاتی مظاہرے کو شطرنج کی چال کے مترادف سمجھتا ہوں۔ اس لئے میں نے اس کا نام بھی "حتمی بوئنگ ۷۴۷ کی چال" رکھا ہے۔

یہ نام میں نے فریڈ ہوئیل کے بوئنگ ۷۴۷ اور کباڑ خانے کے فرحت آمیز تصوّر سے لیا ہے۔ مجھے ٹھیک سے معلوم تو نہیں کہ یہ ہوئیل نے لکھا تھا یا نہیں، لیکن اس کے قریبی دوست چندرا وکرماسنگھے نے اسے ہائیل سے ہی منسوب کیا ہے اور اس کے مستند ہونے کا امکان غالب ہے[۵۴]۔ ہوئیل نے کہا تھا کہ کرّہ ارض پر زندگی کے پیدا ہو جانے کے امکانات اتنے ہی روشن ہیں جتنے کباڑخانے سے گزرتی آندھی کے ایک بوئنگ ۷۴۷ بنانے کے۔ اس کے بعد اور لوگوں نے بھی اس استعارے کو پیچیدہ حیات کے ارتقاء پر تنقید کرنے کی غرض سے مستعار لیا، خصوصاً جہاں اس کا امکان مشکوک ہو۔ ایک گھوڑے، کیڑے یا آسٹرچ کے مختلف حصوں کو بغیر ترتیب کے چھینٹ دینے سے ایک مکمل طور پر با حرکت گھوڑے، کیڑے یا آسٹرچ کا پیدا ہو جانا ایسا ہی ہے جیسے کباڑ خانے میں آندھی کے گزرنے سے بوئنگ ۷۴۷ تعمیر ہو جائے۔ تو یہ ہے تخلیق پسند کی دلیل کا لب لباب۔ ایک ایسی دلیل جو صرف ایسا شخص ہی گڑھ سکتا ہے جو قدرتی انتخاب کے عمل کی ابجد سے بھی ناواقف ہو: جو یہ سمجھتا ہو کہ قدرتی انتخاب اتفاقات کا نظریہ ہے۔ جبکہ اصلیت اس سے بالکل الٹ ہے۔

تخلیق پسند لاممکنات سے دلیل کا کچھ یوں تصرف بیجا کرتے ہیں، اور اس سے کچھ خاص فرق نہیں پڑ تا کہ کبھی کبھی وہ "ذہین ترتیب۔ Intelligent Design" کا سیاسی طور پر موزوں لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔ مشاہدے سے گزرا ہوا کوئی کرشمہ۔ عموماً کوئی جاندار یا اس کا کوئی پیچیدہ عضو، لیکن در حقیقت چھوٹے ترین خلیے سے لے کر کائنات تک کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے شماریاتی طور پر غیر ممکن ہونے کی بنا پر مثال کے طور پر استعمال کر لیا جاتا ہے۔ کبھی نظریۂ معلومات (information theory) کا سہارا لیا جاتا ہے: ڈارون کے معتقد کو جاندار مادّے میں معلومات کے ذخیرے کی موجودگی کی وضاحت فراہم کرنے کے لئے للکارا جاتا ہے، اور یہاں معلومات سے مراد اس کی تکنیکی تعریف ہے، یعنی کسی چیز کے نہ ہونے کے امکانات کا اندازہ۔ یا پھر ماہرین اقتصادیات کے دقیانوسی قول کو شامل بحث لایا جاتا ہے کہ "مفت کی دعوت کے نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی"۔ اور ڈارون کے نظریے پر الزام تھوپ دیا جاتا ہے کہ وہ کچھ خرچ کئے بغیر کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ در حقیقت جیسا میں اس باب میں دکھاؤں گا، ڈارون کا نظریہ قدرتی انتخاب ہی وہ واحد نظریہ ہے جو اس ناقابل حل مسئلے کا حل ہے کہ یہ ساری معلومات کہاں سے آئی ہیں۔ دوران بحث ثابت یہ ہوتا ہے کہ اصل میں یہ مفروضہ خدائی ہے جو کچھ خرچ کئے بغیر کچھ حاصل کرنا چاہ رہا ہے۔ خدا مفت کی دعوت اڑانا بھی چاہتا ہےاور بننا بھی۔ آپ جتنا کسی ترتیب کار (designer) کو کسی شماریاتی طور پر غیر ممکن ذات کی وضاحتیں دینے کے لئے بروئے کار لاتے جائیں، آپ کے ترتیب کار کو کم از کم اتنا ہی ناممکن ہونا پڑے گا۔ خدا حتمی بوئنگ ۷۴۷ ہے۔

غیر اغلبیت (improbability) سے دلیل یہ کہتی ہے کہ پیچیدہ چیزیں حادثاتی طور پر وجود میں نہیں آ سکتیں۔ لیکن بہت سے لوگ "حادثاتی طور پر وجود میں آنے" کو "سوچی سمجھی ترتیب کی غیر موجودگی میں وجود میں آنے" کے مترادف سمجھ لیتے ہیں۔ لہٰذا اگر وہ سمجھیں کہ غیر ممکنات ترتیب کا ثبوت فراہم کرتی ہے تو اس بات پر حیران نہ ہونا چاہئے۔ ڈارون کا نظریہ قدرتی انتخاب ہمیں دکھاتا ہے کہ حیاتیاتی غیر ممکنات کی رو سے ایسا سوچنا کس قدر غلط ہے۔ مزید برآں اگرچہ ڈارون کا نظریہ ارتقاء ہمیں بیجان دنیا کے بارے میں براہ راست کوئی وضاحت فراہم نہیں کرتا، سوچ کا یہ انداز ہمارے شعور۔ مثال کے طور پر

---

ذہین ترتیب کو تمسخرانہ انداز میں "سستی شیر وانی میں چھپی تخلیق پسندی" بھی کہاجاتا ہے۔

علم فلکیات کو بلند کرنے میں ضرور مدد دیتا ہے۔

ڈارون کے نظریے سے گہری آگاہی ہمیں اس آسان مفروضے سے خبردار کرتی ہے کہ ترتیب ہی حادثے کا متبادل ہے، اور ہمیں پیچیدگی کی رفتہ بڑھتی ہوئی ڈھلانوں پر بڑھنا سکھاتی ہے۔ ڈارون سے پہلے ہی ہیوم جیسے فلسفی یہ سمجھ چکے تھے کہ حیات کی لاممکنات کا مطلب یہ نہیں کہ یہ یقیناً ترتیب کا ہی نتیجہ ہو گی، لیکن وہ کسی متبادل زاویہ نگاہ کے بارے میں سوچنے میں ناکام تھے۔ لیکن ڈارون کے بعد تو ہم سب کو اپنی ہڈیوں تک میں نظریہ ترتیب کے خیال کے بارے میں بھی شبہ محسوس ہونا چاہئے۔ ترتیب کا فریب نظر ایسا جال ہے جس میں انسان پہلے بھی پھنس چکا ہے، اور ڈارون نے اس کے اثرات کے خلاف ہماری قوت مدافعت میں اضافہ کیا ہے۔ کاش کہ اثر سب لوگوں پر ہوا ہوتا۔

## بیداریٔ شعور بطور قدرتی انتخاب

سائنس فکشن کے کسی خلائی جہاز میں خلاء نوردوں کو گھر کی یاد ستائی: 'زمین پر تو آجکل بہار کا موسم ہو گا'! آپ شاید فوراً نہ سمجھ پائیں کہ اس جملے میں غلط کیا ہے، کیونکہ شمالی کرّہ ارض پر بسنے والوں کی لاشعوری وطن پرستی اس حد تک ہماری سوچوں میں رچی بسی ہوئی ہے۔ یہاں 'لاشعوری' اصطلاح کا استعمال بالکل درست ہے ۔ اور یہیں سے بیداریٔ شعور کا سفر شروع ہوتا ہے۔ آسٹریلیا اور نیو زی لینڈ میں آپ ایسے نقشے خرید سکتے ہیں جن میں قطب جنوبی کو اوپر دکھایا جاتا ہے، اور ایسا کرنے کا مقصد محض مزاح سے بڑھ کر ہے۔ ہمارے شمالی کرّہ ارض کے سکولوں میں ٹنگے ہوئے ایسے نقشے بیداریٔ شعور کے لئے کتنا اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ بچوں کو روزانہ یہ باور کرایا جائے کہ "شمال" ایک صوابدیدی قطب ہے جس کے "اوپر" کوئی اجارہ داری نہیں۔ وہ گھر جا کر اپنے والدین کو بتائیں گے ۔ ایک استاد اپنے شاگردوں کو اس سے بہتر کیا تحفہ دے سکتا ہے کہ وہ گھر جا کر اپنے والدین کو "حیران" کر سکیں؟

بیداری شعور کی طاقت کے بارے میں میرے شعور کی بیداری میں تحریک نسواں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ تاریخ کو انگریزی میں history کی بجائے HER-story کہنا اچھا خاصہ حماقت خیز ہے، کیونکہ لفظوں کے علم کے مطابق تاریخ میں "his" کا مردانہ ضمیر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ ۱۹۹۹ میں واشنگٹن کے ایک سرکاری اہلکار کی لفظ "niggardly" استعمال کرنے کے الزام پر برطرفی جتنا ہی احمقانہ ہے ، کیونکہ اس لفظ کا نسلی تعصب سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن niggardly یا herstory جیسی احمقانہ مثالیں بھی ہمارے شعور کی بیداری میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ اپنی ہنسی پر قابو پا لینے کے بعد جب ہم سنجیدگی سے herstory کو دیکھتے ہیں تو ہمیں تاریخ کا ایک نیا زاویہ نظر آتا ہے۔ صنف سے منسلک ضمیر ایسی بیداریٔ شعور کے ہراول دستوں میں شامل ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آپ سے پوچھتا یا پوچھتی ہے کہ اپنے طرز تحریر کے تناظر میں کیا وہ اس طرح کی بات لکھ سکتا یا لکھ سکتی ہے؟ اگر ہم زبان کے اس بھاری بھرکم غیر موزونیت سے آگے بڑھ سکیں تو دنیا کی آدھی آبادی کے احساسات کے بارے میں ہمارا شعور بیدار ہو گا۔ انگریزی زبان میں ایسی بہت سی ترکیبیں ہیں جو عورت کو بحث سے خارج ہی کر دیتی ہیں، جیسے کہ Man, Mankind, the Rights of Man, all men are created equal, one man one vote.. وغیرہ وغیرہ ۔ جب میں جوان تھا تو کبھی میرے وہم و گمان میں بھی نہ آیا تھا کہ انسانیت کے مستقبل کی انگریزی اصطلاح the future of Man خواتین کو کس قدر ہتک آمیز لگتی ہو گی۔ آنے والی دہائیوں میں حقوق نسواں کے بارے میں ہم سب کا شعور بیدار ہوا۔ وہ لوگ جو آج بھی human کی جگہ man استعمال کرتے ہیں یا تو معافی کا لہجہ اختیار کرتے ہیں یا پھر دانستہ لسانی روایات کے علم بردار بن کر خواتین کو ذہنی کوفت پہنچانے کے لئے کرتے ہیں۔ اس روح العصر (سوچ کے غالب رجحان) کے تمام ہی شرکاء نے اپنے شعور کی بیداری کو محسوس کیا ہے۔ اور اس بیداری میں وہ بھی شامل ہیں جنہوں نے شدت کی حد تک منفی رویہ اختیار کیا۔

تحریک نسواں نے ہمیں بیداری شعور کی طاقت دکھائی ہے، اور میں قدرتی انتخاب کے لئے ان کا طریقۂ کار مستعار لینا چاہتا ہوں۔ قدرتی انتخاب کا نظریہ صرف عالم حیات کی وضاحت ہی پیش نہیں کرتا؛ وہ ہمارے اندر مرتّب پیچیدگی کے کسی دانستہ رہنمائی کے بغیر ہی نہایت سادہ شروعات سے پیچیدگی کی حالت تک پہنچنے کے بارے میں سائنس کی قوت وضاحت کے شعور کو بھی جگاتا ہے۔ قدرتی انتخاب کی بھرپور سمجھ ہمیں دوسرے میدانوں میں بھی بے خوفی سے پیش قدمی کرنے کی ہمّت دیتی ہے۔ ہمیں ان دیگر میدانوں میں بھی جھوٹے متبادل زاویوں پر ویسے ہی شک کرنے کی تقویت ملتی ہے جو کبھی ڈارون سے پہلے کے زمانے میں حیاتیات کے لئے عذاب بنے رہتے تھے۔ ڈارون سے پہلے تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ تتلی کے رنگین پر یا عقاب کی آنکھ جیسی چیزیں جو ہمیں ظاہری طور پر ترتیب کا نتیجہ لگتی تھیں دراصل ایک بہت ہی طویل اور غیر حادثاتی قدرتی عمل کا حتمی حاصل ہیں۔

---

کلاسیکی لاطینی اور یونانی زبانیں اس سلسلے میں بہتر طور پر تیار تھیں۔ لاطینی میں homo یا یونانی میں anthro کا مطلب مرد نہیں انسان ہے۔ وہاں مرد کے لیئے (andro) vir اور عورت کے لئے femina (gyne) استعمال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اینتھروپالوجی تمام انسانیت سے تعلق رکھتی ہے جبکہ اینڈرولاجی امراض مردانہ اور گائینیکالوجی امراض نسواں کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔

ڈگلس ایڈمز کا اپنے انتہا پسند دہریہ بننے کا (ایڈمز نے انتہا پسند کی ترکیب پر اصرار کیا تھا کہ کہیں کوئی انہیں "محض" ملحد نہ سمجھ بیٹھے) دل کو چھو لینے والا لیکن مزاحیہ واقعہ ڈارون کے نظریے کی بیدارئ شعور کی قوت کی گواہی دیتا ہے۔ مجھے نیچے دیے گئے اقتباس کو شامل کرنے میں جذباتی خوشی محسوس ہوئی ہے اس کے لئے میں قارئین سے معافی کا خواستگار ہوں۔ میرا عذر یہ ہے کہ ڈگلس میری دیگر پچھلی کتابیں پڑھ کر دہریہ بنا۔ جبکہ ان کتابوں کا یہ مقصد نہیں تھا ۔ لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کا مقصد ہی لوگوں کو الحاد اور دہریت کی راہ دکھانا ہے، اس لئے اسے ڈگلس ایڈمز کی یاد کے نام ہی کرنا چاہئے۔ ایک انٹرویو میں جو اس کی وفات کے بعد Salmon of Doubt میں بھی چھپا، صحافی نے ڈگلس سے پوچھا کہ وہ دہریہ کیسے بنا۔ اس نے اپنے جواب کا آغاز اس انکشاف سے کیا کہ پہلے وہ ملحد بنا تھا:

> میں سوچتا رہا اور میں سوچتا رہا اور میں سوچتا رہا۔ لیکن میرے پاس آگے بڑھنے کے لئے کوئی مواد تھا نہیں، اس لئے میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ مجھے خدا کے خیال کے بارے میں شدید شبہات تو تھے، لیکن میں کسی بھی اور چیز کے بارے میں تفصیلاً کچھ جانتا نہیں تھا کہ زندگی، کائنات، اور سب کچھ کے بارے میں کوئی ایسی کارآمد وضاحت گڑھ سکوں جسے میں خدا کے متبادل کے طور پر پیش کروں۔ جب میں تقریباً تیس سال کا تھا تو میرا واسطہ ارتقائی حیاتیات سے پڑا، خصوصاً جب میں نے رچرڈ ڈاکنز کی کتاب "خود غرض جین ۔ The Selfish Gene " اور "اندھا گھڑی ساز ۔ The Blind Watchmaker" پڑھی ۔ میرا خیال ہے "اندھا گھڑی ساز" کو دوبارہ پڑھتے ہوئے یکا یک ایسا لگا کہ سب کچھ اپنی صحیح جگہ آن بیٹھا ہے۔ یہ ایک حیرت انگیز حد تک سادہ تصوّر تھا لیکن زندگی کی تمام ششدر کر دینے والی پیچیدگی اس ہی سے جنم لیتی ہے۔ اس تصوّر کے لئے میرے دل میں جو تقدّس و احترام پیدا ہوا اس کے سامنے مذہبی لوگوں کے تجربات کے نتیجے میں پیدا ہونے والا تقدّس ہیچ لگتا تھا۔ میں ہمیشہ تفہیم کے احترام کو جہالت کے احترام پر فوقیت دوں گا[۵۵]۔

ڈگلس جس حیرت انگیز حد تک سادہ تصوّر کا ذکر کر رہا تھا، اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ تو ڈارون کے نظریہ ارتقاء بذریعہ قدرتی انتخاب سے مرعوب ہوا تھا۔ جو حتمی آلۂ بیدارئ شعور ہے۔ ڈگلس، مجھے تمہاری بہت یاد آتی ہے۔ تم میرے سب سے مزاحیہ، ہوشیار، کھلے ذہن کے مالک، ظریف، دراز قد اور شاید واحد معتقد ہو۔ میری خواہش ہے کہ یہ کتاب تمہیں محظوظ کرتی، لیکن اتنا تو نہیں جتنا تم نے مجھے ہنسایا ہے۔

ڈانئیل ڈینٹ جو فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ سائنس کا بھی علم رکھتے ہیں،انہوں نے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ نظریہ ٔارتقاء ایک بہت ہی قدیم خیال کی نفی کرتا ہے: 'کہ ہمیں کمتر چیز بنانے کے لئے کسی بہت بڑی، دلکش، اور ذہین چیز کی ضرورت ہے۔ میں اسے نظریہ قطرہ بہ قطرہ تخلیق کہتا ہوں۔ آپ کبھی نہیں دیکھیں گے کہ نیزے نے نیزہ بنانے والے کو تخلیق کیا ہو۔ گھوڑے کی نعل نے کبھی لوہار نہیں بنایا۔ کبھی چائے دانی نے کمہار نہیں بنایا'۔[۵۶] ڈارون کی ایسے قابل عمل طریقہ کار کی دریافت جو ایسی غیر بدیہی حرکت کر سکے انسانی سوچ کے لئے سب سے انقلابی اور بیدارئ شعور سے بھری اعانت تھی ۔

علم حیاتیات کے علاوہ سائنس کے دیگر میدانوں میں کام کرنے والے سائنسدانوں کے لئے بھی شعور کی یہ بیداری کتنی اہم ہے یہ سوچ کر بھی حیرانی ہوتی ہے۔ فریڈ ہوئیل ایک زبردست ماہر، طبیعیات و فلکیات تھا، لیکن اس کی بوئینگ ۷۴۷ والی غلط فہمی اور حیاتیات میں دیگر غلطیاں ۔ جیسے کہ حجری ڈھانچے Archaeopteryx (fossil) کو دھوکا قرار دینا ۔ یہ اشارہ دیتے ہیں کہ اس کے شعور کو قدرتی انتخاب کی دنیا سے متعارف کرا کے جگانے کی ضرورت تھی۔ عقلی لحاظ سے شاید وہ ارتقاء کے عمل کو سمجھتا تھا۔ لیکن شاید نظریےے کی قوت کو بھرپور طریقے سے سمجھنے کے لئے آپ کو اس میں ڈوب جانے اور مکمل طور پر سما جانے کی ضرورت ہے ۔

سائنس کے دیگر مضامین ہمارے شعور کو اور طریقوں سے جگاتے ہیں۔ فریڈ ہوئیل کی فلکیات حقیقتاً اور استعارةً کائنات میں ہمیں ہماری اوقات سے آگاہ کرتی ہے اور ہماری خود نمائی ادنٰی اصلیت کو ہمارے سامنے بے رحمی سے پیش کر دیتی ہے، کہ ہم محض کسی قدیم فلکیاتی دھماکے کے نتیجے میں بننے والے ادنٰی سے ملبے کے نقطے پر بیٹھے ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ علم ارضیات (geology) ہمیں باور کراتا ہے کہ ہمارا وجود بطور فرد واحد اور بطور نوع کس قدر حقیر

ہے۔ ارضیات نے جان رسکن کے شعور کو جگا دیا، اور وہ یک لخت چلّا اٹھا: اے کاش کہ یہ ماہرین ارضیات مجھے اکیلا چھوڑ دیں، تو میں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ لیکن وہ منحوس ہتھوڑے! مجھے انجیل کی ہر آیت کے اختتامی لے میں ان کی کھنکار سنائی دے جاتی ہے'۔ ارتقاء بھی ہمارے وقت کے احساس کے ساتھ ایسا ہی کھیل کھیلتا ہے۔ اورر اس میں تعجب کی بات بھی نہیں کیونکہ ارتقاء کا عمل ارضیاتی پیمانۂ وقت پر محیط ہے۔ لیکن ڈارون کا ارتقاء خصوصاً قدرتی انتخاب، اس سے بڑھ کر ایک اور کارنامہ بھی سر انجام دیتا ہے۔ وہ حیاتیات میں نظریہ ترتیب کے بھرم کی دھجّیاں بکھیر دیتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ ہمیں ترغیب دیتا ہے کہ طبیعیات اور فلکیات میں بھی ترتیب کی ہر تجویز کو شک کی نگاہ سے دیکھیں۔ میرے خیال میں ماہر طبیعیات لینارڈ سسکنڈ کے ذہن میں یہی ہو گا جب انہوں نے لکھا کہ 'میں مؤرخ نہیں ہوں لیکن ایک رائے کا اظہار کرنے کی جسارت ضرور کروں گا: جدید فلکیات کا آغاز ڈارون اور والس سے ہی ہوا ہے۔ انہوں نے ہمارے وجود کی ایسی توجیہات پیش کیں جن میں مافوق الفطرت محرکات کو مسترد کیا گیا تھا.... ڈارون اور والس نے صرف علوم حیاتیات ہی نہیں دیگر علوم میں بھی ایک معیار استوار کر دیا'<sup>۵۵</sup>۔ دیگر طبیعیاتی سائنسدان جو بیداریٔ شعور کی ضرورت سے آگے بڑھ چکے ہیں، ان میں وکٹر سٹنگر، جن کی کتاب "کیا سائنس نے خدا کو ڈھونڈ لیا ۔ Has Science Found God " میں آپ کو تجویز کرنا چاہوں گا[§§§§§§]، اور پیٹر ایٹکنز جن کی Creation Revisited سائنسی شاعری کا میرا پسندیدہ مجموعہ ہے، قابل ذکر نام ہیں۔

میں ان مذہبی لوگوں سے ہمہ وقت حیران رہتا ہوں جو اپنے شعور کو جگانے کی بجائے ، قدرتی انتخاب کو خدا کے ذریعہ تخلیق سے منسوب کرتے ہیں۔ وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ قدرتی انتخاب حیات سے بھرپور ایک دنیا بنانے کا نہایت آسان اور نفیس طریقۂ کار ہے۔ خدا کو تو کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ مندرجہ بالا کتاب میں پیٹر ایٹکنز اس انداز فکر کو اس کے منطقی انجام تک لے جاتے ہیں اور ایک ایسے خدا کا تصوّر پیش کرتے ہیں جو کم سے کم کام کر کے کائنات اور حیات پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایٹکنز کا خدا اٹھارویں صدی کی Enlightenment کے خدا سے بھی زیادہ کاہل ہے: حالت فرصت میں بیٹھا ہوا، خالی، بے روزگار، غیر ضروری، ناکارہ۔ قدم بہ قدم، ایٹکنز کامیابی سے اس سست خدا کا کام کم کرتے جاتے ہیں حتٰی کہ وہ قطعی طور پر کچھ نہیں کرتا: ایسا خدا موجود ہونے کی زحمت نہ بھی کرے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہاں مجھے ووڈی ایلن کی کراہنے والی آواز سنائی دیتی ہے: 'اگر ایسا ہو کہ واقعی کوئی خدا ہو، تو میرے خیال میں وہ برا نہیں ہو گا۔ اس کے بارے میں شاید صرف اتنی سی بدترین بات کی جا سکتی ہے کہ اس کی کارکردگی اس کی قابلیت سے کہیں کم نکلی'۔

## ناقابل تخفیف پیچیدگی

ڈارون اور والس جس گتھی کو سلجھانے میں کامیاب ہوئے اس کی پیچیدگی کا جتنا بھی بیان کیا جائے کم ہے۔ میں کسی بھی حیات کی تشریح الاعضاء (anatomy) ، اس کے خلیاتی ڈھانچے (cellular structure) ، حیاتی کیمیا اور روّیے و عادات کو مثال کے طور پر پیش کر سکتا ہوں۔ لیکن بظاہر ترتیب کے سب سے شاندار کارنامے وہ ہیں جو تخلیق پسند مصنف اپنے مقاصد کے لئے چن کر لاتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کچھ ستم ظریفی ہی ہے کہ میں نے بھی اپنی مثالیں ایک تخلیق پسند کتاب "زندگی ۔ یہاں تک کیسے پہنچی؟ Life – How did it Get Here " سے لی ہیں، جس کا کوئی مصنف نہیں لیکن جسے واچ ٹاور بائیبل سوسائٹی نے ۱۶ زبانوں میں شائع کیا ہے اور جس کی ۱۱ میلین جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔ یقیناً یہ ان لوگوں کی محبوب کتابوں میں سے ہے کیونکہ ان ۱۱میلین جلدوں میں سے قریب ۶ یا ۷ میلین تو پوری دنیا سے کرم فرماؤں نے بن مانگے تحائف کے طورپر مجھے ہی بھیج دی ہیں۔

اس اعلٰی اور بے دریغ تقسیم کئے جانے والے نمونے سے بلا امتیاز ایک صفحہ پلٹتے ہوئے ہماری نظر اس اسفنج پر پڑتی ہے جس کا نام 'وینس کی پھولوں کی ٹوکری' (Euplectella) ہے، جس کے ساتھ ہی شہرۂ آفاق ماہر حیاتیات سر ڈیوڈ ایٹنبرو کا اقتباس بھی شامل کیا گیا ہے: 'جب آپ ایک اسفنج کے پیچیدہ ڈھانچے کا معاینہ کرتے ہیں تومعلوم ہوتا ہے کہ یہ سلیکا کا باریک کیلوں سے بنا ہے جسے دیکھ کر حس تخیّل دنگ رہ جاتی ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ نیم آزاد خوردبینی خلیے ہم آہنگی سے کام کرتے ہوئے لاکھوں کرچیاں خارج کریں اور اتنی پیچدار اور خوبصورت جالی بن پائیں؟ معلوم نہیں'۔ واچ ٹاور کے مصنفین ایک لمحہ ضایع کئے بغیر اپنا حرف آخر بھی نتھی کر دیتے ہیں: 'لیکن ساری بات تو ہمیں معلوم ہے، کہ یہ ترتیب حادثاتی طور پر ظہور پزیر نہیں ہوئی۔ سچ ہے کہ حادثہ اس کا ترتیب کار نہیں۔ اس بات پر تو ہم سب متّفق ہو سکتے ہیں۔ کسی بھی نظریۂ حیات کا یہ اوّلین فرض ہے کہ وہEuplectella کے ڈھانچہ کی شماریاتی لا ممکنت جیسے واقعات کے مرکزی معمّے کا حل پیش کرے۔ شماریاتی لا ممکنت کا عدد جتنا بڑا ہو گا، "حادثہ" اتنا ہی کم قرین قیاس (عقل کے مطابق) ہو گا: غیر ممکن کا

---

[§§§§§§] ان کی ۲۰۰۷ کی کتاب *God, the Failed Hypothesis: How Science Shows that God Does Not Exist* بھی ملاحظہ کیجئے

یہی مطلب ہے۔ لیکن عوام میں مقبول غلط تاثر کے برعکس "ترتیب" اور "حادثہ" لا ممکنت کے معمّے کے دو نعم البدل حل نہیں ہیں، بلکہ "ترتیب" اور "قدرتی انتخاب" ہیں۔ زندہ حیاتیات میں لا ممکنت کی بہتات کے پیش نظر حادثے کو حل نہیں مانا جا سکتا، اور کسی بھی دانشمند ماہر حیاتیات نے آج تک اس کو حل کے طور پر پیش نہیں کیا۔ جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے، ترتیب بھی کوئی حل نہیں ہے؛ لیکن فی الحال میں آپ کی توجہ اس مسئلہ پر مرکوز رکھنا چاہتا ہوں، کہ "حادثے" سے کیسے فرار حاصل کیا جائے۔

واچ ٹاور کی کتاب کے اوراق پلٹتے ہوئے ہمارا سامنا ایک دلچسپ پودے سے ہوتا ہے جس کا نام "ڈچ مینز پائپ ۔ *Aristolochia trilobata*" ہے، جس کے سارے حصّے ایک ہی مقصد کے لئے تخلیق کئے ہوئے لگتے ہیں کہ حشرات الارض کو پھنسایا جائے، ان کو زر گل (*pollen*) میں ڈبو دیا جائے اور ایک اور ڈچ مینز پائپ کی جانب روانہ کر دیا جائے۔ اس پھول کی پیچیدہ نزاکت واچ ٹاور کو یہ سوال اٹھانے پر مجبور کر دیتی ہے کہ "کیا یہ سب حادثاتی طور پر ظہور پزیر ہوا یا اس کو کسی درپردہ ذہانت نے ترتیب دیا"؟ ایک بار پھر ہمارا جواب یہی ہے کہ نہیں! یقیناً اس میں حادثے کا کوئی عمل دخل نہیں۔ ایک بار پھر، ہمیں یہ بھی کہنا پڑے گا کہ "ذہین ترتیب" حادثے کا نعم البدل نہیں ہے۔ قدرتی انتخاب صرف کفایتی ، قرین قیاس اور نفیس حل ہی نہیں، یہ حادثے کے مقابلے میں آج تک تجویز کیا جانے والا واحد قابل عمل حل ہے۔ ذہین ترتیب کے خلاف وہی اعتراضات اٹھتے ہیں جو حادثے کے خلاف اٹھتے ہیں۔ یہ شماریاتی لا ممکنت معمّے کا قرین قیاس حل ہیں ہی نہیں۔ اور جیسے جیسے لا ممکنت کا عدد بڑھتا ہے، ذہین ترتیب کم سے کم قرین قیاس ہونے لگتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ذہین ترتیب مشکل کو دوگنا کر دیتی ہے۔ کیونکہ ترتیب دینے والے کی اپنی ابتدا کا سوال کھڑا ہو جاتا ہے۔ کسی ایسی ہستی کا جو ڈچ مینز پائپ جیسی لا ممکن شے بنا سکتی ہے اس سے بھی زیادہ لا ممکن ہونا ضروری ہے۔ اس خوفناک الٹ چال کے خاتمے کی بجائے خدا بڑے بھرپور انداز سے اس کی سنگینی میں اضافہ کرتا ہے۔

آیئے واچ ٹاور کی کتب کا ایک اور صفحہ پلٹتے ہیں اور سرخ تاڑ کے دیو قامت درخت (*Sequoiadendron giganteum*) کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس درخت سے مجھے خاص لگاؤ ہے کیونکہ اس کا ایک چھوٹا سا پودا میرے اپنے باغیچے میں بھی ہے ۔ لگ بھگ سو سال کی چھوٹی عمر کا، لیکن پورے علاقے میں پھر بھی سب سے جسیم۔ 'ایک پستہ قد شخص اس کے بالکل نیچے کھڑے ہو کر اوپر دیکھے تو اس کی جسامت کو حیرت سے گھورتا رہے۔ کیا اس بات میں کوئی منطق ہے کہ اس جسیم درخت اور ان نہایت چھوٹے بیجوں کی تخلیق جس سے یہ پیدا ہوا کسی ترتیب کا نتیجہ نہیں ہے'؟ ہاں! اگر آپ یہ سوچیں کہ ترتیب کا واحد نعم البدل حادثہ ہے تو واقعی اس بات میں کوئی منطق نہیں ہے۔ لیکن مصنفین نے ایک بار پھر تیسرے اور حقیقی متبادل یعنی قدرتی انتخاب کو نظر انداز کر دیا، کیونکہ یا تو وہ اسے سمجھ نہیں پا رہے تھے یا سمجھنا چاہتے ہی نہیں تھے۔

جس عمل سے پودے ۔ چاہے وہ مہین سا مسکیہ (pimpernel) ہو یا نہایت جسیم ویلنگٹونیہ ۔ اپنی نشو نما کے لئے توانائی حاصل کرتے ہیں اسے فوٹو سنتھیسس (ضیائی تا الیف ۔ photosynthesis) کہتے ہیں۔ یہاں پھر واچ ٹاور کی تحریر دیکھئے:'ایک ماہر حیاتیات نے کہا کہ "فوٹو سنتھیسس میں تقریباً ۷۰ کیمیائی عمل کار فرما ہوتے ہیں"۔ سبز پودوں کو قدرت کے "کارخانے" کہا جاتا ہے ۔ خوبصورت، خاموش، ماحولیاتی آلودگی سے پاک، آکسیجن بنانے والے، پانی کو دوبارہ استعمال کرنے والے، اور پوری دنیا کی خوراک کا انتظام کرنے والے کارخانے۔ کیا یہ کارخانے حادثاتی طور پر وجود میں آ گئے؟ کیا یہ قابل قبول ہے'؟ نہیں، یہ واقعی قابل قبول نہیں ہے۔ لیکن مثال در مثال دہرانے سے ہم بحث میں کوئی پیش رفت نہیں کر پائیں گے۔ تخلیق پسندوں کی "منطق" ہمیشہ ایک ہی ہوتی ہے۔ کوئی قدرتی کرشمہ شماریاتی طور پر اس قدر نا ممکن، یا ا پیچیدہ، یا اس قدر خوبصورت، یا حیران کن ہوتا ہے کہ وہ حادثاتی طور پر وجود میں آ ہی نہیں سکتا ہو۔ ان مصنفین کے گمان میں حادثے کا واحد متبادل ترتیب ہی ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ کارنامہ کسی ترتیب دینے والے نے ہی سر انجام دیا ہو گا۔ اور سائنس کا اس کمزور منطق کے لئے ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا ہے۔ حادثے کا واحد متبادل ترتیب نہیں۔ قدرتی انتخاب ایک افضل متبادل ہے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ ترتیب تو سرے سے متبادل ہے ہی نہیں کیونکہ وہ جس معمے کو حل کرتی ہے اس سے بڑے معمے کو جنم دے دیتی ہے: ترتیب کار کو کس نے ترتیب دیا؟ ترتیب اور حادثہ دونوں ہی شماریاتی غیر ممکنات کے مسئلے کا حل فراہم کرنے میں ناکام رہتے ہیں، کیونکہ ایک تو خود مسئلہ ہے اور دوسرا الٹ چال چلتا ہوا مسئلے کی جانب نکل پڑتا ہے۔ صحیح حل صرف قدرتی انتخاب ہی ہے۔ یہ واحد کار آمد حل ہے، اور نہ صرف کار آمد، بلکہ نہایت نفیس، سادہ اور طاقتور حل ہے۔

جبکہ حادثہ اور ترتیب دونوں زندگی کے معمے کا حل فراہم کرنے میں ناکام رہتے ہیں، قدرتی انتخاب ایسا کیا ہے جو اس کو ایک کامیاب حل بناتا ہے؟ قدرتی انتخاب کی کامیابی کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک مجموعی حل ہے، جو غیر اغلیت (improbability) کے مسئلے کو چھوٹے چھوٹے حصّوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ہر حصہ "تھوڑا سا" ناممکن ہے، لیکن امتناعی حد تک نہیں۔ جب ان قریب قریب نا ممکن ٹکڑوں کو سلسلہ وار ایک دوسرے کے اوپر رکھا جاتا ہے تو نتیجہ اتنا شدید نا ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ "حادثے" کی حدود سے باہر ہو جاتا ہے۔ یہی وہ حتمی نتیجے ہیں جو تخلیق پسندوں کی زچ کرنے والی توجیہات کا مرکز بنتے ہیں۔

تخلیق پسند حضرات (اور اس بار خواتین کو اس فہرست میں شامل نہ کئے جانے پر ملال نہیں ہونا چاہئے) بات کو سمجھ ہی نہیں پاتے کیونکہ وہ شماریاتی غیر اغلیت کی ابتداء کو ایک واحد واقعہ قرار دینے پر بضد ہیں۔ وہ مجموعات (accumulation) کی طاقت کو سمجھ ہی نہیں پاتے۔

اپنی کتاب "غیر اغلیت کی پہاڑی کا سفر - Climbing Mount Improbable " میں میں نے اس نقطے کو ایک کہانی کے ذریعے بیان کیا ہے۔ پہاڑی کی ایک طرف اونچی چٹّان ہے جس پر چڑھنا محال ہے، اور دوسری طرف چوٹی تک پہنچنے کے لئے ہموار سطح ہے۔ چوٹی پر کوئی پیچیدہ آلہ پڑا ہے، جیسے انسانی آنکھ یا جرثومے کے سوتے کی موٹر (bacterial flagellar motor)۔ اس قدر پیچیدہ آلے کے ذریعہ خود سے اپنے آپ کو یکا یک ترتیب دے سکنے کے بے معنی خیال کو علامتاً یوں بیان کیا جاتا ہے کہ جیسے کوئی اس پہاڑی کے نیچے کھڑا ہو اور ایک ہی جست میں چوٹی سر کر لے۔ اس کے برعکس، ارتقاء پہاڑی کے عقب میں جا کر آہستہ آہستہ ہموار سطح سے اوپر چڑھتا جاتا ہے اور با آسانی چوٹی تک پہنچ جاتا ہے۔ لمبی چھلانگ مارنے کے مقابلے میں ہموار سطح پر چڑھنے کا نظریہ اس قدر سادہ ہے کہ انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ انسانیت کو ایک ڈارون کا انتظار کیوں کرنا پڑا کہ وہ منظر پر نمودار ہو اور اسے دریافت کرے۔ جب تک ڈارون نے یہ نظریہ دریافت کیا، نیوٹن کے "حیرت انگیز سال" کو گزرے دو صدیاں بیت چکی تھیں۔ اگرچہ نیوٹن کے کارنامے بظاہر ڈارون سے زیادہ مشکل تھے۔

بینک میں نصب خزانے کا کمرہ (vault) اور اس کے combination lock شدید غیر اغلیت کے لئے استعمال کیا جانے والا ایک اور پسندیدہ استعارہ ہے۔ اصولی طور پر تو یہ ممکن ہے کہ بینک میں ڈاکہ ڈالنے آیا ڈاکو حادثاتی طریقے سے والٹ کے combination کے نمبر گھمانے میں کامیاب ہو جائے۔ لیکن حقیقت میں یہ لاک اتنی زیادہ غیر اغلیت کے اطلاق سے بنایا جاتا ہے کہ حادثاتی طور پر یہ سارے نمبر گھوم پانا ممکن نہیں۔ جیسے فریڈ ہوئیل کا بوئینگ ۷۴۷۔ لیکن اگر آپ ایک ایسے لاک کا تصور کر سکیں جس کی بناوٹ میں ایسی کمی رہ گئی ہو جو ہر نمبر کو دبانے کے بعد آنے والے نمبر کے بارے میں چھوٹے چھوٹے اشارے چھوڑتا جاتا ہے۔ سوچیئے کہ جیسے جیسے ڈائیل اپنے درست اعداد کی طرف بڑھتا ہے والٹ کا دروازہ مزید کھلتا چلا جاتا ہے اور پیسے کی ایک قلیل مقدار تسلسل سے اس کھلتے ہوئے دروازے سے بہہ نکلتی ہے۔ حتٰی کہ ڈکیت خزانہ خالی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

جو تخلیق پسند اپنے حق میں غیر ممکنات کی دلیل استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہ فرض کر لیتے ہیں کہ حیاتیاتی ارتقاء میں صرف "خزانہ" یا "کچھ نہیں" کی صورت ممکن ہوتی ہے۔ اس منطقی غلطی کا ایک اور نام "نا قابل تخفیف پیچیدگی - Irreducible Complexity (IC) " ہے۔ یا تو آنکھ دیکھتی ہے یا نہیں دیکھتی ہے۔ یا تو پر اڑنے میں مدد کرتا ہے یا نہیں کرتا ہے۔ تخلیق پسند درمیانی صورتوں کا اعتراف نہیں کرتا۔ لیکن یہ صریحاً غلط ہے۔ ایسی درمیانی صورتیں حقیقتاً بہتات میں پائی جاتی ہیں - جیسا کہ ہمیں نظریے کے مطابق توقع ہونی چاہئے۔ حقیقی زندگی غیر اغلیت کی پہاڑی کے عقب میں ہموار سطح کا سہارا لیتی ہے، جبکہ تخلیق پسند کی نظر پہاڑی کے سامنے چوٹی کو چھوڑ باقی ہر امکان کے لئے نابینا ہے۔

ڈارون نے اپنی کتاب The Origin of Species میں ایک پورا باب "ترمیم کے ساتھ نزول کے نظریے میں مشکلات" کے لئے مختص کیا۔ اور یہ کہنا بجا ہو گا کہ اس مختصر سے باب میں ان تمام مشکلات کی پہلے ہی پیش گوئی کر دی جو بعد میں پیش کی جاتی رہیں اور ان کے مناسب حل بھی بتا دئے۔ سب سے شدید مشکلات میں انتہائی پیچیدہ اور کامل اعضاء شامل ہیں، جن کے لئے کبھی کبھی "نا قابل تخفیف حد تک پیچیدہ" کی غلط اصطلاح کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ ڈارون نے شدید مشکل کی مثال کے طور پر آنکھ پر توجہ مرکوز کی: 'میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ قیاس کرنا کہ آنکھ مختلف فاصلوں کے مطابق اپنے مراکز نگاہ کو تبدیل کرنے کی منفرد تدابیر کے ساتھ، روشنی کی مختلف مقداروں کو اندر داخل ہونے کی اجازت دینے اور رنگ و ہیئت کی غلطیوں کی تصحیح کرنے کی قابلیت لئے کسی قدرتی انتخاب کے نتیجے میں ظہور پزیر ہوئی ہو گی، خاصہ بے معنی سا لگتا ہے'۔ تخلیق پسند بڑے شوق سے اس جملے کو بار بار اقتباسات میں استعمال کرتے ہیں۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ اس جملے کے بعد آنے والے جملوں کا کبھی ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ ڈارون کا یہ ناگوار آزادانہ اعتراف دراصل بحث کو آگے بڑھانے کی ایک چال تھی۔ وہ اپنے مدّمقابل کو اپنی طرف بڑھنے کی دعوت دے رہے تھے، تاکہ جب ان کا وار پڑے تو اپنے پورے زور کے ساتھ پڑے۔ اور یہ وار ڈارون کی آنکھ کی تخلیق کے بارے میں وضاحت کی شکل میں کیا گیا تھا جہاں انہوں نے بڑے مربوط انداز میں سمجھایا کہ کیسے آنکھ ارتقاء کے مراحل سے گزرتی ہوئی باآسانی اس حالت تک پہنچی تھی۔ ڈارون نے بھلے ہی نا قابل تخفیف پیچیدگی یا غیر اغلیت کی پہاڑی کی ہموار سطح جیسی اصطلاحات استعمال نہ کی ہوں، لیکن وہ ان کے پس، پردہ نظریات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔

"آدھی آنکھ کا کیا فائدہ ہے" یا "آدھے پر سے کیسے اڑا جا سکتا ہے" دونوں نا قابل تخفیف پیچیدگی کی مثالیں ہیں۔ کسی فاعل چیز کو اس وقت نا قابل تخفیف تصوّر کیا جا تا ہے جب اس کے کسی حصے کے نکال دئے جانے سے وہ چیز فاعل نہ رہے۔ آنکھ اور پر کے لئے اس خاصیت کو از خود واضح سمجھا جاتا رہا

ہے۔ لیکن ان مفروضوں پر تھوڑا سا بھی دھیان دینے سے ہمیں ان کی منطق کی غلطی صاف دکھائی دے جاتی ہے۔ موتیا بند کے مریض کی آنکھ سے عدسہ نکال بھی دیا جائے تو وہ اتنا تو دیکھ ہی لیتا ہے کہ کسی سے ٹکرا نہ جائے یا کھائی میں نہ گر پڑے۔ آدھا پر حقیقتاً بہت کام کا نہیں، لیکن پھر بھی درخت سے گرتے ہوئے پرندے کے کچھ کام تو آ ہی جاتا ہے۔ اور ۵۱ فیصد پر تھوڑے اونچے درخت سے گرتے ہوئے بچنے کے کام آ سکتا ہے۔ پر کا جو بھی تناسب ہو، درخت کی کوئی نہ کوئی اونچائی ایسی ہوتی ہے جس سے بچنے کے لئے وہ کام آ سکتا ہے جبکہ اس سے چھوٹا پر پرندے کو اس اونچائی سے نہیں بچا پاتا۔ درخت کی مختلف اونچائیوں کا یہ خیالی تجربہ ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ ا سے لے کر ۱۰۰ فیصد تک فائدے کا ایک ہموار میلان بنایا جا سکتا ہے۔ ہمارے جنگل کودتے، پھانتے اڑتے ہوئے ایسے جانوروں سے بھرے پڑے ہیں جو غیر ممکنات کی پہاڑی کی ہر منزل پر موجود ہیں۔

مختلف اونچائیوں کے درخت کی مثال کی طرح ہم ایسی آدھی آنکھ کا بھی تصوّر کر سکتے ہیں جو کسی کی جان بچانے میں مدد گار ثابت ہو جبکہ ۴۹ فیصد آنکھ ایسا نہیں کر سکتی۔ روشنی کی بدلتی مقدار اور شکار یا شکاری سے فاصلہ آنکھ کے ہموار میلان کا تعین کرتے ہیں۔ اور جیسا کہ ہم نے انچائیوں اور پروں کی قابلیت کے سلسلے میں دکھایا، یہاں بھی متوسط درجے نہ صرف ممکن ہیں بلکہ عالم حیوان میں بہتات سے پائے بھی جاتے ہیں۔ کینچوے کی آنکھ انسانی آنکھ سے ہر اعتبار سے آدھی سے بھی کم ہے۔ ناٹیلس اور اس کے ناپید ایمونی (ammonites) رشتے داروں (ایمونی ایسے بحری جانوروں کے حجریہ جن کا منہ ان کے پاؤں کے درمیان ہوتا ہے؛ یہ حجریہ عموماً ہموار پیچوں میں پیلیوزوک اور میسوزوک سمندروں میں پائے جاتے تھے) کی آنکھ اپنی خصوصیات میں کینچوے اور انسان کی آنکھ کے درمیان کہیں پائی جاتی ہے۔ کینچوے کی آنکھ کے برعکس جو صرف روشنی اور سایہ دیکھ سکتی ہے لیکن حجم نہیں، ناٹیلس کی آنکھ "پن ہول کیمرہ" کی طرح صورت دیکھ سکتی ہے؛ لیکن یہ صورت ہماری آنکھ سے دکھنے والی صورت کے مقابلے میں دھندلی اور مدھم ہوتی ہے۔ اس بتدریج بہتری پر کوئی قدر لگانا قاعدے کی جعلی مشق ہو گی، لیکن کوئی بھی عقلمند انسان اس بات کو نہیں جھٹلا سکتا کہ ان غیر ضروری جانداروں کی یہ آنکھیں آنکھ نہ ہونے سے بہتر ہیں، اور سب غیر اغلیت کی پہاڑی کی مسلسل اور مدھم ڈھلوان پر ہیں، جس پر ہماری اپنی آنکھ بھی ایک بہت اونچی چوٹی پر ہے، اگر چہ سب سے اونچی چوٹی پر نہیں۔ اپنی کتاب Climbing Mount Improbable میں میں نے آنکھوں اور پروں کے لئے ایک پورا باب مختص کیا تھا، جس میں میں نے دکھایا تھا کہ ان کے لئے چھوٹے چھوٹے درجات سے آہستہ آہستہ (اور کبھی کافی تیز بھی) ارتقاء کا سفر طے کرنا کتنا آسان ہے۔ لہٰذا میں فی الحال اس موضوع کو موقوف کر دیتا ہوں۔

لہٰذا ہم نے دیکھا کہ آنکھ اور پر ناقابل تخفیف حد تک پیچیدہ نہیں ہیں۔ لیکن ان مثالوں سے زیادہ دلچسپ وہ سبق ہے جو ہم یہاں سے سیکھ سکتے ہیں۔ اگر اتنے زیادہ لوگ اتنی واضح مثالوں کے بارے میں بھی اتنی سفاک غلطی کر سکتے ہیں تو زیادہ مبہم مثالیں ہمارے لئے خطرے کی گھنٹی ثابت ہو سکتی ہیں، جیسے کہ خلیاتی یا بائیو کیمیائی عوامل، جن کو تخلیق پسند، جو آج کل سیاسی مصلحت کے تحت" ذہین ترتیب" کے نئے جھنڈے تلے اکٹھے ہوتے ہیں، اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر سکتے اور کرتے ہیں۔

یہ کہانی ہمیں خبردار کرتی ہے کہ ہر چیز کو ناقابل تخفیف حد تک پیچیدہ نہ بنائیں؛ اس کا اغلب امکان موجود ہے کہ آپ نے تفاصیل کو غور سے نہیں دیکھا یا ان کے بارے میں دھیان سے نہیں سوچا۔ دوسری طرف، ہم سائنسدانوں کو بھی کٹڑ حد تک پر اعتمادی کا اظہار نہیں کرنا چاہئے۔ شاید قدرت میں واقعی کچھ ایسا ہو جو اپنی حقیقی ناقابل تخفیف پیچیدگی کی بنا پر ہمیں غیر اغلیت کی پہاڑی کی ہموار سطح کے نہ ہونے کا اشارہ دیتی ہے۔ تخلیق پسند اپنے اس اصرار میں بجا ہیں کہ اگر کسی حقیقی ناقابل تخفیف پیچیدگی کا مظاہرہ ممکن ہو تو ڈارون کی تھیوری کے تابوت میں کیل گڑھ جائے۔ ڈارون نے خود بھی کچھ ایسا ہی کہا تھا: 'اگر یہ دکھایا جا سکتا کہ کوئی ایسا پیچیدہ عضو موجود تھا جو بیشار، ایک کے بعد ایک چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں کے نتیجے میں وجود میں نہیں آیا تھا، تو میرا نظریہ تباہ ہو جائے گا۔ لیکن مجھے آج تک ایسی کوئی مثال نہیں ملی'۔ ڈارون کو کبھی ایسی کوئی مثال نہیں ملی، اور نہ ہی کسی کو کڑی محنت کے باوجود اس کے بعد آج تک مل سکی ہے۔ تخلیق پسندی کے اس مقدس نادر نمونے کے بہت سے دعوے دار سامنے آتے رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی آج تک تفتیشی عمل کی تاب نہیں لا سکا۔

ویسے بھی، اگر کوئی حقیقی ناقابل تخفیف پیچیدگی دریافت ہو بھی جائے اور ڈارون کے نظریے کو تباہ کرنے کے قابل بھی ہو، تب بھی، کون کہہ سکتا ہے کہ یہی ناقابل تخفیف پیچیدگی "ذہین ترتیب" کے نظریے کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک نہیں کرے گی؟ در حقیقت، یہ نظریہ ذہین ترتیب کے ساتھ تو ایسا سلوک کر بھی چکی ہے کیونکہ، جیسا کہ میں کہتا آیا ہوں اور کہتا رہوں گا، خدا کے بارے میں ہمارا علم کتنا ہی کم کیوں نہ ہو، ایک بات تو ہم بڑے اعتماد سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ بہت بہت پیچیدہ ہو گا، اور غالباً ناقابل تخفیف بھی!

# خلاؤں کی پرستش

## The Worship of Gaps

ناقابل تخفیف پیچیدگی کی مخصوص مثالیں ڈھونڈتے رہنا بنیادی طور پر تحقیق کا ایک غیر سائنسی طریقہ ٔکار ہے: حالیہ جہالت و بے خبری سے دلیلیں دیناایک خاص نمونہ ہے۔ یہ اسی ناقص منطق کو استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے جو خلاؤں کے خدا (God of the Gaps) کی حکمت عملی ہے جس کی عالم دین ڈیٹرک بونہوفر نے مذمّت کی ہے۔ تخلیق پسند بڑی بے تابی سے ہماری معلومات اور سمجھ میں دراڑ یا جھول کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اگر کوئی بظاہر شگاف نظر آ جائے تو فی الفور فرض کر لیا جاتاہے کہ اِسے پر کرنے کے لئے صرف خدا کا ہی سہارا لیا جا سکتا ہے۔ جو بات بونہوفر جیسے پر فکر علماء کو پریشان کرتی ہے وہ یہ ہے کہ جیسے جیسے سائنس ترقی کرتی ہے یہ شگاف چھوٹے ہوتے چلے جاتے ہیں اور خدا، جسے نہ تو مزید کوئی کام ہے اور نہ کوئی چھپنے کی جگہ میسر ہے، حتّٰی کہ خدا کے وجود کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ سائنسدانوں کی پریشانی کا باعث کچھ اور ہی ہے۔ لاعلمی کا اعتراف کرنا سائنسی طریقہ ٔکار کا ایک لازمی جزہے۔ اس حد تک کہ ایسا لگتا ہے جیسے سائنسدان مستقبل میں آنے والی کامیابیوں کی امید میں حالیہ لا علمی کا جشن منا رہے ہوں۔ جیسا کہ میرے دوست میٹ رڈلی نے لکھا: 'بیشتر سائنسدان ماضی کی دریافتوں سے اکتائے ہوئے لگتے ہیں۔ یہ لاعلمی ہے جو انہیں آگے بڑھنے کی تحریک دیتی ہے'۔ صوفی اسرار میں مسرّت محسوس کرتے ہیں اور حالات کو پراسرار ہی رہنے دینا چاہتے ہیں۔اس کے برعکس سائنسدان بھی حالت اسرار میں فرحت محسوس کرتے ہیں لیکن کسی اور وجہ سے: انہیں عمومی طور پر کچھ کرنے کو مل جاتا ہے۔ اور جیسا میں باب ۸ میں دہراؤں گا، مذہب کے نقصان دہ اثرات میں سے ایک اہم اثر یہ ہے کہ مذہب انسان کو یہ سبق دیتا ہے کہ سمجھ کے فقدان سے اطمینان بہت فضیلت کی بات ہے۔

لا علمی کا اعتراف اور عارضی حالت اسرار اچھی سائنس کے لئے نہایت اہم ہیں۔ لہٰذا یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ تخلیق پسند مبلغ کی سب سے اہم حکمت عملی ہمارے علم میں شگاف تلاش کرنے اور انہیں "ذہین ترتیب" سے آراستہ کرنے کی منفی حکمت ہے۔ درج ذیل بحث قیاس پر مبنی لیکن بالکل عام ہے۔ ایک تخلیق پسند بولتے ہوئے: 'کم چتکبرے مینڈک کی کہنی کا جوڑ ناقابل تخفیف حد تک پیچیدہ ہے۔ اگر اس کے تمام حصوں کو ایک ساتھ بروئے کار نہ لایا جائے تو کوئی بھی حصہ کسی کام کا نہیں۔ میں شرط لگا سکتا ہوں کہ آپ اس مینڈک کی کہنی کے بتدریج ارتقاء کا کوئی طریقہ نہیں سوچ سکتے'۔ اگر سائنسدان فوری طور پر ایک مفصّل جواب دینے میں ناکام رہے تو تخلیق پسند فوراً یہ پہلے سے طے شدہ نتیجہ اخذ کر لیتا ہے: 'تو پھر ٹھیک ہے۔ متبادل نظریہ، "ذہین ترتیب"، کسی اور متبادل کی عدم موجودگی میں کامیاب قرار پاتا ہے'۔ متعصب منطق ملاحظہ کیجئے: اگر کوئی نظریہ "الف" کسی طرز سے ناکام ہو جاتا ہے تو نظریہ "ب" ہی صحیح ہو گا۔ اس منطق کا اطلاق کبھی دوسری سمت میں نہیں کیا جاتا۔ ہمیں اس بات کی ترغیب نہیں دی جاتی کہ نظریہ "ب" کو کامیاب قرار دے دینے کی بجائے اسے بھی اسی طرز پر جانچ لیا جائے جس پر نظریہ "الف" کو جانچا گیا تھا کہ آیا یہ بھی تو اس طرز پر ناکام نہیں ہو جاتا۔ "ذہین ترتیب" کو ایک پروانہ راہداری فراہم کر دیا جاتا ہے، ان تمام مشکل مراحل سے ایک خوبصورت استثنٰی جن سے نظریہ ارتقاء کو گزرنا پڑتا ہے۔

میرا مدعا یہ ہے کہ تخلیق پسندوں کا یہ حربہ سائنسدانوں کی عارضی بے یقینی میں قدرتی بلکہ ضروری خوشی کو مجروح کرتا ہے ۔ محض سیاسی وجوہات کی بنا پر آج کا سائنسدان یہ کہنے سے پہلے ہچکچاتا ہے: ' ارے! یہ تو ایک دلچسپ نقطہ ہے! نہ جانے اس مینڈک کے آبا و اجداد نے کہنی کے جوڑ کا ارتقاء کیسے کیا۔ میں مینڈکوں کا ماہر نہیں ہوں۔ مجھے یونیورسٹی کی لائبریری میں جا کر کچھ تحقیق کرنی چاہیئے۔ شاید کسی گرجویٹ طالب علم کو تحقیق کرانے کے لئے ایک اچھا مضمون مل جائے'۔ جس لمحہ سائنسدان یہ کہتا اور اس سے بہت پہلے کہ وہ طالب علم اپنی تحقیق پر کام شروع کر سکتا ،کسی تخلیق پسند رسالے میں یہ شہ سرخی چھپ جاتی: 'مینڈک کو صرف خدا ہی ترتیب دے سکتا ہے۔

لہٰذاسائنس کے طریق کار میں بے خبری کے شگاف ڈھونڈتے رہنے کی ضرورت اور تخلیق پسندوں کی فتح کا اعلان کرنے کی خواہش کی وجہ سے بے خبری کے شگاف ڈھونڈنے کی ضرورت میں ایک افسوس ناک تعلق موجود ہے۔ یہ حقیقت کہ تخلیق پسندوں کے پاس اپنے کوئی شواہد نہیں ہوتے اور ان کا نظریہ سائنس کے چھوڑے ہوئے شگاف کے درمیان جنگلی گھاس کی طرح اگتا ہے سائنسدانوں کے لئے شدید تکلیف کا باعث ہے، کیونکہ سائنسدان ان ہی خلاؤں پر تحقیق کی غرض سے ان کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں سائنس اپنے آپ کو بھولی بھالی مقبول عام اور ذہین ترتیب کی شگاف پسند مذہبیت کے خلاف بونہوفر جیسے نفیس علماء کے ساتھ متحد پاتی ہے۔

تخلیق پسندوں کا حجرہ کے ریکارڈ میں شگاف کے ساتھ معاشقہ ساری شگاف پسند مذہبیت کی غمازی کرتا ہے۔ میں نے ایک دفعہ کیمبرئین پھیلاؤ (Cambrian Explosion) کے بارے میں ایک باب کے تعارفی پیرائے میں یہ جملہ لکھا: 'ایسا لگتا ہے کہ سارے حجرہ وہاں کسی ارتقائی تاریخ کے بغیر رکھ

دئے گئے ہوں'۔ یہ محض لفاظی تھی، جس کا مقصد آگے دی جانے والی وضاحت کے بارے میں قاری کے تجسس کو مکمل طور پر اجاگر کرنا تھا۔ میں افسوسناک پس اندیشی سے دیکھ سکتا ہوں کہ یہ پیش گوئی کتنی آسان تھی کہ میری نہایت صابرانہ وضاحتوں کو نظر انداز کر دیا جائے گا اور اس لفاظی کو سیاق و سباق سے ماورا چھاپ دیا جائے گا۔ تخلیق پسند حجرہ میں "شگاف" کی موجودگی سے شدید محبت کرتے ہیں، جیسے وہ عمومی طور سے شگاف سے محبت کرتے ہیں۔

ارتقائی منتقلی کی بہت سی مثالوں کا مشاہدہ ان کے مسلسل بدلتے ہوئے درمیانی حجرہ (fossil) کو دیکھ کر کیا جاسکتا ہے۔ کبھی یہ درمیانی حجرے نہیں ملتے۔ اور یہی وہ مشہور زمانہ "شگاف" ہیں۔ مائیکل شرمر نے خاصے مذاقیہ انداز میں اس بات کی نشاندہی کی کہ اگر کسی حجرے کی دریافت کسی شگاف کو صفائی سے دو حصوں میں بھی کاٹ دے تو تخلیق پسند اعلان کر دے گا کہ اب دوگنے شگاف ہو گئے ہیں! ایک بار پھر پہلے سے طے شدہ حالت کا استعمال ملاحظہ کیجئے۔ اگر کسی فریضہ ارتقائی منتقلی کو ثابت کرنے کے لئے کوئی حجرہ نہ مل سکے تو تخلیق پسندوں کا پہلے سے طے شدہ مفروضہ یہ ہے کہ کوئی ارتقائی منتقلی عمل میں نہیں آئی؛ لہٰذا خدا نے مداخلت کی ہو گی۔

کسی بیانیے کے ہر قدم کا مکمل دستاویزی ثبوت کا مطالبہ کرنا نہایت بے تکی حرکت ہے، چاہے وہ مطالبہ سائنس سے کیا جائے یا نظریہ ارتقاء سے۔ یوں تو آپ قتل کے کسی مقدمے میں قتل کے لمحے تک مبینہ قاتل کے ہر قدم کا فلمی ریکارڈ طلب کر لیں جس میں کوئی بھی فریم غائب نہ ہو۔ مردہ جانداروں کی ایک بہت ہی قلیل مقدار حجرہ بنتی ہے۔ لہٰذا ہم بہت خوش قسمت ہیں کہ ہمارے پاس اتنے درمیانی حجرے ہیں۔ ایسا بھی ممکن تھا کہ ہمارے پاس کوئی بھی حجرے نہ ہوتے۔ پھر بھی ارتقاء کے حق میں سالماتی جینیات (molecular genetics) اور جغرافیائی تقسیم جیسے دیگر ثبوت شدید موثر ثابت ہوتے۔ اس کے برعکس ارتقاء یہ طاقتور پیشگوئی کرتا ہے کہ اگر ایک بھی حجرہ غلط ارضیاتی درجے میں پایا جاتا تو نظریۂ ارتقاء کی دھجّیاں بکھر جاتیں۔ جب کارل پاپر کے ایک سرگرم معتقد نے سوال اٹھایا کہ ارتقاء کو کیسے جھٹلایا جا سکتا ہے تو جے بی ایس ہالڈین نے غصے سے جواب دیا: 'قبل از کیمبریائی دور میں خرگوش کا حجرہ ملنے سے'! کوئلے کی کان میں انسانی کھوپڑی اور انسان اور ڈائنوسار کے قدموں کے نشان ایک ہی جگہ پائے جانے کے بارے میں تخلیق پسندوں کی پھیلائی ہوئی جھوٹی کہانیوں کے باوجود، آج تک ایسے غلط زمانی حجرے دریافت نہیں ہوئے۔

تخلیق پسند کے ذہن میں شگاف کو پر کرنے کے لئے صرف خدا کا ہی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ایسی ہی بات ہم غیر اغلبیت کی پہاڑی کے بارے میں بھی کہہ سکتے ہیں، جس کی ہموار سطح یا تو فوری طور سے ظاہر نہیں ہوتی یا کسی سے نظر انداز ہو جاتی ہے۔ یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ ایسے موضوعات جہاں معلومات کی یا سمجھ کی کمی ہے خدا کی اجارہ داری میں ہیں۔ جلد بازی سے ناقابل تخفیف پیچیدگی کی آڑ لے لینا تخّیل کی کمزوری کو ظاہر کرتا ہے۔ کسی حیاتیاتی عضو پر، چاہے وہ آنکھ ہو یا جرثومے کے سوتے کی موٹر یا بائیو کیمیائی راہداری (biochemical pathway) ہو، مزید بحث کے بغیر فتویٰ جاری کر دیا جاتا ہے کہ وہ ناقابل تخفیف حد تک پیچیدہ ہے۔ ناقابل تخفیف پیچیدگی کو ثابت کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی۔ آنکھ، پر یا دیگر ایسے عضو کی کہانیوں کے باوجود، اس مشکوک تعریف کے ہر نئے امیدوار کو شفاف اور از خود ظاہر طریقے سے ناقابل تخفیف حد تک پیچیدہ تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ لیکن ذرا سوچئے! کیونکہ ناقابل تخفیف پیچیدگی کو ذہین ترتیب کی دلیل کے طور پر پیش کیا جارہا ہے، اس کو فتوے سے ثابت نہیں ہونا چاہئے، جیسا کہ نہ ہی ذہین ترتیب کو۔ آپ مزید کسی بحث یا وضاحت دئے بغیر سیدھے سے اعلان کر دیں کہ میٹڈک ترتیب کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہ سائنس کے کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔

یہ منطق اس مثال سے جتنی ہی ناقابل یقین ہے: 'میں [اپنا نام لکھئے] ذاتی طور پر یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ [حیاتیاتی عمل کا نام لکھئے] درجہ بہ درجہ عمل پزیر ہوا ہو گا۔ لہٰذا یہ ناقابل حد تک پیچیدہ ہو گا۔ یعنی یہ ترتیب شدہ ہے'۔ اپنے اس جملے کو پڑھتے ہوئے آپ کو محسوس ہو گا کہ یہ کسی بھی سائنسدان کے حملے کے سامنے کمزور نظر آتا ہے جو کوئی درمیانی مرحلہ دریافت کر لے، اور اگر دریافت نہ بھی کر سکے تو تخیّلاتی سطح پر اس کی نشاندہی ضرور کر لے۔ اور اگر کوئی سائنسدان وضاحت نہ بھی پیش کر سکے، تب بھی یہ تصور کرنا کہ "ترتیب" بہتر وضاحت دے سکتی ہے بڑی بودی منطق ہے۔ نظریہ ذہین ترتیب کا استدلال ست اور شکست پسند ہے ۔ "شگاف کے خدا" والی منطق۔ میں نے کتاب میں کہیں اسے "ذاتی بے اعتقادی کی دلیل" کا نام دیا تھا۔

تصور کیجئے کہ آپ کسی جادوگر کا ایک زبردست شعبدہ دیکھ رہے ہیں۔ جادو گروں کی مشہور جوڑی پین اور ٹیلر کا ایک کھیل دکھاتے ہیں جس میں دونوں بیک وقت ایک دوسرے پر گولی چلاتے ہیں اور اپنے دانتوں میں گولی پکڑ بھی لیتے ہیں۔ چلانے سے پہلے گولیوں پر شناخت کی خاطر مخصوص نشان کھرچے جاتے ہیں۔ سارا عمل مجمعے میں سے چنے گئے ایسے عینی شاہدوں کے سامنے کیا جاتا ہے جنہیں ہتھیار استعمال کرنے کا تجربہ ہے، اور بظاہر فریب کاری کے تمام امکانات کو مٹا دیا جاتا ہے۔ ٹیلر کی نشان زدہ گولی پین کے منہ میں اور پین کی نشان زدہ گولی ٹیلر کے منہ میں پہنچ جاتی ہے۔ میں [رچرڈ ڈاکنز] قطعی طور پر سوچنے سے قاصر ہوں کہ یہ فریب کیسے ہو سکتا ہے۔ ذاتی بے اعتقادی کی دلیل میرے دماغ کے قبل از سائنس مراکز کی گہرائیوں سے چیخ چیخ کر پکارتی ہے اور تقریباً

مجھے یہ کہنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ 'یہ معجزہ ہی ہو گا۔ اس کی کوئی سائنسی توجیہہ ممکن نہیں۔ اس کا مافوق الفطرت ہونا لازم ہے'۔ لیکن میری سائنسی تعلیم کی سبھی ہوئی آواز ایک اور ہی پیغام سناتی ہے۔ پین اور ٹیلر مشہور زمانہ شعبدہ باز ہیں۔ کہیں ایک نہایت مناسب وضاحت موجود ہے لیکن میں بہت سادہ لوح ہوں، یا میری حس مشاہدہ کمزور ہے، یا میری قوت تصوّر خام ہے، جو میں اس وضاحت کو دیکھ نہیں پا رہا۔ اگر کوئی حیاتیاتی عمل آپ کو ناقابل تخفیف حد تک پیچیدہ لگ رہا ہے تو اس کے مشاہدے کے لئے یہی واحد درست رویہ ہے۔ وہ لوگ جو قدرتی کرشمات پر ذاتی حیرانگی کی وجہ سے سیدھے ما فوق الفطرت توجیہات پر چھلانگ مار دیتے ہیں ان احمقوں سے بہتر نہیں جو سرکس میں شعبدہ باز کو چمچے موڑتا دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں کہ یہ ما بعد الطبیعات ہے ۔

سکاٹ لینڈ کے کیمیا گرای جی کیرنز سمتھ نے اپنی کتاب Seven Clues to the Origins of Life میں محراب کی مثال استعمال کرتے ہوئے ایک اضافی سوال اٹھایا ہے۔ غیر تراشیدہ پتھروں کی ایک محراب جو سیمنٹ اور گارے کی عدم موجودگی میں بھی کھڑی ہے ناقابل تخفیف پیچیدگی کا ایک نمونہ ہے: ایک بھی پتھر نکالنے سے یہ ڈھیر ہو جاتی ہے۔ تو پھر اسے بنایا کیسے گیا تھا؟ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ پتھروں کا ایک ڈھیر لگایا جائے اور پھر آہستہ آہستہ اس میں سے بالترتیب پتھر نکالے جائیں۔ عمومی طور پر ایسے کئی ڈھانچے ہیں جنہیں اس طرز پر ناقابل تخفیف مانا جاسکتا ہے کہ ان کے کسی بھی حصے کے نکل جانے سے مسمار ہو سکتے ہیں، لیکن جن کی تعمیر میں مچانوں کا استعمال کیا گیا ہو جو بعد میں ہٹا دی گئیں۔ تکمیل کے بعد مچانیں ہٹانے سے کوئی نقصان نہیں ہوتا اور ڈھانچہ بدستور سالم حالت میں کھڑا رہتا ہے۔ یہ قابل قیاس ہے کہ ارتقاء میں بھی آج دیکھے جانے والے عضو کی تعمیر کے دوران پچھلی نسلوں میں ایسی ہی "مچانیں" میسّر رہی ہوں جو ارتقائی عمل کے دوران "گرا" دی گئی ہوں۔

ناقابل تخفیف پیچیدگی کوئی نیا نظریہ نہیں ہے، لیکن اس کا حالیہ نام ۱۹۹۶[58] میں تخلیق پسند مبلّغ مائیکل بیہے نے ایجاد کیا تھا۔ نظریۂ تخلیق کو حیاتیات کے جدید زاویوں یعنی خلیاتی حیاتیات (cell biology) اور بائیو کیمیسٹری سے ہم آہنگ کروانے کا سہرا بیہے کو جاتا ہے. اسے لگتا تھا تخلیق کو ثابت کرنے کے مقاصد آنکھوں اور پروں سے زیادہ ان زاویوں میں حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ آج تک اپنی طرف سے وہ جو بہترین مثال سامنے لا سکا وہ جرثومے کے سوتے کی موٹر کی ہے، اور سچ پوچھئے تو تخلیق کے حق میں یہ کوئی اتنی شاندار مثال ثابت نہیں ہوئی ہے۔

جرثومے کے سوتے کی موٹر قدرت کے غیر معمولی اوصاف کا حامل شاہکار ہے۔ انسانی صنعت کے علاوہ یہ موٹر آزادی سے گھومنے والے دھرے (freely rotating axle) کا واحد قدرتی نمونہ ہے۔ بڑے جانوروں میں اگر ایسے پہیے یا موٹر پائے جاتے تو ہم انہیں ناقابل تخفیف پیچیدگی کی عمدہ مثال کہہ سکتے تھے، اور شاید اسی لئے قدرت میں وہ موجود نہیں ہیں۔ اعصاب اور خون کے نسیں موٹر کے دانتوں سے کیسے گزرتیں*******؟ سوتا دھاگے کی طرح کا پنکھا ہوتا ہے، جس کی مدد سے جرثومہ پانی میں سرنگ بناتا جاتا ہے۔ میں نے "تیرتا"کی بجائے " سرنگ بناتا جاتا" کہا کیونکہ جرثومے کے لئے پانی کی کثافت کا احساس شاید ہمارے احساس سے بہت مختلف ہوتا ہو گا۔ جرثومے کو پانی دلیہ، یا جیلی، یا شاید گیلی ریت جیسا بھاری لگتا ہو گا ، اور اسے اس کثیف مادے سے گزرنے کے لئے سرنگ ہی بنانی پڑتی ہو گی۔ ابتدائی حیوان (protozoa) کے سوتے کے مقابلے میں جرثومے کا سوتا ڈرف چپو کی طرح ہی نہیں چلتا بلکہ سالماتی (molecular) موٹر سے چلنے والا آزادانہ گھومتا ہوا درا ہے جو مسلسل حرکت کرتا ہے۔ سالماتی درجے پر موٹر انہی قوانین کے مطابق چلتی ہے جو پٹھوں کی حرکت کے پیچھے کارفرما ہیں، لیکن وقفہ بہ وقفہ سکڑنے کی بجائے آزادی سے گھومنے کی حرکت کرتی ہے ۔ اسے ایک چھوٹی سی بیرونی موٹر بھی کہا جاتا ہے ۔ ( اگرچہ انجینئرنگ کے اعتبار سے اور ایک حیاتیاتی نظام کے لحاظ سے غیر معمولی طور پر نہایت غیر مؤثر اور کاہل نظام ہے)۔

بغیر کسی جواز، وضاحت یا طول دئے، بیہے اعلان کرتا ہے کہ جرثومے کے سوتے کی موٹر ناقابل تخفیف حد تک پیچیدہ ہے۔ کیونکہ وہ اپنے دعوے کے حق میں کوئی ثبوت فراہم نہیں کرتا، ہم اس کی تصوراتی حس کی ناکامی کے بارے میں شک سے اپنی شروعات کرتے ہیں۔ وہ یہ الزام بھی لگاتا ہے کہ مخصوص

---

******* بچوں کے ادب میں اس کی ایک مثال موجود ہے۔ بچوں کی کتابیں لکھنے والے فلپ پلمین اپنی کتاب His Dark Materials میں جانوروں کی ایک نئی نوع "ملیفا" کا تصور کرتا ہے، جو ایسے درختوں کے ساتھ رہتے ہیں جن کے بیج کے خول بالکل گول اور درمیان سے کھوکھلے ہوتے ہیں۔ ملیفا ان خولوں کو پہیوں کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ "پہیے" جسم کا حصہ نہیں ہیں اس لئے رگوں کے درے میں الجھ جانے کا کوئی خطرہ نہیں رہتا۔ پلمین ایک مزید نقطے کا ذکر بھی کرتا ہے: یہ نظام اس لئے کامیابی سے چل پاتا ہے کیونکہ اس سیارے پر سیاہ مرمر کی پٹّیاں موجود ہیں جو قدرتی سڑکوں کا کام دیتی ہیں، پہیے غیر ہموار سطح پر کارگر نہیں ہوتے۔

حیران کن طور پر، پٹھوں کا اصول حشرات الارض پر ایک تیسرے طریقے سے بھی کارفرما ہوتا ہے، جیسے کہ مکھّیاں، بھنورے اور مکوڑے، جن میں اڑانے والا پٹھا reciprocating engine کی طرح ارتعاش پیدا کرکے کام کرتا ہے۔ جہاں ٹڈی دل جیسے دوسرے حشرات اپنے پر کی ہر ایک ارتعاش کے لئے اعصابی ہدایات بھیجتے ہیں، بھنورے اپنی موٹر کو شروع کرنے اور بند کرنے کی ہدایات بھیجتے ہیں۔ جرثومے (bacteria) ایک ایسا نظام استعمال کرتے ہیں جو نہ تو پوری طرح سکڑنے سے کام کرتا ہے اور نہ ہی پوری طرح reciprocstor ہے، بلکہ صحیح معنوں میں گھومنے (rotation) کے اصول پر چلتا ہے۔ اس طرز سے یہ بجلی کی موٹر کی مانند ہے۔

حیاتیاتی تحقیق نے اس اہم مسئلے کو نظر انداز کر دیا ہے۔اس جھوٹے الزام کی تفصیل جو بیہے کے لئے بھی شرمناک تھا۔ ۲۰۰۵ میں پینسلوینیا میں جج جان ای جونز کی عدالتی کاروائی میں قلم بند کیا گیا، جہاں بیہے تخلیق پسندوں کے ایک گروہ کی جانب سے ماہرانہ رائے دینے کے لئے حاضر ہوا تھا۔ اس گروہ نے ایک مقامی سکول میں ذہین ترتیب پر مبنی نظریۂ تخلیق کو سائنس کے نصاب میں شامل کروانے کی کوشش کی تھی، جو جج جونز کے الفاظ میں 'ناقابل فہم دیوانگی' کا ایک فعل تھا (جج جونز اور ان کے الفاظ کے لئے ابدی شہرت ناگزیر ہے)۔ اور جیسا کہ ہم دیکھیں گے، بیہے کے لئے اس عدالتی کاروائی میں یہ شرمندگی کا واحد موقع نہیں تھا۔

ناقابل تخفیف پیچیدگی کا مظاہرہ کرنے کی کلید یہ ہے کہ یہ دکھایا جا سکے کہ کوئی بھی حصہ اپنے آپ میں کسی کام کا نہیں ہے۔ ان سب کو کارآمد بننے کے لئے اپنی جگہ پر ہونا ضروری ہے (بیہے کی پسندیدہ تمثیل چوہے دانی تھی)۔ در حقیقت سالماتی حیاتیات کے ماہرین (molecular biologists) کو ایسے حصے دریافت کرنے میں کبھی مشکل پیش نہیں آئی جو مکمل جسم سے علیحدہ بھی کامیابی سے کام کر سکتے ہوں، جیسے کہ سوتے کی موٹر یا ناقابل تخفیف پیچیدگی کے حق میں بیہے کی طرف سے پیش کی گئی دیگر مثالیں۔ اس نقطے کو براؤن یونیورسٹی کے کینیتھ ملر نے بہت عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے۔ ملر قدرت کی طرف سے ذہین ترتیب پر انتقام بن کر نازل ہوا ہے، کیونکہ وہ خود ایک متقی عیسائی ہے۔ میں عموماً ملر کی کتاب "ڈارون کے خدا کی تلاش ۔ Finding Darwin's God " ایسے مذہبی لوگوں کو تجویز کرتا ہوں جو بیہے سے مرعوب ہونے کے بعد مجھے خط لکھتے ہیں۔

جرثومے کی گھومنے والی موٹر کے سلسلے میں ملر ہماری توجہ اس طریقہ کار کی طرف مبذول کراتا ہے جسے تیسری طرز کے غدود کا نظام[59] یا Type Three Secretory System or TTSS کہا جاتا ہے۔ TTSS گھومنے کی حرکات کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا۔ یہ ان کئی نظاموں میں سے ایک ہے جو جرثومے (bacteria) اپنی دیواروں کے راستے زہریلے اجزاء اپنے میزبان جاندار میں منتقل کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ انسانی درجے پر ہم اسے ایک سوراخ سے پانی بہانے کے عمل سے مشابہت دیں گے؛ لیکن جرثومے کے درجے پر چیزیں بہت مختلف نظر آتی ہیں۔ اس درجے پر ہونے والے مادّے کا ہر سالمہ TTSS کے درجے پر مخصوص تین جہتی ڈھانچے (three-dimensional structure) والا ایک بڑا لحمیہ (protein) ہوتا ہے: مادہ کی بجائے ایک ٹھوس ہیئت ہر سالمہ پانی کی طرح "بہنے" کی بجائے انفرادی طور پر ایک نفیس نظام کے بیچوں بیچ آگے بڑھتا ہے، جیسے ایک خود کار سلاٹ مشین کھلونے یا بوتلیں باہر نکالتی ہے۔ یہ تقسیم کار خود بھی چند چھوٹے چھوٹے لحمیاتی سالمات سے بنا ہوتا ہے، جو حجم اور پیچیدگی میں ان سالموں سے مختلف نہیں ہوتے جو اس سوراخ سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ دلچسپی کی ایک بات یہ بھی ہے کہ مختلف جرثوموں میں یہ تقسیم کار ایک ہی جیسی شکل اور وضع کے ہوتے ہیں جبکہ ان جرثوموں کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ ان کی تخلیق جن جرثوموں پر منحصر ہے وہ غالباً کسی دوسرے جرثومے سے نقل کر کے یہاں چپکا دئے گئے ہوں گے: جرثوموں میں ایسا کرنے کی قابلیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ یہ اپنی ذات میں ایک بہت دلچسپ موضوع ہے، اور میں اس پر بعد میں لوٹنا چاہوں گا، لیکن ابھی مجھے آگے بڑھنا چاہئے۔

TTSS کا ڈھانچہ جن لحمیاتی سالموں پر مشتمل ہے وہ سوتے کی موٹر کے سالموں سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ عالم ارتقاء پر یہ بات عیاں ہے کہ جب سوتے کی موٹر کا ارتقاء ہوا تو TTSS کے سالموں کو ایک بالکل نئے کام کے لئے بروئے کار لایا گیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ TTSS اپنے اندر سے سالموں کو کھینچ کر گزارتا ہے، ہم یہ دیکھ کر بالکل حیران نہیں ہوتے کہ یہ اسی اصول کے ایک ابتدائی نمونے کا استعمال کرتا ہے جو سوتے کی موٹر میں دھرے کے سالموں کے گھومنے میں کار فرما ہے ۔ بظاہر، سوتے کی موٹر کے حصّے موٹر کے ارتقاء سے قبل بھی موجود تھے اور کام کر رہے تھے۔ کسی بظاہر ناقابل تخفیف جز کے خلاف قیاس پہاڑی کی چوٹی کو با آسانی سر کر سکنے کے لئے موجودہ پرزوں اور ترکیبوں کو استعمال کرنا ایک واضح اور منطقی طریق کار ہے۔

ابھی بہت کام کرنے کی ضرورت ہے، اور مجھے یقین ہے کیا بھی جائے گا۔ اگر سائنسدان "نظریۂ ذہین ترتیب" جیسے کسی سست پزیر نظریے سے مطمئن ہو جائیں تو سائنس میں مزید ترقی نہ ہو سکے۔ ایک فرضی "ماہر نظریہ ذہین ترتیب" شاید سائنسدانوں کو اس طرح کا کوئی پیغام نشر کرے: 'اگر آپ کو سمجھ نہیں آ رہا کہ کوئی چیز کیسے کام کر رہی ہے، تو گھبرایئے مت! رک جایئے اور اعلان کر دیجئے کہ یہ خدا نے کیا ہے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ دماغ کی نسیں کیسے کام کرتی ہیں؟ ٹھیک! آپ کو سمجھ نہیں آتا کہ دماغ میں یاداشتیں کس طریقے سے جمع کی جاتی ہیں؟ زبردست! کیا ضیائی تالیف (photosynthesis) ایک حیران کن حد تک پیچیدہ عمل ہے؟ بہت اعلیٰ! اپنی مشکل سلجھانے کے لئے کام پہ مت لگ جائیں۔ چھوڑیں کام وام اور خدا سے رجوع کریں۔ محترم سائنسدان! اس معمے کو حل کرنے کی بجائے ہمارے پاس لائیں۔ ہم ان کا استعمال کر سکتے ہیں۔ اس بیش قیمت جہالت پر تحقیق کر کے اسے یونہی دریا میں نہ بہا دیں۔ ہمیں کہانی کے یہ خوشنما شگاف خدا کی آخری پناہ گاہ کے طور پر شدّت سے درکار ہیں'۔ سینٹ آگسٹین نے تو کھلے بندوں کہا تھا: 'ایک بہکاوا اور بھی ہے، جو مزید پر خطر ہے۔ وہ

ہے ارمغان شوق تحقیق۔ یہی ہے جو ہمیں قدرت کے اسرار و رموز پر تحقیق کرنے کی تحریک دیتا ہے، وہ اسرار جو ہماری سمجھ سے بالا تر ہیں، جن سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور جنہیں جاننے کی انسان کو خواہش بھی نہیں کرنی چاہئے' (فریمین ۲۰۰۲ میں اقتباس)۔

نظام مدافعت ناقابل تخفیف پیچیدگی کے سلسلے میں بیہے کی پسندیدہ مبینہ مثالوں میں سے ایک ہے۔ اس ضمن میں جج جونز کا بیان ملاحظہ ہو:

> حقیقت یہ ہے کہ جرح کے دوران جب بیہے سے اس کے ۱۹۹۶ کے اس دعوے کے بارے میں بھی پوچھ تاچھ کی گئی تھی کہ سائنس مدافعاتی نظام کے لئے کبھی ارتقاء پر مبنی وضاحت تلاش نہیں کر پائے گی۔ اس کے سامنے ہم عصروں کی تصدیق شدہ اٹھاون مطبوعاتی تحریریں رکھی گئیں، بائیس کتابیں پیش کی گئیں، اور نصابی کتب میں مدافعاتیات پر چھپنے والے ان گنت باب بھی دکھائے گئے؛ اس کے بعد بھی وہ بضد رہا کہ ارتقاء کو ثابت کرنے کے لئے یہ ثبوت ناکافی ہیں، اور 'اچھا نہیں ہے'۔

جب مدعین کے وکیل ایرک روتھ چائیلڈ نے بیہے سے مزید جرح کی تو وہ ماننے پر مجبور ہو گیا کہ اس نے ان اٹھاون مطبوعاتی تحریروں میں سے بیشتر کو نہیں پڑھا تھا۔ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں، کیونکہ مدافعاتیات ایک محنت طلب شعبہ ہے۔ اس سے زیادہ ناقابل معافی بیہے کا یہ دعویٰ تھا کہ یہ ساری تحقیق 'بے ثمر' ہے۔ اگر آپ کا مقصد حقیقی دنیا کے بارے اہم سچ بے نقاب کرنے کی بجائے معصوم عوام اور سیاستدانوں میں گمراہ کن تشہیر کرنا ہے، تو واقعی یہ تحقیق بے ثمر ہے۔ بیہے کی باتیں سننے کے بعد روتھ چائیلڈ نے جو خلاصہ پیش کیا اسے کمرۂ عدالت میں بیٹھا شاید ہر شخص محسوس کر رہا تھا:

> شکر ہے کہ ایسے سائنسدان بھی ہیں جو واقعی مدافعاتی نظام کی شروعات کے سوال پر تحقیق کرتے ہیں.... یہ خطرناک اور مہلک بیماریوں کے خلاف ہمارا دفاع کرتا ہے۔ ان مطبوعات اور کتابوں کے مصنف سائنسدان کسی مالی فائدے یا شہرت کے بغیر گم نامی میں محنت کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس، پروفیسر بیہے اور ان کی ذہین ترتیب کی ساری تحریک ہمارے سائنسی اور طبی علم میں اضافے کے سلسلے میں کوئی کام سرانجام نہیں دے رہی ہے، بلکہ مستقبل کے سائنسدانوں کو صلاح دے رہے ہیں کہ 'زحمت نہ کریں'[۲۰]۔

امریکی ماہر جینیات (geneticist) جیری کوئین نے بیہے کی کتاب کے تجزیہ میں لکھا 'اگر سائنس کی تاریخ ہمیں کوئی سبق دیتی ہے تو وہ یہ کہ ہم اپنی جہالت کو "خدا" کا نام دے کر ترقی کی امید نہیں کر سکتے'۔ یا ایک فصیح بلاگر کے الفاظ میں، جس نے گارڈئین میں چھپنے والے ذہین ترتیب کے موضوع پر میرے اور کوئین کے ایک مقالے پر تبصرہ کیا:

> خدا کو کسی بھی چیز کی وضاحت کیوں سمجھا جاتا ہے؟ حالانکہ ایسا نہیں ہے ۔ یہ وضاحت دینے میں ناکامی کے سبب ہے، کندھوں کا اچکانا ، روحانیت اور رسوم میں لپٹا ہوا "مجھے نہیں پتا"۔ اگر کوئی شخص کسی بات کا سہرا خدا کے سر کرتا ہے، تو عموماً اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اسے کوئی اندازہ ہی نہیں، اس لئے وہ تمام تر ذمہ داری پہنچ سے باہر، سمجھ سے باہر ایک آسمانی ہستی کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس سے دریافت کریں کہ وہ ہستی کہاں سے آئی تو وہ مبہم سا یا کوئی نیم فلسفیانہ سا جواب دے گا کہ وہ ہستی تو دائمی ہے یا مافوق الفطرت ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ کچھ بھی واضح نہیں ہوتا[۲۱]۔

ڈارون کا نظریہ ہمارے شعور کو اور طریقوں سے بھی اجاگر کرتا ہے۔ ارتقاء پزیر اعضاء خوبصورت اور موئثر ہونے کے باوجود خامیوں کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں ۔ بالکل آپ کی توقعات کے مطابق اگر ان کی تاریخ ارتقائی ہے، اور بالکل آپ کی توقعات کے خلاف اگر وہ ترتیب دیے گئے ہوں۔ میں نے دیگر کتابوں میں بھی مثالیں دی ہیں: متواتر نمودار ہونے والی نرخرے کی رگ (recurrent laryngeal nerve) جو اپنی ارتقائی تاریخ کا مظاہرہ منزل تک پہنچنے کے لئے ایک شاندار اور انتہائی بے کار پھیر بنا کر کرتی ہے۔ ہماری بہت سی بیماریاں، جیسے کہ کمر کا درد، فتاق (hernia) ، گرا ہوا شکم مادر (prolapsed uterus) اور ہمارا ناک سے منسلک بیماریوں کے سلسلے میں حساس ہونا اس امر کا نتیجہ ہے کہ ہم ایک ایسے جسم کے ساتھ دو پاؤں پر کھڑے ہوتے جو سینکڑوں میلین سالوں میں چار پاؤں پر چلنے کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ قدرتی انتخاب کا ظالمانہ اور زیاں کی طرف مائل رویہ بھی ہمارے شعور کو بیدار کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ شکاری جانور اپنے شکار کو پکڑنے کے لئے نہایت خوبصورت انداز سے 'ترتیب شدہ' لگتے ہیں، اور شکار ہونے والے جانور اپنے بچاؤ کے اقدامات کرنے کے لئے نہایت خوبصورت انداز سے 'ترتیب شدہ' لگتے ہیں۔ آخر خدا کس کی طرف داری میں ہے؟[۴۲]

## اصول بشری : سیاروں کا تغیر

## The Anthropic Principle: Planetary Version

شگاف پر انحصار کرنے والے علماء دین جو آنکھوں ، پروں، سوطیہ موٹر اور مدافعاتی نظام کی مثالوں سے ذہین ترتیب کو ثابت کرنے میں ناکام ہو گئے ہوں اپنی آخری امید ابتداء حیات سے جوڑ لیتے ہیں۔ ارتقاء کی شروعات میں غیر حیاتیاتی کیمیائی تبدیلیاں بعد میں ظہور پزیر ہونے والی کسی اور تبدیلی کے مقابلے میں سب سے بڑا شگاف ہیں۔ ایک مخصوص طرز سے یہ سب سے بڑا شگاف ہے۔ اور یہ مخصوص طرز مذہبی عذر خواہ کو کوئی آسانی فراہم نہیں کرتا۔ ابتداء حیات کا واقعہ صرف ایک بار ہی پیش آنا تھا۔ لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک انتہائی بعیداز قیاس (improbable) واقعہ تھا، اور اس کے غیر اغلیت (improbability) کا درجہ زیادہ تر لوگوں کی سوچ سے کہیں بڑھ کر ہے، جیسا کہ میں آگے چل کر دکھاؤں گا۔ یک بعد دیگرے ہونے والے ارتقائی مرحلے ملتے جلتے طریقوں سے کروڑ ہا نوع میں ان گنت بار ایک دوسرے کی نقل کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا، پیچیدہ زندگی کے ارتقاء کو بیان کرنے کے لئے ہم اس شماریاتی منطق کا سہارا نہیں لے سکتے جو ہم حیات ابتداء کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ارتقائی سفر کے مراحل اتنے غیر ممکن نہیں ہو سکتے جتنا ابتداء حیات کا واقعہ۔

آپ کو یہ تفریق شاید پریشان کن لگے، میں اصول بشری کو استعمال کرتے ہوئے اس کو مزید واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔ اصول بشری کا نام ۱۹۷۴ میں ریاضی دان برانڈن کارٹر نے ڈالا تھا، اور ماہرین طبیعیات جان بیرو اور فرینک ٹپلر نے اس موضوع پر اپنی کتاب میں اس کی مزید وضاحت کی ہے[۴۳]۔ اصول بشری کا اطلاق عموماً کائنات پر کیا جاتا ہے، میں اس پر بھی آگے بات کروں گا۔ لیکن فی الحال اس تصور کا تعارف سیارے کی حد تک کروانا چاہتا ہوں۔ ہم یہاں کرّہ ارض پر رہتے ہیں۔ لہٰذا یہ ارض اور اس قسم کا سیارہ، چاہے وہ کتنا بھی غیر معمولی اور خاص الخاص ہو، ایسا ہو گا جو ہمیں پیدا کرنے اور پالنے کی قابلیت رکھتا ہو۔ مثال کے طور پر ایک خاص قسم کی حیات پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ بے شک مافوق الارض ماہرین حیاتیات آسمانوں میں غیر ارضی حیات کی تلاش کر رہے ہیں، جو درحقیقت پانی کی تلاش ہی ہے۔ ہمارے سورج جیسے عام سے ستارے کے گرد ایک گولڈیلوکس خطہ (Goldilocks Zone) ہے ۔ نہ بہت ٹھنڈا اور نہ بہت گرم بلکہ بالکل مناسب ۔ جو عام حالت میں پانی رکھنے والے سیاروں کے لئے نہایت موزوں ہے۔ مداروں کی ایک باریک سی پٹی ان مداروں کے بیچ پائی جاتی ہے جو ذرا سورج سے فاصلے پر ہوں تو پانی جم جاتا اور سورج کے قریب ہوں تو ابل جاتا ہے۔

غالباً زندگی کی افزائش کرنے والا مدار دائرہ نما ہونا ضروری ہے۔ ایک شدید بیضوی مدار جیسا کہ حال ہی میں دریافت ہونے والے دسویں سیارے زینا (Xena) کا ہے، اپنے سیارے کو چند زمینی دہائیوں یا صدیوں میں صرف ایک بار قلیل عرصے کے لئے گولڈیلوکس خطے میں سے گزرنے کا موقع دے گا۔ زینا جو کہ ہر ۵۶۰زمینی سال بعد سورج کے قریب آ جاتا ہے، لیکن گولڈیلوکس خطے میں کبھی نہیں آ پاتا۔ دم دار ستارہ ھیلی (Halley's Comet) کا درجہ حرارت سورج کے قرب کے دوران ۴۷°C ہوتا ہے جبکہ سورج سے انتہائی دوری کے زمانے میں منفی ۲۷۰°C ہوتا ہے۔ کرّہ ارض کا مدار بھی باقی سیاروں کی طرح بیضوی ہی ہے (جنوری میں سورج کے قریب ترین اور جولائی میں دور ترین ); لیکن دائرہ بھی بیضوی خط کا ایک خاص نمونہ ہی ہوتا ہے، اور زمین کا مدار دائرہ نما ہونے کے اتنے قریب ہے کہ کبھی بھی گولڈیلوکس خطے سے باہر نہیں جاتا۔ شمسی نظام میں کرّہ ارض (یعنی ہماری زمین) کی جگہ کئی اور طریقوں سے بھی

---

اگر آپ کو یہ بات حیران کن لگ رہی ہے، تو آپ کو زمین کے شمال میں رہنے والوں کی طرح امتیازی سلوک روا رکھنے کی بیماری ہے۔ اس کا ذکر میں باب نمبر ۴ میں کر چکا ہوں۔

موزوں ہے جن کی وجہ سے یہ سیارہ ارتقاء حیات کے لئے منتخب ٹھہرا۔ قوی ہیکل مشتری (Jupiter) کی کشش ثقل ایک ویکیوم کلینر کی طرح کام کرتی ہے اور زمین کو ان سیارچوں سے محفوظ رکھتی ہے جو بیرونی خلاء سے زمین کی طرف بڑھتے ہوئے مہلک ٹکراؤ کا خطرہ پیش کرتے ہیں۔ زمین کا اکلوتا اور قدرے بڑا چاند زمین کی گردش کے محور کو استحکام فراہم کرتا ہے"[۱۴] اور زندگی کی بقاء کے سلسلے میں مزید خدمات سر انجام دیتا ہے۔ ہمارا سورج اس امر میں غیر معمولی ہے کہ وہ جوڑے دار نہیں، یعنی ایک ہم رکاب ستارے کے ساتھ باہمی مدار میں جکڑا ہوا نہیں ہے۔ جوڑے دار ستاروں کے ساتھ سیاروں کا ہونا ممکن تو ہے، لیکن ان کے مدار اس قدر بے ترتیب ہوتے ہیں کہ ان میں حیات کا ارتقاء ممکن نہیں ہوتا۔

حیات کی جانب ہمارے سیارے کے مخصوص دوستانہ رویے کے بارے میں دو مختلف وضاحتیں پیش کی گئی ہیں۔ نظریہ ترتیب یہ کہتا ہے کہ خدا نے دنیا بنائی، اسے گولڈیلوکس خطے میں رکھا، اور دانستاً ساری تفصیلات ہمارے فائدے کے لئے ترتیب دیں۔ بشری نقطۂ نظر اس سے بالکل برعکس ہے، اور اس میں ڈارونی طرز نگاہ کی خفیف سی جھلک نظر آتی ہے۔ کائنات میں اکثر سیارے اپنے ستارے کے گولڈیلوکس خطے میں نہیں ہیں، اور زندگی کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ اس اکثریت میں کہیں بھی زندگی نہیں ہے۔ سیاروں کی یہ اقلیت جہاں زندگی کے لئے حالات موزوں ہو سکتے ہیں کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو، ہمیں لا محالہ اسی اقلیت میں سے کسی ایک میں ہی رہنا چاہئے، کیونکہ ہم یہیں اس کے متعلق سوچ رہے ہیں ۔

اتفاق سے یہ بڑی عجیب و غریب حقیقت ہے کہ مذہبی عذر خواہ اصول بشری کوچند وجوہات کی بنا پر بہت پسند کرتے ہیں، جن کا عموماً کوئی مطلب نہیں نکلتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ اصول ان کے موقف کی حمایت کرتا ہے۔ جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ قدرتی انتخاب کی طرح اصول بشری بھی نظریۂ ترتیب کا **متبادل** ہے۔ وہ اس امر کی ایک منطقی اور غیر 'ترتیبی' توجیہ پیش کرتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو ہماری افزائش کے لئے ایسے موزوں خطے میں پاتے ہیں۔ میرے خیال میں مذہبی ذہن میں ابہام اس لئے پیدا ہوتا ہے کیونکہ اصول بشری کا ذکر صرف اس مشکل کے ضمن میں ہی کیا جاتا ہے جسے حل کرنے کی وہ کوشش کر رہا ہے، کہ ہم ایک حیات افزاء جگہ میں رہتے ہیں۔ لیکن مذہبی ذہن یہ سمجھنے سے قاصر نظر آتا ہے کہ مسئلے کے دو حل پیش کئے جاتے ہیں۔ پہلا خدا ایک ہے، دوسرا اصول بشریت ۔ اور یہ دونوں ایک دوسرے کے متبادل ہیں۔

جیسا کہ ہم جاتے ہیں کہ پانی زندگی کی ضروری شرط توہے۔ لیکن محض یہی کافی نہیں ہے۔ زندگی تو بہر طور پانی میں ہی شروع ہوئی ہے، اور زندگی کی شروعات ایک نہایت غیر ممکن واقعہ رہا ہے ۔ ایک بار زندگی کی شروعات ہو جاتی ہے توپھر ڈارونی ارتقاء چل نکلتا ہے۔ لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ زندگی کی یہ شروعات کیسے ہوئی؟ زندگی کی شروعات وہ کیمیائی عمل یا سلسلہ تھا جس کے نتیجے میں قدرتی انتخاب کے لئے موزوں حالات پہلی بار ظہور پزیر ہوئے۔ ایک اہم جز تو وراثت کا تھا، خواہ وہ ڈی این اے ہو یا کوئی اور خلیہ جو ڈی این اے کی ہی طرح اپنی نقل بنانے کی قابلیت رکھتا ہو، یا شاید اس سے ہی منسلک آر این اے کا خلیہ۔ ایک دفعہ کسی قسم کے جینیاتی خلیے کا اہم ترین جزتیار ہو جائے، تو ڈارونی قدرتی انتخاب کا کاروبار چمک اٹھتا ہے، جس کے نتیجے میں پیچیدہ حیات جنم لیتی ہے۔ لیکن اس پہلے جینیاتی خلیے کا بے ساختہ ظہور بہت سے لوگوں کو غیر ممکن لگتا ہے۔ شاید یہ ہے بھی بہت ہی غیر ممکن، اور اس پہلو پر میں کچھ وقت صرف کرنا چاہوں گا، کیونکہ یہ حصہ اس کتاب کے لئے مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ زندگی کی ابتدا اگرچہ تحقیق کا ایک پھلتا پھولتا قیاسی موضوع ہے۔ لیکن اس تحقیق کے لئے جس مہارت کی ضرورت ہے وہ کیمیا کی ہے، اور میں کیمیا میں ماہر نہیں ہوں۔ میں شدید تجسس سے باہر ہی باہر سے اس کام کو دیکھتا رہتا ہوں، اور اگر اگلے چند سالوں میں کیمیا دان یہ دعویٰ کریں کہ انہوں نے لیبارٹری میں ایک نئی زندگی کو تخلیق کیا ہے تو میں قطعاً حیران نہیں ہوں گا۔ بہر طوراابھی ایسا ہوا نہیں ہے، اور یہ ماننا اب بھی ممکن ہے کہ اس کا امکان بہت ہی کم تھا اورہے ۔ اگرچہ ایک بار تو یہ واقعہ پیش آ ہی چکا ہے!

جیسا ہم نے گولڈیلوکس خطے کے بارے میں کیا تھا، یہاں بھی ہم اس نقطے پر زور دے سکتے ہیں کہ زندگی کی ابتدا کتنی بھی غیر ممکن رہی ہو، ہمیں معلوم ہے کہ یہ زمین پر وقوع پزیر ضرور ہوئی تھی، کیونکہ ہم یہاں موجود ہیں۔ اور جیسا ہم نے گولڈیلوکس خطے کے درجہ حرارت کے سلسلے میں کیا تھا، یہاں بھی ہمیں واقعات کے بارے میں دو نظریات میسّر ہیں ۔ نظریۂ ترتیب اور سائنسی یا بشری نظریہ۔ ترتیبی رویّہ کہتا ہے کہ کسی خدا نے دانستہ معجزہ کیا، قبل از حیات کیچڑ میں ربّانی آگ ڈالی، اور ڈی این اے یا اس کے کسی مترادف کو اس کے زبردست سفر پر روانہ کر دیا۔

گولڈیلوکس کی طرح، یہاں بھی نظریہ بشری کے شماریات پر انحصار کرتا ہے۔ سائنسدان قوی اعداد کا جادو جگاتے ہیں۔ قیاس کے مطابق ہماری کہکشاں میں ۱ سے ۳۰ ارب سیارے ہیں، اور کائنات میں ۱۰۰ ارب کہکشائیں ہیں۔ عاقبت اندیشی میں کچھ صفر گرا بھی دئے جائیں تو ایک محتاط اندازے کے مطابق کم از کم کائنات میں اربہا ارب سیارے موجود ہیں۔ تصوّر کیجئے کہ زندگی کی ابتدا، ڈی این اے کی وہ بے ساختہ پیدائش واقعی ایک انتہائی غیر ممکن واقعہ تھا۔ یہ اتنا غیر ممکن تھا کہ ایک ارب سیاروں میں سے صرف ایک سیارے پر ایسا ہونا ممکن تھا۔ تحقیقی وسائل کی اجازت دینے والا کوئی بھی ادارہ کسی بھی ایسے کیمیا دان پر ہنس

پڑتا جو اعتراف کرتا کہ اس کی کامیابی کا امکان سو میں سے ایک ہے۔ لیکن یہاں تو ہم ایک ارب میں سے ایک کے امکانات کی بات کر رہے ہیں۔ اور اس کے باوجود ... اتنے حماقت خیز حد تک کمزور امکانات کے ساتھ بھی، زندگی کم از کم ایک ارب سیاروں پر نمودار ہوئی ہو گی، جن میں سے ہماری زمین بھی ایک ہے[۲۵]۔

یہ نتیجہ اتنا حیران کن ہے کہ میں اسے دہرا دیتا ہوں۔ اگر کسی سیارے پر زندگی کے نمودار ہونے کے امکانات ایک ارب میں ایک تھے، تو پھر بھی ایک ارب سیاروں پر یہ حیران کن حد تک غیر ممکن واقعہ پیش آیا ہو گا۔ ان زندگی دینے والے ایک ارب سیاروں میں سے کسی ایک کو بھی تلاش کر پانا آٹے میں زیرے کے دانے کے مترادف ہے۔ لیکن ہمیں اس دانے کی تلاش میں بہت دور نہیں جانا پڑتا ہے کیونکہ کوئی بھی مخلوق جو ایسا سوال سوچنے کے قابل ہے اپنی تلاش کی شروعات کرنے سے پہلے خود بھی کسی ایسے ہی "دانے" پر بیٹھی ہو گی۔

ممکنات کے بارے میں کوئی بھی بیان لاعلمی کے درجے کے سیاق و سباق میں ہی دیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم ایک سیارے کے بارے کچھ نہیں جانتے، تو ہم اس پر زندگی کے نمودار ہونے کے امکانات کے بارے میں اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شاید وہ ایک ارب میں سے ایک ہوں گے۔ لیکن اگر ہم اپنے اندازے میں نئے مفروضات متعارف کروا دیں تو حالات بدل جاتے ہیں۔ ایک مخصوص سیارے کی کچھ خاص خصوصیات ہو سکتی ہیں، جیسے کہ پتھروں میں کسی خاص عنصر (element) کی بہتات ، جو اس سیارے کو حیات کے لئے قدرے موزوں بنا دیتی ہوں۔ دوسرے الفاظ میں کچھ سیارے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ "زمین نما" ہوتے ہیں۔ اور ظاہر ہے زمین تو خاص طور سے زمین نما ہے! اس بات سے ہمارے ان کیمیا دانوں کو تقویت ملنی چاہئے جو اپنی تجربہ گاہوں میں اس واقعے کو دوہرانے کی کوشش کر رہے ہیں، ان کی کامیابی کے امکانات بہتر ہو جانے چاہئیں۔ لیکن جیسے کہ میرے حساب نے ظاہر کیا، اگر کیمیائی نمونے کی کامیابی کے امکانات ایک ارب میں سے ایک کے بھی ہوں تو بھی یہ نمونہ پیشگوئی کرے گا کہ کائنات میں ایک ارب سیاروں پر زندگی کی شروعات ہو سکے گی۔ اصول بشری کی خوبصورتی یہی ہے کہ ہمارے سیارے پر زندگی کے ہونے کی ایک اچھی اور مکمل طور پر اطمینان بخش وضاحت کے سلسلے میں یہ اصول تمام الہام کے برعکس ہمیں یہ بتاتا ہے کہ کیمیائی نمونے کو صرف اتنی پیشگوئی کرنے کی ضرورت ہے کہ اربہا ارب سیاروں میں سے کسی ایک سیارے پر زندگی کی شروعات ہو سکتی ہے۔ مجھے ایک لمحے کے لئے بھی یہ بات قبول نہیں کہ حقیقت میں زندگی کی شروعات اس قدر غیر ممکن تھی۔ میرے خیال میں سائنسدان اپنی تجربہ گاہوں میں اس واقعے کو دوہرانے کی کوششوں پر ذرائع صرف کرنے میں بالکل حق بجانب ہیں اور اسی طرز پر SETI پراجیکٹ پر بھی، کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ دور کہیں ذہین حیات کے ہونے کے امکانات موجود ہیں۔

زندگی کی بے ساختہ پیدائش کے امکانات کے انتہائی قنوطی اور مایوس کن اندازے بھی ایسی کسی تجویز کو مکمل طور پر تباہ کر دیتے ہیں کہ ہمیں اس خلاء کو پر کرنے کے لئے ترتیب کا مفروضہ مان لینا چاہئے۔ ارتقاء کی کہانی کے تمام اہم خلاؤں میں سے زندگی کی شروعات کا خلاء ایسے ذہنوں کے لئے بالکل ناقابل رابطہ ہے جو امکان اور خطرے کو انسانی زندگی کے معیار پر پرکھنے کے عادی ہو چکے ہیں: ایسے معیار جن پر وسائل کی اجازت جاری کرنے والے ادارے کیمیا دانوں کی طرف سے جمع کروائی گئی تحقیقاتی تجاویز کو پرکھتے ہیں۔ پھر بھی، اتنے بڑے خلاء کو بھی با آسانی شماریات پر مبنی سائنس سے پر کر لیا جاتا ہے، جبکہ وہی شماریات پر مبنی سائنس ربانی تخلیق کار کے خیال کو "حتمی ۷-۴۷ " کی بنیاد پر رد کرنے کے لئے کافی ثابت ہوتی ہے۔

لیکن اب ہم اس دلچسپ نقطے کے جانب لوٹتے ہیں جس سے کتاب کا یہ حصہ شروع ہوا تھا۔ فرض کیجئے کہ کوئی شخص حیاتیاتی موافقت (biological adaptation) کے عمومی کرشمے کو انہی خطوط پر سمجھانے کی کوشش کرے جو ابھی ہم نے زندگی کی ابتدا کی وضاحت کے سلسلے میں استعمال کئے ہیں: میسر سیاروں کی ایک کثیر تعداد پر انحصار کرتے ہوئے۔ مشاہدہ حقیقت یہ ہے کہ ہر جنس، اور اس جنس کے اندر ہر وہ عضو جس کا تجزیہ کیا گیا ہے، اپنے کام میں ماہر ہے۔ پرندوں، شہد کی مکھیوں، اور چمگادڑوں کے پر اڑنے کا کام بخوبی سر انجام دیتے ہیں۔ آنکھیں دیکھنے کی ماہر ہیں۔ پتے ضیائی تالیف کا کام بہت عمدگی سے کرتے ہیں۔ ہم ایک ایسے سیارے پر رہتے ہیں جہاں ہم غالباً دس میلین جنس سے گھرے ہوئے ہیں، جن میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ ترتیب کے فریب کا مظاہرہ کرتی ہے۔ ہر جنس اپنے مخصوص طرز زندگی کے لئے بالکل موزوں ہے۔ کیا ہم 'بے شمار سیاروں' کی منطق کو اتنے بہت سارے ترتیب کے فریبوں کی وضاحت کے لئے استعمال کر سکتے ہیں؟ نہیں! میں کہتا ہوں بالکل نہیں۔ ایسا کرنے کے بارے میں سوچئے بھی مت۔ یہ بہت اہم بات ہے، کیونکہ یہ ڈاروین کے نظریے کے بارے میں سب سے بڑی غلط فہمی کی جڑ تک جاتی ہے۔

اس سے فرق نہیں پڑتا کہ ہمارے پاس مشاہدے کے لئے کتنے سیارے موجود ہیں؛ " خوش قسمتی"سے ہمارے سیارے پر زندگی کی پیچیدگی کے بھرپور تنوّع کی اس طرح کی وضاحت دینے کے لئے ناکافی ہے جیسے ہم نے زندگی کی موجودگی کے لئے دی تھی۔ زندگی کا ارتقاء زندگی کی ابتداء سے ایک قطعی مختلف مسئلہ ہے کیونکہ ابتداء ایک ایسا منفرد واقعہ تھا جسے ایک دفعہ ہی ہونا تھا۔ ہر نوع کے اپنے منفرد ماحول کے مطابق ڈھل جانے کا عمل کروڑہا بار ہوا ہے اور آج

بھی جاری ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ ہم زمین پر انواع کی بہتری کے عمومی عمل کا مشاہدہ کر رہے ہیں، ایک ایسا عمل جو مسلسل پورے سیارے پر جاری ہے، ہر بر اعظم پر اور ہر جزیرے پر۔ ہم بڑے اعتماد سے یہ پیشگوئی کر سکتے ہیں کہ اگر ہم ایک کروڑ سال تک انتظار کر پائیں تو یقیناً نئی انواع اسی طرح اپنے ماحول کے مطابق ڈھل چکی ہوں گی جیسے آج کی انواع اپنے ماحول کے مطابق ہیں۔ یہ ایک بار ہا دوہرایا جانے والا، قابل پیشگوئی، اور کثرت سے ہونے والا کرشمہ ہے، کسی شماریاتی خوش قسمتی کا نمونہ نہیں جسے پس اندیشی میں پہچانا گیا ہو۔ ہم ڈارون کے مرہون منّت ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ سب قدرتی انتخاب کے ذریعے کیسے ہوتا ہے۔

اصول بشری زندہ مخلوق کی رنگ برنگی تفاصیل کی وضاحت پیش کرنے میں ناکام ہے۔ زمین پر زندگی کے تنوع کا حساب دینے کے لئے اور خصوصاً ترتیب کے فریب کو غلط ثابت کرنے کے لئے ہمیں واقعی ڈارون کی طاقتور کرین کی ہی ضرورت ہے۔ اس کے برعکس زندگی کی ابتداء اس کرین کی پہنچ سے باہر ہے، کیونکہ قدرتی انتخاب اس کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور یہاں اصول بشری اپنے پورے جوبن پر ابھرتا ہے۔ ہم زندگی کی منفرد ابتداء کے لئے سیاروں کی کثیر تعداد سے پیدا ہونے والے مواقع کے بارے میں مفروضے قائم کرتے ہیں۔ ایک بار اس ابتدائی خوش قسمتی کے دعوے کو تسلیم کر لیا جائے ۔ اور اصول بشری بڑے فیصلہ کن لہجے میں ہمیں یہ تسلیم کرنے کا موقع دیتا ہے تو قدرتی انتخاب اختیار سنبھال لیتا ہے: اور قدرتی انتخاب میں یقیناً قسمت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا ہے۔

بہر طور یہ ممکن ہے کہ ارتقاء کی کہانی میں ابتداء ہی واحد ایسا خلاء نہیں ہے جسے "قسمت" کے پل کے ذریعہ طے کیا گیا ہو۔ مثلاً میرے ہم عصر مارک رڈلی نے اپنی کتاب "مینڈل کا بھوت ۔ Mendel's Demon " (جسے امریکی ناشرین نے بیہانہ اور مبہم انداز میں "پر تعاون جین ۔ The Cooperative Gene " کے نام سے چھاپا) میں یوکاریوٹک خلیے کی ابتداء (ہمارے جیسا خلیہ جس میں حیاتیاتی مادے کے مرکز اور خیطی ذرہ (mitchondia) جیسی دیگر پیچیدہ خصوصیات موجود ہوں جو جرثومے میں نہیں پائی جاتیں) کو زندگی کی بتداء سے بھی زیادہ اہم، مشکل، اور شماریاتی طور پر غیر ممکن واقعہ قرار دیا۔ شعور کی ابتداء شاید ایک اور ایسا ہی اہم خلاء رہا ہو گا جس کے پار کئے جانے کا واقعہ غیر امکان کے ایسے ہی درجے پر پایا جاتا ہو گا۔ صرف ایک بار پیش آنے والے ایسے واقعات کی وضاحت کے لئے اصول بشریت کو کچھ اس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ایسے اربوں سیارے موجود ہیں جہاں جرثومے کی حد تک زندگی کا ارتقاء ممکن ہوا، لیکن زندگی کے ان نمونوں میں سے ایک نہایت قلیل سی تعداد ارتقائی خلاء کو پار کر کے یوکاریوٹک خلیہ بننے میں کامیاب ہوئی۔ اور ایک اس سے بھی کم تعداد نے بعد میں شعور تک پہنچنے کے لئے سب سے بڑی چھلانگ لگائی۔ اگر یہ دونوں واقعات ایک ہی بار ہوئے ہوتے ، تو پھر ہم ہر جگہ موجود اور ہمہ گیر عمل کا مشاہدہ نہیں کر رہے ہوتے جیسا کہ ہم عام حیاتیاتی موافقت میں دیکھتے ہیں۔ اصول بشری ہمیں یہ بتاتا ہے کہ چونکہ ہم زندہ ہیں، یوکریاوٹک ہیں، اور با شعور ہیں، لہذا ہمارا سیّارہ ان چند سیاروں میں سے ہے جو یہ تینوں خلاء کامیابی سے پار کئے گئے۔

قدرتی انتخاب اس لئے کامیاب ہے کیونکہ یہ بہتری کی جانب ایک یک رویہ گلی ہے۔ اس کے شروع ہونے کے لئے کچھ "خوش قسمتی" کی ضرورت ہے ، اور وہ خوش قسمتی اسے اربوں سیاروں پر پھیلے اصول بشری سے مہیا ہوتی ہے۔ شاید ارتقاء کی کہانی کے کچھ مزید خلاء بھی اس اصول بشری کی فراہم کردہ اس خوش قسمتی کے محتاج ہیں۔ لیکن کچھ بھی کہہ لیں، "ترتیب" یقیناً کامیاب زندگی کی وضاحت کرنے سے قاصر ہے، کیونکہ ترتیب بالآخر مجموعی نہیں ہے، اور جتنے سوالوں کے جواب دیتی ہے اس سے کہیں زیادہ نئے سوالوں کو جنم دیتی ہے ۔ وہ ہمیں سیدھا حتمی ۷۴۷ کی لا محدود الٹی چال کی طرف لے جاتی ہے۔

ہم ایک ایسے سیّارے پر رہتے ہیں جو زندگی کے لئے بہت موافق ہے، اور ہم نے اس کے ایسا ہونے کی دو وجوہ دیکھے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ زندگی نے اس سیارے کے حالات کے مطابق پہنچنے کے لئے مناسب ارتقاء کیا ہے ، اور یہ قدرتی انتخاب کی وجہ سے ممکن ہوا۔ دوسری وجہ بشریت سے منسلک ہے۔ کائنات میں اربوں سیّارے ہیں، اور ان میں سے ارتقاء پسند سیّاروں کی تعداد کتنی بھی کم ہو، ہمارا سیّارہ یقیناً ان میں سے ایک ہو گا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اصول بشری کو ایک پچھلے مرحلے حیاتیات سے کونیات (cosmology) کی جانب لے جائیں۔

## اصول بشری کا کونیاتی بیان

## The Anthropic Principle – Cosmological Version

ہم صرف ایک دوستانہ سیّارے پر ہی نہیں رہتے بلکہ ایک دوستانہ کائنات میں رہتے ہیں۔ ہماری موجودگی سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ طبیعیات کے

قوانین زندگی کے لئے اتنے موافق ضرور ہوں گے کہ ہمارے سیّارے پر زندگی کی ابتداء ہو سکے۔ یہ حادثہ نہیں کہ جب ہم رات کو آسمان کی طرف دیکھتے ہیں تو ہمیں ستارے نظر آتے ہیں، کیونکہ ستاروں کی موجودگی کیمیائی اجزاء کی موجودگی کے لئے لازمی شرط ہے، اور علم کیمیا کے بغیر زندگی کی ابتدا نہ ہو پاتی۔ ماہرین طبیعیات نے حساب لگایا ہے کہ اگر طبیعیات کے قوانین اور اعداد میں تھوڑا سا بھی فرق ہوتا تو کائنات ایک ایسے انداز سے تیّار ہوتی کہ اس میں زندگی ناممکن ہوتی۔ مختلف ماہرین طبیعیات اس بات کو مختلف انداز سے بیان کرتے ہیں، لیکن نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے[§§§§§§§]۔ "صرف چھ اعداد ۔ Just Six Numbers" میں مارٹن ریس نے چھ بنیادی اعداد کا ذکر کیا جو پوری کائنات میں کسی رد و بدل کے بغیر موجود ہیں۔ان چھ میں سے ہر ایک عدد ایسے نفیس انداز سے مرتب (fine tuned)ہے کہ اگر وہ اپنی مقدار سے ذرا سا بھی مختلف مقدار میں ہوتے تو کائنات یکسر مختلف ہوتی اور شاید زندگی کے لئے سازگار نہ ہوتی[********]۔

ریس کے چھ اعداد میں سے ایک عدد 'مضبوط قوت ۔ strong force' کا حجم ہے۔ یہ وہ قوت ہے جو ایٹمی مرکز کے اجزاء کو اکٹھا رکھنے کا کام سر انجام دیتی ہے، اور جسے زیر کئے بغیر ایٹم کو نہیں توڑا جا سکتا۔ اس کی پیائش کو E سے منسوب کیا جاتا ہے، جو ہائیڈروجن کے مرکز کے اس وزن کا تناسب ہے جو ہیلیم میں تبدیلی کے عمل کے دوران توانائی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہماری کائنات میں اس عدد کا حجم ۰٫۰۰۷ ہے، اور ایسا لگتا ہے کہ E کو اس مقدار کے بہت ہی قریب ہونا ضروری ہے تاکہ کیمیائی عناصر (chemical elements)وجود میں آ سکیں۔ کیمیاء ان ۹۰ کے لگ بھگ قدرتی طور پر میسّر عناصر کے متواتر اور دوبارہ ملاپ پر مشتمل ہے۔ ہائیڈروجن (Hydrogen) سب سے سادہ کثیر تعداد میں پایا جانے والا عنصر ہے۔ کائنات میں باقی تمام عناصر ہائیڈروجن کے جوہری انشقاق (nuclear fusion) کا نتیجہ ہیں۔ جوہری انشقاق ایک نہایت مشکل عمل ہے جو ستاروں کے اندرونی حصے (یا ہائیڈروجن بم) میں پائے جانے والے شدید گرم ماحول میں ممکن ہوتا ہے۔ ہمارے سورج جیسے قدرے چھوٹے ستارے صرف ہلکے عناصر کو جنم دے پاتے ہیں، جیسے کہ ہیلیم (Helium) جو کہ ہائیڈروجن کے بعد سب سے ہلکا عنصر ہے۔ مزید با وزن عناصر کی تخلیق کے لئے قدرے بڑے اور گرم ستاروں کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ وہ انتہائی درجۂ حرارت حاصل کئے جا سکیں جو ان عناصر کو پیدا کرنے والے جوہری انشقاق کے اس تسلسل کے لئے ضروری ہیں۔ فریڈ ہوئیل اور اس کے دو رفقاء کار نے اس عمل کی تفاصیل واضح کیں، (لیکن حیران کن طور پر ہوئیل کو اس کارنامے کے سلسلے میں ملنے والے نوبل انعام سے محروم رکھا گیا)۔ یہ بہت جسیم ستارے عظیم دھماکوں (supernova)میں پھٹتے ہیں اور اپنے مادّے بشمول کیمیائی عناصر کائنات میں گرد کے بادل کی صورت میں پھیلا دیتے ہیں۔ گرد کے یہ بادل بلآخر پھر مجتمع ہو کر نئے ستاروں اور سیّاروں کو جنم دیتے ہیں، جیسے کہ ہمارا کرّۂ ارض۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا سیّارہ ان عناصر سے زرخیز ہے؛ وہ عناصر جن کے بغیر عمل کیمیاء اور زندگی ممکن نہ تھی۔

یہاں قابل غور نقطہ یہ ہے کہ 'مضبوط قوت ۔ strong force' کا حجم ہی اس بات کا تعین کرتا ہے کہ جوہری اشقاق عناصر کی دوری جدول (Periodic Table) کے کس پائےدان تک پہنچ پائے گا۔ اگر مضبوط قوت ۰٫۰۰۷ کی بجائے ۰٫۰۰۶ ہوتی تو کائنات میں صرف ہائیڈروجن ہی پایا جاتا اور کوئی دلچسپ کیمیائی عمل دیکھنے میں نہ آتے۔ اگر یہ ۰٫۰۰۸ ہوتی تو سارے ہلکے عناصر جوہری اشقاق کے نتیجے میں بھاری عناصر میں تبدل ہو چکے ہوتے اور ہائیڈروجن ختم ہو چکے ہوتے۔ ہائیڈرو جن کی غیر موجودگی میں حیات افزا کیمیائی عمل ناممکن ہے۔ ایک بات تو یہ کہ سرے سے پانی ہی نہ ہوتا۔ یہ گولڈیلوکس عدد ۔ ۰٫۰۰۷ ۔ ایک دلچسپ اور حیات بخش کیمیاء کے لئے بالکل صحیح مقدار میں ہے، نہ کم نہ زیادہ۔

میں ریس کے تمام چھ اعداد کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ سب کا لب لباب ایک ہی ہے۔ اصل عدد ایک ایسی گولڈی لوکس خطے میں پایا جاتا ہے جس کے باہر زندگی ممکن نہ ہوتی۔ اس بات پر ہمارا رد عمل کیا ہونا چاہئے؟ ایک بار پھر، ایک طرف ہمارے پاس مذہبی جواب ہے اور دوسری طرف اصول بشری پر مبنی جواب۔ مذہبی لوگوں کا ماننا ہے کہ کائنات کی تخلیق کے وقت خدا نے ان بنیادی اعداد کی قدریں یوں طے کر دیں کہ ان میں سے ہر ایک زندگی کی افزائش کے لئے اس گولڈی لوکس خطے میں ہی پایا جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے خدا کے پاس ریڈیو کے ناب کی طرح کے چھ ناب ہیں جنھیں گھما گھما کر وہ انہیں ان کی گولڈی لوکس مقدار تک لے آتا ہے۔ ہمیشہ کی طرح مذہبی جواب اطمینان بخش نہیں ہے، کیونکہ یہ خدا کی موجودگی کے بارے میں تو کوئی وضاحت دیتا

---

[§§§§§§§] ماہر طبیعیات وکٹر سٹینگر اس اتفاق رائے سے اختلاف کرتا ہے، اور ماننے سے انکار کرتا ہے کہ طبیعیات کے قوانین اور اعداد زندگی کے لئے کسی خاص حد تک موافق ہیں۔ اس کے باوجود، میں 'دوستانہ کائنات' کے تصور کو درست تسلیم کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار ہوں تاکہ یہ دکھایا جا سکے کہ اس سے توحید پرستی کو تقویت نہیں ملتی۔،

[********] میں نے "شاید" کا لفظ اس لئے استعمال کیا ہے کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ غیر ارضی مخلوق کس قدر مختلف ہوگی، اور اگر ہم ہر عدد کو فرداً فرداً تبدیل کرنے کی کوشش کریں تو ہمارے غلطی کرنے کا احتمال بہت زیادہ ہے۔ کیا ان چھ اعداد کے کوئی اور مجموعات بھی ممکن ہیں جو زندگی کے لئے ایسے انداز سے موزوں ہوں جسے ہم اعداد کو اکیلے اکیلے پرکھنے سے دریافت نہ کر سکیں؟ بہر طور میں بحث کی آسانی کی خاطر یہ مان کر چلوں گا کہ ہمارے سامنے اعداد کی نفیس انداز سے مرتب ہونے کی وضاحت ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔

ہی نہیں۔ ایسا خدا جو ان چھ اعداد کی گولڈی لوکس مقدار کا حساب لگا سکتا ہے کم از کم اتنا غیر ممکن (imptobable) تو ہو گا ہی جتنا غیر ممکن خود ان مقداروں کا کوئی حیات بخش مجموعہ ہو گا۔ اور یہ مجموعہ واقعی بہت غیر ممکن ہے۔ ہماری اس بحث کی بنیاد ہی اس خیال پر رکھی گئی ہے۔ لہذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مذہبی جواب اس مسئلے کو حل کرنے میں ناکام ہے جس کو ہم سلجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے اس کو رد کرنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ میں ان لوگوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پا رہا جو اس مسئلے کو سمجھ نہیں پا رہے ہیں اور حقیقتاً "خدائی ناب گھمانے والے" کی توجیہہ سے مطمئن ہیں۔

شاید اس حیران کن اندھے پن کی نفسیاتی وجہ کا اس بات سے بھی تعلق ہے کہ زیادہ تر لوگوں کا شعور ابھی اس طرح سے بیدار نہیں ہو سکا جیسا کہ نظریہ قدرتی انتخاب اور اس کی غیر امکان کو اپنے طابع کرنے کی قوت کی وجہ سے ماہرین حیاتیات کا ہو چکا ہے۔ جے اینڈرسن ٹامسن کی ارتقائی نفسیات کا زاویہ میری توجہ ایک اور سبب کی طرف بھی لے جاتا ہے۔ یہ وہ نفسیاتی تعصب ہے جس کی بنیاد پر انسان بے جان چیزوں کو "شخصیت" بخش دیتا ہے۔ جیسا کہ ٹامسن کہتا ہے، ہمارا ذہن سائے کو چور سمجھنے کے لئے فوراً تیار ہو جاتا ہے، لیکن چور کو سایا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک غلط مثبت نتیجہ (false positive) وقت کا زیاں ہو۔ ایک خط میں ٹامسن نے مجھے یہ تجویز دی کہ ہمارے آباء و اجداد کی تاریخ میں شاید ہمارے لئے اپنے ماحول میں سب سے اہم خطرہ ایک دوسرے سے ہی رہتا ہو گا۔ ' انسانی ارادے کا طے شدہ مفروضہ اس آبائی خطرے کے احساس کی میراث ہے۔ لہذا ہمیں انسانی سبب کے علاوہ اور کچھ بھی دیکھنے میں بہت مشکل پیش آتی ہے'۔ ہم نے قدرتی طور پر اس انسانی ارادے کی تعمیم کرتے ہوئے اسے نیت ربّانی بنا دیا۔ میں باب ۵ میں عالموں کی اس دل فریبی کی طرف واپس آؤں گا۔

چونکہ ماہرین حیاتیات کا شعور نظریہ قدرتی انتخاب کی اس قوت کی وجہ سے بیدار ہو چکا ہوتا ہے جس سے وہ غیر ممکن چیزوں کے عروج کی وضاحت فراہم کرتا ہے، اس لئے ان کا کسی ایسے نظریے سے مطمئن ہونے کا امکان کم ہے جو غیر اغلبیت (improbability) کے مسئلے کو نظر انداز کرتا ہو۔ اور مذہب پسندوں نے تو اس مسئلے کو عظیم الشان طریقے سے نظر انداز کیا ہے۔ ان کا جواب مسئلے کو محض دوسرے الفاظ میں بیان کرنے سے بڑھ کر اس کو ایک خوفناک انداز سے پھیلا دیتا ہے۔ تو پھر آیئے اصول بشری کے مہیا کردہ متبادل کی جانب چلیں۔ اپنے سادہ ترین اوتار میں اصول بشری کا جواب یہ ہے کہ ہم کائنات کے ہونے کے سوال پر تو صرف ایسی ایک کائنات میں بحث کر سکتے ہیں جو ہمیں پیدا کرنے کے قابل ہے۔ ہماری موجودگی ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ چھ بنیادی اعداد اپنے اپنے گولڈی لوکس خطوں میں موجود ہوں گے۔ مختلف ماہرین طبیعیات ہماری موجودگی کے معمے کے منفرد بشری حل مہیا کرتے ہیں۔

کچھ ماہرین اس زاویے میں کسی قسم کی لچک لانے کو تیار نہیں کہ وہ چھ ناب اپنی قدروں میں ردو بدل کے لئے کبھی آزاد تھے ہی نہیں۔ جب ہم مستقبل میں اس ہمہ گیر نظریہ Theory of Everything تک پہنچ جائیں گے تو ہم دیکھیں گے کہ یہ چھ اعداد ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں یا کسی ایسی چیز پر جس کے بارے میں ابھی ہم کچھ نہیں جانتے، ایسے زاویوں سے جن کے بارے میں ابھی ہم کچھ نہیں جانتے۔ جیسے دائرے کے گھیرے اور قطر کے تناسب میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں، ممکن ہے کہ اسی طرح ان چھ اعداد کی مقدار میں بھی تبدیلی کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ کائنات کے ہونے کا صرف ایک ہی طریقہ ہو گا۔ ان چھ ناب کو گھمانے کے لئے کسی خدا کے ہونے کی ضرورت کی بجائے سرے سے کوئی ناب ہو گی ہی نہیں گھمانے کے لئے۔

دوسرے ماہرین طبیعیات (جن میں خود مارٹن ریس بھی شامل ہے) اس سے مطمئن نہیں، اور میرا خیال ہے میں ان سے متفق ہوں۔ یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ کائنات کے وجود کا صرف ایک ہی طریقہ ہو۔ لیکن وہ "ایک طریقہ" ہمارے حتمی ارتقاء کے لئے اتنا موزوں کیونکر ثابت ہوا؟ یہ کیوں ضروری تھا کہ ایک ایسی کائنات ہو جس کے معائنہ سے ایسا لگتا ہے جیسے (ماہر نظریاتی طبیعیات فریمین ڈائیسن کے الفاظ میں) اسے معلوم تھا کہ ہم آنے والے ہیں؟ فلسفی جان لیسلی اس سلسلے میں ایسے شخص کا استعارہ استعمال کرتا ہے جسے موت کی سزا سنائی گئی ہو۔ یہ ممکن ہے کہ بندوق چلانے والے دس کے دس جوانوں کا نشانہ خطا کر جائے۔ بادی النظر میں بچ جانے والا شخص اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھنے لگتا ہے اور بڑی خوشی سے کہنے لگتا ہے : " ظاہر ہے ان سب کا نشانہ چوک گیا؛ ورنہ میں یہاں نہ ہوتا"۔ لیکن پھر بھی اگر وہ یہ سوچے کہ وہ کیوں بچ گیا اور کیا جوانوں کو رشوت دی گئی تھی یا انہوں نے شراب پی رکھی تھی تو ہمیں اس کو معاف کر دینا چاہیئے۔

اس اعتراض کا جواب اس تجویز سے دیا جا سکتا ہے، اور جس کی تائید خود مارٹن ریس بھی کرتا ہے کہ بہت سی کائناتیں جھاگ کے بلبلوں کی طرح

ایک کثیر کائنات (multiverse) میں ایک ساتھ وجود میں آئی ہیں(یا "عظیم کائنات ۔ megaverse " جیسے لیونڈ سسکنڈ کہنا پسند کرتا ہے)۔ کسی بھی کائنات کے قوانین و اعداد جیسے کہ ہماری قابل مشاہدہ کائنات محض ضمنی قوانین (by-laws) ہی ہیں۔ کثیر کائنات میں اس قسم کے ضمنی قوانین کی بھرمار ہے۔ یہاں اصول بشریت پھر اس بات کی وضاحت کرنے میں کار فرما ہوتا ہے کہ ہم ان سب کائناتوں میں سے اس ایک کائنات میں موجود ہیں جس کے ضمنی قوانین ہمارے ممکنہ ارتقاء اور بالآخر ہمارے اس سوال کے بارے میں سوچ سکنے کے لئے موزوں ہے۔

کائنات کے اختتام کے بارے میں قیاس کرنے سے کثیر کائنات کی ایک دلچسپ صورت سامنے آتی ہے۔ مارٹن ریس کے چھ اعداد جیسے نمبروں کی قدروں کے حساب سے یا تو ہماری کائنات ہمیشہ پھیلتی رہے گی یا ایک مستحکم توازن اختیار کر لے گی یا پھر واپسی کے سفر میں سکڑنا شروع کر دے گی اور ایک عظیم سکڑن (Big Crunch) میں ختم ہو جائے گی۔ اس عظیم سکڑن کے کچھ ڈھانچے (models) سکڑن کے بعد ایک نئے پھیلاؤ کے راستے پر چل نکلتے ہیں اور یوں ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، جس میں پھیلاؤ اور سکڑن کی ہر جوڑی لگ بھگ ۲۰ ارب سال پر محیط ہوتی ہے۔ ہماری کائنات کا معیاری ڈھانچہ یہ کہتا ہے کہ خود وقت اور خلاء بھی عظیم دھماکے (Big Bang) پر قریب ۱۳ ارب سال پہلے شروع ہوئے تھے۔ لیکن سکڑن اور پھیلاؤ کے تسلسل والا دھانچہ اس بیان میں کچھ رد و بدل کرتا ہے: ہمارا وقت اور ہماری خلاء واقعی ہمارے ہی عظیم دھماکے میں شروع ہوئے تھے، لیکن یہ دھماکوں کے ایک طویل تسلسل کی محض حالیہ کڑی ہے، اور ہر نیا دھماکہ سابقہ کائنات کی سکڑن کے نتیجے میں شروع ہوا ہو گا۔ کوئی بھی ٹھیک سے سمجھ نہیں پایا کہ عظیم دھماکے جیسی اکائیت (singularity) کے اندر ہوتا کیا ہے، اس لئے یہ قابل قیاس ہے کہ ہر بار قوانین اور اعداد کی نئی قدریں استوار ہوتی ہوں۔ اگر دھماکہ۔ پھیلاو۔ واپسی۔ سکڑن ایک آسمانی ہارمونیم کی طرح ہمیشہ سے چلتے چلے آ رہے ہیں تو ہمارے پاس مساوی کثیر کائنات کی بجائے مسلسل کثیر کائنات کا تصوّر آتا ہے۔ ایک بار پھر اصول بشریت اپنے وضاحتی فرائض سر انجام دیتا ہے۔ سلسلے میں جتنی بھی کائناتیں ہیں ان میں سے ایک اقلیت ہی ہے جن میں اعداد کے "ناب" حیاتیاتی حالات کے موافق قدروں پر گھومتے ہوئے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ حالیہ کائنات اس اقلیت میں سے ایک ہو گی کیونکہ ہم اس میں موجود ہیں۔ ہوا کچھ یوں ہے کہ یہ مسلسل تصوّر اب اتنا ممکن نہیں مانا جاتا جتنا کبھی سمجھا جاتا تھا، کیونکہ حالیہ شواہد نے ہمیں عظیم سکڑن والے ڈھانچے سے دور لے جانا شروع کر دیا ہے۔ اب ایسا لگتا ہے کہ ہماری کائنات ہمیشہ پھیلتی ہی رہے گی۔

ایک اور ماہر نظریاتی طبیعیات، لی سمولن نے کثیر کائنات کا لچا دینے والا ڈارونی تصوّر پیش کیا ہے جس میں مسلسل اور مساوی اجزاء دونوں موجود ہیں۔ سمولن کے خیالات اس کی کتاب "عالم ظاہر کی زندگی ۔ The Life of the Cosmos " میں بیان کی گئی ہے، جواس نظریے پر منحصر ہے کہ دختر کائناتیں اپنے والد کائناتوں کے علاوہ کسی بھر پور عظیم سکڑن کی بجائے سیاہ خلاء (black hole) میں پیدا ہوتی ہیں۔ یہاں سمولن موروثیت کے خیال کو بھی متعارف کرواتا ہے: دختر کائنات کے بنیادی مستقل اعداد اپنی والدہ کائنات کے بنیادی مستقل اعداد کی ذرا سی بدلی ہوئی نقلیں ہوتی ہیں ۔ موروثیت ڈارونی قدرتی انتخاب کا اہم جزو ہے اور سمولن کا بقیہ نظریہ یہاں سے با آسانی اخذ ہو جاتا ہے۔ وہ کائناتیں جن میں 'بقا' اور 'افزائش' کے لئے ضروری خصوصیات موجود ہیں کثیر کائنات پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ اور ضروری خصوصیت یہ ہے کہ وہ کائنات اتنی دیر تک جاری رہ سکے کہ وہ ایک دختر کائنات کو جنم دے پائے۔ کیونکہ جنم دینے کا عمل سیاہ خلاء میں ہوتا ہے، کامیاب کائناتوں میں وہ اجزاء موجود ہوتے ہوں گے جو سیاہ خلاء کی تخلیق کے لئے ضروری ہیں۔ ایسی قابلیت کے لئے مزید خصوصیات کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر مادے کے گاڑھا ہو کر بادل اور پھر ستارہ بن جانے کی جبلّت سیاہ خلاء کی تخلیق کے لئے ضروری شرط ہے۔ اور جیسا کہ ہم دیکھ ہی چکے ہیں، ستارے دلچسپ کیمیاء کی نشوو نما کے لئے اجزاء فراہم کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں زندگی وجود میں آتی ہے۔ سمولن کا خیال ہے کہ کثیر کائنات میں کائناتوں کا بھی ایک ڈارونی قدرتی انتخاب ہوتا ہے، جو براہ راست سیاہ خلاء کی افزائش کی طاقت کو تقویت پہنچاتا ہے اور بالواسطہ طور پر زندگی کی شروعات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اگرچہ سب ماہرین طبیعیات سمولن کے خیالات سے اتفاق نہیں کرتے لیکن نوبل انعام یافتہ ماہر طبیعیات مرے گیل.مین کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے: "سمولن؟ عجیب و غریب خیالات رکھنے والا جوان؟ شاید وہ غلط نہ ہو"[۲۶]۔ کوئی شرارتی ماہر حیاتیات یہ بھی سوچ سکتا ہے کہ شاید ماہرین طبیعیات کو بھی ڈارونی بیداری شعور کی ضرورت ہے۔

اس خیال میں بھی بہت جاذبیت ہے کہ بیشار کائناتوں کے نظریے پیش کرنا ایک ایسی عیاشی ہے جس کی سرے سے اجازت ہی نہیں ہونی چاہئے۔ اس نظریے کے مطابق اگر ہم کثیر کائنات کی عیاشی کی اجازت دینے کے لئے رضامند ہو ہی گئے ہیں تو ایک قدم اور بڑھا کر خدا کے ہونے کو بھی قبول کر لیں۔ کیا

---

سسکنڈ(۲۰۰۶) نے اس "عظیم کائنات" میں اصول بشریت کی بہت عمدہ وکالت کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زیادہ تر ماہرین طبیعیات اس خیال سے نفرت کرتے ہیں۔ مجھے تو اس نفرت کی وجہ سمجھ نہیں آتی۔ مجھے تو یہ تجویز نہایت خوبصورت لگتی ہے۔ شاید کیونکہ میرا شعور ڈارون کی وجہ سے بیدار ہو چکا ہے۔

یہ دونوں ہی برابر کے غیر کفایتی، وقتی، اور غیر تسلّی بخش مفروضے نہیں ہیں؟ جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں ان کا شعور ابھی تک قدرتی انتخاب کے ذریعے بیدار نہیں ہوا ہے۔ حقیقتاً اسراف پسند مفروضہ ٔخدا اور ظاہری طور پر اسراف پسند کثیر کائنات کے مفروضے سے تقابل کریں تو فرق صرف شماریاتی غیر امکان کا ہی ہے۔ اپنے اسراف کے باوجود کثیر کائنات بہت سادہ ہے۔ خدا یا کسی اور ذہین، فیصلے اور حساب کرنے والے عامل کا ہونا شماریاتی طور ہراتنا ہی غیر ممکن ہے جتنا ان چیزوں کا جن کی اس خدا یا عامل سے وضاحت کی امید کی جا سکتی ہے۔ کثیر کائنات اپنے اندر سمائی ہوئی کائناتوں کی مقدار کی وجہ سے اسراف زدہ لگتی ہے، لیکن اگر ان میں سے ہر ایک کائنات اپنے بنیادی قوانین کی حد تک سادہ ہیں، تو ہم کسی بہت زیادہ غیر ممکن چیز کا دعویٰ نہیں کر رہے ہیں۔ کسی بھی ذہین کے بارے میں ہمیں اس سے بالکل برعکس بات کرنی پڑے گی۔

کچھ ماہرین طبیعیات مذہبی بھی ہوتے ہیں (رسل سٹینارڈ اور ریورنڈ جان پولکنگ ہورن دو برطانوی مثالیں ہیں جو میں نے پیش کی ہیں)۔ توقع کے عین مطابق، وہ تمام طبیعیاتی اعداد کے تنگ سے گولڈی لوکس خطوں میں پائے جانے کی شماریاتی غیر ممکنات پر جھپٹتے ہیں اور ایک کائناتی ذہانت کی تجویز پیش کرتے ہیں جس نے دانستاً ان اعداد کی قدریں مطمئن کی ہوں۔ میں پہلے ہی ایسی تمام تجاویز کو رد کر چکا ہوں کیونکہ یہ جتنی مشکلات حل کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ نئی مشکلات پیدا کر دیتے ہیں۔ مذہبی لوگوں نے اس بات کا جواب دینے کی کیا کوشش کی؟ وہ اس منطق سے کیسے نمٹتے کہ ایک ایسا خداجو ایک ایسی کائنات ترتیب دینے کی قابلیت رکھتا ہے جو نہایت دھیان اور دور اندیشی سے ہمارے ارتقاء تک پہنچنے کے لئے تخلیق کی گئی ہے، خود بھی ایک انتہائی پیچیدہ اور غیر ممکن ہستی ہو گا جو اس سے بھی بڑی وضاحت کا محتاج ہے جو وہ پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے؟

توقع کے مطابق، عالم دین رچرڈ سوائین برن کا خیال ہے کہ ان کے پاس اس معمے کا حل ہے، جو وہ اپنی کتاب "کیا خدا ہے؟ Is there a God " میں بیان کرتا ہے۔ وہ شروعات میں ہی اپنی صاف نیت کا ثبوت مہیا کرتا ہے کہ ہمیں کیوں اس سادہ ترین وضاحت کو قبول کرنا چاہئے جو حقائق پر پوری اترتی ہے۔ سائنس پیچیدہ چیزوں کو ان کے سادہ اجزاء کے تعاملات اور آخر کار بنیادی ذرّات کے تعاملات کے لحاظ سے بیان کرتی ہے ۔ میں (اور آپ بھی) اس بات کو ایک خوبصورت خیال سمجھتے ہیں کہ سب چیزیں ان بنیادی ذرّات سے بنی ہوئی ہیں جو بہت زیادہ تعداد میں ہونے کے باوجود ذرّات کی اقسام کی ایک بہت ہی محدود تعداد سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر ہمیں اس خیال کی صحت پر شک ہو تو اس کی وجہ صرف یہی ہو گی کہ ہمیں یہ خیال کچھ زیادہ ہی سادہ لگ رہا ہو گا۔ لیکن سوائین برن کے لئے یہ بالکل بھی سادہ نہیں۔ بلکہ اس کے الٹ ہے۔

یہ جانتے ہوئے کہ کسی بھی ایک قسم کے ذرّات کی تعداد بہت ہی زیادہ ہے، سوائین برن کے خیال میں ان سب کی ایک جیسی خاصیتیں ہونا کوئی حادثہ نہیں ہو سکتا۔ ایک الیکٹران تو سوائین برن کو ہضم ہو سکتا تھا لیکن ارب ہا ارب الیکٹران کا ایک ہی خاصیت کا مظاہرہ کرنا سوائین برن کے اعتقاد کو جھنجھوڑتا ہے۔ اس کے مطابق یہ زیادہ آسان، زیادہ قدرتی، کم وضاحت طلب ہوتا اگر تمام الیکٹران ایک دوسرے سے مختلف ہوتے۔ اور کسی بھی الیکٹرون کو اپنی خصوصیات ایک لمحہ سے زیادہ برقرار نہیں رکھ پانا چاہئے؛ ہر ایک الیکٹرون کی ترتیب کو ایک لمحے سے دوسرے لمحے میں اپنی مرضی کے بغیر بدل جانا چاہئے تھا۔ سوائین برن کے نزدیک معاملات کی یہی سادہ ترین حالت درست ہے۔ اس سے زیادہ کسی بھی یکسانیت آمیز حالت (جسے آپ اور میں شاید "سادہ" کہیں گے) کے لئے ایک مخصوص وضاحت درکار ہو گی۔ 'کیونکہ الیکٹرون اور تانبے کے چھوٹے چھوٹے ٹکروں اور دیگر مادّی اشیاء کی آج بھی وہی خصوصیات ہیں جو انیسویں صدی میں تھیں، اسی لئے آج بھی چیزیں ویسی ہیں جیسی تھیں۔

پھرا سٹیج پر خدا کی آمد ہو جاتی ہے۔ خدا دانستہ اور مسلسل ان اربوں الیکٹرونوں اور تانبے کے ٹکروں کی تمام خصوصیات کو برقرار رکھتا ہے، اور ان کی بے ترتیبی کی طرف فطری جبلّت کو زائل کئے رکھتا ہے۔ بس یہی وجہ ہے کہ اگر آپ نے ایک الیکٹرون کو دیکھا ہے تو سمجھئے سارے الیکٹرون کو دیکھ لیا ہے؛ یہی وجہ ہے کی تانبے کے ٹکڑے تانبے کے ٹکڑوں کی طرح ہی حرکت کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہر الیکٹرون اور تانبے کا ہر ٹکڑا لمحہ بہ لمحہ اور صدی بہ صدی ایک ہی طرح حرکت کرتا ہے۔ کیونکہ خدا نے ہر ذرّے پر اپنی انگلی رکھی ہوئی ہے، اور اس کی لاپرواہیوں کو قابو میں رکھ کر اسے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کھڑا کر دیں تاکہ سب ایک جیسے ہی رہیں۔

لیکن سوائین برن اس بات پر کیسے بضد رہ سکتا ہے کہ خدا کا یہ نظریہ جس میں خدا اربوں بے راہ رو الیکٹرون پر بیک وقت انگلی رکھتا ہے ایک "سادہ" نظریہ ہے؟ در حقیقت یہ نظریہ "سادہ" کا مکمل متضاد ہے۔ سوائین برن ایک حیرت انگیز دانشورانہ گستاخی کے ذریعے اپنے آپ کو مطمئن کرتا ہے کہ اس کا شعبدہ مکمل ہے۔ بغیر کسی جواز کے وہ دعویٰ کرتا ہے کہ خدا صرف ایک 'واحد' مادّہ ہے۔ واہ! ان اربوں کھربوں الیکٹرونوں کا ایک جیسا ہونے کے مقابلے میں وضاحتی عوامل کا کیا حیران کن اختصار ہے!

> وحدانیت دعویٰ کرتی ہے کہ ہر موجود چیز کے وجود کا سبب ایک ہے اور وہ ایک ہی ماڈے کی وجہ سے حالت وجود میں ہے، جسے ہم خدا کہتے ہیں۔ اور وہ مزید یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ ہر چیز کی ہر خاصیت کا وجود صرف اس وجہ سے ہے کہ خدا اس کا سبب ہے اور اس کی اجازت دیتا ہے۔ سادہ وضاحت کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ وہ کم سے کم اسباب پر مبنی ہو۔ لہذا اس سے زیادہ سادہ وضاحت تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی جس میں صرف ایک سبب ہو۔ وحدانت شرک کے مقابلے میں حد درجہ سادہ ہے۔ وحدانیت اپنے لئے جس سبب کو فرض کرتی ہے وہ ایک "شخص" کی صورت میں ہے جس کے پاس بے انتہا قوّت ہے (خدا ہر وہ چیز کر سکتا ہے جو منطقی طور پر ممکن ہے)، بے انتہا علم ہے ( خدا ہر اس چیز کے بارے میں معلومات رکھتا ہے جس کے بارے میں منطقی طور پر علم رکھا جا سکتا ہے)، اور بے انتہا اختیار رکھتا ہے۔

سوائین برن بڑی فراخدلی سے اعتراف کرتا ہے خدا ایسا کوئی کام نہیں کر سکتا جو منطقی طور پر ممکن نہ ہواور ہم سوائین برن کی اس فراخدلی کے لئے اس کے مشکور ہیں۔ اس کے با وجود اس کی کوئی حد نہیں کہ خدا کی قوّت کو کیسے کیسے وضاحتی مقاصد کے لئے بروئے کار لایا جاتا ہے۔ کیا سائنس کو کوئی بات "ب" واضح کرنے میں دقت پیش آ رہی ہے؟ کوئی مسئلہ نہیں! ب پر دوسری نظر بھی نہ ڈالیئے۔ خدا کی لا محدود طاقت کو کام پر لگایا جاتا ہے اور "ب" کی وضاحت پیش کر دی جاتی ہے، اور یہ ہمیشہ ایک نہایت سادہ وضاحت ہوتی ہے کیونکہ خدا تو ایک ہی ہے۔ اس سے زیادہ سادہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

در حقیقت سب ہی کچھ۔ ایک خدا جو کائنات کے ہر ذرّے کی انفرادی حالت کی ہمہ وقت نگرانی کرتا ہے اور اپنے اختیار میں رکھتا ہے کسی صورت سادہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے تو اپنے وجود کے لئے ایک بہت بڑی وضاحت درکار ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر(سادگی کے نقطۂ نظر سے) خدا کے دیو ہیکل شعور کے مختلف کنارے ہر ایک انسان ۔ اور دیگر ذہین خلائی مخلوق جو سارے کہکشاؤں میں پائے جانے والے سیاروں میں بستے ہیں ۔ ان کی حرکات و احساسات و عبادات کو لے کر بہ یک وقت مصروف رہتے ہیں۔ بقول سوائین برن اس کو ہر وقت یہ فیصلہ بھی کرنا پڑتا ہے کہ جب ہمیں کینسر ہو جائے تو وہ ہماری جان بچانے کے لئ مداخلت کرنے سے گریز کرے۔ یہ تو بالکل قابل قبول نہیں ہے، کیونکہ 'اگر خدا رشتہ داروں کے حق میں کی گئی ہر دعا کو قبول کر کے کینسر سے نجات دینے لگے تو کینسر کی بطور ایک ایسی مشکل کے کوئی حیثیت ہی نہیں رہ جائے گی جسے انسانی حل درکار ہے'۔ اور پھر ہم اپنے فارغ وقت کے ساتھ کیا کریں گے؟

تمام علماء دین سوائین برن کی حد تک نہیں جاتے۔اس کے باوجود یہ حیران کن تجویز کہ نظریۂ خدائی ایک سادہ نظریہ ہے دیگر مذہبی تصنیفات میں بھی پایا جاتا ہے۔ کیتھ وارڈ جو ۱۹۹۶ میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں الہیات کے ریجس پروفیسر تھا، کے خیالات اس معاملے میں بہت واضح تھے، جو اس نے اپنی کتاب "خدا، قسمت اور ضرورت ۔ God, Chance and Necessity " میں یوں بیان کئے:

> حقیقت یہ ہے کہ وحدانیت پرست دعویٰ کرے گا کہ خدا کائنات کے وجود کی ایک بہت نفیس، کفایتی اور فائدہ مند وضاحت ہے۔ کفایتی اس لئے ہے کہ یہ ساری کائنات میں موجود ہر چیز کے وجود کا ذمہ صرف ایک ہستی کی جھولی میں ڈال دیتی ہے، ایک ایسا حتمی سبب جو بشمول اپنی ذات کے ہر چیز کے وجود کی وجہ کا تعین کرتی ہے۔ نفیس اس لئے کہ ایک کلیدی خیال کو لے کر یعنی سب سے کامل ممکنہ ہستی کا خیال ۔ خدا کی قدرت اور کائنات کے وجود کو قابل فہم انداز میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

سوائین برن کی طرح وارڈ بھی اس بات کو سمجھنے میں غلطی کر گیا کہ وضاحت کا مطلب کیا ہے، اور وہ غالباً یہ بھی نہیں سمجھ پایا کہ کسی چیز کے بارے میں سادگی کا دعویٰ کرنے کا کیا مطلب ہے۔ میں ٹھیک سے نہیں کہہ سکتا کہ وارڈ کے مطابق خدا واقعی سادہ ہے یا مندرجہ بالا اقتباس محض "بحث برائے بحث" کا ایک نمونہ ہے۔ "سائنس اور عیسائی اعتقاد ۔Science and Christian Belief" میں سر جون پولکنگ ہورن تھامس آکوئیناس پر وارڈ کی تنقید پر اقتباس کرتے ہوئے لکھتا ہے: 'اس سوچ میں بنیادی غلطی یہ فرض کرنے سے پیدا ہوتی ہے کہ خدا منطقی لحاظ سے سادہ ہے ۔ اس انداز سے سادہ نہیں کہ وہ نا

قابل تقسیم ہے، بلکہ اس انداز سے سادہ کہ جو خدا کے کسی حصے کے لئے سچ ہے وہ پورے کے لئے بھی سچ ہے۔ لیکن پھر بھی یہ فرض کرنا با ربط ہے کہ ناقابل تقسیم ہونے کے باوجود خدا اندرونی طور پر پیچیدہ ہے'۔ وارڈ کی یہ بات درست ہے۔ ۱۹۱۲ میں ماہر حیاتیات جولئین ہکسلے نے عناصر کے ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے تناظر میں "پیچیدگی" کی تعریف لکھی، جس سے اس کی مراد ایک خاص طرح کی فعال تقسیم ناپزیری (functional indivisibility[٦٧]) ہے۔

دوسری جگہوں پر وارڈ مذہبی ذہن کی حیات کی پیچیدگی کے ماخذ کو سمجھنے میں ناکامی کے بارے میں شواہد دیتا ہے۔ وہ ایک اور مذہب پسند سائنسدان آرتھر پیکاک (میرے برطانوی مذہب پسند سائنسدانوں کی تکڑم کا تیسرا ممبر) کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے پیکاک کے مطابق جاندار مادے میں پیچیدگی کے بڑھنے کی قدرتی جبلّت موجود ہوتی ہے۔ وارڈ اس کو ارتقائی تبدیلی کے ایسے جھکاؤ سے مشابہت دیتا ہے جو پیچیدگی کی طرف مائل ہے۔ آگے چل کر وہ یہ تجویز بھی پیش کرتا ہے کہ 'اس قسم کی طرف داری کا رویہ تبدیلی کے عمل کا جھکاؤ بھی ہو سکتا ہے جس کی بدولت زیادہ پیچیدہ تبدیلیاں رونما ہوئی ہوں'۔ وارڈ یہاں شک کا اظہار کرتا ہے جو کہ واجب ہے۔ اگر کہیں پیچیدگی کی طرف ارتقائی جھکاؤ ظہور پزیر ہوتا بھی ہے تو نہ تو پیچیدگی بڑھانے کی کسی جبلّت کی وجہ سے ہے اور نہ ہی ارتقائی تبدیلی کی طرف مائل ہونے کی وجہ سے۔ بلکہ یہ قدرتی انتخاب کی وجہ سے ہوتا ہے: جہاں تک ہمیں علم ہے، وہ واحد عمل جو سادگی سے پیچیدگی پیدا کرنے کی قابلیت رکھتا ہے۔ قدرتی انتخاب کا نظریہ حقیقتاً بہت سادہ ہے۔ اور وہ ابتدائی مراحل بھی جہاں سے اس کی شروعات ہوئی۔ اس کے برعکس جس کی یہ وضاحت کرتا ہے وہ ناقابل بیان حد تک پیچیدہ ہے: ہمارے وہم و گمان سے بھی زیادہ پیچیدہ۔ سوائے کسی خدا کے جو اس کو مرتّب کرنے کی قوّت رکھتا ہو۔

## کیمبرج میں ایک وقفہ

کیمبرج میں سائنس اور مذہب پر منعقدہ ایک حالیہ اجتماع میں جب میں نے حتمی ۷۴۷ کی دلیل پیش کی، تو مجھے خدا کی سادگی کے سوال پر ذہنوں کے ملاپ میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ تجربہ انکشافات سے بھرپور تھا، میں اسے آپ کے سامنے بیان کرنا چاہوں گا۔

پہلے تو مجھے یہ اعتراف کر لینا چاہئے (شاید یہ صحیح لفظ ہے) کہ اس اجتماع کا اہتمام ٹمپلٹن فاؤنڈیشن نے کیا تھا۔ سامعین میں صرف امریکہ اور برطانیہ سے خاص طور پر چنے گئے صحافیوں کی ایک محدود تعداد شامل تھی۔ اٹھارہ مدعو کئے گئے مقررین میں سے میں واحد دہریہ تھا، جسے علامتی طور پر شامل کیا گیا تھا۔ ایک صحافی جان ہورگن نے انکشاف کیا کہ تمام صحافیوں کو اجتماع میں شرکت کے لئے پندرہ ہزار پاؤنڈ فی کس ادا کئے گئے تھے، اور خرچہ پانی اس کے علاوہ تھا۔ میں اس بات سے بہت حیران ہوا۔ تعلیمی اجتماعات کے میرے طویل تجربے میں ایسی کوئی مثال شامل نہیں تھی جہاں سامعین کو (مقررین کے مقابلے میں) اجتماع میں شمولیت کے لئے رقم فراہم کی گئی ہو۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو میرے شک کی حس فوراً بیدار ہو جاتی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ کیا ٹمپلٹن اپنی دولت سے سائنسی صحافیوں کو رشوت دے کر ان کی دیانتداری پر اثر انداز ہونا چاہ رہا تھا؟ بعد ازاں جان ہورگن کو بھی یہی خیالات آئے اور اس نے اپنے سارے تجربے کے بارے میں ایک تفصیلی مقالہ لکھا[٦٨]۔ اس میں مجھے چڑانے کی غرض سے اس نے انکشاف کیا کہ میری شمولیت کی تشہیر نے اسے اپنے شکوک پر قابو پانے میں مدد کی:

> اجتماع میں برطانوی ماہر حیاتیات رچرڈ ڈاکنز کی شرکت نے مجھے اور میرے رفقا کو اس اجتماع کی سچائی کے بارے میں قائل کیا ۔ ڈاکنز وہ واحد مقرر تھا جس نے مذہبی عقائد کی سائنس سے متضاد ہونے کی وجہ سے مذمّت کی اور مذہب کو خلاف عقل اور نقصان دہ قرار دیا ۔ باقی مقرّرین جن میں تین مادّیت پرست، ایک یہودی، ایک دین فطرت کا معتقد، اور ۱۲ عیسائی شامل تھے (ایک مسلم فلسفی نے آخری لمحے پر معذرت کر لی) ۔انہوں نے ایسا زاویہ پیش کیا جو شدید حد تک مذہب اور عیسائیت کی طرف مائل تھا۔

ہورگن کا مقالہ مبہم ضرور تھا لیکن ملتفت کرنے والا بھی تھا۔ اپنے شبہات کے باوجود، اس کے تجربات کے کچھ پہلو ایسے تھے جو ہورگن کے لئے (اور جیسا کہ آپ نیچے ملاحظہ کریں گے، میرے لئے بھی) اہمیت کے لائق ہیں۔ ہورگن نے لکھا:

> معتقد لوگوں سے گفتگو کے بعد مجھے کچھ بہتر سمجھ آنے لگی کہ ذہین اور تعلیم یافتہ لوگ مذہب کی طرف کیوں مائل ہو جاتے

ہیں۔ ایک شخص نے اپنی "زبانوں میں بات" کرنے کے تجربات کے بارے میں بتایا، جب کہ ایک اور نے عیسیٰ مسیح کے ساتھ اس کے قریبی تعلقات کا ذکر کیا۔ میرے عقائد تو نہیں ڈگمگائے لیکن دوسروں پر ضرور اثر ہوا۔ کم از کم ایک شخص نے اعتراف کیا کہ ڈاکنز کے مذہب کے پردے چاک کرنے کی وجہ سے اسے اپنا ایمان ڈگمگاتا ہوا محسوس ہوتا نظر آ رہا تھا۔ اور اگر ٹمپلٹن فاؤنڈیشن کے توسط سے مذہب سے پاک دنیا کی طرف ایک چھوٹا سا قدم بھی بڑھایا جا سکے تو اس میں کیا مضائقہ ہے؟

ادبیات کے ایجنٹ جان بروکمین نے ہورگن کے مقالے کو اپنی ویبسائٹ "ایج ۔ Edge" پر اشاعت ثانیہ فراہم کی، جہاں اسے مختلف قسم کے رد عمل اور جوابات ملے، جن میں ماہر نظریاتی طبیعیات (theoretical physics) فریمین ڈائسن کا جواب بھی شامل تھا۔ اس پر میں نے ڈایسن کو جو جواب دیا اس میں میں نے اس کی اس تقریر سے بھی اقتباس کیا جو اس نے ٹمپلٹن انعام قبول کرتے ہوئے کی تھی۔ وہ مانے یا نہ مانے، لیکن ٹمپلٹن انعام قبول کر کے ڈائسن نے دنیا کو ایک طاقتور اشارہ دیا تھا۔ اس کی اس حرکت کو دنیا کے ایک باعزت اور مشہور ماہر طبیعیات کی طرف سے مذہب کے حق میں تصدیق تصوّر کیا جا سکتا تھا۔

'میں ان ان گنت عیسائیوں میں شامل رہنے پر مطمئن ہوں جو نظریہ تثلیث یا انجیل کی کتابوں کی تاریخی حقیقت کو خاص اہمیت نہیں دیتے'۔

لیکن کیا یہ ایسا جملہ نہیں ہے جو کوئی دہریہ سائنسدان اپنے آپ کو عیسائی ثابت کرنے کے لئے بولے؟ میں نے ڈائسن کی تقریر سے مزید اقتباسات بھی دیے، اور بیچ بیچ میں ایک فرضی ٹمپلٹن اہلکار سے کئے گئے سوالات بھی شامل کر دئے جو یہاں خط کشیدہ کے ذریعہ دکھائے گئے ہیں:

<u>اچھا! تو آپ کو گہرے خیال بھی چاہئے۔ تو یہ کیسا رہے گا...</u>

'میں ذہن اور خدا میں تفریق نہیں کرتا۔ ذہن جب عام فہمی کی حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو خدا بن جاتا ہے'۔

<u>ہو گیا سب؟ اب کیا میں طبیعیات کی طرف واپس جا سکتا ہوں؟ نہیں؟ ابھی آپ مطمئن نہیں ہوئے؟ تو بھی اس کے بارے میں کیا خیال ہے....</u>

'بیسویں صدی کی خوفناک تاریخ میں بھی مجھے مذہب کی ترّقی کے شواہد ملتے ہیں۔ وہ دو افراد جو بیسویں صدی میں برائی کی نہج سمجھے جاتے ہیں، یعنی ایڈولف ہٹلر اور جوزف سٹالن، دونوں پکّے دہریے تھے '۔

<u>اب میں چلوں؟</u>

ڈائسن چاہتا تو اپنی ٹملٹن والی تقریر کے اقتباس میں پوشیدہ مطلب کی تردید کر سکتا تھا، جس کے لئے اسے صرف صاف الفاظ میں یہ واضح کرنا تھا کہ خدا کے ایک ایسے تصوّر پر ایمان کے لئے اس کے پاس کیا ثبوت ہے جو کہ آئنسٹائن کے تصوّر خدا ، جس کا تذکرہ میں نے باب ا میں کیا تھا، سے بڑھ کر ہو۔ اگر میں ہوگن کی بات کو صحیح طریقے سے سمجھ پایا ہوں، تو ٹمپلٹن کا پیسہ سائنس کا اخلاق برباد کر رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ڈائسن اس قسم کی معاشی بد اخلاقی سے بالا ہے، لیکن پھر بھی اس کی اس تقریر نے دوسروں کے لئے ایک بہت غلط مثال قائم کر دی ہے۔ ٹمپلٹن انعام صحافیوں کو دیے جانے والے کیمبرج انعام سے دو گنا زیادہ ہے، اور اسے دانستاً نوبل انعام کی رقم سے زیادہ رکھا گیا۔ میرے دوست ڈینیل ڈینٹ نے ایک بار مذاقاً مجھ سے کہا تھا: "رچرڈ! اگر کبھی کسمپرسی

---

اس بہتان کا جواب باب نمبر ۷ میں دیا گیا ہے۔

کا سامنا ہو تو ... "

میں نے کیمبرج کے اجتماع میں اچھے برےدو دن گزارے، جس دوران میں نے ایک لیکچر دیا اور کئی مباحثوں میں شرکت بھی کی۔ میں نے علماء دین کے سامنے یہ تحدّی بھی رکھی کہ وہ اس نقطے کا جواب دیں کہ کیاایک ایسا خدا جو کائنات یا کسی بھی چیز کی ترتیب کرنے کی قابلیت رکھتا ہے از خود پیچیدہ اور شماریاتی طور سے نا ممکن ہو گا۔ مجھے جو سخت ترین جواب ملا وہ بس یہی تھا کہ میں زبردستی ر الہیات پر سائنسی علیت مسلط کرنا چاہتا ہوں[§§§§§§§§]۔ علماء دین کی تعریف کے مطابق خدا ہمیشہ سادہ ترین نظریہ رہا ہے۔ تو پھر میں ایک سائنسدان کون ہوتا تھا ان علماء کے سامنے اصرار کرنے والا کہ در حقیقت ان کا خدا پیچیدہ ہے؟سائنسی توجیہات جس کو میں اپنے کام میں استعمال کرنے کا عادی تھا، یہاں غیر مناسب تھے، کیونکہ ان علماء نے ہمیشہ یہی دعویٰ کیا تھا کہ خدا ماورائے سائنس ہے۔

وہاں مجھے یہ تاثر نہیں ملا کہ جن علماء نے خدا کا یہ دفاع مرتّب کیا جان بوجھ کر جھوٹ بول رہے تھے۔ میرے خیال میں وہ مخلص ہی تھے۔ اس کے باوجود مجھے پادری ٹیلہارڈ ی شارڈاں کی کتاب " انسان کا معجزہ ۔The Phenomenon of Man" پر پیٹر میڈیوار کا تنقیدی جملہ یاد آ گیا: "کتاب کے مصنف کو بے ایمانی کے الزام سے صرف اسی صورت میں بری الذمّہ مانا جا سکتا ہے اگر ہم یہ مان لیں کہ دوسروں کو دھوکا دینے سے پہلے مصنف نے خود اپنے آپ کو مکمل کامیابی سے دھوکا دیا تھا"[۶۹]۔ کیمبرج کے میرے اس مقابلے میں علماء نے اپنے آپ کو ایک علمیاتی سیف زون میں لا کھڑا کیا تھا جہاں منطقی بحث ان تک نہیں پہنچ سکتی تھی کیونکہ انہوں نے فتویٰ کی نوعیت کا اعلان کر دیا تھا بایں ہمہ منطقی بحث ان تک نہیں پہنچ سکتی۔ میں کون ہوتا تھا دعویٰ کرنے والا کہ منطقی بحث ہی واحد قابل اجازت بحث ہے۔ سائنسی طریقے کے علاوہ دوسرے طریقے بھی تو ہیں خدا کو پہچاننے اور جاننے کے لئے، ان طریقوں میں سے کسی ایک طریقے کا استعمال لازمی ہے۔

ان "دوسرے" طریقوں میں سے سب سے اہم طریقہ خدا کو ذاتی اور داخلی طور پر محسوس کرنے کا ہے۔ کیمبرج کے اجتماع میں منعقد کئے گئے مناظروں میں بہت سے شرکاء نے خدا سے اپنے ذہنوں میں بات کرنے کا دعویٰ کیا، اتنے ہی واضح اور شفاف انداز میں جیسے دو انسان آپس میں گفتگو کرتے ہیں۔ میں نے فریب نظر اور ہذیان کے بارے میں باب ۳ میں ذکر کیا ہے (ذاتی تجربے سے دلیل)، لیکن کیمبرج کے اجتماع میں میں نے دو اضافی نکات بھی بیان کیے ۔ اولاً کہ اگر خدا واقعی انسانوں سے بات کرتا ہے تو یہ فعل سائنس سے ماورا نہیں ہو سکتا۔ خدا اپنی ما فوق الفطرت آماجگاہ کو چھوڑ کر ہماری دنیا میں دھماکے دار انداز سے داخل ہوتا ہے جہاں اس کے پیغامات انسانی دماغ سے وصول ہوتے ہیں ۔ اور آپ کو لگتا ہے اس معجزے کا سائنس سے کوئی تعلق نہیں؟ دوئم یہ کہ ایک ایسا خدا جو کروڑوں لوگوں کو بیک وقت سمجھ آ سکنے والے پیغام بھیجنے کی قابلیت رکھتا ہے اور ان سب سے بیک وقت پیغامات وصول بھی کر سکتا ہے، وہ کچھ بھی ہو سادہ نہیں ہو سکتا۔ اتنی بڑی بینڈ ویتھ!! خدا کے پاس شاید عصبات (neurons) سے بنا ہوا دماغ نہ ہو یا سیلیکون کا بنا ہوا CPU نہ ہو، لیکن اگر اس کے پاس واقعی وہ قوتیں ہیں جو اس سے منسوب کی جاتی ہیں تو اس کے پاس کچھ ایسا ہو گا جو دماغ یا دنیا کے بڑے ترین کمپیوٹر کے مقابلے میں کہیں زیادہ واضح اور با ترتیب انداز سے تعمیر کیا گیا ہے۔

وقت بے وقت میرے دینی علماء دوست اسی مدعے پر لوٹتے رہے ہیں کہ کچھ نہ ہونے کی بجائے کچھ ہونے کے پیچھے کوئی تو وجہ ہونی چاہئے۔ ہر چیز کی کوئی پہلی وجہ ہو گی، تو پھر ہم اس کا نام خدا ہی کیوں نہ رکھ دیں؟ میں نے جواب دیا کہ ہاں! لیکن وہ بہت سادہ رہا ہو گا، لہٰذا ہم اس کو جو بھی کہیں خدا کا لفظ اس کے لئے مناسب نہیں ہو گا (ما سوائے کہ ہم اس لفظ سے وہ تمام خصوصیات کی نفی کر دیں جو عموماً مذہبی لوگوں کے ذہنوں میں اس لفظ کے ساتھ منسوب ہیں)۔ ہم جس "پہلی وجہ کی تلاش کر رہے ہیں وہ اس خود کار تعمیراتی نظام کی اساس ہو گا جس نے دنیا کو بلآخر اس پیچیدہ وجود تک پہنچایا جہاں وہ آج ہے۔ یہ تجویز کرنا کہ اوّلین بنیادی محرک (original prime mover) اس قدر پیچیدہ تھا کہ ذہین ترتیب کر سکے، اور بیک وقت کروڑوں لوگوں کے خیالات پڑھ بھی سکے، اپنے آپ کو تاش کے پتّوں کا بہترین سیٹ بانٹنے کے مترادف ہے۔ اپنے ارد گرد نظر گھما کر دنیا کی زندگی کو دیکھئے؛ ایمیزون کے جنگل کو، اور اس میں لیانا، برومیلیاڈ، جڑوں اور اڑنے والے پشتوں کو؛ کیڑے مکوڑوں کی فوج کو، جیگوار کو، برازیلی سوٗر ٹاپیر کو، جنگلی مینڈک اور طوطوں کو دیکھئے۔ یہ سب تاش کے پتّوں کے ایک انتہائی معیاری ہاتھ کے مترادف ہے (ذرا سوچئے کہ آپ سارے حصوں کو کتنے طریقوں سے جوڑ سکتے ہیں، لیکن صرف ایک ہی مجموعہ ایسا ہے جو کام کرتا ہے) ۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ سب کیسے وجود میں آیا: قدرت کے بتدریج تعمیراتی عمل سے۔ صرف سائنسدان ہی اس لاممکن فعل کے ایک دم عمل پزیر ہونے کے خلاف نہیں ہیں؛ عقل سلیم بھی اس خیال کو قبول کرنے سے انکاری ہے۔ یہ تجویز کہ ایک نا معلوم "اوّل وجہ" جو تمام ہستی کے نہ ہونے

[§§§§§§§§] یہ الزام ہمیں NOMA کی یاد دلاتا ہے، جس سے ہم باب نمبر۱ میں نمٹ چکے ہیں۔

کے مقابلے میں ہونے کے لئے ذمّہ دار ہے، ایک ایسی ذات ہے جو کائنات کو ترتیب دینے اور کروڑوں لوگوں کے ساتھ بیک وقت ہم کلام ہونے کی قابلیت رکھتی ہے، وضاحتیں تلاش کرنے کی ہماری ذمّہ داری سے مکمل دستبرداری کے مترادف ہے۔ یہ خود پسندی اور سوچ سے انکار کی ایک خوفناک نمائش ہے۔

میں کسی سائنسی تنگ نظری کی وکالت نہیں کر رہا۔ لیکن حقائق کی کسی سچی تلاش کو جو بارانی جنگل، ساحلی مرجان (coral reef) اور کائنات جیسے عظیم الشان عدم امکان کی وضاحتیں ڈھونڈنے کی سعی کرتی ہے، کم از کم اپنی شروعات کے لئے آسمانی کنڈے کی بجائے بتدریج تعمیراتی عمل کا سہارا لینا چاہئے۔ ضروری نہیں کہ قدرتی انتخاب ہی واحد تعمیراتی عمل ہو۔ لیکن آج تک اس سے بہتر مترادف تجویز نہیں کیا جا سکاہے۔ عین ممکن ہے کہ دوسرے عمل بھی موجود ہوں جو ابھی تک دریافت نہیں کئے جا سکے۔ شاید وہ "پھیلاؤ" جو ماہرین طبیعیات کے خیال کے مطابق کائنات کے پہلے یوکٹوسیکنڈ (second $10^{-28}$) میں پیش آیا ڈارون کے حیاتیاتی تعمیراتی نظام کی طرح کائناتی تعمیراتی نظام ہی ثابت ہو۔ یا شاید کائناتی سائنسدان جس فریبی نظام کی تلاش میں رہتے ہیں ممکن ہےڈارون کے خیال کا ہی ایک زاویہ ہو: سمولن کا خاکہ یا اس سے کچھ ملتا جلتا۔ یا شاید وہ مارٹن ریس اور دیگر اصحاب کا بتایا ہوا کثیر کائناتی نظام ہو جو اصول بشریت کے طابع ہے۔ یا پھر انسان سے بالا تر کوئی ترتیب کار ہو سکتا ہے ۔ لیکن اگر ایسا ہوا تو وہ یقیناً ایسا ترتیب کار نہیں ہو گا جو یکایک وجود میں آگیا ہو گا، یا جو ہمیشہ سے موجود تھا۔ اگر (میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس بات کو نہیں مانتا) ہماری کائنات کو ترتیب دیا گیا ہے، اور اگر ترتیب کار ہمارے خیالات پڑھ سکتا ہے اور ہمارے درمیان عالم الغیوب سے صلاح، معافی اور رہائی بانٹ سکتا ہے، تو ایسا ترتیب کار خود بھی کسی تعمیراتی نظام کا ہی نتیجہ ہو گا، شاید کسی اور کائنات میں ڈاروینی ارتقاء کا نتیجہ۔

کیمبرج میں میرے ناقدین کا آخری حربہ حملہ آوری تھا۔ دنیا کے بارے میں میرے زاویۂ نظرے کو انیسویں صدی کا زاویہ کہا گیا۔ یہ اتنی کمزور دلیل ہے کہ میں اس کا ذکر کرنا ہی بھول گیا تھا۔ اور مجھے عموماً اس کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کسی زاویے کو انیسویں صدی سے منسلک کرنا اس کی حقیقی خامی بیان کرنے کے مترادف نہیں ہے۔ انیسویں صدی کے کچھ خیالات بہت اچھے تھے جیسے کہ خود ڈارون کا انتہائی خطرناک خیال تھا۔ اور یہ خاص دشنام طرازی تو خاصی حیران کن تھی، کیونکہ یہ ایک ایسے صاحب کی طرف سے کی گئی تھی (جو کیمبرج میں ماہر ارضیات ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے ضمیر کا سودا کرتے ہیں۔ وہ عنقریب ٹمپلٹن انعام کے حقدار ہوں گے) جو اپنے عیسائی عقائد کی حمایت میں صحیفۂ قدیم کی تاریخی حقیقت کی دلیل پیش کرتے ہیں۔ یہ انیسویں صدی ہی تھی جس میں شواہد پر مبنی مطالعے تاریخ کے طریقہ کار استعمال کرتے ہوئے اس مبینہ تاریخی حقیقت پر شک کا اظہار کیا گیا ۔ کیمبرج کے اجتماع میں موجود علماء دین نے اس بات کی طرف توجہ مبذول کروانے میں کوئی وقت ضایع نہیں کیا ۔

بہر طور، میں اس "انیسویں صدی" والی تہمت سے بخوبی واقف ہوں۔ اور یہ "دیہاتی دہریہ" والے طعنے کے ساتھ خوب جچتا ہے۔ اور یہ اس طرز کے طنز کے ساتھ بھی سننے کو ملتا ہے: " آپ کے خیالات سے بالکل برعکس ہا ہا ہا ہم اب آسمان میں بسنے والے کسی باریش آسمانی بزرگ میں یقین نہیں رکھتے ہا ہا ہا"۔ تینوں مذاق کسی اور بات کا اشارہ ہیں، جیسے امریکہ میں ۶۰ کی دہائی میں سیاستدان "امن و امان کی صورت حال" کو اشارۃً سیاہ فام لوگوں کے خلاف اپنی نسلی تنگ نظری کا اظہار کرنے کے لئے استعمال کرتے تھے*********۔ تو پھر ایک مذہبی بحث کے سیاق و سباق میں "آپ تو انیسویں صدی سے تعلق رکھتے ہیں" کا پوشیدہ مطلب کیا ہے؟ یہ ان الزامات کی جانب اشارہ ہے: 'آپ اس قدر خام اور غیر لطیف ہیں؛ آپ اتنے بے حس اور بد تمیز کیسے ہو سکتے ہیں کہ مجھ سے براہ راست یہ سوال کریں کہ "کیا آپ معجزات پر یقین رکھتے ہیں" یا یہ کہ "کیا آپ مانتے ہیں کہ عیسیٰ ایک کنواری کی کوکھ سے پیدا ہوا تھا" ؟ آپ جانتے نہیں کیا کہ مہذب معاشرے میں ایسے سوال نہیں کئے جاتے؟ ایسے سوالات انیسویں صدی میں پوچھے جاتے تھے، اب نہیں'۔ لیکن ذرا سوچئے تو کہ آج کے دور میں ہم مذہبی لوگوں سے براہ راست حقائق پر مبنی ایسے سوالات کیوں نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ یہ انتہائی شرمناک ہے! لیکن اصل شرم کا مقام یہ ہے کہ کوئی ان سوالوں کا جواب اثبات میں دے۔

انیسویں صدی کا الزام اب بالکل واضح ہے۔انیسویں صدی کا دور وہ آخری دور تھا جب ایک تعلیم یافتہ شخص بلا جھجک یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ کنواری کے بطن سے ولادت جیسے معجزات پر ایمان رکھتا ہے۔ دور حاضر کے تعلیم یافتہ عیسائی مذہبی وفا داری سے مجبور ہو کر کنواری سے ولادت یا عیسیٰ کے دوبارہ جی اٹھنے کی نفی نہیں کر پاتے ۔ لیکن ان کے منطقی ذہن انہیں بتاتے ہیں کہ یہ سب حماقت خیز کہانیاں ہیں، اس لئے انہیں شرم بھی محسوس ہوتی ہے اور وہ ان پر سوال پسند نہیں کرتے۔ لہذا جب کوئی مجھ جیسا ان سے ایسے سوال کرتا ہے تو وہ الٹا مجھے ہی "انیسویں صدی کا" کہتے ہیں۔ سوچئے تو کافی مضحکہ خیز بات ہے۔ میں اجتماع سے بہت متحرّک اور پر عظم ہو کر لوٹا۔ میرے اعتماد میں اضافہ ہوا کہ غیر امکان کی دلیل ۔ بوئنگ ۷۴۷ کی چال ۔ خدا کے وجود کے خلاف ایک بہت

*********برطانیہ میں "اندرون شہر" کی اصطلاح بھی ایسے ہی مقصد کے لئے استعمال کی جاتی تھی، جس پر اوبروں واح نے تمسخرانہ انداز میں "دونوں جنسوں کے اندرونی شہر" کا حوالہ دیا۔

عمدہ دلیل ہے، جس کے بارے میں میں نے آج تک کسی عالم دین کو متعدد مواقع اور دعوتوں کے باوجود کوئی قابل قبول جواب فراہم کرتے نہیں دیکھا۔ ڈینیل ڈینیٹ نے اس کو 'ناقابل تردید' کہا جو آج بھی اتنی ہی تباہ کن ہے جتنی اس وقت تھی جب فایلو نے اسے کلینتھیز کو ہرانے کے لئے استعمال کیا تھا'، اس کا ذکر ہیوم کے Dialogues میں آج سے دو صدیوں پہلے کیا گیا تھا۔ آسمانی کنڈا محض مسئلے کے حل کو ملتوی کر دیتا ہے ۔ لیکن ہیوم کسی تعمیراتی نظام کے بارے میں نہ سوچ سکا اس لئے شکست قبول کرنے پر مجبور ہو گیا"۔ آخر کار ڈارون نے ایک اہم تعمیراتی نظام فراہم کیا؛ ہیوم اس کے بارے میں جان کر کتنا خوش ہوتا۔

اس باب میں میری کتاب کی مرکزی دلیل موجود ہے۔ لہٰذا میں اسے چھ نکات کی صورت میں یہاں دہرانا چاہوں گا۔

۱. انسانی ذہانت کو صدیوں سے درپیش مشکلات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کائنات کی پیچیدہ، غیر ممکن ترتیب کیسے وجود میں آئی۔

۲. ہماری فطری جبلّت ہمیں ظاہری ترتیب کو ترتیب کی حقیقت سے منسلک کرنے پر اکساتی ہے۔ انسان کی بنائی ہوئی چیزوں ۔ جیسے کہ گھڑی ۔ کا ترتیب کار واقعی ایک ذہین مہندس تھا۔ لیکن اس منطق کا آنکھ پر ، مکڑی یا انسان پر اطلاق کرنے کی خواہش میں بہت کشش ہے۔

۳. لیکن یہ کشش جھوٹی ہے، کیونکہ نظریہ ترتیب فوراً ایک مزید بڑی مشکل کو جنم دیتا ہے، کہ ترتیب کار کو کس نے ترتیب دیا۔ ہم نے جس مسئلے سے شروعات کی وہ شماریاتی غیر امکان کی وضاحت کا تھا۔ حل کے طور پر کسی مزید غیر ممکن چیز کو پیش کر دینا مسئلے کا حل نہیں بلکہ مسئلے کو مزید الجھا دیتا ہے۔ ہمیں آسمانی کنڈا نہیں بلکہ تعمیراتی نظام درکار ہے۔ کیونکہ ایسا نظام ہی بتدریج سادگی سے غیر ممکن پیچیدگی کی جانب سفر کر سکتا ہے۔

۴. آج تک دریافت ہونے والا سب سے طاقتور اور جامع نظام ڈارون کا نظریہ ارتقاء ہے جو قدرتی انتخاب کے ذریعہ کام کرتا ہے۔ ڈارون اور اس کے بعد آنے والوں نے ہمیں دکھایا کہ جاندار، اپنی حیران کن شماریاتی غیر امکان اور ظاہری ترتیب سمیت، ایک بتدریج ارتقائی عمل کے نتیجے میں اپنی آج کی حالت میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اب ہم بہت یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ترتیب کا فریب نظر بس یہی ہے ۔ ایک فریب ۔

۵. ابھی تک ہمارے پاس طبیعیات کی وضاحت کے لئے کوئی تعمیراتی نظام نہیں ہے۔ شاید کسی قسم کا کثیر کائنات کا نظریہ طبیعیات کے لئے اسی نوعیت کی وضاحت فراہم کر سکے جیسی ڈارون نے حیاتیات کے لئے فراہم کیا۔ اس قسم کی وضاحت بظاہر ڈارون کے نظریے کے مقابلے میں کم اطمینان بخش ہے کیونکہ یہ خوش قسمتی پر بہت زیادہ انحصار کرتی ہے۔ لیکن اصول بشری ہمیں اس سے کہیں زیادہ خوش قسمتی کو فرض کرنے کا حق فراہم کرتا ہے جو ہماری محدود انسانی الہام ماننے کو تیار ہے۔

۶. ہمیں طبیعیات کے لئے بھی ایک بہتر تعمیراتی نظام کی دریافت کی امید نہیں چھوڑنی چاہئے، جو اتنا ہی طاقتور ہو جتنا ڈارون کا نظریہ ارتقاء حیاتیات کے لئے ہے ۔ لیکن ایک اطمینان بخش تعمیراتی نظام کی عدم موجودگی کے باوجود، ہمارے پاس موجود کمزور نظام بھی ، جب انہیں اصول بشری کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے، تو کسی آسمانی کنڈے کی ذہین ترتیب کار کی وضاحت سے کہیں بہتر وضاحتیں فراہم کرتا ہے۔

اگر اس باب کی دلیل کو تسلیم کر لیا جائے، تو مذہب کی بنیادی منطق — نظریۂ خدائی — نا قابل دفاع ہو جاتا ہے۔ تقریباً یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ خدا کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اب تک یہ کتاب اسی نتیجے کی جانب گامزن ہے۔ یہاں سے متعدد سوالات ابھرتے ہیں۔ اگر ہم تسلیم کر بھی لیں کہ خدا کا وجود نہیں ہے، تو کیا پھر بھی مذہب کی اہمیت سے انکار کیا جا سکتا ہے؟ کیا مذہب تسلی کا کام نہیں کرتا؟ کیا وہ لوگوں کو اچھائی کی ترغیب نہیں دیتا؟ اگر مذہب نہ ہوتا، تو لوگ اچھے برے میں فرق کیسے کرتے؟ آخر اتنی شدید مخالفت کیوں؟ اگر مذہب ڈھکوسلہ ہے تو یہ دنیا کی ہر بڑی تہذیب میں کیوں موجود ہے؟ سچ ہو یا جھوٹ، مذہب ہر جگہ موجود تو ہے۔ تو پھر یہ آیا کہاں سے؟ اب ہم اس آخری سوال کی جانب توجہ مبذول کرنا چاہتے ہیں۔

# باب ۵ : مذہب کی بنیادیں

ایک ارتقاپزیر ماہر نفسیات کے لئے مذہبی رسومات کی نا معقولیت اوراس میں کئے جانے والے وقت اور وسائل کا اصراف، ، اور تکلیف و غربت بندر کی پیٹھ کی طرح بے ہودہ حد تک واضح ہونا چاہئے کہ مذہب انسان کی منشا میں ڈھل جاتا ہے۔ (مارک کوہن)

## ڈارونی لازمہ

## The Darwinian Imperative

مذہب کی شروعات اوراس کے تمام انسانی تہذیبوں میں پائے جانے کے بارے میں ہر شخص کا ایک پسندیدہ نظریہ ہوتا ہے۔ اور یہ نظریہ اس شخص کو تسلّی اور سکون فراہم کرتا ہے۔ یہ گروہوں میں ہم آہنگی کو فروغ دیتا ہےاور اپنے وجود کو سمجھنے کی ہماری خواہش کو مطمئن کرتا ہے۔ میں تھوڑی دیر میں ان وضاحتوں کی طرف بھی آؤں گا۔ لیکن پہلے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں، جو باقی بحث پر مقدم ہے: قدرتی انتخاب کے بارے میں ڈارونی طرز کا ایک سوال۔

یہ جانتے ہوئے کہ ہم ڈارونی ارتقاء کا نتیجہ ہیں، ہمیں قدرتی انتخاب کی طرف سے پڑنے والے اس دباؤ پر سوال اٹھانا چاہئے جو مذہب کا محرّک بنا۔ یہ سوال ڈارون کے اقتصادی تحفظات کے تناظر میں مزید اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ مذہب خاصہ نامعقول اور مسرف ہے۔ جبکہ ڈارونی انتخاب عادتاً اسراف کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ قدرت بہت ہی سخت محاسب ہے۔ وہ پائی پائی کا حساب رکھنے والی، پل پل گھڑی دیکھنے والی، جو مختصر ترین زیاں پر بھی سزا دیتی ہے۔ جیسا کہ ڈارون نے وضاحت بھی کی ہے، 'یہ بے رحمی سے، رکے بغیر، ہر روز ہر گھڑی پوری دنیا میں ہر کمی بیشی کی جانچ پڑتال کے کام میں مصروف رہتی ہے؛ برے کو رد کرتی ہے اور اچھے کو محفوظ اور جمع کرتی ہے؛ جہاں موقع ملے خاموشی سے ہر جاندار کی بہتری کا کام سرانجام دیتی چلی جاتی ہے'. اگر کوئی جنگلی جانور عادتاً کسی بیکار حرکت میں ملوث رہتا ہے تو قدرتی انتخاب اس کے ایسے حریف کوسراہے گا جو اپنا وقت اور قوّت زندہ رہنے اور افزائش نسل میں صرف کرتے ہیں۔ قدرت بیکار نفس کے کھیلوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ ہمیشہ ایسا نہیں لگتا ہے، لیکن قدرت کے ماحول میں سنگدل افادیت پسندی کا دور دورہ رہتا ہے۔

بظاہر مور پنکھ بدرجہ اتم نفس کا کھیل لگتے ہیں۔ وہ پروں کے مالک کی بقا میں واقعی کوئی کردار ادا نہیں کرتے۔ لیکن اس سے ان جینز (genes) کو ضرور فائدہ پہنچتا ہے جو اسے اپنے کم خوشنما حریفوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ مور کے پر ایک اشتہار ہیں جو اسے اپنے جوڑے کو اپنی طرف راغب کر کے قدرت کی معیشت میں اپنا مقام مستحکم کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ اس منطق کا اطلاق اس محنت اور وقت پر بھی ہوتا ہے جو ایک گھونسلہ بنانے والا نر پرندہ گھاس، ٹہنیاں، خوش رنگ توت، پھول ،دانے اور بوتلوں کے ڈھکّن جمع کرنے میں صرف کرتا ہے تاکہ مادہ کو آمادہ کر سکے۔ یا ایک ایسی مثال لیتے ہیں جس کا اشتہاربازی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ پرندوں کی دکموڑوں (ant hill) میں گھس کر مکوڑوں میں "نہانے" یا اپنے پروں میں مکوڑے ڈالنے کی عادت ہے ـ کوئی نہیں جانتا کہ اس عمل کے کیا فوائد ہیں۔ شاید حفظان صحت کے مقاصد کار فرما ہوں اور طفیلی حشرات الارض (parasites) کو مارنا مقصد ہو؛ اس سلسلے میں مزید نظریات پیش کئے گئے ہیں، لیکن ان میں سے کسی کو بھی شواہد کی حمایت میسر نہیں ہے۔ لیکن تفصیل کے بارے میں بے یقینی ڈارون کے معتقدین کو یہ فرض کرنے سے نہیں روکتی ـ اور نہ ہی روکنا چاہئے ـ کہ مکوڑوں میں غسل کا کوئی مقصد تو ہو گا۔ اگرچہ ہمیں غسل کے اس عمل کے بارے میں پوری طرح علم نہیں ہے، ڈارونی منطق کے مطابق اگر پرندے یہ غسل نہ کرتے ہوں تو ان کی جینیاتی کامیابی کے امکانات اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ یہ نتیجہ اس دوہری بنیاد پر مبنی ہے کہ (ا) قدرتی انتخاب وقت اور قوت کے زیاں کی سزا دیتی ہے اور (ب) پرندوں کو اکثر مکوڑوں کے غسل میں اپنا وقت اور قوت صرف کرتے ہوئے پایا جاتا ہے۔ اگر اس "اصول مطابقت" کو ایک جملے کے منشور میں بیان کیا جا سکتا ہے تو وہ ہارورڈ یونیورسٹی کے ماہر جینیات (geneticist) رچرڈ لیونٹن کا یہ جملہ ہے: 'اس ایک نقطے پر تمام ماہرین ارتقاء متفق ہیں کہ کوئی جاندار اپنے ماحول میں جو کام کر رہا ہے اس سے بہتر کام کرنا تقریباً ناممکن ہے'۔ اگر مکوڑوں سے غسل پرندوں کے زندہ رہنے اور افزائش نسل کے حق میں نہ ہوتا تو قدرتی انتخاب نے بہت عرصہ قبل ان پرندوں کے حق میں اقدامات کر لئے ہوتے جو اس سے پرہیز کرتے ہیں۔ ڈارون کے معتقد شاید مذہب کے بارے میں بھی ایسے ہی خیال رکھتے ہوں۔ اس لئے یہ بحث اور بھی اہم ہو جاتی ہے۔

ارتقاء پسند کے لئے مذہبی رسومات سورج سے دھلے مرغزار میں مور کی طرح نمایاں نظر آتے ہیں (ڈینئیل ڈینیٹ کا جملہ)۔ مذہبی رویے اور طور

طریقے مکوڑوں سے غسل یا گھونسلہ سازی کی مانند ہی ہیں، لیکن ایک انتہائی وسیع پیمانے پر ان رسومات میں وقت اور قوت کا استعمال ہوتا ہے، اور نتائج کے تکلّف کی زیادتی مور کے پروں سے کم نہیں۔ مذہب متّقی شخص کی زندگی بھی خطرے میں ڈال سکتا ہے اور دوسروں کی بھی۔ ہزاروں لوگوں کو اپنے مذہب سے وفاداری کی پاداش میں ظلم و تشدّد کا نشانہ بنایا جاتارہا ہے، جبکہ ظالمین کا اپنا عقیدہ مظلوم کے عقیدے سے قابل قدر حد تک منفرد نہیں ہوتا۔ مذہب عموماً انتہائی وسیع پیمانے پر وسائل کو نگل جاتا ہے۔ قرون وسطیٰ میں ایک گرجا گھر کی تعمیر میں تقریباًایک صدی کی انفرادی قوت صرف ہو جاتی تھی، لیکن یہ عمارت کبھی آماجگاہ کے طور پر یا کسی اور ضروری مقصد کے لئے استعمال نہیں ہوتی تھی۔ کیا یہ کوئی تعمیراتی "مور پنکھ" تھا؟ اگر تھا، تو یہ اشتہار بازی کس کی توجہ حاصل کرنے کے لئے کی جاتی تھی؟ قرون وسطیٰ اور Renaissance (نشاۃ ثانیہ) کے ادوار میں تخلیقی قابلیت زیادہ تر مقدس موسیقی اور بھگتی سے بھری مصوّری پر مرکوز رہی۔ بھگت اپنے خداؤں کے لئے مرتے اور مارتے رہے ہیں، مذہب کی خدمت میں اپنی پیٹھ پر کوڑے برساتے رہے ہیں یا تا حیات کنوارے پن یا خاموشی کی قسمیں کھاتے رہے ہیں۔ یہ سب کس لئے ہے؟ مذہب کا کیا فائدہ ہے؟

ڈارونی سائنسدان کے لئے لفظ "فائدہ" سے مراد فرد واحد کے جینز کی افزائش ہے۔ مزید بر آں، ڈارونی فائدہ فرد واحد کے جینز کی افزائش تک محدود نہیں ہے۔ فائدے کے تین علیحدہ علیحدہ اہداف ہیں۔ ایک تو گروہوں کے انتخاب سے اخذ ہوتا ہے، اس کی جانب میں بعد میں آؤں گا۔ دوسرا اس نظریے سے پیدا ہوتا ہے جس کا ذکر میں نے The Extended Phenotype (وسیع شکل نوع) میں کیا تھا: جس فرد کو آپ دیکھ رہے ہیں ہو سکتاہے وہ کسی اور فرد کے جینز کے طابع کام کر رہا ہو، جیسے کہ طفیلی حشرات۔ ڈینئیل ڈینیٹ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ زکام بنی نوع انسان میں اتنی ہی عالمگیر حیثیت کا حامل ہے جتنا مذہب، لیکن ہم کبھی یہ دعویٰ تو نہیں کرنا چاہیں گے کہ زکام ہمارے لئے فائدہ مند ہے۔ ہمارے پاس ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جن میں جانور کی حرکات کو اس انداز سے ڈھالا گیا ہے کہ وہ کسی طفیلی جرثومے کو اگلے میزبان میں کامیابی سے منتقل کر سکے۔ میں نے اس نقطے کو اپنے 'مرکزی نظریہ وسیع شکل نوع – central theorem of the extended phenotype' میں یوں بیان کیاہے: 'کسی بھی جانور کے حرکات ایسے نسبوں کی افزائش کے حق میں کام کرتے ہیں جو ان حرکات کے موافق ہوں، چاہے وہ جینز اس جانور کے جسم میں تاحال موجود ہوں یا نہ ہوں'۔

تیسرے مرکزی نظریہ جینز کی جگہ زیادہ عمومی اصطلاح "نقال – replicator" کو استعمال کرتا ہے۔ مذہب کی عالگیر حیثیت سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ اس سے کسی کو تو فائدہ ہوا ہے، لیکن وہ شاید ہم یا ہمارے جین نہ ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ صرف مذہبی خیالات کو ہی فائدہ پہنچتا ہو، کہ جس حد تک ان کا برتاؤ جینز کی طرح ہی ہو۔ میں اس مدعے پر ذیل میں مزید اس سرخی کے تحت بات کروں گا: 'دھیان سے چلئے! آپ میری نشانیوں پر چل رہے ہیں'۔ فی الحال میں ڈارون کی روایتی تشریح کو لے کر آگے بڑھنا چاہتا ہوں، جہاں "فائدے" کا مطلب فرد واحد کی بقاء اور افزائش ہے۔

شکاری اور املاک جمع کرنے والے لوگ (hunter-gatherer people)، مثلاً آسٹریلیا کے مقامی قبیلے، آج بھی غالباً اسی طرح زندگی گزارتے ہیں جیسے ہمارے قدیم آباو اجداد گزارتے تھے۔ آسٹریلیائی سائنسی فلسفی کم سٹیریلنی نے ان کی زندگیوں کے ایک اہم تضاد کی نشاندہی کی ہے۔ ایک طرف تو یہ لوگ ایسے نامصائب حالات میں زندہ رہنا جانتے ہیں جو ان کی جسمانی قابلیت کا بھرپور امتحان لیتے ہیں۔ لیکن، جیسا کہ سٹیریلنی نشاندہی کرتا ہے کہ نہ صرف انسان ذہین ہے ،بلکہ وہ انتہائی ذہین ہے۔ وہی لوگ جو قدرتی دنیا کے بارے میں اتنا عاقلانہ روّیہ رکھتے ہیں اپنے ذہنوں کو ایسے عقائد سے بھی بھرے رکھتے ہیں جو صریحاً جھوٹے ہیں اور جن کے لئے 'بیکار' کا لفظ بھی بہت بڑی رعایت ہے – سٹیریلنی خود بھی پاپوا نیو گنی کے مقامی قبائل سے واقف ہے۔ وہ اپنے حیاتیاتی ماحول کے بارے میں "افسانوی درجہ کی درست معلومات کے دم پر ایسی ناقابل برداشت مشکلات میں زندہ رہتے ہیں جہاں خوراک کا حصول بہت کٹھن ہوتا ہے۔ لیکن وہ اس علم میں عورت ذات کی ماہ واری اور جادو ٹونا کے بارے میں اپنے گہرے اور تباہ کن جنون کی آمیزش کر دیتے ہیں۔ بہت سی مقامی تہذیبیں جادو کے خوف اور اس خوف سے پیدا ہونے والے تشدّد میں مبتلا رہتی ہیں"۔ سٹیریلنی سوال اٹھاتا ہے کہ 'ہم بیک وقت اتنے زیرک اور اتنے خوفزدہ کیسے ہو جاتے ہیں'[۲]۔

اگرچہ تفصیلات میں فرق ہو سکتا ہے، لیکن دنیا میں کوئی بھی تہذیب ایسی نہیں گزری جس میں وقت اور دولت کا زیاں کرنے والی، نفرتیں پالنے والی، حقیقت دشمن، اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے والی مذہبی رسومات و توہمات موجود نہ ہوں۔ ہو سکتا ہے چند تعلیم یافتہ افراد نے مذہب کو چھوڑ دیا ہو، لیکن سب کی پرورش مذہبی ماحول میں ہی ہوئی ہو گی، جسے خیر آباد کہنے کے لئے انہیں ایک شعوری فیصلہ کرنا پڑا ہو گا۔ سچ سے لبریز ایک پرانا آئرش لطیفہ ہے کہ "اچھا! لیکن کیا تم کیتھولک ملحد ہو یا پرٹیسٹنٹ ملحد"؟ مذہبی روّیوں کو بھی اسی طرح آفاقی کہنا چاہئے جس طرح ہم مخالف جنس کی طرف رغبت کو آفاقی کہتے ہیں۔ دونوں تعمیم (generalizations) اپنے اندر مستثنیات کی گنجائش رکھتی ہیں، لیکن وہ مستثنٰی مثالیں ان اصولوں کو اچھی طرح سمجھتی ہیں جن سے وہ منحرف ہوئی ہیں۔ دنیا میں موجود ہر نوع کے آفاقی خد و خال ڈارونی وضاحت چاہتے ہیں۔

ظاہر ہے جنسی روّیوں کے ڈارونی فوائد بیان کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ ان کا مقصد بچے پیدا کرنا ہی ہے، چاہے ہم جنس پرستی یا مانع حمل حرکات اس مقصد کی نفی کرتی نظر آئیں۔ لیکن ہم مذہبی روّیوں کے بارے میں کیا کہیں گے؟ انسان روزہ کیوں رکھتے ہیں، سجدے میں کیوں گر جاتے ہیں، خود کوزد و کوب کیوں کرتے ہیں، دیوانہ وار ایک دیوار کی طرف سر کیوں ہلاتے جاتے ہیں، مذہبی جنگوں میں کیوں نکل جاتے ہیں، یا دیگر ایسے مہنگے شوق کیوں پورے کرنے میں جٹ جاتے ہیں جن کے پیچھے پوری زندگی گزر جاتی ہے۔

## مذہب کے براہ راست فوائد

اس بات کے شواہد ناپید ہیں کہ مذہب ذہنی دباؤ سے پیدا ہونے والی بیماریوں سے بچاؤ میں فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ مذہب کے حق میں شواہد صحت مند نہیں ہیں، لیکن اگر ہوتے بھی تو اس میں کوئی حیرانی کی بات نہ ہوتی، جیسے شفاء با الدعا کی کامیابی کی چند مثالیں تو مل ہی جاتی ہیں۔ کاش کہ مجھے یہ وضاحت کرنے کی ضرورت نہ ہوتی کہ یہ مثبت اثرات مذہب کے دعوؤں کے سچ کو ثابت کرنے میں کوئی کردار ادا نہیں کر پاتے۔ جارج برنارڈ شا کے الفاظ میں "یہ حقیقت کہ ایک مومن ایک شکّی شخص سے زیادہ خوش رہتا ہے بحث کی صحت سے اتنی ہی دور ہے جتنا یہ حقیقت کہ شراب کے نشے میں مخمور ایک شخص ایک ہوش مند شخص سے زیادہ خوش رہتا ہے"۔

ایک طبیب اپنے مریض کو جو کچھ دے سکتا ہے اس میں تسلّی اور یقین دہانی بھی شامل ہیں۔ اس بات کو یونہی نظر انداز نہیں کر دینا چاہئے۔ اب میرا اپنا ڈاکٹر بھی شفاء بالدعا کا عمل تو نہیں کرتا اور نہ ہی "ہاتھ رکھنے کا عمل" (ایک خالصتاً عیسائی عمل جس میں عامل مریض کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دعائیں پڑھتا ہے) کرتا ہے۔ لیکن کئی بار ایسا ہوا کہ میں اس کے پر تیقّن لہجے اور ذہانت سے بھرے چہرے کی مدد سے ہی کسی معمولی بیماری سے یکدم بھلا چنگا ہو کر اٹھ بیٹھا۔ ایسے بے ضرر مادّے جو مریضوں کو ان کے علم کے بغیر دوائی کی جگہ دیے جاتے ہیں placebo کہلاتے ہیں۔ مریضوں پر ان کے اثرات کے دستاویزی ریکارڈ کا ایک ذخیرہ موجود ہے۔ اور یہ اثرات پراسرار بھی نہیں ہیں۔ یہ نقلی گولیاں جن کا دوا سے متعلق کوئی اثر نہیں ہے، پھر بھی مریض کی صحت میں بہتری کا باعث بنتی ہیں۔ اسی لئے دواؤں پر کئے جانے والے دوہرے (double blind) اندھے تجربات میں ان نقلی گولیوں کو منضبط عوامل (control) کے طور پر استعمال کیا جاتاہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہومیوپیتھی کی دوائیں کام کرتی نظر آتی ہیں، اگرچہ ان میں کارآمد مواد کی مقدار اتنی ہی ہوتی ہے جتنی نقلی گولی میں ،یعنی صفر مالیکیول اتفاق سے ڈاکٹری کی حدود میں وکیلوں کی دخل اندازی کا ایک مضر نتیجہ یہ بھی نکلا ہے کہ اب ڈاکٹر حضرات ان نقلی گولیوں کا نسخہ لکھنے سے کتراتے ہیں۔ یا افسر شاہی ان کو مجبور کرتی ہے کہ اپنے تحریری ریکارڈ میں، جس تک مریض کو رسائی حاصل ہوتی ہے، یہ بیان کریں کہ یہ گولیاں یا دوائیں نقلی ہیں، جس سے نقلی گولیاں دینے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ ہومیوپیتھی کے ڈاکٹر شاید اس لئے نسبتاً کامیاب نظر آتے ہیں کیونکہ ان کو آج بھی نقلی دوائیاں دوسرے نام سے دینے کی اجازت ہے – ا ان کے پاس ویسے بھی مریض سے بات چیت کرنے اور نرم دلی سے پیش آنے کے زیادہ مواقع ہوتے ہیں۔ ہومیوپیتھی کی طویل تاریخ کے اوائل میں ہومیوپیتھی کا مرتبہ اس وجہ سے بھی بلند ہوا کیونکہ اس کا مریض پر کوئی منفی اثر نہیں ہوتا تھا جبکہ رسمی طب کے طریقے – جیسے کہ فصد کھولنا (bloodletting) – اس دور میں عموماً خاصے مضر ثابت ہوتے تھے۔

کیا مذہب ایک نقلی گولی ہے جو ذہنی دباؤ کم کر کے زندگی کو دوام بخشتی ہے؟ اگرچہ اس نظریے کو ایسے بیشمار متشکک لوگوں کا سامنا کرنا پڑے گا جو آپ کو ایسے کئی حالات گنوا دیں گے جن میں مذہب دباؤ کم کرنے کی بجائے اس میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ ماننا بڑا مشکل ہے کہ احساس گناہ کی وہ نیم مستقل حالت جس میں ایک خامیوں سے بھرا ہواتقریباً کند ذہن رومن کیتھولک مستقل رہتاہے اس کی صحت کے لئے بہتر ثابت ہو سکتا ہے۔ شاید صرف کیتھولک کو نشانہ بنانا درست نہیں ہے۔ امریکی مزاحیہ اداکارہ کیتھی لیڈمین کا مشاہدہ ہے کہ 'سارے مذاہب ایک ہی جیسے ہیں: بنیادی طور پر مذہب احساس گناہ کا دوسرا نام ہے۔ صرف تہوار فرق ہیں'۔ بہرطور، مجھے نقلی دوا والا نظریہ مذہب جیسے ہمہ گیر نادر الظہور (phenomenon) کے شایان شان نہیں لگتا۔ مجھے نہیں لگتا کہ مذہب ہمارے درمیان اس لئے ہے کہ یہ ہمارے آباء و اجداد کے ذہنی دباؤ کو کم کرنے میں مدد گار ثابت ہوتا تھا۔ اگر اس اثر کا کوئی ضمنی عمل دخل رہا بھی ہو تو بھی یہ نظریہ مذہب کی کامیابی کو واضح کرنے کے لئے ناکافی ہے۔ مذہب ایک بہت ہی عظیم مظہر ہے بایں ہمہ اس کی وضاحت کے لئے بھی ایک عظیم نظریہ ہی درکار ہے۔

کئی دوسرے نظریات تو ڈارون کی وضاحتوں کے نکات کو سمجھنے سے بالکل ہی قاصر رہ جاتے ہیں، جیسے کہ "مذہب کائنات اور ہماری زمین کے بارے میں ہمارے تجسس کو مطمئن کرتا ہے" یا " مذہب دلاسا ہے"۔ شاید ان باتوں میں کوئی نفسیاتی سچائی بھی ہو، لیکن دونوں ہی جملے ڈارونی وضاحت پر پورے نہیں اترتے۔ سٹیفن پنکر نے اپنی کتاب "ذہن کیسے کام کرتا ہے – How the Mind Works " میں دلاسے کے بارے میں بڑے سخت الفاظ استعمال کرتے

ہوئے کہا: 'یہاں یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ ایک ذہن ایسی نوعیت کا ارتقاء کیوں کرے گا جہاں اس کو ایسے عقائد سے دلاسا ملے جن کے بارے میں وہ دیکھ سکتا ہے کہ وہ سچ نہیں ہیں۔ سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے آدمی کو اس عقیدے سے کوئی راحت نہیں ملتی کہ وہ گرم ہے؛ شیر کے سامنے کھڑا آدمی اس عقیدے کی وجہ سے سکون میں نہیں آ جاتا کہ وہ شیر نہیں خرگوش ہے'۔ دلاسے کے اس نظریے کو ڈارونی زبان میں ترجمہ کرنے کی سخت ضرورت ہے، لیکن ایسا کرنا اتنا آسان نہیں۔ اس قسم کی نفسیاتی وضاحتیں کہ یہ عقائد کچھ لوگوں کے لئے کار آمد ہوتے ہیں اور کچھ کے لئے نہیں، محض فوری ہیں حتمی نہیں۔

ڈارونی فوری اور حتمی کی اس تفریق کو بے انتہا اہمیت دیتے ہیں۔ گاڑی کے انجن کے سلنڈر میں دھماکے کی فوری توجیہہ تو سپارک پلگ پر منحصر ہے۔ لیکن حتمی وضاحت دھماکے کے مقصد کے بارے میں سوچنا چاہتی ہے: کہ پسٹن (piston) کو سلنڈر میں دھکا دیا جا سکے، اور وہ کرینک شافٹ (crankshaft) کو گھما سکے۔ مذہب کا مقرّب سبب شاید دماغ میں رگوں کی کسی مخصوص گرہ (node) میں انتہائی تیز حرکت ہو۔ میں دماغ میں " مرکز خدا" کے کسی اعصابی خیال پر مزید بات نہیں کروں گا کیونکہ فوری مسائل کے بارے میں فکر مند نہیں ہوں۔ اور آپ یہ مت سمجھئے کہ میں ان سوالات کی تضحیک کرنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کواس موضوع پر سیر حاصل بحث کے لئے مائیکل شرمر کی کتاب How We Believe: The Search for God in an Age of Science تجویز کر سکتا ہوں۔ اس کتاب میں آپ کو مائیکل پرسنگر اور دیگر اصحاب کی یہ تجویز بھی پڑھنے کو مل جائے گی کہ الہامی تجربات دماغ کے حصے temporal lobe میں مرگی کے دورے سے تعلق رکھتے ہیں۔

لیکن اس باب میں میرا سارا دھیان ڈارونی حتمی وضاحتوں پر ہے۔ اگر ماہرین اعصابیات (neuroscientists) دماغ میں کوئی مرکز خدا کی شناخت کر بھی لیں، تو میرا اور مجھ جیسے دیگر ڈارونی سائنسدانوں کا سارا تجسس قدرتی انتخاب کے اس دباؤ کو سمجھنے کی طرف مرکوز ہو گا جس کی وجہ سے یہ مرکز خدا وجود میں آیا – کیا وجہ تھی کہ ہمارے وہ آباء جن میں ایسے مرکز خدا کی آبیاری کا جینیاتی رجحان تھا مزید نسلیں پیدا کرنے میں کامیاب رہے جبکہ ان کے مد مقابل ناکام ہو گئے؟ اعصابیاتی سوال کے مقابلے میں ڈارونی حتمی سوال نہ تو ایک بہتر سوال ہے، نہ زیادہ گہرا اور نہ ہی زیادہ سائنسی سوال ہے۔ لیکن میری بات کا مرکز یہی سوال ہے –

ڈارونی لوگ سیاسی توجیہات سے بھی مطمئن نہیں ہوتے۔ 'مذہب ایک آلہ کار ہے جسے حکمران محکوم پر اپنا اختیار برقرار رکھنے کے لئے استعمال کرتا ہے'۔

یہ حقیقت ہے کہ امریکہ میں سیاہ فام غلاموں کو اگلے جہان میں ملنے والی ایک بہتر زندگی کے خواب دکھا کے مطمئن رکھا جاتا تھا، جو اس زندگی سے ان کی بد اطمینانی کو کند کئے رکھتی تھی، جس کا فائدہ یقینی طور پر صرف مالکان کو ہی ہوتا تھا۔ یہ سوال کہ کیا مذاہب ترش رو (cynical) پروہتوں اور حاکموں کی ایجاد ہوتے ہیں خاصہ دلچسپ ہے، اور مورخین کو اس پر مزید توجہ دینی چاہئے۔ لیکن اپنے آپ میں یہ ایک ڈارونی سوال نہیں ہے۔ ڈارونی بہر طور یہی سمجھنا چاہتا ہے کہ لوگ مذہب کے دلکش فریب کی زد میں کیوں آ جاتے ہیں اور پروہتوں، سیاستدانوں اور باشاہوں کے ہاتھوں اپنا استحصال کیوں ہونے دیتے ہیں۔

کوئی ترش رو سازشی شخص سیاسی طاقت حاصل کرنے کے لئے جنسی ہوس کے ہتھیار کا استعمال کر سکتا ہے، لیکن ہمیں پھر بھی اس ہتھیار کے کام کر جانے کی ڈارونی وضاحت تلاش کرنی ہے۔ جنسی ہوس کے سلسلہ میں جواب دینا بہت آسان ہے: قدرت نے ہمارا دماغ جنسی فعل سے لطف اندوز ہونے کے لئے تیار کیا ہے، کیونکہ قدرتی حالت میں جنسی فعل کے نتیجے میں افزائش نسل کا مقصد حاصل ہوتا ہے۔ یا کوئی سیاسی سازش کرنے والا اپنے مقاصد کے لئے بیجا ظلم کا سہارا لے سکتا ہے۔ یہاں پر بھی ڈارونی کو اس بات کی وضاحت کرنی ہو گی کہ جسمانی ظلم کارگر کیوں ثابت ہوتا ہے؛ ہم شدید تکلیف سے بچنے کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار کیوں ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ یہاں بھی وجہ روز روشن کی طرح عیاں ہے، ڈارونی پر پھر بھی واجب ہے کہ وہ ضاحت کو مرحلہ وار بیان کرے: قدرتی انتخاب نے تکلیف کے احساس کو جان کے خطرے کے اشارے کے طور پر ہمارے تحت الشعور میں بسا دیا ہے، اور ہمیں اس سے بچاؤ کی تدابیر کی لاشعوری تربیت دی ہے۔ ایسے نایاب افراد جو یا تو تکلیف محسوس نہیں کر سکتے یا اس کی پروا نہیں کرتے عموماً کم عمری میں ہی ان چوٹوں کی وجہ سے مر جاتے ہیں جن سے بچاؤ کے لئے عام انسان حد درجہ کوشش کرتا ہے۔ چاہے اس کا استحصال کیا جاتا ہے، یا چاہے یہ یکایک نمودار ہوتا ہے، آخر انسانوں میں خدا کے وجود کے لئے اس شدید خواہش کی کیا وجہ ہے ؟

# اجتماعی انتخاب

# GROUP SELECTION

کچھ مبیّنہ حتمی وضاحتیں وقت آنے پر گروہ کے انتخاب کا نظریہ ثابت ہوتی ہیں۔ گروہ کا انتخاب ایک متنازعہ خیال ہے جس کے مطابق ڈارونی انتخاب کسی جنس (species) یا کسی گروہ کا انتخاب کرتا ہے۔ کیمبرج کے ماہر آثار قدیمہ کولن رینفریو کے مطابق عیسائیت ایک طرح کی جماعت کے انتخاب کی وجہ سے ہی پنپ پائی ہے کیونکہ وہ جماعت کے اندر وفاداری اور برادرانہ شفقت کے احساس کو ترویج دیتی تھی، اور ان احساسات نے دیگر غیر مذہبی جماعتوں کے مقابلے میں مذہبی جماعتوں کی بقا میں مدد کی۔ امریکہ میں " جماعتی انتخاب" کے معتقد ڈی این ولسن نے اپنی کتاب "ڈارون کا کلیسا – Darwin's Cathedral " میں تفصیلی طور پر ایسا ہی ایک نظریہ پیش کیاہے۔

مذہب میں جماعتی انتخاب کا نظریہ دیکھنے میں کیسا لگے گا، اس کے لئے ایک ایجاد کردہ مثال پیش خدمت ہے۔ "جنگ کے خدا" کو ماننے والا ایک قبیلہ جنگوں میں ایسے قبیلوں پہ حاوی رہتا ہے جو امن اور آشتی کے خداؤں کی عبادت کرتے ہیں یا جن کے یہاں کوئی خدا ہے ہی نہیں۔ ایسے جنگجو جن کا کامل ایمان ہے کہ جنگ میں شہادت حاصل کرنے کی وجہ سے وہ سیدھے جنت میں جائیں گے بہت بہادری سے لڑیں گے اور بخوشی اپنی جان کا نذرانہ پیش کریں گے۔ لہٰذا ایسے مذاہب پر ایمان رکھنے والے قبیلوں کے دوسرے قبیلوں سے جنگ میں فتح یاب ہونے کے امکانات زیادہ ہیں، اور وہ ہارے ہوئے دشمن قبیلے کی املاک پر قبضہ کریں گے اور عورتوں کو لونڈی بنا پائیں گے۔ ایسے کامیاب قبیلے ذیلی قبیلے پیدا کریں گے، جو اپنی بساط میں مزید ذیلی قبیلے پیدا کرتے چلے جائیں گے۔ اور یہ تمام قبائل اسی جنگجو خدا کی عبادت کرتے رہیں گے۔ ایک جماعت کی ذیلی جماعت پیدا کرنے کا خیال اتنا غیر منطقی نہیں ہے۔ ماہر علم بشریات نپولین شانئوں نے جنوبی امریکہ کے یانومامو قبائل پر اپنی شہرہ آفاق تحقیق "غضب ناک قومیں – Fierce People " میں ان بنیادوں پر قبائل کے ٹوٹنے کا تجزیہ کیا ہے[۳۲]۔

شانئوں گروہی انتخاب کے نظریے کا حامی نہیں ہے، اور نہ ہی میں اس نظریے کی تائید کرتا ہوں۔ اس نظریے پر بہت خوفناک اعتراضات موجود ہیں۔ اس بحث میں جانبدار ہونے کی وجہ سے مجھے اس بات کا خیال رکھنا ہو گا کہ میں جذبات کی رو میں بہہ کر اپنے پسندیدہ "گھوڑے" مماس (Tangent) پر سوار اس کتاب کے اصل مقصد سے کہیں دور ہی نہ نکل جاؤں۔ کچھ ماہرین حیاتیات حقیقی جماعتی انتخاب – جیسا کہ فرضی جنگجو خدا کی مثال میں تھا – اور ایسے رویوں کو جسے وہ جماعتی انتخاب سمجھتے ہیں لیکن جو تفصیلی تجزیے پر رشتہ داروں کا انتخاب یا باہمی ایثار ثابت ہوتا ہے، ان کے درمیان تفریق نہیں کر پاتے ہیں(باب ٦ ملاحظہ کیجئے)۔

ہم میں سے جو سائنسدان جماعتی انتخاب سے متفق نہیں وہ بھی اتنا تو مانتے ہیں کہ یہ اصولی طور پر ممکن ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا عمل ارتقاء میں اس کی کوئی واضح اہمیت ہے یا نہیں۔ جب اس نظریے کا موازنہ نچلے درجے کے انتخابی عمل سے کیا جاتا ہے – جیسے کہ انفرادی قربانی اور ایثار کی وضاحت کے طور پر – تو نچلے درجے کا انتخابی عمل زیادہ طاقتور نظر آتا ہے۔ تصوّر کیجئے کہ ہمارے فرضی قبیلے کی اس فوج میں جہاں ہر سپاہی قبیلے کے لئے جان قربان کرنے اور جنّت میں انعام پانے کے لئے بیتاب ہے، ایک ایسا سپاہی بھی ہے جو اپنے ذاتی مفاد کے بارے میں فکر مند ہے۔ پیچھے ہٹنے کی وجہ سے اس کی فاتح فوج کا حصہ ہونے کے امکانات میں کوئی قابل ذکر کمی واقع نہیں ہو گی۔ اس کے ساتھیوں کی شہادت کا فائدہ اس کو قدرے زیادہ ہو گا اور شہیدوں کو نسبتاً کم، کیونکہ وہ سب تو مر چکے ہوں گے۔ لہٰذا اس کے بچے پیدا کرنے کے امکانات بھی شہدا کے مقابلے میں زیادہ ہوں گے، اور قربانی نہ دینے سے منسلک اس کی آنے والی نسلوں میں جینز کی افزائش کے امکان بھی زیادہ ہوں گے۔ لہٰذا آنے والی نسلوں میں شہادت کا رجحان کم ہوتا چلا جائے گا۔

یہ دانستاً سادہ اور بچکانہ مثال جماعتی انتخاب کی دائمی مشکل کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ جماعتی انتخاب پر مبنی ذاتی قربانی کے نظریے اندرونی بغاوت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جماعت کے نابود ہونے یا پھوٹ پڑنے کے واقعات کے مقابلے میں افراد کی اموات اور ولادتیں وقت کے قدرے بڑے تیز پیمانے پر تواتر کے ساتھ ظہور پزیر ہوتی ہیں۔ علم ریاضیات کی مدد سے بنائے گئے ڈھانچوں (models) سے ایسے مخصوص حالات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے جن میں جماعتی انتخاب کے ذریعے ارتقاء ممکن ہو سکے۔ یہ مخصوص حالات قدرتی قوانین کے لحاظ سے غیر حقیقی ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی یہ بحث کی جا سکتی ہے کہ قبائلی جماعتوں میں مذہب بالکل اسی طرح کے غیر حقیقی مخصوص حالات کو فروغ دیتا ہے۔ یہ ایک دلچسپ نظریہ ہے لیکن میں اس پر مزید وقت صرف نہیں کروں گا، سوائے اس بات کا اعتراف کرنے کے کہ خود ڈارون بھی، اگرچہ وہ فرد واحد کے سلسلے میں انتخاب کا جوشیلا وکیل تھا، اپنی مندرجہ ذیل گفتگو میں جماعتی انتخاب کے بہت قریب آگیا تھا:

دور قدیم میں جب ایک ہی ملک میں بسنے والے دو قبیلے ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوتے تھے تو (باقی عوامل کو برابر رکھتے ہوئے) جس قبیلے میں بہادر، ہمدرد، اور عقیدت مندوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی وہ ایک دوسرے کو خطرات سے آگاہ کرنے اور مدد و دفاع کے لئے کوشاں رہتے ہوں گے، ایسا قبیلہ بے شک دوسرے پر حاوی رہتا ہو گا ... خود غرض اور جھگڑالو لوگ ہم آہنگ نہیں ہو سکتے، اور ہم آہنگی کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں ہے۔ ایسا قبیلہ جس میں یہ خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہوں پھیل جائے گا اور دیگر قبیلوں پر فتح یاب ہو گا؛ لیکن جیسا کہ ہم نے تاریخ میں دیکھا ہے وقت کے گزرنے کے ساتھ یہ قبیلہ بھی کسی دوسرے افضل قبیلے سے زیر ہو جائے گا"۔

اس کتاب کو پڑھنے والے کسی بھی ماہر حیاتیات کو مطمئن کرنے کے لئے میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ڈارون کا نظریہ کسی سخت حد تک جماعتی انتخاب کا نہیں تھا، جس میں کہ کامیاب جماعتیں مزید ذیلی جماعتوں کو وجود بخشتے ہیں جن کو جماعتوں کی ایک جماعت میں شماریاتی طریقے سے گنا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس، ڈارون کے ذہنی خاکے میں مختلف قبیلوں کے بے لوث معاونین ممبران کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ڈارون کا نظریاتی ڈھانچہ برطانیہ میں سرخ گلہری کے مقابلے میں سرمائی گلہری کے کامیاب پہلوؤں سے مماثلت رکھتا ہے: جماعتی انتخاب نہیں ماحولیاتی متبادل۔

## مذہب کسی عمل کے ضمنی پیداوار کی حیثیت سے

بہرطوراب میں جماعتی انتخاب کو ایک طرف رکھتے ہوئے مذہب کی ڈارونی بقائی قدر (value) کے متعلق اپنا ذاتی زاویہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ میں ماہرین حیاتیات کی اس بڑھتی ہوئی آبادی میں شامل ہوں جن کا یہ خیال ہے کہ مذہب کسی اور ہی عمل کا ضمنی پیداوار (side effect) یا نتیجہ ہے۔ میرا یہ خیال ہے کہ ڈارونی بقائی قدر کے بارے میں قیاس آرائیاں کرنے کی بجائے ہم جیسوں کو "ضمنی پیداوار" کے زاویے سے سوچنا چاہیئے۔ جب ہم کسی چیز کی بقائی قدر کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو شاید ہم سوال ہی غلط پوچھ رہے ہوتے ہیں۔ ہمیں اس سوال کو بہتر طور پر آسان اور عام فہم انداز میں لکھنا چاہیئے۔ شاید ہم جس خصوصیت میں دلچسپی لے رہے ہیں اس کی اپنی کوئی بقائی قدر ہی نہ ہو، بلکہ وہ کسی دوسری ایسی چیز کا ضمنی پیداوار ہو جس کی اپنی بقائی قدر وجود رکھتی ہے۔ میرے خیال میں جانوروں کے طرز عمل پر کئے گئے میرے اپنے کام سے اقتباسات ضمنی پیداوار کے نظریے کے تعارف کے سلسلے میں بہت مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

پروانہ جس انداز سے شمع کی جانب اڑ کر جاتا ہے اور شعلے میں جل جاتا ہے، یہ دیکھنے میں حادثہ تو نہیں لگتا۔ پروانے اپنی قربانی دینے کی بھرپور کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ ہم اسے خودسوزی کا طرز عمل کہہ سکتے ہیں اوراس اشتعال انگیزنام کے تحت یہ سوچتے ہیں کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ قدرتی انتخاب اس حرکت کی حمایت کرے۔ میرا مدعایہ ہے کہ ذہین جوابات ڈھونڈنے سے پہلے ہمیں سوال کو ہی نئے انداز سے سوچناہو گا۔ پروانے کی موت خودکشی نہیں ہے۔ بظاہر خودکشی کسی دوسرے عمل کے نادانستہ اثر کے طور پر نمودار ہوتی ہے۔ اثر ... مگر کس کا؟ ایک امکان پیش خدمت ہے جو اس نقطے کو واضح کرنے میں مددگار ہو سکتا ہے۔

رات کے اندھیرے ماحول کو منوّر کرنے کے لئے غیر قدرتی روشنی انسانی ارتقاء کی کہانی میں ایک بہت حالیہ آمد ہے۔ ماضی قریب میں بھی رات کو صرف چاند اور ستاروں کی روشنی میسّر تھی۔ یہ دونوں اجسام بصری حدود سے باہر "لا محدود" مقام (infinity) پر ہیں۔ لہٰذا ان سے آنے والی کرنیں تقریباً متوازی ہیں۔ لہٰذا یہ قطب نما کے طور پر استعمال کئے جانے کے لئے نہایت موزوں ہیں۔ حشرات سورج اورچاند جیسے آسمانی اجسام کی مدد سے کامیابی سے ایک سیدھے قطار میں چلتے ہیں، اور شام کو الٹے پیر گھر بھی لوٹ پاتے ہیں۔ حشرات کا اعصابی نظام اس قسم کے عارضی اصول بنانے میں بہت قابلیت رکھتا ہے: 'ایسی سمت اختیار کرو کہ روشنی کی کرنیں تمہاری آنکھ پر ۳۰ ڈگری کے زاویے سے پڑیں'۔ چونکہ حشرات کی آنکھیں مرکّب آنکھیں ہوتی ہیں (جن میں روشنی کی رہ نما سیدھی نالیاں آنکھ کے وسط سے سطح کی طرف نکلی ہوئی ہوتی ہیں)، اس اصول کا شاید اتنا ہی مطلب ہو کہ روشنی کو صرف کسی ایک نالی میں رکھنے کی ضرورت ہے، جس سے حشرات سمت کا تعین کر سکتے ہیں۔

لیکن روشنی پر مبنی اس قطب نما کی کامیابی کا سارا دار و مدار اس بات پر ہے کہ روشنی کا سر چشمہ "لا محدود" مقام پر ہو۔ اگر ایسا نہیں ہو گا تو کرنیں متوازی نہیں ہوں گی، اور سائیکل کے پہیے کی تاروں کی طرح مرکز سے منتشر ہوتی ہوں گی۔ حشرات کا اعصابی نظام جو کہ متوازی کرنوں پر مبنی ہے ۳۰ ڈگری

(یا کسی اور سمت) کے اصول پر عمل درامد کی کوشش میں شمع کو بھی ایسے ہی سمجھے گا کہ جیسے وہ چاند کی طرح لا محدود مقام پر ہے، اور پروانے کو مرغولہ نما (spiral) راستے سے سیدھا شعلے میں لے جائے گا۔ آپ خود ۳۰ ڈگری یا کسی اور منفرد زاویہ کا استعمال کرتے ہوئے کاغذ پر اس کا نقشہ کھینچ کر دیکھ لیں؛ آپ ایک بہت نفیس لوگارتھمی مرغولہ بنائیں گے جو شعلے پر جا کر ختم ہو گا۔

اگرچہ ان مخصوص حالات میں تو یہ جان لیوا ثابت ہو گا، لیکن پروانے کا یہ اصول عمومی طور سے کافی فائدہ مند رہتاہے، کیونکہ شمع سے پروانے کا شاذو نادر ہی کبھی واسطہ پڑتاہے، لیکن چاند کی روشنی اسے ہر رات دکھائی دیتی ہے۔ ہمیں ان سینکڑوں پروانوں کی موجودگی کا کبھی احساس نہیں ہوتا جو روزانہ بڑی کامیابی سے سورج، چاند، دیگر ستاروں یا فاصلے پر موجود کسی شہر کی روشنی کی مدد سے اپنے راستے کا تعین کرتے ہیں۔ ہمیں صرف شمع میں جلتے ہوئے پروانے نظر آتے ہیں، اور اس وجہ سے ہم غلط سوال پوچھ بیٹھتے ہیں: یہ سارے پروانے خود سوزی کیوں کر رہے ہیں؟ اس سوال کی بجائے ہمیں یہ سوال پوچھنا چاہیے کہ ان پروانوں کے اعصابی نظام اس طرز پر کیوں بنے ہوئے ہیں کہ راستہ تلاش کرنے کے لئے انہیں روشنی کی کرنوں کو ایک مقرّرہ زاویے پر برقرار رکھنا پڑتا ہے؟ یہ ایک ایسا حربہ ہے جسے ہم اسی وقت دیکھ پاتے ہیں جب وہ ناکام ہوتا ہے۔ سوال کو جب دوسرے الفاظ میں لکھا جاتا ہےیا دوسری طرح سمجھا جاتا ہے تو سارا راز بھانپ کی طرح اڑ جاتا ہے۔ پروانے کی حرکت کو خود سوزی کہنا کبھی صحیح تھا ہی نہیں۔ یہ توعموماً بس ایک فائدہ مند قطب نما کا وقتی ناکامی (mis-firing) کی ضمنی پیداوار ہے۔

اب ذرا انسانوں کے مذہبی رویے پر اس ضمنی پیداوار کے سبق کا اطلاق کر کے دیکھیں۔ ہم انسانوں کی ایک کثیر تعداد کا مشاہدہ کرتے ہیں ــ کچھ رجحانات میں تو ۱۰۰ فیصد لوگ ایسے عقائد پر قائم ہیں جو قابل اثبات سائنسی حقوق کی بھی نفی کرتے ہیں اور مد مقابل مذاہب کے عقائد کی بھی۔ لوگ نہ صرف ان عقائد کے ساتھ جذباتی تیقّن سے وابستہ رہتے ہیں، بلکہ ایسی حرکات پر وقت اور ذرائع بھی صرف کرتے ہیں جو ان عقائد کی وجہ سے مرّوج ہیں۔ ان عقائد کے لئے مرتے بھی ہیں اور مارتے بھی ہیں۔ ہم اس پر تعجّب کا اظہار کرتے ہیں، جیسے ہم نے پروانوں کی خود سوزی پر تعجب کا اظہار کیا تھا۔ عالم بد حواسی میں ہم پوچھتے ہیں: آخر کیوں؟ لیکن یہاں بھی میرا مدعا یہی ہے کہ ہم شاید غلط سوال پوچھ رہے ہیں۔ مذہبی رویے کا نفسیاتی جھکاؤ کسی ضمنی پیداوار کی وجہ سے ناکام رہے ہیں جو ممکن ہے کسی اور حالات میں کارگر رہے ہوں گے۔ اس زاویے سے دیکھا جائے تو وہ نفسیاتی جھکاؤ جو ہمارے آباء و اجداد میں قدرتی انتخاب کے نتیجے میں ظاہر ہوا مذہب نہیں تھا؛ اس کے کچھ اور ہی فوائد تھے، اور اس کا مذہبی حرکات و سکنات کی صورت میں ظاہر ہونا محض حادثاتی ہے۔ ہم مذہبی روّیوں اور حرکات کو اسی وقت بہتر طور پر سمجھ پائیں گے جب ہم ان کو ایک نیا نام دے سکیں گے۔

تو پھراگر مذہب کسی اور چیز کی ضمنی پیداوار ہے، تو وہ "اور چیز" کیا ہے؟ مذہبی پیرائے میں ایسی کیا چیز ہے جس کا پروانے کی آسمانی روشنی کی کرنوں کی مدد سے راستہ تلاش کرنے کی قابلیت سے موازنہ کیا جا سکتا ہے؟ وہ کونسی قدیم فائدہ مند خصلت ہے جس کی ناکامی کے باعث کبھی کبھار مذہب کی پیدائش عمل میں آتی ہے؟اس کی توضیح کے لئے میں ایک خیال پیش کروں گا، لیکن میں یہاں اصرار کرتا چلوں کہ یہ محض اس قسم کی چیز کی ایک مثال ہے، آگے چل کر میں دوسرے لوگوں کی پیش کردہ مثالوں کا بھی ذکر کروں گا۔ میں کسی خاص جواب کے مقابلے میں اس بنیادی اصول پر زیادہ زور دیتا ہوں کہ سوال صحیح طریقے سے سوچا جانا چاہئے اور ضرورت پڑے تو لکھا جانا چاہئے۔

اس سلسلے میں میرا مخصوص مفروضہ بچوں سے تعلق رکھتا ہے۔ کسی اور جنس کے مقابلے میں انسان اپنی بقاء کے لئے پچھلی پیڑھیوں کے مجموعی علم اور تجربات پر کہیں زیادہ انحصار کرتے ہیں، اورآنے والی نسلوں کی حفاظت اور نشوو نماء کے لئے ہمیں یہ علم و تجربات ان نسلوں کو منتقل کرنے ہوتے ہیں۔ اصولی طور پر تو بچے اپنے ذاتی تجربات سے بھی سیکھ سکتے ہیں کہ انہیں کھائی کے پاس نہیں جانا چاہئے، زہریلے توت نہیں کھانے چاہئے، یا مگر مچھ والے پانی میں نہیں تیرنا چاہئے۔ لیکن ایسے بچوں کے دماغوں کے لئے ایک انتخابی فائدہ ہو گا جو اپنے بزرگوں کی ہدایات کو بغیر سوال کئے من و عن مان لیتے ہوں۔ والدین کی اطاعت کرو؛ قبیلے کے سرداروں کی اطاعت کرو، خاص کر جب وہ سنجیدہ اور دھمکی آمیز لہجہ اختیار کرتے ہوں۔ بزرگوں پر اعتماد کرنا بچوں کے لئے بالعموم ایک فائدہ مند اصول ہے۔ لیکن پروانوں کی مثال سامنے رکھیں تو کبھی کبھی اس اصول کا اطلاق غلط نتائج بھی دے سکتا ہے۔

میں بچپن میں سکول کے عبادت گھر میں دیے جانے والے خوفناک وعظ کو کبھی نہیں بھول سکا۔ اگرچہ بادی النظر میں یہ خوفناک لگتا ہے، اس دور میں میرے بچکانہ ذہن نے اس وعظ کو اسی نیت سے قبول کیا جس نیت سے واعظ نے اسے لکھا تھا۔ اس نے ہمیں فوجیوں کی ایک ٹولی کی کہانی سنائی جو ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ پریڈ کی مشق، یونی ڈرل، کر رہے تھے۔ ایک موقع پر ڈرل سارجنٹ کی توجہ ہٹ گئی اور اس نے رکنے کا حکم نہیں دیا۔ حکم ماننے کے بارے میں فوجیوں کی تربیت اتنے اعلیٰ درجے کی تھی کہ انہوں نے اپنی پریڈ جاری رکھی اور سامنے سے آتی ہوئی ریل گاڑی کی زد میں آگئے۔ میں اس کہانی کو بالکل

نہیں مانتا اور مجھے امید ہے کے وعظ لکھنے والے پادری کا بھی یہی خیال ہو گا کہ یہ سچ نہیں تھا۔ لیکن جب میں ۹ سال کا تھا تو یقیناً اسے سچ ہی سمجھتا تھا، کیونکہ یہ کہانی مجھے ایک ایسے ذی شعور شخص نے سنائی تھی جس کا اس وقت مجھ پر اثر و رسوخ تھا۔ اور وہ بذات خود اس کہانی پر یقین رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، اس کی منشا یہی تھی کہ اس کے زیر تربیت بچے اپنے آپ کو ان فوجیوں کے مطابق ڈھالیں، اور حاکم کے احکامات کی غلامانہ اطاعت اور تابعداری کی روش اختیار کریں، چاہے وہ احکامات کتنے ہی بے معنی یا احمقانہ کیوں نہ ہوں۔ جہاں تک میرا خیال ہے، ہم ان فوجیوں کو رشک کی نظر سے ہی دیکھتے تھے۔ بلوغت کی عمر میں اب مجھے یقین نہیں آتا کہ زمانہ نادانی میں میں نے کبھی سوچا بھی ہو گا کہ کیا مجھ میں اتنی بہادری ہے کہ میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں ریل گاڑی کے نیچے ہی لیٹ جاؤں گا؟ لیکن جہاں تک میری یاداشت ساتھ دیتی ہے، اس وقت میں نے ایسا ہی سوچا تھا۔ اس وعظ نے یقیناً مجھ پر گہرا اثر چھوڑا ہو گا، کیونکہ نہ صرف وہ مجھے یاد رہا بلکہ میں نے اسے آپ تک بھی پہنچایا۔

سچ پوچھئے تو مجھے نہیں لگتا کہ واعظ کا خیال تھا کہ وہ ہمیں کوئی مذہبی پیغام دے رہا ہے۔ اپنی نیت میں وہ پیغام مذہبی سے زیادہ ٹینیسن کی نظم "Charge of the Light Brigade" کی طرح عسکری نوعیت کا تھا، اور شاید اس نے وہاں سے اقتباس بھی کیا ہو:

'لائٹ بریگیڈ، یلغار ہو'!
کوئی جوان نہ خوف زدہ ہو۔
انہیں کیا معلوم، کہیں غلطی ہو گئی۔
ان کو نہ سوال کرنا تھا۔
ان کو نہ غور کرنا تھا۔
ان کو تو بس نثار ہونا تھا۔
اور چھ سو بہادر۔
موت کی وادی میں اتر گئے۔

(انسانی آواز کی سب سے پرانی اور کٹی پھٹی ریکارڈنگ میں سے ایک لارڈ ٹینیسن کی اپنی آواز میں ہی نظم کی ریکارڈنگ ملی ہے۔ اور اس آواز کا کھوکھلا صوتی اثر، جیسے وہ کسی لمبی سرنگ سے یاد ماضی کی صدا کی طرح آ رہی ہو، نظم کے ہیبت ناک تاثر کو اور بھی دوبالا کر دیتا ہے)۔ کمان عالیہ کے نقطۂ نظر سے ہر فوجی کو حکم ماننے یا نہ ماننے کی آزادی دینا ایک احمقانہ فعل ہوتا۔ ایسی قومیں جن کے فوجی حکم ماننے کی بجائے اپنی مرضی کرنے لگیں اکثر جنگیں ہار جاتی ہیں۔ قوم کے نقطۂ نظر سے احکامات کی بجا آوری ایک کار آمد اصول ہے، اگرچہ اس میں انفرادی سانحات کا احتمال برقرار رہتا ہے۔ فوجیوں کو مشین یا کمپیوٹر کی طرح حکم ماننے کی ہی تربیت دی جاتی ہے۔

کمپیوٹر وہی کرتا ہے جس کا اسے حکم دیا جائے۔ وہ غلامانہ انداز سے ہدایات پر عمل کرتا چلا جاتا ہے۔ اور اس طرح وہ تمام ضروری کام سر انجام دیتا ہے جیسے ورڈ پراسیسنگ یا سپریڈشیٹ کا کام۔ لیکن اس کا ضمنی پیداوار یہ ہے کہ وہ غلط لکھے گئے احکامات کو بھی اسی تندہی سے سر انجام دیتا ہے۔ کمپیوٹر کے پاس ایسی کوئی قابلیت نہیں ہوتی کہ وہ بتا سکے کہ کسی خاص حکم کا اثر فائدہ مند ہو گا یا نقصان دہ۔ وہ تو بس حکم مانتا ہے، جیسا کہ فوجیوں سے بھی توقع کی جاتی ہے۔ ان کی احکامات پر بغیر سوال کئے چلنے کی یہ خاصیت ہی کمپیوٹر کو انسان کے لئے فائدہ مند بناتی ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ سافٹ ویئر وائرس کے حملے اسے بہت کمزور اور غیر محفوظ بھی بنا دیتی ہے۔ بد نیت طریقے سے مرتّب ایک وائرس کا یہ حکم کہ "میری نقل بنا کر اس کمپیوٹر میں پڑے ہر پتے پر اس نقل کو ارسال کر دو" بغیر کسی حجّت کے مان لیا جائے گا۔ اور ان دیگر کمپیوٹر میں بھی اسی طرح مان لیا جائے گا جس کا اثر یہ ہو گا کہ وائرس وبا کی طرح پھیل جائے گا۔ ایسا کمپیوٹر بنانا بہت مشکل سمجھا جاتا ہے جو فرمانبردار ہونے کے باوجود وائرس سے بالکل محفوظ رہ سکے۔

اگر میں آپ کو قائل کرنے میں کامیاب رہا ہوں تو آپ بچوں کے ذہنوں اوران پر مذہب کے اثرات کے بارے میں میری دلیل کو مکمل کر چکے ہوں گے۔ قدرتی انتخاب بچوں کے ذہنوں کو ایسے تعمیر کرتا ہے کہ ان میں اپنے بڑوں اور قبائلی قائدین کی بات قبول کرنے کی فطری رغبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اتنی اعتماد سے بھرپور تابعداری بقاء کے لئے بہت اہم ہے: جو پروانے کا چاند کی روشنی میں راستہ تلاش کرنے کے مترادف ہے۔ لیکن اس اعتماد سے بھرپور تابعداری کی تصویر کے دوسرے رخ پر آپ کو غلامانہ سادہ مزاجی نظر آئے گی۔ اور اس کا ناگزیر ضمنی پیداوار دماغی وائرس کا وبائی مرض ہے۔ ڈارونی بقاء سے منسلک چند نہایت اعلیٰ وجوہات کی بنا پر بچے کے دماغ کو والدین پر اور بڑی عمر کے ایسے لوگوں پر جن پر والدین اعتماد کرنے کو کہیں، اعتماد کرنے کی ضرورت

ہوتی ہے۔ اس اعتماد کا ایک نتیجہ تو یہ ہوتا ہے کہ اعتماد کرنے والا اچھی اور بری صلاح میں تمیز کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔ بچہ یہ نہیں بتا سکتا کہ "لیمپوپو جھیل کے مگر مچھ بھرے پانیوں میں مت کھیلو" ایک فائدہ مند صلاح ہے جبکہ "تمہیں پورے چاند کی رات ایک بکرے کی قربانی دینی ہو گی ورنہ بارش نہیں ہو گی" وقت اور بکریوں کے زیاں سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ دونوں صلاح اعتماد کے قابل لگتی ہیں۔ دونوں ہی معتبر ذرائع سے آتی ہیں اور ایسی سنجیدگی سے کہی جاتی ہیں جو طابعداری اور عزت طلب ہوتی ہیں۔ اور یہ اصول دنیا، کائنات، اخلاقیات اور انسان کی قدرت کے بارے میں تجاویز کے لئے بھی اتنے ہی درست ہیں۔ اس بات کا بھی اغلب امکان ہے کہ بچہ بڑا ہونے پر یہ تمام بے معنی اور با معنی باتیں اپنی اولاد کو من و عن منتقل کر دے گا، اور اس کے لئے وہی سنجیدہ لہجہ اور رویّہ اختیار کرے گا جو اس کے ساتھ کیا گیا تھا۔

اس حساب سے ہمیں یہ توقع کرنی چاہئے کہ دنیا کے مختلف خطوں میں انسانوں کو مختلف صوابدیدی عقائد ورثے میں دئے جاتے ہیں جو حقائق پر مبنی نہیں ہوتے لیکن ان پر روایتی حکمت کے طور پر اسی شدت سے اعتماد کیا جاتا ہے جیسے یہ کہنا کہ گوبر فصل کے لئے اچھا ہوتا ہے۔ ہمیں یہ امید بھی رکھنی چاہئے کہ توہمات اور غیر حقیقی عقائد کا ارتقاء مقامی نوعیت کا ہو گا، جو نسل در نسل بے ترتیب بہاؤ یا کسی قسم کے ڈارونی انتخاب کے نتیجے میں تبدیل ہو گئیں، اور بلآخر اپنے مشترکہ جدّی عقیدے سے قطعی مختلف ہوں گے۔ اگر زبانوں کی جغرافیائی علیحدگی کو مناسب وقت دیا جائے تو وہ اپنی مشترکہ جڑ سے بہت دور نکل جاتی ہیں (اس نقطے پر میں تھوڑی دیر میں لوٹوں گا)۔ بظاہر اس اصول کا اطلاق ان اساس سے عاری اور صوابدیدی عقائد اور احکامات پر بھی ہوتا نظر آتا ہے جو ہمیں ورثے میں ملے ہیں – عقائد جنہیں بچوں کے معصوم ذہن کو باآسانی کسی ایک راستے پر ڈھالے جا سکنے کی فطرت سے فروغ ملتا ہے۔

قائدین مذہب بچّے کے ذہن کی باآسانی مجروح کئے جا سکنے کی فطرت اور مذہبی تلقین کی مشق کی جلد از جلد شروعات کی اہمیت سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ جیسوٹ عیسائیوں کے اس فخریہ دعوے میں کہ "مجھے سات سال کے لئے اپنا بچّہ دو، میں تمہیں مرد (انسان) واپس لوٹا دوں گا" اپنی دقیانوسیت کے باوجود سچ موجود ہے۔ دور حاضر میں بدنام زمانہ "خاندان پر دھیان – Focus on the Family" تحریک کے بانی جیمز ڈابسن بھی اس سنہرے اصول سے بخوبی واقف ہیں: "قوم کا مستقبل ان کے ہاتھ میں ہے جو بچوں کی تعلیم اور تجربات پر اثر انداز ہو سکیں: بچے کیا دیکھتے، سنتے، سوچتے اور مانتے ہیں۔

لیکن یاد رکھیے! بچوں کے معصوم ذہنوں کا یہ استحصال محض ہر "اس طرح کی چیز" کی ایک مثال ہے جسے ہم پروانوں کی چاند یا تاروں کی کرنوں سے راستہ تلاش کرنے کی قابلیت سے موازنہ کرنے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ ماہر خلقیات رابرٹ ہنڈ نے "خدا کیوں برقرار ہے؟ Why Gods Persist"، اور ماہرین بشریات پال بائیر (مذہب کی وضاحت Religion Explained) اور سکاٹ آٹران (ہم خداؤں پر اعتماد کرتے ہیں In Gods We Trust) نے اپنے اپنے انداز میں مذہب کے نفسیاتی مزاج کا ضمنی پیداوار ہونے کے عمومی خیال کو فروغ دیا ہے – یا یوں کہیئے کہ ضمنی "پیداوار"، کیونکہ علماء بشریات دنیا میں مختلف مذاہب کی بہتات اور ان کے باہمی فرق پر بھی زور دیتے ہیں ۔ علماء بشریات کی ایسی دریافتیں ہمیں عجیب لگتی ہیں کیونکہ ہم ان سے نا واقف ہوتے ہیں۔ ہر شخص کو وہ عقیدہ بہت عجیب لگتا ہے جس میں وہ خود پلا بڑھا نہیں ہوتا۔ بائیر نے کیمرون کے فینگ اقوام پر تحقیق کی، جن کا ماننا ہے کہ...

> .... جادو گرنیوں میں ایک جانور نما اندرونی عضو ہوتا ہے جو رات کو ان کے جسم سے نکل کر پرواز کر جاتا ہے اور لوگوں کے کھیت تباہ کرتا ہے یا ان کے خون میں زہر ملاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ جادو گرنیاں کبھی کبھی بڑی بڑی ضیافتوں کے لئے جمع ہوتی ہیں، جہاں وہ اپنے (انسانی) شکار کو کھاتی ہیں اور اگلے حملے کی تیاری کرتی ہیں۔ بہت سے لوگ آپ کو بتائیں گے کہ ان کے ایک دوست کے دوست نے رات کو جادوگرنی کو کیلے کے پتّے پر بیٹھ کر گاؤں کے اوپر اڑتے اور بے خبر لوگوں پر تیر پھینکتے دیکھا ہے۔

بائیر اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے ایک ذاتی قصہ رقم کرتا ہے:

---

میں کلوراڈو میں ایک گاڑی کے بمپر پر یہ سٹیکر دیکھ کر بہت محظوظ ہوا: "اپنے (بکواس) خاندان پر دھیان دو"۔ لیکن اب یہ اتنا مضحکہ خیز نہیں لگتا۔ شاید کچھ بچوں کو اپنے والدین کی تلقین سے بچانے کی بھی ضرورت ہے۔

میں کیمبرج کے ایک کالج میں رات کے کھانے پر ایسے نادرواقعات کے قصے سنا رہا تھا کہ ہمارے ایک مہمان نے جو کیمبرج کے ایک مشہور عالم دین تھے، میری طرف مڑے اور یوں مخاطب ہوئے: 'یہی تو بات ہے جو علم بشریات کو اتنا دلچسپ اور اتنا مشکل بھی بناتی ہے۔ آپ کو سمجھانا پڑتا ہے کہ لوگ ایسی احمقانہ باتوں پر کیسے یقین کر لیتے ہیں'۔ اور میں بھونچکا رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کیتلیوں اور دیگچیوں کی طرز پر کوئی مناسب جواب تراشتا، گفتگو آگے بڑھ چکی تھی۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ عالم دین ایک رسمی عیسائی تھا، تو غالباً اس کے عقائد درج ذیل فہرست کا کوئی مجموعہ ہوں گے:

۱. ہمارے آباء و اجداد کے زمانے میں ایک کنواری عورت کے بطن سے ایک بچہ پیدا ہوا، جس کی پیدائش میں کسی آدمی کا ہاتھ نہیں تھا۔

۲. اسی بن باپ کے بچے نے اپنے مرحوم دوست لعزر (Lazarus) کو پکارا تو وہ جی اٹھا، اگرچہ اس کی وفات کو اتنا وقت گزر چکا تھا کہ اس کی میت باس مار رہی تھی۔

۳. یہ بن باپ کا انسان خود بھی تین دن وفات پزیراور دفن رہنے کے بعد جی اٹھا تھا۔

۴. چالیس دن بعد یہ بن باپ کا آدمی ایک پہاڑی کی چوٹی پر گیا، اور وہاں سے جسمانی حالت میں آسمان میں غائب ہو گیا۔

۵. اگر آپ اپنے دل ہی دل میں خیالات کی سرگوشیاں کرتے ہیں، تو بن باپ کا آدمی، اور اس کا "باپ" (جو وہ خود ہی ہے) آپ کے خیالات کو سن لیں گے اور شاید ان پر عمل بھی کر لیں۔ وہ بیک وقت دنیا کے سب لوگوں کی آواز سننے کی قابلیت رکھتا ہے۔

۶. آپ اچھائی کریں یا برائی کریں، اس بن باپ کے آدمی کو سب دکھتا ہے، چاہے کسی اور کو آپ کی حرکت نظر آئے یا نہ آئے۔ آپ کو اپنے کیے کی جزاو سزا بھی مل سکتی ہے، اور یہ اگلے جہان میں بھی ممکن ہو گا۔

۷. بن باپ کے آدمی کی کنواری ماں کبھی فوت نہیں ہوئی بلکہ آسمان میں جسمانی طور پر "اٹھا لی گئی"۔

۸. اگر کوئی ایسا پادری جس کے مردانہ اعضاء مخصوصہ ہوں اور وہ روٹی اور شراب پر رحمت کی دعا پڑھ دے تو وہ بن باپ کے آدمی کا جسم اور لہو بن جاتے ہیں۔

اگر ایک غیر جانبدار ماہر بشریات کیمبرج میں اپنی تحقیق کر رہا ہو اور اس کے سامنے یہ عقائد پیش کئے جائیں تو اس کا رد عمل کیا ہو گا؟

## نفسیاتی طور پر مذہب کے لئے تیار

ارتقائی نفسیات کے اہم اور بڑھتے ہوئے شعبہ علم و تحقیق سے نفسیاتی ضمنی پیداوار کا تصّور پیدا ہو جانا قدرتی ہے[۶۵]– ماہرین ارتقائی نفسیات کا کہنا ہے کہ جیسے آنکھ بینائی کے لئے ایک ارتقاء پزیر عضو ہے اور پر پرواز کے لئے ارتقاء پزیر عضو ہے، ویسے ہی دماغ بھی اعضائے رئیسہ (یا نیم خود مختار اعضا) کا مجموعہ ہے جو ضرورت کے حساب سے معلومات کومختلف حصوں میں منتقل کرنے میں ماہر ہے۔ان میں ایک حصہ رشتہ داری کے تعلقات سے نمٹنے کے لئے ہے، ایک باہمی لین دین کے لئے، ایک جذبہ ہمدردی کے لئے، وغیرہ وغیرہ۔ ہم مذہب کو ان میں سے کچھ یا کئی حصّوں کی غلط کارکردگی کے ضمنی پیداوار کے طور پر بھی دیکھ سکتے ہیں: مثال کے طور پر دوسرے ذہنوں کے بارے میں تصوّرات استوار کرنے کا حصّہ، اتحاد بنانے کا حصّہ، یا جماعت کے ممبران کے حق میں اور اجنبیوں کے خلاف امتیازی سلوک روا رکھنے کا حصّہ۔ ان میں سے کسی بھی حصّے کو پروانے کی اجسام فلکی کی روشنی میں راستہ تلاش کرنے کی حس کا انسانی متبادل سمجھا جا سکتا ہے، جس کے ناکارہ ہو جانے کا خطرہ اسی طرح رہتا ہے جیسے میں نے بچّوں کی سادہ مزاجی کے بارے میں کہا تھا۔ ماہر نفسیات پال بلوم جو "مذہب بطور ضمنی پیداوار" کے نظریے کے اہم وکیل ہیں، وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ بچّوں میں ذہن کے ثنویاتی (dualistic) نظریے کی طرف قدرتی رجحان ہوتا ہے۔ بلوم کے مطابق مذہب اس جبلّی ثنویت (dualism) کا ضمنی پیداوار ہوتا ہے۔ اس کے مطابق انسان، خصوصاً بچے قدرتی طور پر ثنویاتی ہوتے ہیں۔

ایک ثنویت پسند مادّے اور ذہن کی بنیادی تفریق کا اعتراف کرتا ہے۔ اس کے برعکس وحدت پسند یہ مانتا ہے کہ ذہن در اصل مادّے کا ہی مظہر ہے – دماغ یا شاید کمپیوٹر کا مواد – مادّے سے علیحدہ وجود نہیں رکھ سکتا۔ ثنویت پسند کے مطابق ذہن کوئی غیر مجسم روح ہے جو جسم میں رہائش اختیار کر لیتی ہے؛ لہٰذا یہ بات قابل فہم ہے کہ یہ روح جسم سے انخلاء کر کے کسی دوسری جگہ بھی وجود برقرار رکھ سکتی ہے۔ ثنویت پسند بہت آسانی سے دماغی امراض کی تشریح کرتے ہوئے کہہ دیتے ہیں کہ "مریض میں شیاطین اتر آئے ہیں"؛ یہ شیاطین ایسی روحیں ہیں جو اس جسم میں عارضی طور پر مکین ہیں، اور جسم سے بے دخل کی جاسکتی ہیں۔ ثنویت پسند غیر جاندار اجسام کو بھی شخصیت کی صفت سے نوازنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے؛ انہیں آبشاروں اور بادلوں میں بھی شیطان اور بد روحیں دکھائی دیتی ہیں۔

ایف آنسٹی کا ۱۸۸۲ کا ناول Vice Versa ثنویت پسند کو سمجھ آجاتا ہے، لیکن مجھ جیسے کسی پکّے وحدت پسند کی سمجھ سے ماورا ہی رہتا ہے۔ مسٹر بلٹی ٹیوڈ (Mr. Bultitude) اور ان کے بیٹے کو یہ پتا چلتا ہے کہ انہوں نے پر اسرار طور پر اپنے جسم آپس میں تبدیل کر لئے ہیں۔ بچّہ اس بات پر محظوظ ہے کہ والد کو نہ چاہتے ہوئے بھی بچّے کے جسم میں دوبارہ سکول جانا پڑے گا ، جبکہ بیٹا باپ کے جسم میں باپ کے کاروبار کو اپنے نادان فیصلوں کی وجہ سے تقریباً تباہ کردیتا ہے۔ کچھ ایسا ہی خاکہ پی جی ووڈہاؤس نے اپنی کہانی Laughing Gas میں استعمال کیا، جہاں ارل آف ہیورشاٹ اور ایک نو عمر اداکار کو دندان ساز کی جراحی میں ساتھ ساتھ لگی کرسیوں پر بٹھا کر بے ہوشی کی دوا دی گئی، لیکن بعد ازیں دونوں ایک دوسرے کے جسم میں بیدار ہوئے۔ ایک بار پھر، یہ کہانی ایک ثنویت پسند کو سمجھ آسکتی ہے۔ لارڈ ہیورشاٹ سے تعلق رکھنے والی کوئی تو ایسی شئے ہو گی جو اس کے جسم کا حصّہ نہیں لیکن اس کی شخصیت کا حصّہ ہے، ورنہ وہ نوعمر اداکار کے جسم میں کیسے جاگ سکتا ہے؟

زیادہ تر سائنسدانوں کی طرح میں بھی ثنویت پسند نہیں ہوں، لیکن اس کے باوجود مندرجہ بالا دونوں کہانیوں سے محظوظ ہونے کی قابلیت رکھتا ہوں۔ یہاں بلوم اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ اگرچہ میں عقلی اعتبار سے وحدت پسند ہوں، لیکن ایک انسانی جانور ہونے کے ناطے میرا ارتقاء ایک جبلّی ثنویت پسند کے طور پر ہی ہوا ہے۔ چاہے ہم کتنا بھی وحدت پسند ہونے کا ڈھونگ کریں، یہ تصوّر کہ میری آنکھوں کے پیچھے ایک "میں" بیٹھا ہوا ہے جو کم از کم قیاس کی حد تک یہ قابلیت رکھتا ہے کہ کسی کے دماغ میں نقل مکانی کر سکتا ہے، ہمارے دل و دماغ میں کامل حد تک رچا بسا ہے۔ بلوم اپنے دعوے کے دفاع میں تحقیقاتی شواہد پیش کرتا ہے کہ بچّے بڑوں سے بھی زیادہ ثنویت پسند واقع ہوتے ہیں، خصوصاً بہت چھوٹے بچّے۔ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ثنویت پسندی کا رجحان ہمارے دماغوں میں ہی موجود ہوتا ہے اور، بقول بلوم، ہمیں مذہبیت کی جانب راغب کرتا ہے۔

بلوم یہ بھی تجویز کرتا ہے کہ ہم قدرتی طور پر نظریہ تخلیق کے حامی (creationist) واقع ہوئے ہیں۔ قدرتی انتخاب کی کوئی بدیہی تک نہیں بنتی۔ خاص طور سے بچّوں کی ہر چیز کو مقصدیت کی خاصیت سے نوازنے کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں، جیسے کہ ماہر نفسیات ڈیبرا کیلمین اپنے مقالے "کیا بچّے 'بدیہی توحید پرست' ہوتے ہیں؟ Are children 'intuitive theists'?"[۶۷] میں کہتی ہے۔ بادل "بارش کے لئے" ہوتے ہیں۔اور نوکیلے پتھر "جانوروں کی خارش کرنے کے لئے" ۔ ہر چیز کے ساتھ مقصد منسلک کرنے کو teleology (یا نظریہ مقصدیت) کہا جاتا ہے۔ بچّے جبلی طورپر مقصدیت پسند ہوتے ہیں اور اکثر اوقات اس نظریے سے باہر نہیں نکل پاتے۔

جیسے پروانوں کا "روشنی کا قطب نما" ان میں نا دانستہ خود کشی کا رجحان پیدا کر دیتا ہے، ویسے ہی موافق حالات میں جبلی ثنویت اور جبلی مقصدیت پسندی ہمارے اندر مذہبی رجحانات پیدا کرتے ہیں۔ جبلی ثنویت ہمیں ذہنی طور پر "روح" میں یقین رکھنے پر آمادہ کرتی ہے، ایک ایسی روح جو ہمارے جسم کا حصہ ہونے کی بجائے صرف اس میں قیام کرتی ہے۔ جسم سے غیر منسلک ایسی روح کے بارے میں یہ تصوّر کرنا مشکل نہیں کہ یہ جسم کی موت کے بعد "کہیں اور" نقل مکانی کر جاتی ہے۔ ہم کسی ایسی خدائی کا تصوّر بھی با آسانی کر سکتے ہیں جو کامل روح ہے، اور پیچیدہ مادے سے اخذ ہونے والی خصوصیت کی بجائے مادے سے علیحدہ وجود رکھتی ہے۔ بچکانہ مقصدیت پسندی مذہب کی جانب ہماری راہ ہموار کر دیتی ہے۔ اگر ہر چیز کسی مقصد کے تحت بنی ہے، تو پھر وہ مقصد کس کا ہے؟ یقیناً خدا کا، اور کس کا؟

تو پھرانسانوں میں پروانے کی روشنی کے قطب نما کی افادیت سے متساوی کیا چیز ہے؟ قدرتی انتخاب نے ہمارے قدیم آباء و اجداد اور ان کی نسلوں کے دماغوں میں ثنویت اور مقصدیت پسندی کو فروغ کیوں دیا ہو گا؟ ابھی تک میرے "فطری ثنویت" کے نظریے نے بس اتنا ہی کہا ہے کہ انسان قدرتی طور پر ثنویت اور مقصدیت پسند ہے۔ لیکن ان سب کا ڈاروینی فائدہ کیا ہے؟ دوسروں کے حرکات کی پیشگوئی کرسکنا ہماری بقاء کے لئے بہت اہم ہے، اور ہماری یہ توقع بجا تھی کہ یہ قدرتی انتخاب ہمارے دماغوں کو یہ کام بہت تیزی اور مہارت سے کرنے کے قابل بنائے۔ کیا ثنویت اور مقصدیت اس سلسلے میں ہماری کچھ مدد کر

سکتے ہیں؟ ہم اس مفروضے کو ڈینیل ڈینیٹ کے "ارادی موقف" کی روشنی میں شاید بہتر طور سے سمجھ سکیں۔

ڈینیٹ نے مواقف کی ایک بہت مدد گار تین رویا درجہ بندی کی ہے جسے ہم جانوروں، مشینوں اور ایک دوسرے کی حرکات کو سمجھنے اور ان کی پیش گوئی کرنے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں''۔ یہ ہیں طبیعیاتی موقف، ترتیبی موقف، اور ارادی موقف۔ " طبیعیاتی موقف" اصولی طور سے کارآمد تو ہیں، کیونکہ ہر شئے طبیعیات کے اصولوں کی تابع ہے، لیکن حقایق کو سمجھنے کا کام بہت سست روی سے مکمل ہو پاتا ہے۔ جب تک ہم کسی پیچیدہ شئے کے تمام منسلک حصوں کا حساب مکمل کر پاتے ہیں، تب تک اس کے "مستقبل" کو جس کی ہم پیش گوئی کرنا چاہتے ہیں ماضی بنے ہوئے بھی کچھ وقت گزر چکا ہو تا ہے۔ ان اشیاء کے لئے جو واقعی ترتیب شدہ ہیں – جیسے کہ کپڑے دھونے کی مشین – ترتیبی موقف شاید ایک مناسب چور راستہ مہیا کرتا ہے۔ ہم طبیعیات کے مطالعہ کو نظر انداز کرتے ہوئے سیدھے ترتیب کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ ڈینیٹ کہتا ہے:

> الارم والی گھڑی کے محض ظاہری معائنے کی بھی کوئی شخص پیشگوئی کر سکتا ہے کہ الارم کب بجے گا۔ یہ جاننا ضروری نہیں کہ گھڑی چابی والی ہے، بیٹری والی، یا سورج کی روشنی سے چلتی ہے، اور اس کے اندر پیتل کے پہیےاور جواہر کے ذرّات ہیں یا سیلیکون چپ – ہم مان لیتے ہیں کہ گھڑی ترتیب شدہ ہے اور اس کا الارم اس وقت بولے گا جس وقت کے لئے اسے مقرر کیا گیا ہے۔

جاندار چیزیں ترتیب شدہ نہیں ہوتیں، لیکن ڈارون کا قدرتی انتخاب ان کے لئے ترتیبی موقف کا ایک انداز مہیا کر دیتا ہے۔ اگر ہم تا وقت یہ فرض کر لیں کہ دل جسم میں خون کی گردش کے لئے ترتیب دیا گیا ہے، تو اس کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ شہد کی مکھیوں کے بارے میں زمانے کی متفقہ رائے تھی کہ یہ مکھیاں رنگ نہیں دیکھ سکتیں۔ لیکن کارل فان فریش نے اس رائے کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مکھیوں کی رنگ پہچاننے کی صلاحیت پر تحقیق شروع کر دی کیونکہ اس نے یہ فرض کیا کہ پھولوں کے شوخ رنگ ان مکھیوں کو اپنی جانب راغب کرنے کے لئے ہی "ترتیب" دئے گئے ہیں۔ (ترتیب کے گرد اقتباس کے نشان صرف کاذب تخلیق پسندوں کو دور بھگانے کے لئے لگائے گئے ہیں کہ کہیں وہ اس آسٹرین ماہرحیاتیات کو اپنے موقف کا حامی نا گردان دیں)۔ یہاں یہ باور کرانے کی بھی ضرورت نہیں کہ فریش اس ترتیبی موقف کو ڈارونی اصطلاحات میں ڈھالنے کی مکمل صلاحیت رکھتا تھا۔

ارادی موقف ایک اور چور راستہ ہے جو ترتیبی موقف سے بھی ایک ہاتھ آگے ہے۔ کسی بھی ہستی کے لئے نہ صرف یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ وہ ایک خاص مقصد کے لئے ترتیب دی گئی ہے بلکہ یہ بھی مان لیا جاتا ہے کہ یا تو وہ خود عامل (agent) ہے یا اس کے اندر عامل موجود ہے جو ان ارادوں کا مالک ہوتا ہے جو اس ہستی کی حرکات کا تعیّن کرتے ہیں۔ شیر کو دیکھ لینے کے بعد آپ کو اس کی متوقع حرکات کی پیشگوئی میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔ اس کے خلیوں کی طبیعیات اور اس کے اعضاء، پنجوں اور دانتوں کی ترتیب کو ایک طرف رکھ دیجئے۔ وہ آپ کو کھانے کا ارادہ رکھتا ہے اور اپنے اعضاء، پنجوں اور دانتوں کو بھرپور انداز سے بروئے کار لاتے ہوئے اپنے ارادے کو پایا تکمیل تک پہنچائے گا۔ اس کے ارادوں کا اندازہ لگانے کا سب سے تیز راستہ یہی ہے کہ آپ طبیعیات اور حیاتیات کو بھول جائیں اور فی الفور وہاں سے دوڑ لگا دیں۔ ملاحظہ کیجئے، کہ جس طرح ترتیبی موقف غیر ترتیب شدہ چیزوں پر اتنا ہی کار فرما تھا جتنا ترتیب شدہ چیزوں پر، اسی طرح ارادی موقف ان چیزوں پر بھی اتنا کار فرما ہے جن میں دانستہ باہوش ارادہ (deliberate conscious intention) موجود ہے جتنا ان چیزوں میں جن میں یہ ارادہ موجود نہیں ہے۔

مجھے ارادی موقف میں بقائی قدر کی موجودگی بالکل قرین قیاس لگتی ہے ، جو بطور ایک ایسے دماغی نظام کے جو خطرناک حالات اور مشکل سماجی صورتوں میں آپ کی فیصلہ کرنے کی قوت کو نمایاں اور تیز کر دیتاہے ۔ لیکن یہ فوراً واضح نہیں ہو پاتا کہ آیا ثنویت ارادی موقف کے ساتھ لازم و ملزوم ہے یا نہیں۔ میں یہاں اس مسئلے کو آگے نہیں بڑھاؤں گا، لیکن مجھے لگتا ہے یہ بحث کی جاسکتی ہے کہ ذہنوں کا کوئی ایسا نظریہ جو ثنویت کے اصولوں پر استوار ہو ارادی موقف کی پشت پر موجود ہو سکتا ہے – خاص طور پر پیچیدہ سماجی صورت حال میں اور اس سے بھی خاص طور سے کہ جہاں اعلیٰ درجے کی سماجی ارادیت کا عمل دخل ہو۔

ڈینیٹ سہ درجہ (third order) کی ارادیت کا ذکر کرتا ہے (مرد کو یقین تھا کہ عورت کو معلوم ہے کہ وہ اسے چاہتا ہے)، چہار درجہ (عورت کو یہ احساس ہوگیا کہ مرد کو یقین تھا کہ عورت کو معلوم ہے کہ وہ اسے چاہتا ہے)، حتیٰ کہ پانچویں درجہ کی ارادیت بھی (پنڈت نے اندازہ لگا لیا کہ عورت کو یہ

احساس ہو گیا تھا کہ مرد کو یقین تھا کہ عورت کو معلوم ہے کہ وہ اسے چاہتا ہے)۔ اس سے مزید اونچے درجات کی ارادیت غالباً افسانوں کی دنیا تک محدود ہے، جیسے کہ مائیکل فلن نے اپنے مزاحیہ ناول دی ٹن مین (The Tin Men) میں لکھا: 'ننوپولس کو دیکھتے ہوئے، رک جانتا تھا کہ وہ تقریباً یقین سے کہہ سکتا ہے کہ آنا فڈلنگ چائیلڈ کے لئے آنا کے جذبات کو سمجھ سکنے میں فڈلنگ چائیلڈ کی ناکامی کے بارے میں حقارت بھرے جذبات رکھتی تھی، اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ نینا جانتی تھی کہ وہ ننوپولس کی معلومات کے بارے میں جانتی ہے...'۔ لیکن یہ حقیقت کہ ہم افسانے میں دوسرے ذہنوں کے بارے میں قیاس آرائیوں کی ایسی پیچیدگی پر ہنس سکتے ہیں ہمیں اس بارے میں کچھ اہم بات بتاتی ہے کہ ہمارے ذہن حقیقی دنیا میں کام کرنے کے لئے کس طرح سے قدرتی طور پر منتخب کئے گئے ہیں۔

ترتیبی موقف کی طرح ارادی موقف بھی اپنے نچلے درجات میں وقت بچانے کا کام کرتا ہے جو ہماری بقاء کے لئے نہایت ضروری ثابت ہو سکتا ہے۔ نتیجتاً قدرتی انتخاب نے ہمارے دماغ کو یوں تراشہ کہ وہ ارادی موقف کو بطور "چور راستہ" استعمال کرنے کے قابل ہو جائے۔ ہمارے دماغ نے حیاتیاتی سطح پر یہ سیکھ لیا ہے کہ ہم ایسی سب ہستیوں سے ارادیت منسوب کریں جن کی حرکات ہمارے لئے اہمیت رکھتی ہیں۔ یہاں ایک بار پھر پال بلوم تجرباتی ثنویت فراہم کرتا ہے کہ بچوں میں ارادی موقف اختیار کرنے کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ بہت چھوٹے بچّے جب ایک چیز کو کسی دوسری چیز کے پیچھے پیچھے آتاہوا دیکھتے ہیں تو وہ فرض کرتے ہیں کہ وہ ایک ارادی عامل (intentional agent) کو تعقب کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، جس کا اندازہ ہمیں اس حیرانی سے ہوتا ہے جس سے یہ بچّے اس وقت ہمکنار ہوتے ہیں جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ عامل نے تعقب کو ادھورا چھوڑ دیا۔

ترتیبی موقف اور ارادی موقف نہایت فائدہ مند ذہنی ترکیبیں ہیں، اور ان ہستیوں کے بارے میں ایسے اندازے لگا سکنے کے لئے اہم ہیں جن پر ہماری بقاء کا انحصار ہے، جیسے کہ حملہ آور یا ممکنہ جنسی ساتھی۔ لیکندیگر ذہنی ترکیبوں کی طرح، یہ بھی کبھی کبھار غلط سمت میں چل پڑتے ہیں۔ بچّے، اور قدیم انسان موسم، سمندر کی موجوں، یا گرتے ہوئے پتھروں کے ساتھ بھی ارادیت منسلک کر دیتے ہیں۔ ہم سب میں مشینوں کے بارے میں ایسے رجحانات پائے جاتے ہیں، خصوصاً جب وہ مشین عین ضرورت کے وقت کام کرنے سے انکار کر دے۔ ہم میں سے بہت سوں کو وہ دن یاد رہے گا جب باسل فالٹی کی گاڑی اس وقت خراب ہو گئی جب وہ "گورمے نائٹ" کی انتہائی اہم مہم پر روانہ ہونے والا تھا۔ اس نے گاڑی کو خبردار کیا، تین تک گنتی کی، گاڑی سے باہر نکلا، درخت کی ایک ٹہنی توڑی، اور گاڑی کو بے دردی سے پیٹ ڈالا۔ ہم میں سے بیشتر لوگ اس ذہنی کیفیت سے گزر چکے ہیں، اگر گاڑی کے ساتھ نہیں تو کمپیوٹر کے ساتھ تو ضرور۔ جسٹن بارٹ نے ایک اصطلاح ایجاد کی hyperactive agent detection device or HADD، یعنی عامل کو پہچاننے کا تیز اور کارگر آلہ۔ ہم بہت پھرتی سے ایسی جگہوں پر بھی عامل ڈھونڈھ نکالتے ہیں جہاں حقیقت میں کوئی عامل نہیں ہوتا، اور ہمیں وہاں بھی عداوت یا عنایت کا شک گزرتا ہے جہاں قدرت محض لا تعلقی برت رہی ہوتی ہے۔ میں بھی کبھی اپنے آپ کو اپنی سائیکل کی چین جیسی بے ضرر بے جان چیزسے شدید نفرت کرتا ہوا پاتا ہوں۔ حال ہی میں ایک آدمی کے بارے میں خبر چھپی تھی جو فٹزویلیم میوزیم میں اپنے جوتے کے تسمے میں پاؤں کے الجھنے کی وجہ سے سیڑھیوں سے لڑھکتا ہو انیچے آیا اور چین کے قنگ دور کی تین نادر اور بیش قیمت صراحیوں سے ٹکرایا، جو پاش پاش ہو گئیں: 'وہ صراحیوں کے عین بیچ میں آ گرا اور صراحیاں ہزاروں ٹکڑوں میں بکھر گئیں۔ جس وقت عجائب گھر کا عملہ وہاں پہنچا تو وہ ان ٹکڑوں کے بیچ میں ہی بیٹھا ہوا تھا۔ سب اس کے ارد گرد سکتے کی حالت میں خاموش کھڑے تھے۔ وہ شخص بار بار اپنے تسمے کی جانب اشارہ کرتا جاتا اور کہتا جاتا: یہ! یہی ہے آپ کا قصور وار[۴۸]'"۔

ہنڈ، شرمر، بوئر، ایٹرین، بلوم، ڈینیٹ، کیلمین اور دیگر مفکرین نے ضمنی پیداوار سے منسلک مذہب کی مزید توجیہات پیش کی ہیں۔ خاص طور سے ڈینیٹ نے ایک بہت ہی دلچسپ امکان کا ذکر کیا ہے کہ مذہب کی نامعقولیت ہمارے دماغ کی ایک خاص اندرونی نامعقولیت کی ضمنی پیداوار ہے: ہماری محبت میں گرفتار ہو جانے کی جبلّت، جس کے مبیّنہ جینیاتی فوائد ہیں۔

ماہر بشریات ہیلین فشر نے "ہم محبت کیوں کرتے ہیں —Why We Fall in Love" میں نہایت خوبصورتی سے رومانوی محبت کی دیوانگی کا ذکر کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ یہ جذبہ محض افزائش نسل کی ضرورت کے مقابلے میں کس قدر اضافیت کا شکار ہے۔ آیئے اس بات کا جائزہ لیتے ہیں۔ مرد کے نقطہ نظر سے اس بات کاامکان نہیں ہے کہ اس کی جان پہچان کی عورتوں میں سے کوئی ایک عورت ایسی ہو گی جو اسے قریب ترین حریف سے ۱۰۰ گنا زیادہ قابل محبت ہو گی۔ لیکن جب وہ اس کی "محبت میں گرفتار" ہو گا تو ایسے ہی الفاظ میں یاد کرے گا۔ مقابل جنس کے بہت سے ممبران سے بیک وقت محبت کرنا (جیسے ہم ایک سے زیادہ قسم کی شراب، موسیقار، گاڑی کتاب یا کھیل کو بیک وقت پسند کر سکتے ہیں) جنونی یک زوجگی عقیدت، جس کے زیر اثر ہم سب رہتے ہیں کے مقابلے میں بظاہر ایک زیادہ منطقی فعل نظر آتا ہے۔ ہم بخوشی اعتراف کرتے ہیں کہ ہم ایک سے زیادہ اولاد، والد، بہن ، بھائی، استاد، دوست یا پالتو جانورسے پیار

کر سکتے ہیں۔ اگر ہم ایسے سوچیں تو کیا ایک زوج یا زوجہ سے بلا شرکت والہانہ محبت سے منسوب امیدیں عجیب نہیں لگتیں؟ لیکن ہم یہی امیدیں لگاتے بھی ہیں اور ان کو پورا کرنے کے لئے تگ و دو بھی کرتے ہیں۔ آخر اس کی کوئی تو وجہ ہو گی۔

ہیلین فشر اور دیگر سائنسدانوں نے ہمیں دکھایا کہ محبت کے تجربے کے ساتھ دماغ کی کچھ مخصوص حالتیں منسوب ہیں، جن میں عصبی طور سے فعال کیمیکل (در حقیقت ہماری قدرتی منشیات) کی موجودگی بھی شامل ہے جو بہت خاص ہیں اور صرف اسی ذہنی حالت میں پائے جاتے ہیں۔ ارتقائی نفسیات کے ماہر فیشر سے متفق ہیں کہ یہ غیر منطق "پہلی نظر کی محبت" والدین کے جوڑے میں وفاداری کو یقینی بناتا ہے، جو کم از کم اتنی دیر تو جاری رہ سکے کہ کامیابی سے بچے کی افزائش مکمل ہو سکے۔ ڈارونی نقطہ نگاہ سے یقیناً مناسب ساتھی کا انتخاب بیشتر وجوہات کی بنا پر ایک اہم فیصلہ ہے۔ لیکن انتخاب کر لینے کے بعد – خواہ وہ برا ہی کیوں نہ ہو – اور اس کے نتیجے میں اولاد کے ہو جانے کے بعد، اپنے فیصلے کے ساتھ دیانت داری کرنا بہت ضروری ہو جاتا ہے، کم از کم اس وقت تک جب تک بچہ خود اپنا دفاع کرنے کے قابل نہ ہو جائے۔

کیا غیر منطقی مذہب ان غیر منطقیت کی ترکیبات کا ایک ضمنی پیداوار ہو سکتا ہے جو قدرتی انتخاب نے انسان کے دماغ میں اوائل میں صرف محبت میں پڑنے کے لئے بنائی تھی؟ یقیناً مذہبی عقیدت کے خد و خال محبت میں گرفتار ہونے سے بہت مماثلت رکھتے ہیں (اور دونوں میں منشیات کے اثرات کی صفات پائی جاتی ہیں )۔ عصبیاتی نفسیات کے ماہر جان سمتھیز ہمیں متنبہ کرتے ہیں کہ ان دو طرح کے جنون میں دماغ کے جو حصے زیر عمل لائے جاتے ہیں ان میں اہم فرق موجود ہیں۔ اس کے باوجود وہ کئی مماثلتیں بھی گنواتا ہے:

> مذہب کے بہت سے چہروں کا ایک پہلو وہ والہانہ محبت ہے جو صرف ایک واحد غیر مجسم ہستی یعنی خدا پر مرکوز ہوتی ہے اور جو اپنے ساتھ اس ہستی کی شبیہوں کی تعظیم بھی لاتی ہے۔ انسانی زندگی زیادہ تر ہمارے خود غرض جین ،اور تقویت مہیا کرنے کے طریقہ کار کی مرہون منت ہے۔ مذہب سے ہمیں بے پناہ تقویت ملتی ہے: ایک خطرناک دنیا میں چاہے جانے اور محفوظ ہونے کے آرام دہ اور پر سکون جذبات، موت کے خوف سے آزادی، مشکل وقت میں دعا مانگنے پر مدد کا حاصل ہو جانا وغیرہ۔ اسی طرح، کسی دوسرے (عموماً مقابل جنس کے شخص) حقیقی شخص کے لئے رومانوی محبت کا جذبہ اسی شدید توجہ کا مظہر ہوتا ہے۔ یہ جذبہ "دوسرے" کی شبیہوں، جیسے کے خطوط، تصاویر اور، وکٹورین زمانے میں، بالوں کے لچھے سے، بیدار کیا جا سکتاہے۔ محبت کی حالت کے بہت سے جسمانی لوازمات بھی ہیں، جیسے بھٹّی کی طرح ٹھنڈی آہیں بھرنا[9]۔

میں نے ۱۹۹۳ میں محبت اور مذہب کا تقابلی جائزہ کیا، جس کے دوران میں نے یہ مشاہدہ کیا کہ مذہب کے مرض میں مبتلا انسان کچھ ویسی ہی علامات کا مظاہرہ کرتا ہے جیسے کوئی جنسی محبت میں مبتلا شخص کرتا ہے۔ یہ ایک بہت طاقتور ذہنی قوت ہے اور یہ حیرانی کی بات نہیں کہ اس کا استحصال کرنے کے لئے بڑے طاقتور وائرس پیدا ہو گئے ہیں۔ (یہاں لفظ وائرس مذہب کے استعارہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے؛ میرے ایک مقالے کا نام بھی "ذہن کے وائرس" تھا)۔ آویلا کی سینٹ ٹیریسا کا شہوانی کشف اتنا مشہور زمانہ ہے کہ یہاں اس کی داستان دہرانے کی ضرورت نہیں۔ سنجیدہ اور قدرے کم شہوانی درجے پر فلسفی اینتھونی کینی اس کامل خوشی کی بڑی عمدہ گواہی پیش کرتا ہے جو قلب ماہیّت (transubstantiation) کے راز پر یقین کرنے والوں کا مقدّر ہے۔ اپنے رومن کیتھولک پادری کے منصب پر تقرری کے واقعے کو بیان کرنے کے بعد، جس میں وعظ کے عوامی جشن (celebrating mass) کے دوران جسم پر ہاتھ رکھ کر دعا کرنا بھی شامل تھا، کینی نے ذکر کیا:

> شروع کے چند مہینوں کے اس سرور کا جو وعظ پڑھنے سے حاصل ہوتا تھا۔ جہاں میں کبھی صبح جاگنے میں سستی کیا کرتا تھا، اب بستر سے ہشاش بشاش لپک کر نکلتاہوں، اس عظیم ذمہ داری کے نشے میں مخمور جو مجھے سونپا گیا تھا...

---

میں نے خطرناک منشیات جیرن آئل کو ایک مقالے میں بے نقاب کیا تھا۔ R. Dawkins, 'Gerin Oil', *Free Inquiry* ۲۴: ۱, ۲۰۰۳, ۹–۱۱

> مسیح کے جسم کو چھونے کی چاہ ، پادری کا عیسیٰ کے قرب نے مجھے اپنا گرویدہ کیا ہوا تھا۔ میں تقدیس کی دعا کے بعد اس کے جسم کو عاشق کی نیم گداز آنکھوں سے تکتا رہتا... پادری بننے کے بعد شروع کے وہ دن مجھے احساس تکمیل اور بے انتہا خوشی کے دنوں کے طور پر یاد ہیں؛ ایک بیش قیمت لیکن بہت ہی نازک چیز، جیسے کوئی رمانوی عشق جو ایک بے جوڑ شادی کی وجہ سے پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا ہو۔

ایک ہی شخص کے ساتھ محبت کی بظاہر بے تکی لیکن فائدہ مند عادت روشنی کے قطب نما کی طرف پروانے کے رد عمل کا متبادل ہے۔ یا ہوے (کنواری مریم، عیسیٰ سے منسوب روٹی کے ٹکڑے، یا اللہ) سے محبت اور اس محبت کے نتیجے میں کی جانے والی غیر منطقی حرکات جنسی محبت کے جذبے کی ناکامی کے ضمنی پیداوار ہیں اور پروانے کا شمع کی لو کی طرف اڑنے کے مترادف ہیں۔

ماہر حیاتیات لویس والپرٹ "ناشتہ سے پہلے چھ نا ممکن چیزیں – Six Impossible Things Before Breakfast" میں ایک تجویز پیش کرتا ہے جسے تعمیری غیر منطقیت (constructive irrationality) کے نظریے کی عمومی شکل کہا جا سکتا ہے۔ اس کا مدعا ہے کہ غیر منطقی حد تک شدید عقیدہ ذہنی ناپختگی کے خلاف دفاع کا کام سر انجام دیتا ہے: 'اگر ان عقائد پر شدّت سے اعتماد نہ کیا جاتا جو زندگی بچاتے ہیں تو یہ انسانی اتقاء کے اوائل میں نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ مثال کے طور پر، شکار کرتے وقت یا اوزار تراشتے وقت بار بار اپنا ارادہ بدلتے رہنا ایک غیر مفید حرکت ہوتی'۔ والپرٹ کی بحث کی منطق یہ ہے کہ چند مخصوص حالات میں مستقل مزاجی ارادہ بدلتے رہنے سے بہتر ہے، چاہے نئے شواہد یا استدلال آپ کو فیصلہ تبدیل کرنے کی جانب راغب کر رہے ہوں۔ ایسی صورت میں محبت میں گرفتار ہونے کے عمل کو بآسانی ایک خاص مثال کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ والپرٹ کی غیر منطقی استقامت 'irrational persistence' کو بھی ایک فائدہ مند نفسیاتی رجحان کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے جو مذہب سے منسلک غیر منطقی حرکات کے کئی اہم پہلوؤں کی توجیہہ فراہم کرتا ہے: یہ ایک اور ضمنی پیداوار ہے !

اپنی دوسری کتاب "معاشرتی ارتقاء–Social Evolution" میں رابرٹ ٹریورز نے ۱۹۷۶ میں پیش کئے گئے خود فریبی کے اپنے ارتقائی نظریے کو مزید واضح کیا۔ خود فریبی یہ ہے :

> سچ کو شعوری ذہن سے چھپانے کا نام ہے، تاکہ اسے کامیابی سے دوسروں سے بھی چھپایا جا سکے۔ ہم بنی نوع انسان میں مکّار نگاہوں، پسینے والی ہتھیلیوں، اور اٹکتی ہوئی آواز جیسی علامات کی مدد سے اس ذہنی دباؤ کی نشاندہی کر پاتے ہیں جو دانستہ فریب کی کوشش کے علم کے نتیجے میں ظاہر ہوتا ہے۔ اپنے ہی فریب سے غافل ہو جانے کی وجہ سے فریب دینے والا ان علامات کو دیکھنے والے کی نظر سے چھپا پاتا ہے۔ پھر وہ گھبرائے بغیر کامیابی سے جھوٹ بول لیتا ہے۔

ماہر بشریات لیونل ٹائیگر بھی "رجایئت : امید کی حیاتایت –Optimism: The Biology of Hope" میں کچھ اسی قسم کی بات کرتا ہے۔ جس تعمیری غیر منطقیت (constructive irrationality) کے بارے میں ہم اوپر بحث کر رہے تھے، وہ ادراکی دفاع (perceptual defence) کے بارے میں اس پیرائے میں بھی نظر آتا ہے:

> انسانوں میں ایک فطری جبلّت موجود ہے کہ ہم وہی دیکھتے ہیں جو ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہمیں حقیقتاً منفی مفہوم دیکھنے میں دقت ہوتی ہے جبکہ مثبت مفہوم ہم بہ آسانی دیکھ پاتے ہیں۔ مثلاً، ایسے الفاظ کے قابل فہم ہونے کے لئے ہمیں پہلے مزید تراش خراش کی ضرورت پڑتی ہے، جو تشویش پیدا کرتے ہوں، خواہ وہ فرد کی ذاتی زندگی کی وجہ سے ہوں یا تجرباتی ساز باز کا نتیجہ ہوں۔

مذہب کی درج بالا خوش فہمیوں سے متعلق مزید وضاحت درکار نہیں ہے۔

میں یہاں "مذہب بطور حادثاتی ضمنی پیداوار" یعنی کسی فائدہ مند عمل کی ناکامی کے عمومی نظریے کی وکالت کرنا چاہتا ہوں۔ تفصیلات بے شمار، پیچیدہ اور متنازعہ بھی ہیں۔ بیان کے تسلسل کی خاطر میں "معصوم بچّے" کے نظریے کا استعمال "ضمنی پیداوارات" کے نظریات کے نمائندہ نظریے کے طور پر جاری رکھوں گا۔ یہ نظریہ کہ بچّوں کے ذہن "ذہنی وائرس" کے حملوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، قارئین کو نامکمل لگے گا۔ یہ ذہن غیر محفوظ ہی سہی، لیکن یہ کسی ایک ہی قسم کے وائرس کی زد میں کیوں آ جاتے ہیں، کسی دوسری قسم کی زد میں کیوں نہیں؟ کیا کچھ وائرس غیر محفوظ ذہنوں پر حملہ کرنے کی کوئی خاص قابلیت رکھتے ہیں؟ یہ 'بیماری' مذہب کی صورت میں کیوں رو نما ہوتی ہے، کسی اور صورت میں کیوں نہیں؟ مگر کس دوسری صورت میں؟ میں جو بات کہنا چاہ رہا ہوں اس کا جزوی مطلب تو یہ ہے کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ بچّے کے دماغ پر کس قسم کی حماقت خیزی کا حملہ ہوتا ہے۔ بس ایک بار اگر بیمار ہو گیا، تو بڑے ہو کر یہ بچّہ اپنی اگلی نسل کو بھی ایسے ہی بیمار کرے گا، خواہ اس کی پسندیدہ حماقت کوئی بھی ہو۔

فریزر کی "سنہری ٹہنی–The Golden Bough" جیسے بشری مطالعاتی جائزے ہمیں انسان کے غیر منطقی عقائد کی تنوّع سے بہت مرعوب کرتے ہیں۔ کسی تہذیب میں رچ بس جانے کے بعد یہ بالکل حیاتیاتی عمل ارتقاء کے انداز میں پھلتے پھولتے اور شاخیں بناتے ہیں۔ اس کے باوجود فریزر چند بنیادی اصول اخذ کرتا ہے، مثلاً علاج بالمثل (ہومیوپیتھی) کے "جادو" کے بارے میں، جہاں ورد اور منتر کے ذریعے حقیقی دنیا کی کسی چیز کا کوئی پہلو مستعار لے لیا جاتا ہے تاکہ اس چیز پر اثر انداز ہوا جا سکے۔ اس کی ایک المناک مثال یہ عقیدہ ہے کہ گینڈے کے سینگھ کا غازہ "مردانہ طاقت" میں اضافہ کرتا ہے۔ اپنی حقیقت میں یہ احمقانہ عقیدہ گینڈے کے سینگھ کی صحت مند مردانہ عضو تناسل سے مماثلت کی وجہ سے وجود میں آیا ہے۔ علاج بالمثل کے جادو کی ہمہ گیر مقبولیت اس امر کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ یہ حماقت خیزی جو کمزور ذہنوں پر اثر انداز ہوتی ہے کلی طور سے بے ترتیب، صوابدیدی حماقت نہیں ہوتی۔

حیاتیاتی تقابل کو اس حد تک لے جانا جہاں ہمیں قدرتی انتخاب کی کار فرمائی کا گمان ہونے لگے، ایک بڑا دلچسپ خیال ہے۔ کیا کچھ عقائد دوسرے عقائد کے مقابلے میں کسی فطری خوبی یا گن کی بدولت زیادہ قابل تشہیر ہیں، یا موجودہ نفسیاتی رجحانات سے مطابقت رکھتے ہیں، اور کیا یہ مذاہب کی قدرت اور صفات کی اسی طرح وضاحت پیش کر سکتے ہیں جیسے ہم عالم حیات میں قدرتی انتخاب کی بنیاد پر پیش کی جاتی ہیں؟ یہاں یہ بات سمجھنا نہایت اہم ہے کہ "خوبی" کا مطلب محض بقاء اور افزائش کی قابلیت ہے۔ یہاں کسی قسم کی قدر کا فیصلہ صادر کرنا مقصود نہیں، جس پر ہم اپنے مخصوص انسانی انداز میں فخر کر سکیں۔

قدرتی انتخاب کی موجودگی ارتقائی سطح پر بھی واجب نہیں ہے۔ ماہرین حیاتیات اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ کسی جین کا ایک آبادی میں کامیابی سے پھیل سکنے کے لئے اس کا اچھا ہونا ضروری نہیں؛ صرف اتنی شرط کافی ہے کہ وہ خوش قسمت ہو۔ ہم اسے خلقی بہاؤ (genetic drift) کہتے ہیں۔ خلقی بہاؤ قدرتی انتخاب کے لئے کتنا اہم ہے ایک علیحدہ بحث طلب مسئلہ ہے۔ لیکن اب یہ سالماتی خلقیات (molecular genetics) کے غیر جانب دار نظریے کے طور پر قبول کی جاتی ہے۔ اگر ایک جین تبدّل پزیر (mutate) ہو کر اپنے ہی کسی دوسری شکل میں سامنے آتا ہے جس کا وہی اثر ہے تو دونوں شکلوں میں تفریق غیر جانبدار ہو گی اور قدرتی انتخاب کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت نہیں دے گا۔ اس کے باوجود، نسل در نسل اس عمل کی وجہ سے جسے ماہرین شماریات نمونہ جات کی غلطیاں (sampling errors) کہتے ہیں، نئی تبدّل پزیر قسم پرانی قسم کو بلآخر جینیاتی تالاب (genepool) سے بے دخل کر دیتی ہے۔ یہ سالماتی درجے پر ایک حقیقی تبدیلی ہے (اگرچہ جامع اجسام کی دنیا میں آپ کو کوئی تبدیلی رونما ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی)۔ یہ ایک غیر جانبدار ارتقائی تبدیلی ہے جو کسی انتخابی فائدے کی مرہون منّت نہیں۔

جینیاتی بہاؤ کا تمدّنی متبادل ایک قائل کر دینے والی پسند ہے، جسے ہم مذہب کے ارتقاء کے بارے میں سوچتے ہوئے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ زبان بظاہر حیاتیاتی انداز سے ارتقاء پزیر ہوتی ہے اور اس کے ارتقاء کا سفر دیکھنے میں بے ترتیب بہاؤ (random drift) کی طرح بے سمت لگتا ہے۔ یہ ہمیں جینیات (genetics) کے تمدنی متبادل کے طور پر ودیعت ہوتا ہے، جو صدیوں کے عرصے میں آہستگی سے تبدیل ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس کے مختلف دھارے ایک دوسرے کے لئے مکمل طور پر نا قابل فہم ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ زبان کا ارتقاء کسی قسم کے قدرتی انتخاب کی بنا پر ہی ہوتا ہو، لیکن بحث کا یہ زاویہ بہت معقول نہیں لگتا۔ میں ذیل میں واضح کرنے کی کوشش کروں گا کہ زبان کی تاریخ میں ایسے ہی اہم رجحان کی تجویز بار ہا پیش کی جائے، جیسے کہ حرف علّت کی عظیم تبدیلی (Great Vowel Shift) جو انگریزی زبان میں پندرھویں سے اٹھارویں صدی کے درمیان عمل میں آئی۔ لیکن ہمارے زیادہ تر مشاہدات کو سمجھنے کے لئے ایسے فعال نظریے کی کوئی خاص ضرورت نہیں پڑتی۔ اس بات کا واضح امکان موجود ہے کہ زبان عموماً بے ترتیب خلقی بہاؤ کے کسی

تہذیبی متبادل کی مدد سے ارتقاء کے مراحل طے کرتی ہے۔ لاطینی زبان یورپ کے مختلف حصوں میں بے ترتیبی سے بہتی ہوئی ہسپانوی، پرتگالی، اطالوی، فرانسیسی، سویٹزرلینڈ کی رومانش اور ان زبانوں کی مختلف ذیلی بولیوں میں تبدیل ہو گئی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ یہ قطعاً واضح نہیں کہ ان ارتقائی تبدیلیوں میں مقامی فوائد یا "انتخابی دباؤ" کا کوئی عمل دخل ہے۔

میرا اندازہ ہے کہ زبان کی طرح مذہب کا ارتقاء بھی صوابدیدی شروعات کے بعد ایک ایسے بے ترتیب انداز میں ہی ہوتا ہے جو مذہب کے حیران کن اور کبھی کبھی خطرناک تنوّع کو جنم دیتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ، یہ بھی ممکن ہے کہ قدرتی انتخاب کی کوئی قسم انسانی نفسیات کی بنیادی یکسانیت کے ساتھ کام کرتے ہوئے اس امر کو یقینی بناتی ہے کہ انتہائی مختلف مذاہب میں بھی چند اہم عناصر مشترک ہوں۔ مثال کے طور پر، بہت سے مذاہب ہمیں معروضی یا خارجی طور پر نامعقول لیکن نفسی یا داخلی طور پر پرکشش نظریے کا درس دیتے ہیں کہ ہماری شناخت ہماری جسمانی موت کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ دائمی حیات کا یہ نظریہ پنپتا اور پھیلتا ہے کیونکہ یہ ہماری خواہشات کے حاجت رساں کا کام کرتا ہے۔ اور خواہشات کی اہمیت مسلّم ہے، کیونکہ انسانی نفسیات میں عقیدے کو خواہش کا رنگ دینے کا ایک ہمہ گیر رجحان ہے ('تمہاری خواہش نے، ہیری، اس خیال کو جنم دیا' جیسا کہ ہینری چہارم حصہ دوئم نے اپنے بیٹے سے کہا[§§§§§§§§§])۔

اس میں کوئی ابہام نظر نہیں آتا کہ مذہب سے منسلک بہت سی خصوصیات کا واحد مقصد معاشرتی بے ہنگمی میں مذہب اور اس کی خصوصیات کی بقا ہی نظر آتا ہے۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ کسی مذہب اور اس کی خصوصیات کا یہ ملاپ "ذہین ترتیب" کی وجہ سے ہوتا ہے یا قدرتی انتخاب کی وجہ سے۔ جواب یہ ہے کہ شاید دونوں ہی عوامل کار فرما ہوں گے۔ ترتیب کی طرف سے دیکھیں تو مذہبی قائدین الفاظ کی اس شعبدہ بازی کے پوری طرح قائل نظر آتے ہیں جو مذہب کی بقا میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ مارٹن لوتھر کو بخوبی علم تھا کہ استدلال مذہب کا ازلی دشمن ہے۔ وہ اکثر اوقات لوگوں کو اس کے خطرات سے متنبہ کرتا رہتا تھا: 'استدلال مذہب کا سب سے بڑا دشمن ہے؛ وہ کبھی روحانی معاملات میں مدد کے لئے آگے نہیں بڑھا، بلکہ زیادہ تر کلام الٰہی کے خلاف جدوجہد کرتا ہے اور ہر اس چیز کو حقارت کی آنکھ سے دیکھتا ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے'[۸۰]۔ 'جو بھی عیسیٰ کا مذہب اختیار کرنا چاہتا ہے، وہ اپنے استدلال سے لوتھر کی آنکھیں نوچ ڈالے'، اور مزید 'عیسائیوں میں استدلال کا خاتمہ ہونا چاہئے'۔ لوتھر کو مذہب کی بقا کی خاطر نہایت ذہین انداز سے اس کے غیر ذہین عناصر کی ترتیب میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ لیکن اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ لوتھر یا کسی اور نے واقعی اس کو ترتیب دیا ہو گا۔ ممکن ہے مذہب کسی غیر جینیاتی (non-genetic) طرز کے قدرتی انتخاب کے نتیجے میں ہی وجود میں آیا ہو، جس میں لوتھر اس کا ترتیب کار نہیں بلکہ اس کے فوائد کا ایک چالاک شاہد ہو۔

اگرچہ جینز کے روایتی ڈاروینی انتخاب نے ایسے نفسیاتی رجحانات کی حوصلہ افزائی کی جن کے ضمنی پیداوار کے طور پر مذہب کی تخلیق ہوئی، اس بات کا امکان بہت کم ہے کہ مذہب کی تفصیل بھی اسی عمل کے نتیجے میں گڑھی گئی ہو گی۔ میں نے پہلے بھی اشارۃً یہ کہا ہے کہ اگر ہمیں ان تفاصیل پر کسی قسم کے نظریہ انتخاب کا اطلاق کرنا ہے تو ہمیں سبو جینز (genes) کی طرف نہیں بلکہ ان کے تہذیبی مترادف، یعنی تمدنی معلومات کی اکائی "میم" (memes) کی طرف دیکھنا چاہئے۔

## آہستہ چلئے، کیونکہ آپ میرے "ثقافتی عدد" پر چل رہے ہیں

## Tread Softly; Because you Tread on my Memes

"مذہبی زاویہ نظر سے سچ محض وہ رائے ہے جو باقی بچ جاتی ہے"۔ آسکر وائیلڈ

یہ باب اس مشاہدے سے شروع ہوا تھا کہ ڈاروینی قدرتی انتخاب زیاں سے نفرت کرتا ہے، لہٰذا کسی بھی نوع کا کوئی ہمہ گیر عنصر- جیسے کہ مذہب- اس نوع کے لئے فائدہ مند رہا ہو گا ورنہ وہ ختم ہو جاتا۔ لیکن میں نے اشارۃً یہ بھی کہا تھا ضروری نہیں کہ اس فائدے کا مقصد اس نوع کی بقا یا افزائش نسل ہی رہا ہو۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا، زکام[**********] کے وائرس کے جین کی بقاء کی قابلیت بنی نوع انسان کو جس تکلیف میں ڈالتی ہے اس کا انسان کو کوئی فائدہ نہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ جین ہی ہو جس کو فائدہ ہو رہا ہو۔ اس منطق کا اطلاق کسی بھی ایسی چیز پر کیا جاسکتا ہے جو ازخود اپنی نقول پیدا کرنے کے

---

[§§§§§§§§§] لطیفہ میرا نہیں، And All That ۱۰٦٦ سے مستعار لیا گیا ہے۔

[**********] خاص طور پر میری قوم، اس دقیانوسی قصے کے مطابق: "یہاں ہے ایک انگریز، اپنے عادی زکام کے ساتھ"! یہ ایف ایس پیرسن کی Fractured French سے لیا گیا ہے۔

قابل ہو(نقال یا replicator)۔ ہم جینز کی مثال صرف اس لئے استعمال کرتے ہیں کہ ان کی یہ صفت سب سے واضح ہے۔ اسی رتبے کے دو دیگر امیدوار کمپیوٹر وائرس اور "ثقافتی عدد–meme" یا ثقافتی میراث کی اکائیاں ہیں۔ باب کا یہ حصہ ثقافتی عدد کے موضوع پر مشتمل ہے۔ اگر ہمیں ثقافتی عدد کو سمجھنا ہے تو پہلے ہمیں قدرتی انتخاب کے عمل پر تفصیلی غور و خوض کرنا ہو گا۔

اپنی سادہ ترین شکل میں، قدرتی انتخاب کو متبادل "نقالوں" میں سے کسی ایک کو چننا پڑتا ہے۔ یہ "نقال" code کی شکل میں موجود معلومات کا ایک ٹکڑا ہوتے ہیں جو اپنی مکمل نقل بنا سکتے ہیں، لیکن جن میں نقل کے عمل کے دوران کبھی کبھار تھوڑی بہت غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ یہاں ہمارا مدعا ڈارونی ہے۔ جن نقالوں کو اپنی مکمل طور پر صحیح نقول بنانے میں مہارت ہوتی ہے ان کی آبادی میں اضافہ ہو جاتا ہے، جبکہ زیادہ غلطیاں کرنے والے نقالوں کی آبادی بتدریج گھٹتی جاتی ہے۔ اپنی بنیادی شکل میں قدرتی انتخاب بس یہی ہے۔ جین مثالی نقال ہے: وہ DNA کا ایک لمبا دھاگا ہے جس کی انگنت نسلوں میں نقول بنتی چلی جاتی ہیں جو بالعموم شدید حد تک سچی نقول ہوتی ہیں۔ ثقافتی عدد کے بارے میں مرکزی سوال یہ ہے کہ کیا ثقافتی نقالی کے ایسے اعداد موجود ہیں جو سچّے نقالوں کی طرح کام کریں جیسے جین کرتے ہیں۔ میں اس بات پر اسرار نہیں کررہا کہ ثقافتی عدد ضروری طور پر جین کے ثقافتی متبادل ہی ہیں، بلکہ صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ ان کی خصوصیات جینزسے جتنی زیادہ ملتی جلتی ہوں گی اتنا ہی میرا نظریہ بہتر کام کر سکے گا؛ اور اس باب کا مقصد یہ سوال اٹھانا ہے کہ کیا ثقافتی اعداد کے نظریے کو مذہب کے مخصوص معاملے کو سمجھنے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔

جینز کی دنیا میں اتفاقیہ نقائص اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ جنیز کے مجموعہ میں کسی بھی جین کی متبادل شکلیں، جنہیں ایلیل (allele) کہا جاتا ہے ، بیک وقت موجود اور ایک دوسرے کے مقابل رہتی ہیں۔ مقابلہ کس لئے؟مقابلہ صبغیہ (chromosome) کی اس مخصوص جگہ کے لئے جو تمام مقابل ایلیل کے گروہ کے لئے مختص ہے۔ اور یہ مقابلہ کیسے کیا جاتا ہے؟ سالمے سے سالمے کی براہ راست لڑائی کرا کر نہیں بلکہ اس کے "نائب" کولڑوا کر۔ یہ نائب شکل نوع کے خصائص (phenotypic traits) ہیں، جیسے کہ ٹانگ کی لمبائی یا بالوں کا رنگ: جینز کے مظہر جو ہمیں جسمانی ساخت، اعضاء، حیاتیاتی کیمیا، یا رویے میں نظر آتے ہیں۔ جین کی قسمت اس جسم سے بندھی ہوتی ہے جس میں وہ جا کے بیٹھ جاتا ہے۔ وہ اپنی بقاء کا اس حد تک ہی انتظام کر پاتا ہے جس حد تک وہ اس جسم پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ جیسے جیسے نسلیں گزرتی جاتی ہیں، اجتماع میں جینز کی تعداد ان کے نائب کی کامیابی یا ناکامی کے مطابق بڑھتی یا گھٹتی رہتی ہے۔

کیا ثقافتی عدد کے بارے میں بھی ایسا ہی کہا جاسکتا ہے؟ ایک انداز سے تو یہ بالکل جینز کی طرح نہیں ہیں کیونکہ ان میں صبغیہ، جینیاتی نشان ، ایلیل یا جنسی افزائش نہیں ہے۔ ثقافتی عدد کا تالاب (memepool)جینز کے تالاب کے مقابلے میں کسی قدر کم منظم ہے۔ اس کے باوجود ثقافتی عدد کے بارے میں بات کرنا قطعی حماقت خیز نہیں، جس میں مخصوص ثقافتی عدد ایسے تعداد (frequency) کے مالک ہوں جو متبادل ثقافتی عدد کے ساتھ مقابلے کے نتیجے میں تبدیلی کے قابل ہو۔

کچھ لوگوں نے ثقافتی عدد پر مبنی وضاحتوں پر اعتراضات اٹھائے ہیں جو زیادہ تر اس بنیاد پر کئے جاتے ہیں کہ ثقافتی عدد مکمل طور پر جینز کی طرح نہیں ہوتے۔ آج ہم جین کی طبعی شکل کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں (یہ DNA کا ایک تواتر ہیں)؛ لیکن ثقافتی عدد بالکل مختلف ہیں۔ اور ثقافتی عدد کے ماہرین طبعی راستوں کے رد و بدل سے ایک دوسرے کو بھی شش و پنج میں ڈالے رکھتے ہیں۔ کیا ثقافتی عدد صرف دماغ میں ہی موجود ہوتے ہیں یا کسی کاغذ پر چھپی ہوئی الیکٹرانک نقل بھی ایک ثقافتی عدد شمار ہونے کا حق رکھتی ہے؟ پھر یہ بھی کہ جین بہت ایمان داری سے اپنی نقول بناتے ہیں جبکہ ثقافتی عدد اگر اپنی نقل بنائیں بھی تو بہت کم درستگی سے بنا پاتے ہیں۔

ثقافتی عدد سے منسلک ان مشکلات کو لے کر رائی کا پہاڑ بنا دیا گیا ہے۔ سب سے اہم اعتراض یہ ہے کہ ثقافتی عدد کی نقل بنانے کی قابلیت اتنی کمزور ہوتی ہے کہ انہیں ڈارونی نقال قرار دینا مناسب نہیں۔ اس شک کا اظہار کیا جاتا ہے کہ اگر ہر نسل میں تبدیلی کی رفتار اتنی تیز رہے تو ڈارونی انتخاب اس کے تعدد پر اثر انداز ہو پانے سے پہلے ہی ثقافتی عدد خود اپنا وجود مٹا چکا ہو گا۔ لیکن یہ مسئلہ محض ایک وہم ہے۔ ایک استاد بڑھئی، یا زمانہ قدیم میں ایک چقماق توڑنے والے کا تصوّر کیجئے، جو اپنے ایک شاگرد کو ہنر دکھانا چاہتا ہے۔ اگر شاگرد دیانتداری سے استاد کے ہاتھ کی ہر جنبش کی نقل کر لے تو استاد اور شاگرد کے رشتے کا ثقافتی عدد کچھ ہی نسلوں میں اتنی بار تبدیل ہو گا کہ پہچانا نہیں جائے گا۔ لیکن شاگرد دیانتداری سے استاد کے ہاتھ کی ہر جنبش کی نقل نہیں کرتا۔ ایسا کرنا بے تکا ہو گا۔ اس کی بجائے وہ اس مقصد پر توجّہ دیتا ہے جو استاد حاصل کرنا چاہتا ہے، اور اس مقصد کی نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چاہے ہتھوڑے کے کتنے ہی وار کیوں نہ کرنے پڑیں، کیل کو اس حد تک اندر گھساؤ جہاں تک کہ اس کا سر لکڑی کے برابر ہو جائے؛ شاید واروں کی تعداد استاد کے واروں کی تعداد کے برابر نہ ہو۔ اس قسم کے اصول تبدیلی کی ان گنت نسلوں سے گزرتے ہوئے بھی اپنی اصلی حالت میں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں؛ اس سے کوئی فرق

نہیں پڑتا کہ ان اصولوں کے عمل درآمد کی تفصیلات ہر فرد میں مختلف ہو سکتی ہیں۔ کپڑے کی سلائی، رسّی یا مچھیرے کے جال کی گانٹھیں، جاپانی کاغذ کو تہہ کرنے کا ہنر (اوریگامی)، لکڑی یا ظروف کے کام میں کارآمد ترکیبیں: ان سب کو ایسے مجرد عناصر کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے جن کو واقعی بغیر تبدیلی کے ان گنت نسلوں تک اپنی نقول بنانے کے مواقع میسر ہیں۔ تفصیلات مخصوص انداز میں بدلتی رہ سکتی ہیں، لیکن جوہر تبدیل ہوئے بغیر تفویض ہو جاتا ہے، اور ثقافتی عدد کو جینز سے مشابہ ثابت کرنے کی یہ خصوصیت کافی ہے۔

سوزن بلیکمور کی کتاب "ثقافتی عدد کی مشین–The Meme Machine" کے دیباچے میں میں نے اوریگامی کا استعمال کرتے ہوئے ایک چینی بحری جہاز بنانے کی مثال پیش کی۔ پیچیدہ ترکیب میں ۳۲ بار مختلف تہیں بٹھائی جاتی ہیں۔ آخری نتیجہ، وہ قدیم چینی بحری جہاز ایک دلکش شے ہے، اور اس کے تین درمیانی مراحل ، یعنی بادبانی کشتی، دو ڈھکنوں والی ڈبیہ، اور تصویر کا فریم بھی اتنے ہی دلکش ہیں۔ یہ پورا عمل مجھے ان تہوں اور انغماد (غلاف میں ڈالنا) کے مراحل کی یاد دلاتا ہے جن سے ایک نطفے کی جھلیاں نطفے کے بلاسٹولا سے گلاسٹولا اور نیورولا بنتے ہوئے گزرتی ہیں۔ میں نے قدیم چینی بحری جہاز (Chinese Junk) بنانے کا ہنر اپنے والد سے بچپن میں سیکھا، اور انہوں نے یہ ہنر تقریباً میری ہی عمر میں اپنے اقامتی سکول میں سیکھا تھا– سکول کی دائی (matron) کا شروع کیا ہوا قدیم جہاز بنانے کا یہ جنون خسرے کی وباء کی طرح پورے سکول میں پھیلا، اور خسرے کی وباء کی طرح ہی کچھ عرصے بعد ختم بھی ہو گیا۔ چھبیس سال بعد، جب کہ وہ دائی کب کی فوت ہو چکی تھی، میرا داخلہ بھی اسی سکول میں کروا دیا گیا۔ میں نے اس جنون کو دوبارہ متعارف کروا دیا، اور ایک بار پھر خسرے کی وبا کی طرح وہ پھر سے پھیلا، اور پھر سے ختم ہو گیا۔ ایک سکھائے جا سکنے والے ہنر کا یوں وبا کی طرح پھیلنا ہمیں ثقافتی عدد کی ترویج کی ایمانداری کے بارے میں ایک اہم بات بتاتا ہے۔ ہم اس بات پر پورا اعتماد کر سکتے ہیں کہ ۱۹۲۰ کی دہائی میں میرے والد کی نسل کے بنائے گئے قدیم جہازوں اور ۱۹۵۰ کی دہائی میں میری نسل کے ہاتھوں بننے والے قدیم جہازوں میں کوئی فرق نہیں ہو گا۔

ہم ایک تجربے کے ذریعے اس عمل کی منظم تفتیش کر سکتے ہیں: بچپن کے کھیل "کانا پھوسی" کی ایک طرز (انگریز اسے Chinese Whisper کہتے ہیں اور امریکی بچّے اسے Telephone کہتے ہیں)۔ ایسے ۲۰۰ لوگوں کو جمع کیجئے جنہوں نے پہلے کبھی قدیم چینی بحری جہاز نہیں بنایا، اور پھر انہیں دس دس لوگوں کے بیس گروہوں میں بانٹ دیجئے۔ اب ہر گروہ کے سربراہ کو ایک میز پر جمع کر لیں اور انہیں مظاہرے کے ذریعے قدیم چینی بحری جہاز بنانے کی تربیت دیں۔ اب ہر سربراہ کو اپنے گروہ کے پاس بھیجئے جہاں وہ اپنے ایک نائب کو تخلیہ میں مظاہرے کے ذریعے قدیم جہاز بنانے کی تربیت دے۔ اسی طرح یہ 'دوسری' نسل ایک تیسرے شخص کو قدیم جہاز بنانے کی تربیت دے، اور یہ سلسلہ دسویں شخص تک جاری رہے۔ تمام قدیم جہازوں کو محفوظ رکھئے اور ان کو گروہ کے نام اور نسل کے نمبر کے مطابق سرنامہ (label) لگایئے، تاکہ ان کا بعد میں معائنہ کیا جا سکے۔

میں نے آج تک ایسا تجربہ تو نہیں کیا (میری خواہش ہے کہ میں ایسا تجربہ کر سکوں)، لیکن میں بڑے اعتماد سے نتیجے کی پیشگوئی کر سکتا ہوں۔ میں پیشگوئی کرتا ہوں کہ بیسوں قدیم جہاز بنانے کی قابلیت کو دسویں نسل تک کامیابی سے منتقل نہیں کر پائیں گے۔ کچھ گروہوں میں غلطیاں سرزد ہوں گی: شاید سلسلے کی کوئی کمزور کڑی کسی اہم مرحلے کو بھول جائے گی، جس کی وجہ سے ظاہر ہے کہ بعد کی تمام نسلیں ناکام ہو جائیں گی۔ شاید گروہ نمبر ۴ بادبانی کشتی تو بنا لے گا لیکن قدیم جہاز نہیں بنا سکے گا۔ شاید گروہ نمبر ۱۳ کا آٹھواں فرد دو ڈھکنوں والی ڈبیہ اور تصویر کے فریم کے مرحلوں کے درمیان کہیں تبدیلی کر جائے گا اور فرد نمبر ۹ اور ۱۰ من و عن اس غلطی کی نقل کر لے گا۔ اب، ان گروہوں کے لئے جو دسویں نسل تک قابلیت کو منتقل کرنے میں کامیاب رہے، میری ایک الگ پیشگوئی ہے۔ اگر آپ سارے قدیم جہازوں کو نسل کے حساب سے ایک ترتیب میں سجا دیں تو آپ کو نسل کے حساب سے معیار میں کوئی گراوٹ نظر نہیں آئے گی۔ لیکن اس کے برعکس آپ تمام تر شرائط کو برقرار رکھتے ہوئے اسی تجربے کو دہرائیں اوریگامی قابلیت کی نسل در نسل ترویج کی بجائے قدیم جہاز کی تصویر بنانے کی قابلیت کی ترویج کریں، تو یقیناً تصویر نمبر ۱ سے لے کر تصویر نمبر ۱۰ تک معیار میں نسل در نسل بتدریج اور منظم کمی واقع ہو گی۔

تصویر والے تجربے میں تمام نسل نمبر ۱۰ تک کی تصاویر اپنے گروہ کی نسل نمبر ۱ کی تصویر سے کچھ نہ کچھ مشابہت ضرور رکھتی ہوں گی، اور ہر گروہ میں نسل در نسل مشابہت کمزور پڑتی دکھائی دے گی۔ اس کے برعکس تجربے کی اوریگامی والی طرز میں غلطیاں "سب میں یا کہیں نہیں" ہوں گی: یہ "ڈیجیٹل" تبدیلیاں ہوں گی۔ یا تو گروہ کوئی غلطی نہیں کرے گا اور نسل نمبر ۱۰ کا قدیم جہاز نسل نمبر ۵ یا ۱ کے قدیم جہاز سے نہ برا ہو گا نہ بہتر؛ یا کسی ایک نسل میں کوئی تبدیلی رونما ہو جائے گی اور بعد میں آنے والی تمام نسلوں کی کاوشیں ناکام ہوں گی، اور یہ نسلیں عموماً بڑی دیانتداری سے اس غلطی کی ہی نقل بناتی چلی جائیں گی۔

ان دو قابلیتوں میں اہم فرق کیا ہے؟ فرق یہ ہے کہ اوریگامی کی قابلیت مجرّد اعمال (discrete actions) کے ایک تسلسل پر مشتمل ہے ، جن

میں سے کسی کو بھی اپنے آپ میں کرنا مشکل نہیں۔ زیادہ تر اعمال اس نوعیت کے ہیں، جیسے کہ "دونوں طرفین کو درمیان کی طرف تہ لگائیں "۔ گروہ کا کوئی فرد اس عمل کو غلط طریقے سے بھی کر سکتا ہے، لیکن بعد کی نسلوں کو بہر طور معلوم ہو گا کہ اس کی نیت کیا تھی۔ اوریگامی کے زیادہ تر مراحل خود بخود اپنی طبعی حالت پر واپس آنے (self-normalising) کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کی یہ قابلیت ہے جو انہیں ڈیجیٹل بناتی ہے۔ یہ میرے استاد بڑھئی کی طرح ہے، جس کی کیل کو ہتھوڑے کے وار سے تختے کے ساتھ ہموار کرنے کی نیت اس کے شاگرد پر واضح ہے، چاہے ہتھوڑے کے وار کی تفصیلات جو بھی ہوں۔ یا تو آپ اوریگامی کی ترکیب کے کسی مرحلے کو صحیح انداز سے کر پائیں گے، یا نہیں۔ اس کے برعکس، تصویر کشی ایک 'اینالاگ' قابلیت ہے۔ ہر کوئی کوشش کر سکتا ہے، لیکن کچھ لوگ دوسروں کے مقابلے میں بہتر انداز سے نقل بنا پائیں گے، لیکن کوئی بھی کامل نقل نہیں کر پائے گا۔ نقل کا معیار اس بات پر منحصر ہے کہ اس پر کتنا وقت اور دھیان صرف کیا گیا اور یہ مسلسل متغیر (constantly variable) مقداریں ہیں۔ گروہ کے کچھ ممبران نقل کے عمل کے دوران مخلص انداز سے نقل کرنے کی بجائے اس میں 'بہتری' اور 'اضافہ' بھی کر دیں گے۔

الفاظ، کم از کم جب وہ سمجھ آ سکیں، اوریگامی کے عمل کی طرح خود بخود اپنی طبعی حالت پر واپس آ جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کانا پھوسی کے اصلی کھیل میں ایک بچے کے کان میں کوئی کہانی سنائی جاتی ہے یا جملہ بولا جاتا ہے، اور بچے سے کہا جاتا ہے کہ اگلے بچے کو وہی کہانی یا جملہ کان میں سنا دے۔ اگر جملہ سات الفاظ سے کم کا ہے اور بچوں کی مادری زبان میں ہے تو قوی امکان ہے کہ وہ دسویں نسل تک اپنی مکمل حالت میں پہنچ پائے گا۔ اگر جملہ کسی غیر زبان میں ہے، اور بچّے صرف اس کے صوتی اثرات کی نقل کرنے تک محدود ہیں، تو آخری بچے تک جملے کا پیغام باقی نہیں بچ پائے گا۔ نسل در نسل پیغام کا زوال اسی طرز پر ہے جیسے کہ تصاویر کا تھا، اور جملہ بالکل گڈمڈ ہو جائے گا۔ جب پیغام بچّوں کی اپنی زبان میں قابل فہم ہوتا ہے، اور اس میں شکل نوع یا الیل جیسے کوئی انجانے اور مشکل الفاظ نہیں ہوتے، تو وہ کامیابی سے منتقل ہو جاتا ہے۔ لفظ کے صوتی اثر کی نقل کرنے کی بجائے، ہر بچّہ ہر لفظ کو ایک محدود ذخیرہ الفاظ کے حصے کے طور پر پہچانتا ہے اور اسی لفظ کا انتخاب بھی کرتا ہے، اگرچہ اگلے بچّے کو وہ لفظ منتقل کرتے ہوئے ادائیگی میں کچھ رد و بدل ہو سکتا ہے۔ تحریر شدہ الفاظ بھی اپنی طبعی حالت پر لوٹ جانے کی قابلیت رکھتے ہیں کیونکہ کاغذ پر بنائے گئے آڑے ترچھے نشان اپنی تفصیل میں کتنے بھی مختلف کیوں نہ ہو جائیں، حروف تہجی کی محدود فہرست سے ہی لئے جاتے ہیں۔

طبعی حالت پر لوٹ جانے والی عملیات کی بدولت ثقافتی عدد کا کبھی کبھار مخلصی کا مظاہرہ کرنا ان عام ترین اعتراضات کا جواب دینے کے لئے کافی ہے جو جین اور ثقافتی عدد کے تقابل کے دوران کئے جاتے ہیں۔ بہر طور، ثقافتی عدد کے نظریے کا بنیادی مقصد تہذیب کا ایک سیر حاصل نظریہ مہیا کرنا نہیں ہے جو واٹسن اور کرک کے جینز کے علم (Watson-Crick genetics) کے پائے کا ہو۔ واقعی، شروع میں ثقافتی عدد کی وکالت کرتے ہوئے میری نیت یہ تاثر زائل کرنے کی تھی کہ ڈارون کے نظریے کا مظاہرہ صرف جین کے مشاہدے سے ہی کیا جا سکتا ہے، کیونکہ مجھے اپنی ہی کتاب "خود غرض جین– The Selfish Gene" سے اس پیغام کی ترویج کا اندیشہ تھا۔ پیٹر رچرڈسن اور رابرٹ بوئیڈ نے اپنی اہم اور پر فکر کتاب کے نام "صرف جینز سے نہیں– Not by Genes Alone" میں اس نقطے پر زور دیا ہے، اگرچہ انہوں نے ثقافتی عدد کی اصطلاح نہ استعمال کرنے اور اس کی جگہ "ثقافتی متغیرات Cultural variants" استعمال کرنے کی وجہ بیان کی۔ سٹیفن شینن کی کتاب " جینز، ثقافتی عدد، اور انسانی تاریخ –Genes, Memes and Human History" کسی حد تک اس سے پہلے آنے والی ایک بائڈ اور رابرٹسن کی عمدہ کتاب "ثقافت اور ارتقاء کا عمل–Culture and the Evolutionary Process" سے متاثر تھی۔ ثقافتی عدد کے بارے میں دیگر کتابوں میں رابرٹ انگر کی "برقی ثقافتی عدد –The Electric Meme"، کیٹ ڈسٹن کی "خود غرض ثقافتی عدد –The Selfish Meme" اور رچرڈ بروڈی کی "دماغ کے جراثیم: ثقافتی عدد کی نئی سائنس –Virus of the Mind: The New Science of the Meme" شامل ہیں۔

لیکن دوسروں کے مقابلے میں سوزن بلیکمور نے "The Meme Machine" میں ثقافتی عدد کے نظریے کو ترویج دینے میں سب سے زیادہ کام کیا ہے۔ وہ بار بار ایک ایسی دنیا کا تصوّر کرتی ہے جس میں دماغ (یا معلومات کے کوئی اور مخزن یا راستے، جیسے کہ کمپیوٹر یا ریڈیو بینڈ) ہیں اور جہاں جین ان مخزنوں میں آنے کے لئے ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں۔ جینز کے تالاب کی طرح ثقافتی عدد کے تالاب میں بھی وہی ثقافتی عدد اپنی بقاء کو یقینی بنا پائیں گے جو کامیابی سے اپنی نقل بنا سکیں گے۔ اس کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان میں ایک براہ راست کشش ہے، جیسے کہ کچھ لوگوں کے لئے لافانیت میں ہوتی ہے۔ یا شاید وہ اس لئے پنپ پاتے ہیں کہ وہ دوسرے ثقافتی اعداد کے ساتھ ہوتے ہیں جو پہلے سے ہی پنپ رہے ہیں اور لاتعداد ہو چکے ہیں۔ یہ ثقافتی عدد کے متعلقہ گروہوں (meme complexes) کو جنم دیتے ہیں۔ جیسا کہ ہم ثقافتی عدد کے بارے میں کرتے آئے ہیں، ان گروہوں کو سمجھنے کے لئے بھی ہم جین سے تقابل کرتے ہیں۔

علمی مقاصد کے لئے میں نے جین کو یوں بیان کیا تھا جیسے وہ ایک دوسرے سے جدا ہیں اور آزادانہ اعمال کرتے ہیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں، اور یہ حقیقت ہم پر دو طریقوں سے آشکار ہوتی ہے؛ پہلے تو یہ کہ جین صبغیہ کے اوپر ایک سیدھی لکیر میں چڑھے ہوتے ہیں، لہٰذا نسل در نسل انہی جینز کے ساتھ رہتے ہیں جو ان کی ہمسائیگی میں ہوتے ہیں۔ ہم ڈاکٹر لوگ اس ربط کو "ربط" ہی کہتے ہیں، اور میں اس کے بارے میں مزید کچھ نہیں کہوں گا کیوں کہ ثقافتی عدد میں نہ تو صبغیے ہوتے ہیں، نہ ایلیل، اور نہ ہی جنسی ملاپ۔ دوسرا انداز جس سے جینز ایک دوسرے سے آزاد نہیں ہیں جین کے ربط سے بہت مختلف ہے، اور یہاں پر ہمارے پاس ثقافتی عدد کے ساتھ بہت قریبی مشابہت میسّر ہے۔ یہ بات کہ یہ جینیات (embryology) سے تعلق رکھتی ہے ، حقیقتاً غلط فہمی کے سبب ہے، جبکہ یہ جینز کے علم سے بالکل جدا ہے۔ جسم کسی آڑے کٹے معمے (jigsaw puzzle) کی طرح مختلف جینز کی دی گئی شکل نوع کو جوڑ جوڑ کر نہیں بنائے جاتے۔ تشریح الاعضا (anatomy) یا رڈیوں کی اکائیوں اور جینز کے مابین کوئی "ایک سے ایک"تال میل نہیں ہوتا۔ جینز سینکڑوں دوسرے نسبوں کے ساتھ ہم آہنگی سے کام کرتے ہوئے ان ترقیاتی اعمال کو استوار کرتے ہیں جن کے نتیجے میں آخر کار ایک جسم وجود میں آتا ہے، اسی طرح جیسے کسی کھانے کی ترکیب کے الفاظ پکانے کے مراحل سے گزرتے ہوئے آخر میں اس کھانے کو وجود فراہم کرتے ہیں۔ ایسا تو نہیں ہے کہ ترکیب کا ہر لفظ ایک خاص نوالے سے مساوی ہوتا ہو۔

جینز جسم کی تعمیر کی غرض سے کارخانہ دار انجمن (cartel) کی مانند ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں، اور یہ جینیات کا ایک اہم اصول ہے۔ یہ خیال بہت دلکش ہے کہ قدرتی انتخاب جینز کی اس قسم کے انجمن کی حمایت کرتا ہے جس میں مساوی انجمنوں کے درمیان گروہی انتخاب ہوتا ہو۔ یہ بات صرف الجھن پیدا کرتی ہے۔ اصل میں ہوتا صرف یہ ہے کہ جینز کے تالاب کے باقی جینز ایک ایسا ماحول مہیا کرتے ہیں جس میں جینز کو اس ایلیل کے مقابلے میں منتخب کر لیا جاتا ہے۔ کیونکہ ہر جین دوسرے جینز کی موجودگی میں کامیابی کے لئے ہی چنا جاتا ہے – اور دیگر جینز بھی اسی معیار پر چنے جا رہے ہوتے ہیں – لہٰذا تعاون کرتے ہوئے جینز کی انجمنیں بن جاتی ہیں۔ ہمارے سامنے یہاں ایک منظم معیشت کی بجائے ایک آزاد منڈی موجود ہے۔ قصائی بھی ہے اور نان بائی بھی، لیکن شاید موم بتی بنانے والے کی کمی ہے۔ قدرتی انتخاب کا اندیکھا ہاتھ اس خلا کو پر کرنے کے لئے عمل میں آتا ہے۔ یہ کسی مرکزی منتظم سے مختلف ہے جو قصائی + نان بائی + موم بتی والے مثلث کی حمایت کرتا ہے۔ اندیکھے ہاتھ سے جوڑی گئی ان تعاون کرتی ہوئی انجمنوں کا تصوّر مذہبی ثقافتی عدد اور ان کے طریقہ عمل کے بارے میں ہماری سمجھ میں مرکزی کردار ادا کرے گا۔

جینز کے تالابوں میں جینز کی مختلف انجمنیں منظر عام پر آتی ہیں۔ گوشت خوری کے جینیاتی تالاب میں ایسے جینز موجود ہوں گے جو شکار کا پتا لگانے والے اعضاء، شکار کو پکڑنے والے پنجوں، گوشت خور دانتوں، اور گوشت کو ہضم کرنے والے خامروں کا لائحہ عمل تجویز کرتے ہیں، اور دیگر کئی جینز کے ساتھ تعاون کے لئے بالکل تیّار رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ سبزی خور جینز کے تالاب میں، باہمی مطابقت رکھنے والے جینز کے ایک مختلف گروہ کا ان کے آپس میں تعاون کرنے کی وجہ سے انتخاب کیاجاتا ہے۔ ہم اس خیال سے پہلے سے آشنا ہیں کہ جینز کو اس سے منسلک شکل نوع کی اپنی نوع کے ماحول سے مطابقت کی بنیاد پر حمایت حاصل ہو جاتی ہے: ماحول چاہے ریگستان کا ہو، جنگل کا ہو، یا کچھ بھی ہو۔ میں اس وقت جو نقطہ بیان کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ جینز کو اپنے جینیاتی تالاب میں اس کی دیگر جینز کے ساتھ مطابقت کی بنیاد پر بھی حمایت حاصل ہوتی ہے۔ گوشت خور جین سبزی خور جینیاتی تالاب میں زندہ نہیں رہ پائے گا، اور سبزی خور جین گوشت خور جینیاتی تالاب میں نہیں بچ پائے گا۔ دور رس جینیاتی زاویہ نگاہ سےنوع کے جینیاتی تالاب یعنی جینز کا وہ گروہ جو نسلی تسلسل (sexual reproduction) کی بدولت بار بار اپنی ترتیب بدلتا رہتا ہے – وہ جینیاتی ماحول مہیا کرتا ہے جس میں ہر جین اپنے تعاون کرنے کی قابلیت کی بنیاد پر منتخب کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ثقافتی عدد کے تالاب جینیاتی تالاب کے مقابلے میں قدرے کم منظم اور با قاعدہ ہوتے ہیں، ہم پھر بھی ثقافتی عدد کے تالاب کو ہر متعلقہ گروہ میں موجود عدد کے 'ماحول' کا ایک اہم جزو گردان سکتے ہیں۔

ثقافتی اعداد ایسے ثقافتی عدد کا مجموعہ ہوتا ہے جو اگرچہ ازخود بہت کامیابی سے اپنی بقاء کی کوشش نہ کر سکتے ہوں، لیکن گروہ کے دیگر اراکین کی موجودگی میں اپنا دفاع بہ طریق احسن کر سکتے ہیں۔ پچھلے حصے میں میں نے اس شک کا اظہار کیا تھا کہ زبان کے ارتقاء کی تفصیلیں کسی قسم کے قدرتی انتخاب سے بہرہ مند ہوتی ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ اس کے برعکس زبان کا ارتقاء بے ترتیب بہاؤ کا مرہون منت ہوتا ہو گا۔ یہ قابل قیاس ہے کہ کچھ حروف علت یا حروف صحیح کی ترویج پہاڑی علاقوں میں بہتر طور سے ہو پاتی ہے جس کی بدولت وہ سوئٹزرلینڈ، تبت، یا اینڈیز کی بولیوں کا حصہ بن جاتے ہیں جبکہ کچھ اور قسم کی آوازیں گھنے جنگلوں میں بولے جانے کے لئے زیادہ موزوں ہوتی ہیں اور اس وجہ سے وہ پگمی یا آمازون (Pygmy or Amazon) زبان میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن وہ واحد مثال جو میں نےفطری زبان کے سلسلے میں دی تھی ، یہ نظریہ کہ حرف علّت کی عظیم تبدیلی کی کوئی کارآمد توجیہہ بھی ممکن ہے ، اس طرز کی نہیں

ہے۔ اس کے برعکس، اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ ثقافتی عدد باہمی مطابقت رکھنے والے گروہوں کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں ۔ ایک حرف علّت تھوڑا سا بدلا، شاید کسی اہم شخص کی مقبول عام نقل کی صورت میں، جیسے کہ ہسپانوی زبان کی لکنت کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ اس بات کو چھوڑیئے کہ حرف علّت کی یہ عظیم تبدیلی شروع کہاں سے ہوئی: اس نظریے کے مطابق جب پہلے حرف علّت میں تبدیلی واقع ہوئی تو باقی حروف علّت کا اس کے پیچھے پیچھے تبدیل ہونا لازم تھا، تاکہ زبان میں ابہام نہ پیدا ہونے پائے۔ عمل کے اس دوسرے مرحلے میں، ثقافتی اعداد کا انتخاب پہلے سے موجود ثقافتی اعداد کے متعلقہ گروہ کے پس منظر میں ہوا، جس کے نتیجے میں باہمی مطابقت رکھنے والے ثقافتی اعداد کا ایک نیا متعلقہ گروہ وجود میں آ گیا۔

آخر کار ہم مذہب کے نظریہ ثقافتی عدد کی طرف رجوع کرنے کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ کچھ مذہبی خیالات، کچھ جینز کی طرح، صریحاً اپنی صحت کی بنیاد پر ہی پنپ سکتے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ ان کے گرد و نواح میں اور کیسے ثقافتی عدد موجود ہیں، یہ ثقافتی عدد کسی بھی تالاب میں بچ جائیں گے۔ (میں یہاں اس نقطے کی شدید اہمیت کو دوہرانا چاہتا ہوں کہ 'صحت' سے میری مراد صرف 'تالاب میں باقی بچ رہنے کی قابلیت' ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کسی قدر کا اطلاق مقصود نہیں)۔ کچھ مذہبی خیالات اس لئے بھی باقی رہ جاتے ہیں کیونکہ وہ ثقافتی عدد کے تالاب میں ایسے لاتعداد دیگر اعداد کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں جو کسی متعلقہ گروہ کا حصہ ہیں۔ ذیل میں ایسے مذہبی ثقافتی اعداد کی ایک نامکمل فہرست اعداد کے تالاب میں بقاء کی قابلیت ہے، چاہے وہ ان کی اپنی صحت کی بنا پر ہو یا کسی متعلقہ گروہ کے ساتھ مطابقت کی بنیاد پر:

- تم اپنی موت کے بعد بھی باقی رہو گے۔
- اگر تم شہید ہو گئے، تو تم جنّت کے خاص حصے میں پہنچ جاؤ گے جہاں تم بہتر کنواری حوروں سے لطف اندوز ہو گے (یہاں ان بدقسمت کنواریوں کے لئے بھی ایک لمحے کے لئے اپنے دل میں درد پیدا کیجئے)۔
- بدعتی، کافر اور مرتد کو مار دینا چاہئے (یا سزا دینی چاہئے، مثلاً خاندان سے عاق کر دینا چاہئے)۔
- خدا پر ایمان ایک اعلیٰ و ارفع فضیلت ہے۔ اگر تمھیں اپنا ایمان متزلزل ہوتا ہوا محسوس ہو تو اس کو راستے پر واپس لانے کے لئے تگ و دو کرو، اور خدا سے مدد مانگو۔ (پاسکال کی شرط پر بحث کے دوران میں نے یہ مفروضہ پیش کیا تھا کہ وہ ایک چیز جو خدا ہم سے طلب کرتا ہے وہ ایمان ہے۔ اس وقت میں نے اسے ایک عجوبے کے طور پر پیش کیا تھا، لیکن اب ہمارے پاس اس کی توجیہ آ چکی ہے)۔
- ایمان (شواہد کے بغیر یقین) ایک فضیلت ہے۔ جتنا تمہارے اعتقادات شواہد کے منافی ہوں گے، اتنے ہی تم نیک قرار دیے جاؤ گے۔ نیک معتقد لوگ جو شواہد اور دلیل کی موجودگی میں بھی کسی انتہائی عجیب اور ناقابل تائید بات پر یقین کا اظہار کر سکیں خاص مراعات کے حقدار ہوں گے۔
- ہر شخص پر، بشمول ان کے جو مذہبی عقائد نہیں رکھتے، واجب ہے کہ دوسروں کے عقائد کو ایک اعلیٰ درجے کا خود کار اور قابل حجت احترام بخشیں، جو دوسری نوعیت کے عقیدوں سے افضل ہو (ہم اس زاویے سے باب ۱ میں متعارف ہو چکے ہیں)۔
- ایسی کچھ عجیب باتیں ہیں (تثلیث، عمل تقلیب، اور اوتار) جن کا سمجھنا ہمارے لئے مناسب نہیں سمجھا گیا۔ ان میں سے کسی کو بھی سمجھنے کی کوشش کبھی مت کرو، کیونکہ ایسا کرنے سے اس کے تباہ ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اپنی روح کی تکمیل کی کوشش کرو جو اپنے آپ میں ایک راز ہے۔ باب ۵ میں درج مارٹن لوتھر کی عقل کی شدید مذمت کو یاد کرو، اور سوچو کہ وہ ثقافتی عدد کی بقاء میں کتنا اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔
- خوبصورت موسیقی، فنون لطیفہ، اور الہامی کتب اپنے آپ میں ایسے مذہبی خیال ہیں جو اپنی نقل بنا سکتے ہیں ۔

---

فنون لطیفہ کے مختلف مکاتب اور طریقوں کو متبادل ثقافتی عدد کے متعلقہ گروہوں کے طور پر سمجھا جاسکتا ہے، کیونکہ فنکار اپنے سے پہلے آنے والوں کے خیالات اور اشکال کی نقل کرتے ہیں اور نئے خیالات اور اشکال اسی صورت میں باقی رہتے ہیں اگر وہ دوسروں کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں۔ درحقیقت اعلی تدریس کی شاخ جسے تاریخ فنون لطیفہ کے نام سے جانی جاتی ہے، اور جس میں تاریخی بتوں اور علامتوں

مندرجہ بالا فہرست میں سے کچھ ثقافتی عدد اپنی صحت پر باقی رہنے کی قدر رکھتے ہیں اور کسی بھی ثقافتی عدد کے گروہ میں کامیاب رہ سکتے ہیں۔ لیکن نسبوں کی ہی طرح، کچھ ثقافتی عدد صرف دیگر ثقافتی اعداد کے پس منظر میں ہی پنپ پاتے ہیں، جس کے نتیجے میں متبادل متعلقہ گروہوں کی ترتیب عمل میں آتی ہے۔ دو مختلف مذاہب کو دو مختلف ثقافتی عدد کے گروہوں کے طور پر بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ یوں کہیئے تو شاید اسلام گوشت خور جین گروہ کے مساوی ہے اور بدھ مت سبزی خور جین گروہ کے مترادف۔ کسی بھی مذہب کے خیالات کسی دوسرے مذہب سے حتمی طور پر 'بہتر' نہیں ہیں جیسے گوشت خوری کا جین سبزی خوری کے جینز سے حتمی طور پر 'بہتر' نہیں ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس قسم کے مذہبی ثقافتی عدد میں بقاء کی کوئی حتمی استعداد ہو؛ پھر بھی یہ اس طور 'اچھے' ہی ہوتے ہیں کہ یہ ہم مذہب ثقافتی عدد کی موجودگی میں پنپتے ہیں اور غیر مذہب ثقافتی عدد کی موجودگی میں نہیں۔ اس زاویے سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مثال کے طور پر رومن کیتھولک مذہب اور اسلام کسی ایک شخص کے ترتیب شدہ نہیں بلکہ متبادل مجموعات ثقافتی اعداد کے طور پر ان کا علیحدہ علیحدہ ارتقاء واقع ہوا جو اسی ثقافتی متعلقہ گروہ کے دیگر اراکین کی موجودگی میں پنپتے ہیں۔ منظّم مذاہب کی تنظیم منظّم لوگوں کے ہاتھوں ہی ہوتی ہے: مثلاًپادری، بشپ، ربی، امام اور آیت اللہ۔ لیکن، اس نقطے کو دہراتے ہوئے جو میں نے مارٹن لوتھر کے سلسلے میں پیش کیا تھا، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان مذاہب کا تخیل اور ترتیب بھی لوگوں کے ہاتھوں ہی ہوئی ہو گی۔ جہاں طاقتور افراد کو فائدہ پہنچنے کے لئے مذاہب کا استحصال بھی کیا گیا ہو، وہاں بھی یہ امکان غالب رہتا ہے کہ مذہب کی تفصیلات کو ایک بے دھیان عمل ارتقاء نے ہی تشکیل دیا ہے۔ کسی جینیاتی قدرتی انتخاب سے نہیں، جس کی سست رفتاری مذاہب کے تیز رو ارتقاء اور پھیلاؤ کی توجیہ مہیا کرنے کے لئے ناکافی ہے۔ اس کہانی میں جینیاتی قدرتی انتخاب کا کرداراپنے رجحانات اور تعصبات سمیت دماغ مہیا کرنے کا ہے، یعنی ہارڈویئر اور سافٹ ویئر جو ثقافتی عدد کے انتخاب کا پس منظر مہیا کرتے ہیں۔ اس پس منظر میں مجھے کسی قسم کے ثقافتی عدد کا انتخاب مخصوص مذاہب کے تفصیلی ارتقاء کی ایک منطقی وضاحت پیش کرتا نظر آتا ہے۔ مذہبی ارتقاء کے ابتدائی مراحل میں، تنظیم سے پہلے، سادہ ترین ثقافتی عدد انسانی نفسیات کے رحم و کرم پر رہتے ہوئے اپنی بقاء کو یقینی بناتے ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں مذہب کا ثقافتی عدد کا نظریہ اور نفسیاتی ضمنی پیداوار کا نظریہ متجاوز (overlap) ہو جاتے ہیں۔ بعد کے مراحل، جہاں مذہب منظم ہو جاتا ہے، اور دیگر مذاہب سے خود مختار انداز سے مختلف اور واضح ہو جاتا ہے، ثقافتی عدد کے متعلقہ گروہوں کے نظریے کے ذریعے بآسانی بیان کیاجاسکتا ہے – باہمی مطابقت رکھنے والے ثقافتی اعداد کی انجمن(cartel)پادریوں اور دیگر لوگوں کی طرف سے دانستہ ساز باز اور ہیرا پھیری کے اضافی کردار کو مسترد نہیں کرتا۔ مذاہب کسی حد تک تو ذہین ترتیب کا نتیجہ ہوتے ہیں، جیسے کہ فنون لطیفہ کے مکاتب اور انداز۔

ایک مذہب جو تقریباً مکمل طور پر ذہین طریقے سے ترتیب دیا گیا ہے وہ ہے سائنٹالوجی (Scientology )، لیکن مجھے شک ہے کہ یہ معمول سے ہٹ کر ہے۔ ایک اور مذہب جو اس کسوٹی پر پورا اتر سکتا ہے وہ مارمن مذہب ہے (Mormonism)۔ اس کے کاروباری نوعیت اس مذہب کے کاذب موجد جوزف سمتھ نے بہت ہی محنت اور لگن سے مارمن کی کتاب (The Book of Mormon) کے نام سے ایک مکمل صحیفہ بھی رقم کیا ہے، جس میں سترہویں صدی کی جعلی انگریزی زبان میں امریکہ کی ایک مفصل جعلی تاریخ بھی لکھ دی۔ تاہم مارمن مذہب انیسویں صدی میں اپنا ارتقائی سفر طئے کر چکا ہے اور فی زمانہ امریکی معاشرے میں ایک قابل عزت مرکزی مذہب کی شکل اختیار کر چکا ہے – اب تو وہ امریکہ میں سب سے تیزی سے پھیلنے والا مذہب ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور افواہ گرم ہے کہ ان میں سے کوئی صدارتی امیدوار بھی بننے کا خواہش مند ہے ۔

زیادہ تر مذاہب ارتقاء کے مراحل سے گزرتے ہیں۔ ہم مذہبی ارتقاء کے جس بھی نظریے کو اپنائیں، اس میں مناسب حالات کی موجودگی میں مذہبی ارتقاء کی حیران کن رفتار وضاحت کرنے کی قابلیت ہونی چاہئے۔ ذیل میں ایک تحقیق ملاحظہ کیجئے۔

## کارگو فرقے ۔ Cargo Cults

فلم لائف آف برائن (Life of Brian) میں مونٹی پائیتھن کی ٹیم جو بہت سی چیزیں صحیح بیان کرنے میں کامیاب رہی ان میں سے ایک کسی نئے مذہب کے مقبول عام ہو جانے کی تیز رفتاری بھی تھی۔ وہ راتوں رات پیدا ہو سکتا ہے اور تہذیب میں رچ بس جاتا ہے، جہاں وہ پریشان کن حد تک نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ بحر الکاہل کے میلانیسیہ اور نیو گنی (Melanesia and New Guinea)کے جزیروں پر پائے جانے والے 'کارگوفرقے' اس سلسلے میں حقیقی زندگی سے ایک عمدہ مثال مہیا کرتے ہیں۔ ایجاد سے اختتام تک ان فرقوں کی مکمل تاریخ ہماری زندگی میں ہی مکمل ہوئی ہیں۔ عیسیٰ کے فرقے کے برعکس،

---

کے بڑے پیچیدہ شجرے تلاش کئے جاتے ہیں، کو ثقافتی عدد کے متعلقہ گروہوں کی تفصیلی تحقیق بھی کہاجاتا ہے۔ ثقافتی عدد کے تالاب میں پہلے سے موجود اراکین کی موجودگی کچھ تفصیلات پر مہربانی کرتی ہے اور کچھ پر نہیں، اور ان میں عموماً مذہبی ثقافتی عدد بھی شامل ہوں گے۔

جس کی شروعات کی قابل اعتماد سند میسّر نہیں، یہاں واقعات کا سارا تسلسل ہماری نظروں کے سامنے ہے (اور اس کے باوجود کچھ تفصیلات گم ہو رہی ہیں)۔ یہ بڑا دلچسپ خیال ہے کہ عیسائیت ایسے حالات میں ہی شروع ہوئی اور اوائل میں اس کی ترویج بھی اسی رفتار پر ہوئی۔

کارگو فرقے کے بارے میں معلومات کا میر ا بنیادی ذریعہ ڈیوڈ ایٹنبورو کی دستاویزی فلم Quest in Paradise ہے، جو اس نے مہربانی فرماتے ہوئے مجھے تحفے میں پیش کی۔ انیسویں صدی کے فرقوں سے لے کر جنگ عظیم دوئم کے بعد کے فرقوں میں تمام فرقوں کے ارتقاء کا طریقہ کار ایک جیسا ہی تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ ہر بار جزیروں کے باشندے سفید فام مہاجروں بشمول فوجی، منتظمین اور مبلغین ،کے عجائب ب اموال کو دیکھ کر ورطہ حیرت میں ڈوب گئے۔ شاید وہ آرتھر سی کلارک کے "تیسرے قانون" (جس کا میں نے باب ۲ میں ذکر کیا تھا) کا شکار ہو گئے ہوں گے: "کوئی بھی مناسب حد تک ترقی یافتہ صنعت و حرفت جادو کی حد تک ناقابل شناخت ہے"۔

جزیروں کے باشندوں نے مشاہدہ کیا کہ یہ سفید فام لوگ خود ان اشیاء کو بناتے نہیں ہیں جنہیں وہ استعمال کرتے ہیں۔ جب کسی چیز کی مرمت کی ضرورت ہوتی ہے تو انہیں کہیں بھجوا دیا جاتا اور ان کی جگہ نئی اشیاء سمندری یا ہوائی جہازوں پر لد کر جزیرے پر آ جاتیں۔ کبھی کسی سفید فام کو کوئی چیز مرمت کرتے یا بناتے نہیں دیکھا گیا، یا ایسا کچھ بھی کرتے نہیں دیکھا گیا جسے فائدہ مند کام کہا جاسکے (بظاہر میز کے پیچھے بیٹھ کر کاغذات کو آگے پیچھے کرنا کسی قسم کی عبادت ہو گی)۔ اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ کارگو مافوق الفطرت نوعیت کا ہو گا۔ سفید فام لوگ کچھ ایسی حرکتیں بھی کرتے تھے جو رسومات کی تقریب کے علاوہ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتی تھیں:

> وہ اونچے اونچے شہتیر کھڑے کرتے ہیں، جن سے تاریں جڑی ہوتی ہیں؛ وہ چھوٹے چھوٹے ڈبوں کو سنتے رہتے ہیں جن سے روشنی سی چمکتی ہیں اور جن میں سے عجیب و غریب شور اور گھٹی گھٹی آوازیں آتی ہیں؛ وہ مقامی لوگوں کو ایک جیسے کپڑے پہننے کے لئے راضی کرتے ہیں اور منظّم جلوس کی شکل میں چلاتے ہیں – اس سے زیادہ بے سود مصروفیت سوچی بھی نہیں جا سکتی۔ اور پھر ایک مقامی باشندے کو احساس ہوتا ہے کہ اسے ان حرکات کا راز سمجھ آ گیا ہے۔ یہ سمجھ سے بالا تر حرکات ہی وہ رسومات ہیں جن کے ذریعے سفید فام انسان خداؤں کو سامان رسد بھجوانے کے لئے راضی کرتا ہے۔ اگر مقامی انسان کو بھی یہ سامان رسد چاہئے، تو اسے بھی یہی رسومات کرنی ہوں گی۔

یہ بڑے اچنبھے کی بات ہے کہ تقریباً ایک ہی جیسے کارگو فرقے ایسے جزیروں پر پیدا ہو گئے جو جغرافیائی اور تہذیبی اعتبار سے ایک دوسرے سے قطعی قریب نہیں تھے۔ ڈیوڈ ایٹنبورو ہمیں بتاتا ہے کہ

> ماہرین بشریات کے مطابق نیو کیلیڈونیہ (New Caledonia) میں دو ایسے فرقے پیدا ہوئے ہیں، سولومن جزائر (Solomon Islands)میں چار، فیجی (Fiji)میں چار، نیو ہیبریڈیز (New Hebrides)میں سات، اور نیو گنی میں پچاس سے بھی زیادہ، جن میں سے بیشتر ایک دوسرے سے بالکل آزاد اور غیر منسلک ہیں۔ ان مذاہب کی اکثریت کا یہ ماننا ہے کہ ایک مسیحا قیامت کے روز سامان رسد لے کر آئے گا۔ اتنے بہت سے غیر منسلک مگر انتہائی حد تک ایک دوسرے سے ملتے جلتے فرقوں کی آزادانہ پیدائش ہمیں انسانی نفسیات کو متحد کرنے والی خصوصیات کے بارے میں بہت کچھ بتاتی ہے۔

نیو ہیبریڈیز کے جزیرۂ تانا (Tanna) (۱۹۸۰ کے بعد اس کا نام وانوآٹو Vanuatu رکھ دیا گیا تھا) میں ایک فرقہ آج بھی قائم ہے جو جان فرم (John Frumm) نام کے ایک مسیحائی کردار پر مرکوز ہے۔ سرکاری ریکارڈ میں جان فرم کا نام ۱۹۴۰سے ہی پایا جاتا ہے، اس سے پہلے نہیں، لیکن اتنی حالیہ داستان کے بارے میں بھی یہ ٹھیک سے معلوم نہیں ہے کہ اس کا وجود تھا بھی یا نہیں۔ ایک روایت کے مطابق جان فرم ایک پستہ قد سنہرے بالوں والا شخص

تھا جو اونچی آواز میں بولتا تھا، اور سنہرے بٹنوں والا کوٹ پہنتا تھا۔ وہ عجیب و غریب پیش گوئیاں کرتا تھا اور لوگوں کو مذہبی مبلغوں (missionaries) سے متنفّر کرنے کے لئے حد درجہ کوشش کرتا تھا۔ بالآخر، واپس لوٹنے اور سامان رسد لانے کا وعدہ کر کے وہ آباء و اجداد کے پاس واپس لوٹ گیا۔ اس کے قیامت کے تصوّرات میں ایک عظیم تباہی کا ذکر شامل تھا جس میں 'پہاڑ منہدم ہو جائیں گے اور وادیاں بھر جائیں گی ، بوڑھے پھر سے جوان ہو جائیں گے اور دنیا سے بیماری مٹ جائے گی؛ سفید فام جزیرے سے ہمیشہ کے لئے بے دخل کر دیے جائیں گے؛ اور سامان رسد اس وافر مقدار میں آئے گا کہ کسی کو بھی کسی بھی چیز کی کمی نہ ہو گی'۔

حکومت کے لئے لمحہ فکریہ یہ ہے کہ جان فرم نے یہ پیش گوئی بھی کی تھی کہ واپسی پر وہ ایک نیا سکہ بھی جاری کرے گا جس پر ناریل کی شکل بنی ہو گی۔ لہٰذا لوگوں کو سفید فام لوگوں کی جاری کردہ کرنسی ضایع کر دینی چاہئے۔ ۱۹۴۱ میں اس کی وجہ سے لوگوں نے کام کاج ترک کر دیا اور دیوانہ وار خریداری کرنا شروع کر دی جس کی وجہ سے جزیرے کی اقتصادیات کو شدید نقصان پہنچا۔ نوآبادیاتی منتظمین نے سرغنہ کو گرفتار بھی کیا، لیکن ان کے کسی اقدام سے کوئی فرق نہ پڑا؛ عیسائیوں کے گرجاگھر اور سکول خالی ہو گئے۔

کچھ عرصے بعد ایک نئے نظریے نے جنم لے لیا کہ جان فرم امریکہ کا بادشاہ ہے۔ قسمت سے، انہی دنوں امریکی فوج جزیرے پر لنگر انداز ہوئی اور عجوبوں کا عجوبہ ان میں سیاہ فام فوجی بھی شامل تھے جو مقامی لوگوں کی طرح غریب نہیں تھے بلکہ

> ...سفید فام لوگوں کی طرح کارگو سے مالا مال تھے۔ تانا کے جزیرے پر جوش و خروش کی ایک لہر دوڑ گئی۔ قیامت کا دن قریب تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہر کوئی جان فرم کے استقبال کی تیّاری کر رہا ہے۔ قائدین میں سے کسی نے کہا کہ جان فرم ہوائی جہاز میں سوار ہو کر امریکہ سے آئے گا، لہٰذا سینکڑوں مردوں نے جزیرے کے وسط میں گھاس پھوس صاف کرنا شروع کر دیا تاکہ جہاز کے اترنے کی پٹّی (airstrip) کو ہموار کیا جا سکے۔

ہوائی پٹّی پر بانس کا ایک کنٹرول ٹاور بھی تھا، جس میں ہوائی ٹریفک کی 'کنٹرولر' لکڑی سے بنے جعلی ہیڈفون پہن کر بیٹھے ہوئے تھے۔ پٹی پر لکڑی کے ہی بنے ہوئے جعلی ہوائی جہاز بھی کھڑے تھے تاکہ فرم کے ہوائی جہاز کو تانا پر اترنے کے لئے راغب کیا جاسکے۔

۱۹۵۰ کی دہائی میں نوجوان ڈیوڈ ایٹنبورو کیمرہ مین جیفری ملگن کے ہمراہ جان فرم کے فرقے کی تحقیق کرنے بہری جہاز سے تانا گیا۔ انہیں وہاں اس مذہب کے بے شمار شواہد ملے اور بالآخر انہیں مذہب کے سب سے بڑے پروہت ناما سے بھی متعارف کروایا گیا۔ ناما اپنے مسیحا کو صرف جان کے نام سے یاد کرتا اور دعویٰ کرتا تھا کہ وہ اس سے 'ریڈیو' کے ذریعے گفت و شنید کرتا ہے۔ یہ ('ریڈیو جان کا') ایک بوڑھی عورت تھی جس کی کمر کے گرد تار لپٹی ہوئی تھی اور جو "حال" کے عالم میں زمین پر گر کر بے معنی گفتگو شروع کر دیتی تھی، اور ناما ان الفاظ کی تشریح کے ذریعے جان فرم کا 'پیغام' عوام تک پہنچاتا تھا۔ ناما نے دعویٰ کیا کہ اسے ایٹنبورو کی متوقع آمد کی خبر تھی کیونکہ جان فرم نے اسے پہلے سے ہی بتا دیا تھا۔ ایٹنبورو نے 'ریڈیو' سے ملنے کی درخواست کی لیکن (متوقع طور پر) اس کی درخواست مسترد کر دی گئی۔ اس نے موضوع بدلتے ہوئے ناما سے پوچھا کہ کیا اس نے کبھی خود جان فرم کو دیکھا ہے:

> ناما نے زور زور سے اثبات میں سر ہلایا 'میں نے اسے کئی بار دیکھا ہے'۔
> 'وہ دیکھنے میں کیسا ہے'؟
> ناما نے سختی سے ایٹنبورو کی طرف انگلی سے اشارہ کیا 'تم جیسا، اس کا چہرہ سفید ہے، وہ لمبے قد کا ہے، وہ ایک عرصے سے جنوبی امریکہ میں رہتا ہے'۔

---

اس پیشگوئی کا موازنہ انجیل کے باب ایشا ۴۰:۴ سے کیجئے: "ہر وادی اٹھادی جائے گی اور ہر پہاڑی اور پہاڑ زمیں بوس کر دیا جائے گا"۔ یہ مماثلت انسانی نفسیات کے کسی بنیادی خصوصیت یا کارل گستاف جنگ کی 'اجتمائی بے ہوشی' کی غمازی نہیں کرتی۔ یہ جزائر ایک طویل عرصے سے تبلیغیوں کی یلغار کے شکار تھے۔

ناما کی بتائی گئی یہ تفصیل مندرجہ بالا قصے سے مختلف ہے کہ جان فرم ایک چھوٹے قد کا آدمی تھا۔ ارتقاء پزیر قصوں کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔

تانا پر یہ مانا جاتا ہے کہ جان فرم کی واپسی ۱۵ فروری کو ہو گی، لیکن سال کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ ہر سال ۱۵ فروری کو اس کے ماننے والے اس کے استقبال کے لئے ایک جگہ جمع ہو کر ایک مذہبی رسم ادا کرتے ہیں۔ آج تک تو وہ واپس نہیں آیا، لیکن تانا کے باشندوں نے ہمت نہیں ہاری۔ ڈیوڈ ایٹنبورو نے سام نام کے ایک معتقد سے کہا:

'لیکن، سام، انیس سال گزر چکے ہیں جب جان نے سامان رسد کے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ وعدے پر وعدہ کرتا چلا جاتا ہے لیکن سامنے نہیں آتا۔ انیس سال کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہے کسی کا انتظار کرنے کے لئے'؟

سام نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں اور میری طرف دیکھا۔ 'اگر تم لوگ دو ہزار سال تک عیسیٰ مسیح کے آنے کا انتظار کر سکتے ہو اور وہ پھر بھی نہیں آیا، تو میں جان کی آمد کا انیس سال سے زیادہ تو انتظار کر ہی سکتا ہوں'۔

رابرٹ بکمین کی کتاب "کیا ہم خدا کے بغیر اچھے ہو سکتے ہیں؟–Can We be Good Without God?" میں بھی جان فرم کے ایک معتقد نے ایٹنبورو کی ہی طرح ۴۰ سال بعد بھی ایک کینیڈین اخبار نویس کو ایسا ہی جواب دیا تھا۔

جب ملکہ برطانیہ اور شہزادہ فلپ نے ۱۹۷۴ میں اس علاقے کا دورہ کیا، تو شہزادہ فلپ کو بھی جان فرم کے فرقے کی طرح خدائی پائیدان پر بٹھا دیا گیا۔ شہزادہ ایک خوش شکل آدمی ہے، جو اپنی سفید وردی اور پروں والے ہیلمٹ سمیت ایک رعب دار شخصیت لگتا تھا اور یہ اچنبھے کی بات نہیں کہ ملکہ کی بجائے اسے یہ رتبہ نصیب ہوا۔ یوں بھی، جزیرے کی تہذیب ایک نسوانی خدا کی متحمل ہونے کے قابل نہیں تھی۔

میں جنوبی بحر الکاہل کے ان کارگو فرقے کو ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دینا چاہتا لیکن یہ ہمیں دور حاضر میں مذاہب کے کسی بنیاد کے بغیر وجود میں آنے کے بارے میں ایک عمدہ نمونہ پیش کرتے ہیں ۔ خاص طور پر، یہ ہمیں مذاہب کی پیدائش کے بارے میں چار اہم سبق مہیا کرتے ہیں ۔ میں یہاں انہیں مختصراً بیان کروں گا۔ اول، فرقے کے پیدا ہو جانے کی حیران کن رفتار؛ دوئم، شروعاتی مراحل کے شواہد "گم" ہو جانے کی رفتار۔ اگر جان فرم نام کا کوئی آدمی تھا تو وہ ماضی قریب میں موجود تھا۔ تیسرا سبق مختلف جزیروں پر ایک جیسے فرقوں کے پیدا ہو جانے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان مماثلتوں پر ایک منظم تحقیق ہمیں انسانی نفسیات اور مذہب کے لئے اس کے نرم گوشے کے بارے میں معلومات فراہم کر سکتی ہے۔ چہارم، کارگو فرقے نہ صرف ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں بلکہ پرانے مذاہب سے بھی مماثلت رکھتے ہیں۔ عیسائیت اور دیگر مذاہب جو آج پوری دنیا میں پھیل چکے ہیں بظاہر جان فرم کے فرقے کی طرح مقامی فرقوں کی شکل میں ہی پیدا ہوئے تھے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں یہودیت کے پروفیسر گیزا ورمیز نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ عیسیٰ مسیح ایسی بہت سی مقناطیسی شخصیت رکھنے والے لوگوں میں سے ایک تھا جو اس دور میں فلسطین کے علاقے میں پیدا ہوئے، جہاں ایسی کئی کہانیاں پہلے سے موجود تھیں۔ ان میں سے بیشتر فرقے بتدریج ختم ہو گئے۔ جو باقی بچا، وہ وہی ہے جس سے آج ہم واقف ہیں۔ صدیاں گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ فرقہ ارتقائی منزل طئے کر کے (اگر آپ پسند کریں تو اسے ثقافتی اعداد کا انتخاب بھی کہہ سکتے ہیں؛ اور اگر پسند نہ کریں تو مت کہیں) اس پیچیدہ نظام یا یوں کہئے کہ بہت سے مختلف وارث نظام کی شکل اختیار کر چکا ہے جو دنیا کے ایک بڑے حصے پر حاوی ہے۔ ہیل سلاسی، ایلوس پریسلی اور شہزادی ڈایانا جیسی پر کشش شخصیات کی وفات ہمیں نئے فرقوں کی ترویج اور ثقافتی ارتقاء پر تحقیق کرنے کے مواقع فراہم کر سکتی ہیں۔

مذہب کی بنیادوں کے بارے میں میں بس اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں، سوائے باب ۱۰ میں ایک مختصر ذکر کے، جہاں میں ان نفسیاتی 'ضروریات' کے بارے میں بحث کروں گا جو مذہب مہیا کرتا ہے، اور جس کا مظاہرہ ہم بچپن کے 'فرضی دوست ' کے کرشمے میں دیکھتے ہیں۔

عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ اخلاقیات اپنی بنیادیں مذہب سے اخذ کرتی ہیں، اور اگلے باب میں میں اس زاویے کو تنقید کا نشانہ بنانا چاہتا ہوں۔ میں اس مدعے پر بحث کروں گا کہ خود اخلاقیات کی بنیاد کو بھی ایک ڈاروینی سوال کا موضوع بنایا جاسکتا ہے۔ جیسے ہم نے سوال اٹھایا تھا کہ مذہب کی ڈاروینی قدر کیا

ہے، ویسے ہی ہم سوال اخلاقیات کے بارے میں بھی پوچھ سکتے ہیں۔ اخلاقیات غالباً دنیا میں مذہب کے پہلے سے موجود ہیں۔ جیسے ہم نے مذہب کے سلسلے میں سوال کو واپس لے کر نئے انداز سے لکھا، ویسے ہی اخلاقیات کے سلسلے میں بھی ہم دیکھیں گے کہ یہ کسی اور چیز کا ضمنی پیداوار ہی ہے۔

# باب ٦ : اخلاقیات کی بنیاد: ہم اچھائی کیوں کرتے ہیں

زمین پر ہماری عجیب حالت ہے ۔ ہم یہاں ایک قلیل مدّت کے لئے آتے ہیں؛ لیکن ہمیں اپنے یہاں آنے کی وجہ تک معلوم نہیں ہوتی، ہم کبھی کبھار کچھ وجہ تراشنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ روز مرّہ زندگی کے نقطہ نظر سے ہم اس بات سے واقف ہیں: کہ ہم یہاں دوسرے انسانوں کی خاطر ہی ہیں ۔ خاص کر وہ انسان جن کی مسکراہٹوں اور خوشیوں میں ہماری خوشی پوشیدہ ہے۔

البرٹ آئنسٹائن

زیادہ تر مذہبی لوگ یہ تصوّر کرنے سے قاصر ہوتے ہیں کہ مذہب کی عدم موجودگی میں ہم اچھائی کیسے کرتے ہیں، یا اچھا ہونا بھی چاہتے ہیں۔ اس باب میں میں ایسے ہی سوالات پر بحث کروں گا۔ لیکن شکوک اس سے کہیں آگے بڑھ جاتے ہیں اور کچھ مذہبی لوگوں میں ان لوگوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکا دیتے ہیں جو ان کے عقیدے سے اتفاق نہیں کرتے۔ یہ بہت اہم مسلہ ہے، کیونکہ اخلاقی تقاضے ایسے مذہبی رجحانات کے پیچھے پوشیدہ ہوتے ہیں جن کا حقیقت میں اخلاقیات سے دور دور کا لینا دینا نہیں ہوتا۔ ارتقاء کی تعلیم کی زیادہ تر مخالفت کا ارتقاء یا سائنس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ، بلکہ وہ صرف اخلاقی قدروں پر مبنی غم و غصے کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ مخالفت 'اگر آپ بچّوں کو یہ سکھائیں کہ وہ بندر کی نسل سے ارتقاء پزیر ہوئے ہیں، تو وہ بندروں کی ہی طرح حرکتیں کریں گے' سے لے کر "ذہین ترتیب" کی میخیں (wedges) لگانے کی حکمت عملی کی نفیس تحریک تک پھیلی ہوئی ہے۔ باربرا فورسٹ اور پال گروس نے اپنی کتاب Creationism's Trojan Horse: The Wedge of Intelligent Design میں اس حکمت عملی کو بڑی بے دردی سے بے نقاب کیا ہے۔

مجھے اپنے قارئین سے بہت سے خطوط موصول ہوتے ہیں[§§§§§§§§§§]، جن میں سے بیشتر دوستانہ ہوتے ہیں، کچھ میں مثبت تنقید شامل ہوتی ہے، اور چند نہایت ناگوار اور شر پسند ہوتے ہیں۔ مجھے نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان میں سے سب سے شدید گستاخانہ خط ہمیشہ مذہبی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ایسی گالی گلوچ عموماً ان لوگوں کے ساتھ کی جاتی ہے جنہیں عیسائیت کا دشمن سمجھا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ایک خط ملاحظہ کیجئے جو انٹرنیٹ پر بھی موجود ہے جو دہریت کی ترویج کرنے والی فلم "وہ خدا جو وہاں نہیں تھا ۔ The God Who Wasn't There" کے مصنف اور ہدایتکار برائین فلیمنگ کو لکھا گیا۔ ۲۱ دسمبر ۲۰۰۵ کو لکھے گئے خط کا عنوان تھا "**تم جلو گے اور ہم ہنسیں گے**" اور اس میں یہ لکھا تھا:

> بڑی ہمت ہے تمہاری۔ میرا دل کرتا ہے ایک چھری لے کر آؤں اور تم جیسے سب لوگوں کی انتڑیاں نکال دوں، اور جب تمہاری انتڑیاں تمہارے سامنے زمین پر گریں تو میں خوشی سے چیخوں۔ تم لوگ ایک ایسی جنگ چھیڑنا چاہ رہے ہو جس میں میں اور مجھ جیسے کئی اور لوگ وہ تمام اقدام لے سکیں جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔

اس موقعے پر خط لکھنے والے کو شاید خیال آیا کہ اس کی زبان اخلاق سے گر رہی ہے، اس لئے آگے چل کر وہ تھوڑی رحم دلی کا مظاہرہ کرتا ہے اور کہتا ہے:

> پھر بھی، خدا ہمیں بدلہ لینے کا نہیں بلکہ تم جیسے لوگوں کے لئے دعا کرنے کا حکم دیتا ہے۔

لیکن اس کی یہ رحم دلی زیادہ دیر پا ثابت نہیں ہوئی:

> مجھے یہ جان کر دلی تسکین حاصل ہو گی کہ جو سزا تمہیں خدا دے گا وہ اس سے ۱۰۰۰ گنا زیادہ ہو جو میں دے سکتا

---

[§§§§§§§§§§] خطوط اتنی تعداد میں موصول ہوتے ہیں کہ میں سب کا جواب بھی نہیں دے سکتا، جس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔

ہوں۔ اور سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے ان گناہوں کی سزا بھگتو گے جن سے تم بالکل بے خبر ہو۔ خدا کے قہر میں رحم کی کوئی گنجائش نہیں ہو گی۔ تمہاری خاطر میں امید کرتا ہوں کہ خنجر تمہارے جسم میں پیوست ہونے سے پہلے ہی سچ تم پر آشکار ہو جائے ۔ کرسمس مبارک ہو!!

مکرر آنکہ: تم لوگوں کو اندازہ ہی نہیں کہ اگلے جہان میں تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میں تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں تم لوگوں میں سے نہیں ہوں۔

مجھے یقین نہیں آتا کہ محض مذہبی رائے کا اختلاف اتنا غیض و غضب پیدا کر سکتا ہے۔ ایک اصلی نمونہ پیش خدمت ہے جو میں نے رسالہ Free Thought Today کے مدیر کی ڈاک سے لیا ہے، اور جسے Freedom From Religion Foundation (FFRF) نے، جو کلیسا اور ریاست کی آئینی علیحدگی کی پامالی کے خلاف پر امن طریقے سے احتجاج کرتی ہے، نے اپنی ویب سائٹ پر چھاپا تھا:

اے پنیر کھانے والے نجس لوگوں! ہم عیسائیوں کی تعداد تم جیسے گھٹیا لوگوں سے کہیں زیادہ ہے۔ کلیسا اور ریاست میں کوئی علیحدگی نہیں ہے، اور تم سب جہنمی ہار جاؤ گے....

اب پنیر سے کیا دشمنی ہے؟ میرے امریکی دوستوں نے تجویز دی ہے کہ شاید مشہور آزاد خیال ریاست وسکانسن جہاں FFRF اور دودھ دہی کی صنعت کا مرکز ہے، کے ساتھ اس بات کا کوئی تعلق ہو۔ لیکن یقیناً بات ذرا بھی آگے نہیں ہو گی؟ اور ان فرانسیسی "پنیر کھانے اور ہتھیار ڈال دینے والے بندروں" کا کیا؟ آخر یہ پنیر کی علامتی تصویر کشی کیا ہے؟ خط کو جاری رکھتے ہیں:

شیطان کی پوجا کرنے والے نجس لوگوں .... مر جاؤ اور جہنم میں جاؤ۔ میری خواہش ہے کہ تمہیں پشت کے سرطان جیسی کوئی تکلیف دہ بیماری ہو جائے اور تم دھیرے دھیرے ایک تکلیف دہ موت مرو، تاکہ تم اپنے خدا "شیطان" سے ملاقات کر سکو.... اے دوستوں ! یہ مذہب سے آزادی سب بکواس ہے.... تم سب ہم جنس پرست مرد اور عورتیں جہاں بھی جاؤ اپنا دھیان رکھو، کیونکہ کچھ معلوم نہیں خدا کب کہاں اور کیسے تمہیں پکڑ لے.... اگر تمہیں یہ ملک اور اس کی اساس پسند نہیں تو دفا ہو جاؤ یہاں سے اور سیدھے جہنم میں جا مرو....

مکرر آنکہ: لعنت تم پر، کیمونسٹ فاحشہ.... اپنی کالی شکلیں لے کر امریکہ سے دفا ہو جاؤ.... تمہارے وجود کی کوئی وجہ نہیں۔ ہمارے آقا عیسیٰ مسیح کی لا متناہی قوت کا سب سے بڑا ثبوت خود تخلیق ہے۔

اللہ کی لا متناہی قوت کیوں نہیں؟ یا براھمہ کی؟ یا پھر خداوند کی؟

ہم چپ چاپ چلے نہیں جائیں گے۔ اگر مستقبل میں تشدد کی ضرورت پڑی تو بس اتنا یاد رکھنا کہ شروعات تم نے کی تھی۔ میری بندوق میں گولیاں بھری ہوئی ہیں۔

میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ پاتا کہ خدا کو اتنے وحشی ظالمانہ دفاع کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟ ہمارے خیال میں تو وہ خود اپنا دفاع کرنے کی اچھی خاصی صلاحیت رکھتا ہو گا۔ یاد رکھیے کہ جس مدیر کو اس غلاظت کا نشانہ بنایا جا رہا تھا وہ ایک نرم گفتار جواں سال خاتون تھی۔

میں چونکہ امریکہ میں رہتا نہیں ہوں اس لئے مجھے بھیجی جانے والی نفرت بھری ڈاک اس پائے کی نہیں ہوتی، لیکن اس میں وہ رحم دلی بھی نہیں ہوتی جس کے لئے عیسائیت کا بانی مشہور تھا۔ مندرجہ ذیل خط جو مئی ۲۰۰۵ میں ایک ڈاکٹر نے مجھے بھیجا، نفرت آمیز ہونے کے باوجود، غلاظت سے زیادہ لکھنے والے کے ذہنی عذاب کی غمّازی کرتا ہے اور ہمیں دکھاتا ہے کہ اخلاقیات کا سارا مسئلہ دہریت کے خلاف نفرت کا سرچشمہ ہے۔ چند ابتدائی پیرایوں کے بعد

جن میں ارتقاء کی کھال اتاری گئی تھی (اور طنزاً سوال اٹھایا گیا تھا کہ افریقی سیاہ فام کیا ابھی تک ارتقاء کے مراحل سے گزر رہا ہے)، ڈارون کی ذاتی بے عزتی کی گئی تھی، کھلے سے غلط اقتباس کیا گیا تھا، اور مجھے ترغیب دی گئی تھی کہ میں ایک کتاب ہی پڑھ لوں (میں مذکورہ کتاب پڑھ چکا ہوں) جس میں یہ درج ہے کہ دنیا صرف آٹھ ہزار سال پرانی ہے (کیا یہ شخص واقعی ڈاکٹر ہے؟)، ان الفاظ پر اختتام پزیر ہوتا ہے:

> آپ کی اپنی کتابیں، آکسفورڈ میں آپ کا مقام، آپ کی زندگی کی ہر چیز جس سے آپ کو پیار ہے، یا آپ نے حاصل کی ہے، سب بے وقعت ہیں... کامیو کے سوال سے اب کوئی چھٹکارا نہیں: 'ہم سب خودکشی کیوں نہیں کر لیتے؟' دنیا کے بارے میں آپ کا نقطہ نظر واقعی طلبہ اور دیگر لوگوں پر ایسا ہی اثر چھوڑتا ہے... کہ ہم سب اندھی قسمت کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں، 'لا شے' سے نکلے ہیں اور 'لا شے' میں واپس چلے جاتے ہیں۔ اگر مذہب سچ نہ بھی ہوتا، تو افلاطون کی طرح کسی عظیم داستان کو مان لینا کئی درجے بہتر ہے ممکن ہے ایسا کرنے سے ہمیں اپنی زندگی کے دوران کچھ ذہنی سکون میسّر آ جائے۔ لیکن **آپ** کا نقطہ نگاہ تو ہیجان، منشیات پر انحصار، تشدد، فتنہ انگیزی، لذتیت، فیکنسٹائن سائنس اور زمین پر جہنم کو فروغ دیتا ہے، اور تیسری عالمی جنگ کا دعوت نامہ ہے ... میں سوچتا ہوں آپ خود اپنے ذاتی تعلقات میں کتنے خوش ہیں؟ طلاق یافتہ؟ رنڈوے؟ ہم جنس پرست؟ آپ جیسے لوگ کبھی خوش نہیں ہوتے، ورنہ وہ یہ ثابت کرنے کے لئے اتنی محنت نہ کر رہے ہوتے کہ نہ تو کوئی خوشی ہے اور نہ ہی کسی بات کا کوئی مطلب ہے۔

اس خط کا لہجہ نہ سہی لیکن اس کا متن یقیناً بہت عام ہے۔ ان صاحب کا ماننا ہے کہ ڈارون کا نظریہ فطرتاً فتنہ انگیز ہے اور ہمیں سکھاتا ہے کہ ہم اندھی قسمت کے نتیجے میں وجود میں آئے ہیں (ہزار ہا بار، ارتقاء تو حقیقت میں اندھی قسمت کی ضد ہے) اور مرنے پر نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ ایسے مبیّنہ منفی اثرات کے نتیجے میں ہر قسم کا شر ظہور پزیر ہوتا ہے۔ شاید مجھے یہ طعنہ دینے کا اس کا مقصد نہیں تھا کہ طلاق کی حالت ڈارون کے نظریے کا براہ راست نتیجہ ہے۔ لیکن اس وقت تک اس کا خط نفرت کی اس جنونی حد کو پہنچ چکا تھا جو مجھے عموماً اپنے عیسائی نامہ نگاروں میں نظر آتی ہے۔ میں نے ایک پوری کتاب (Unweaving the Rainbow) حتمی معنی، سائنس کی شاعری، اور فتنہ انگیزی کے منفی اثر کی مخالفت کو وقف کر دی ہے، اس لئے یہاں میں مزید اس موضوع پر وقت صرف نہیں کروں گا۔ یہ بات شر اور اس کے مقابلے میں کھری اچھائی کے بارے میں ہے؛ اخلاقیات کے بارے میں، یہ کہاں سے آتی ہیں، ہمیں انہیں کیوں قبول کرنا چاہیئے، اور کیا اس کے لئے ہمیں مذہب کی ضرورت ہے یا نہیں۔

## کیا ہماری اخلاقی حس ڈارون کے نظریہ ارتقاء کی مرہون منت ہے؟

بہت سی کتابیں، جیسے کہ رابرٹ ہنڈ کی" اچھائی اچھی کیوں ہے، Why Good is Good "، مائیکل شرمر کی " نیکی و بدی کی سائنس The Science of Good and Evil،" رابرٹ بکمین کی "کیا ہم خدا کے بغیر اچھے بن سکتے ہیں؟ Can We be Good Without God"، اور مارک ہوسر کی "اخلاقی ذہن The Moral Mind" میں ان کے مصنّفین نے یہ بحث کی ہے کہ ہماری صحیح اور غلط کی سمجھ ہمیں ہماری ڈارونی تاریخ سے ملتی ہے۔ باب کے اس حصے میں میں نے اسی مسئلے کو اپنے انداز سے بیان کیا ہے۔

بظاہر، ڈارون کا یہ نظریہ کہ ارتقاء کا عمل قدرتی انتخاب کے زور پر آگے بڑھتا ہے ہمارے اندر کی اچھائی، اخلاقیات، شرافت، ہمدردی اور ترس کے جذبات کی وضاحت کرنے سے قاصر ہے۔ قدرتی انتخاب بھوک، خوف، اور جنسی ہوس، جو کہ ہماری بقا اور ہمارے جینز کی افزائش کے لئے اہم ہیں، کی وجہ تو بیان کر سکتا ہے۔ لیکن ایک یتیم بچے کو روتے ہوئے دیکھ کر، ایک بوڑھی بیوہ کا اکیلا پن دیکھ کر، یا کسی زخمی جانور کی کراہ سن کر، ہمارے دل میں ہمدردی کی جو ٹیسیں اٹھتی ہیں، ان کی وضاحت کیسے کی جائے؟ وہ کیا ہے جو ہمارے اندر ایک شدید خواہش پیدا کرتی ہے کہ ہم دنیا کے دوسرے کونے پر سونامی کے متاثرین کو گمنام تحائف بھیجیں، جب کہ ہم ان کو کبھی ملیں گے بھی نہیں اور جن کا ہماری اس نیکی کا جواب دینے کا امکان ناپید ہے؟ ہمارے اندر کا سامرہ کا نیکوکار (The Good Samaritan) کہاں سے جنم لیتا ہے؟ اچھے اور خود غرض جینز کا نظریہ آپس میں متضاد نہیں ہے؟ نہیں! یہ محض نظریے کے بارے میں ایک مقبول عام غلط فہمی ہے ۔ ایک پریشان کن (اور بادی النظر میں قابل قیاس) غلط فہمی[**********]۔ صحیح لفظ پر زور دینا بہت ضروری ہے۔ زور"خود غرض جینز" پر نہیں

---

[**********] مجھے گارڈین اخبار کی ۲۷ مئی ۲۰۰۶ کی اشاعت میں یہ پڑھ کر شدید صدمہ پہنچا کہ میری کتاب The Selfish Gene اینران کارپوریشن کے CEO جیف سکلنگ کی پسندیدہ کتاب ہے، اور وہ اس کتاب سے ڈارونی نوعیت کی ترغیب حاصل کرتا ہے۔ گارڈین کا اخبار نویس رچرڈ کونف اس غلط فہمی کی یہ وضاحت پیش کرتا ہے:

ہونا چاہئے، کیونکہ وہ خود غرض جنس (species) سے موازنہ کرتا ہے۔ میں آپ کو اس کی وضاحت پیش کرتا ہوں۔

ڈارون کی منطق اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ زندگی کے تنظیمی ڈھانچے میں جو اکائی بچ پائے گی اور قدرتی انتخاب کی چھلنی سے گزر سکے گی وہ خود غرضی کی طرف مائل ہو گی۔ دنیا میں وہی اکائیاں باقی رہ پائیں گی جو ارتقاء کے اپنے درجے میں اپنے مدّ مقابل کو پچھاڑنے میں کامیاب ہوں گی۔ اور اس سیاق و سباق میں "خود غرض" کا بس اتنا ہی مقصد ہے۔ سوال یہ ہے کہ عمل کا درجہ کیا ہے؟ خود غرض جینز کا یہ تصّور (اور زور پھر لفظ جینز پر رہے گا) ہے کہ قدرتی انتخاب کی اکائی (یعنی خود غرضی کی اکائی) نہ تو خود غرض عضویہ (organism) ہے نہ خود غرض گروہ نہ خود غرض جنس اور نہ خود غرض ماحولیاتی نظام ہے، بلکہ خود غرض **جین** ہے۔ یہ جین ہے جو معلومات (information) کی شکل میں کئی نسلوں تک باقی رہتا ہے یا نہیں رہ پاتا۔ جینز کے برعکس (اور شاید حیاتیاتی روئیّے (meme) کے بھی) حیات، جنس یا گروہ اکائی گردانے جانے کے لئے مناسب ہستی نہیں ہیں، کیونکہ وہ اپنی مکمل نقول نہیں بنا سکتے اور ایسی خود کی نقول بنانے والی ہستیوں کے تالاب میں ایک دوسرے کے مد مقابل نہیں ہوتے۔ جن کہ جینز بالکل یہی کرتے ہیں، اور جینز کو ڈارونی سیاق و سباق میں خود غرضی کی اکائی کے طور پر منتخب کرنے کی منطقی وضاحت یہی ہے۔

جینز عضوئے کو خود غرضی پر آمادہ کرنے کی پروگرامنگ کرتے ہیں تاکہ اپنی 'خود غرض' بقاء کو یقینی بنا سکیں اور دوسرے جینز کے مقابلے میں سبقت لے جائیں۔ ایسے متعدد حالات میسر آتے ہیں جن میں عضوواحد کی بقاء ان جینز کی بقاء کی ضامن ہو گی جو اس عضوے کے اندر موجود ہیں۔ لیکن مختلف حالات میں مختلف چالوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایسے حالات نایاب نہیں ہیں جن میں مورثے اپنی بقاء کی غرض سے اپنے میزبان عضوے کو ایثار پسندی کی جانب راغب کرتے ہیں۔ ہم ان حالات کو بہت اچھی طرح سمجھ چکے ہیں، اورانہیں ایک دو مرکزی اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایسے جینز جو عضوے کو اپنے (یعنی جینز کے) بھائی بندھوؤں کے حق میں عمل پیرا ہونے کی طرف راغب کرے، ان کا اپنی نقول کے لئے فائدہ مند ثابت ہونے کے شماریاتی امکانات زیادہ ہیں۔ جینز کے تالاب میں ایسے جینز کی تعداد میں اس حد تک اضافہ ہو جائے گا جہاں ایثار پسندی عمومی رویہ بن جائے گا۔ اپنے بچوں کے ساتھ اچھا برتاو اس رویے کی ایک واضح مثال ہے، لیکن واحد مثال نہیں ہے۔ شہد کی مکھیاں، کیڑے، دیمک، اور کسی کم تر حد تک کچھ ریڑھ کی ہڈی والے جانور جیسے سرنگ بنانے والے چوہے، میرکاٹ، اور ہد ہد، نے ایسے معاشرے تعمیر کئے ہیں جس میں بڑے بہن بھائی اپنے سے چھوٹے بہن بھائیوں کا خیال رکھتے ہیں (اور جن میں ایثار پسندی کا جین برابر طریقے سے موجود ہو گا)۔ بالعموم، جیسا کہ میرے مرحوم دوست ڈبلیو ڈی ہیملٹن نے دکھایا کہ رشتہ دار جانور جینز کی نقول بنانے کے شماریاتی امکان کے پیش نظر وہ قریبی رشتہ داروں کا خیال رکھتے ہیں، دفاع کرتے ہیں، اسباب میں حصہ دیتے ہیں، خطرے سے آگاہ کرتے ہیں اور ایثار پسندی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

ایثار پسندی کی دوسری قسم دو طرفہ ایثار پسندی ہے (تم میری کمر کھجا دو اور میں تمہاری کمر کھجا دوں گا)، جس کے لئے ہمارے پاس ایک بھرپور تحقیق شدہ ڈارونی منطق بھی موجود ہے۔یہ نظریہ، جو ارتقائی حیاتیات میں سب سے پہلے رابرٹ ٹرورز نے متعارف کرایا اور جو عموماً ریاضی کی زبان میں "نظریہ کھیل" (game theory) کے نام سے جانا جاتا ہے، مشترک مورثوں پر انحصار نہیں کرتا۔ واقعی، یہ انتہائی مختلف اجناس کے اراکین کے درمیان بھی اتنے ہی یا شاید اس سے بھی بہتر انداز سے کام کرتا ہے، اور اسے ہم زیستگی (symbiosis) کا نام دیتے ہیں ۔ اس کا محرّک اصول انسانوں میں بھی تمام تجارتی تعلقات کی بنیاد ہے۔ شکاری کو نیا نیزہ چاہئے اور لوہار کو تازہ گوشت۔ یہ بے آہنگی سودے کے لئے موزوں حالات مہیّا کرتی ہے۔ شہد کی مکھی کو شہد درکار ہے اور پھول کو انتقال زر گل (pollination)۔ پھول اڑ نہیں سکتے اس لئے وہ شہد کی مکھیوں کے پر کرائے پر لینے کے لئے شہد کے زر مبادلہ میں کرایا ادا کرتے ہیں۔ "شہد راہ نما" (honey guide) نامی پرندے مکھیوں کے چھتّے تو تلاش کر سکتے ہیں لیکن ان میں داخل نہیں ہو سکتے۔ "شہد پسند گلہری" (honey badger) نامی گلہری چھتے کو توڑ تو سکتی ہے لیکن پرواز کے لئے پر نہیں رکھتی کہ چھتے کو تلاش کر سکے۔ شہد راہ نما ایک دلکش طریقے سے اڑتے ہوئے گلہری کو (اور انسانوں کو بھی) ان چھتوں کا راستہ دکھاتے ہیں۔ سودا دونوں فریقین کے لئے فائدہ مند رہتاہے۔ سونے کے ایک ذخیرے کا تصور کیجئے جو ایک نہایت بھاری پتھر کے نیچے دبا پڑا ہے۔ اس کو دریافت کرنے والا شخص پتھر ہلا کر سونا نہیں نکال سکتا۔ وہ اور لوگوں کی مدد حاصل کرتا ہے، اگرچہ ایسا کرنے سے اسے سونے میں سب کو حصہ دینا پڑے گا؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اکیلے میں وہ اس سونے کو نکال ہی نہیں سکتا۔ عالم حیات ایسے باہمی فائدہ مند تعلقات سے بھرا پڑا ہے: بھنبھنسے اور ہد ہد، لال نلکی والے پھول اور شکر خور (hummingbird)، گروفرز مچھلی اور صفائی کرنے والی ریس مچھلی، گائے اور اس کے پیٹ میں پلنے والے جرثومے۔ دو طرفہ ایثار پسندی اس لئے کامیاب ہے کیونکہ ضروریات اور ان کو پورا کرنے کی گنجائش کے درمیان فرق ہے۔ اور اسی لئے مختلف اجناس (species) میں یہ فرق اور

---

http://money.guardian.co.uk/workweekly/story/۰,,۱۷۸۳۹۰۰,۰۰.html.

میں نے کتاب کی آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی جاری کردہ تیس سالہ خصوصی اشاعت کے دیباچے میں ایسی غلط فہمیوں کو دوبارہ پنپنے سے روکنے کے لئے اقدامات کئے ہیں ۔

بھی زیادہ ہوتا ہے: بے آہنگی زیادہ وسیع ہوتی ہے۔

انسانی دنیا میں قرض لوٹانے کے وعدوں سے لے کر پیسے تک بہت سے ایسے طریقے موجود ہیں جو لین دین میں تاخیر کا سبب بنتے ہیں۔ تجارت کے فریقین بہ یک وقت اپنی املاک کا تبادلہ نہیں کرتے بلکہ مستقبل میں قابل ادائیگی ایک قرض تشکیل دیتے ہیں، یہاں تک کہ مستقبل میں ان قرضوں کے بھی لین دین کرتے ہیں۔ جہاں تک میرے علم کی دسترس ہے، عالم حیواں میں کوئی ایسا غیر انسانی جانور کی قسم موجود نہیں جس میں پیسے کا کوئی متبادل ہو۔ لیکن انفرادی شناخت کی یادداشتیں غیر رسمی طور پر پیسے کا کردار ادا کرتی ہیں۔ خون پینے والے چمگادڑ یاد رکھتے ہیں کہ ان کے معاشرتی گروہ میں کون سے افراد ہیں جن پر (جگالی کیا ہوا) خون واپس کرنے کے لئے اعتماد کیا جا سکتا ہے اور کون سے افرادایسے ہیں جو دھوکہ دیتے ہیں۔ قدرتی انتخاب ان افراد کی حمایت میں عمل پیرا ہوتے ہیں جو بے آہنگ ضروریات اور مواقع کے روابط میں، جہاں کچھ دینے کی سکت رکھیں تو دیں، اور جہاں ضرورت محسوس کریں تو مانگ بھی سکیں۔ قدرتی انتخاب فرائض کو یاد رکھنے، بغض پالنے، سودے پر نظر رکھنے، اور دھوکے بازوں کو سزا دینے کی جبلّت کی بھی حمایت کرتا ہے۔

کیونکہ دھوکہ باز ہمیشہ معاشرے میں موجود رہیں گے؛ لہذا دو طرفہ ایثار پسندی کے "نظریہ کھیل" کے معمّوں کے ہر مستحکم حل میں دھوکہ باز کے لئے سزا کا عنصر ہمیشہ شامل رہتا ہے۔ ریاضی کے اصولوں کے مطابق نظریہ کھیل میں اس طرح کے کھیل کودکے مستحکم حل ممکن ہیں۔ "ہمیشہ خباثت دکھاؤ" ایک مستحکم حل ہے، کیونکہ جہاں سب خباثت کا مظاہرہ کر رہے ہوں وہاں اکیلا ایک نفیس انسان کوئی بہتری نہیں لا سکتا۔ لیکن ایک اور بھی حکمت عملی ہے جو اتنی ہی مستحکم ہو سکتی ہے۔ (یہاں "مستحکم" سے مراد ہے کہ جب کوئی حل آبادی میں ایک مخصوص تعداد سے آگے بڑھ جائے، تو پھر کوئی بھی متبادل حل اس سے بہتر نہیں ہو سکتا)۔ وہ حکمت عملی یہ ہے: "اچھائی سے شروعات کیجئے، اور دوسروں کو شک و شبہ کا فائدہ دیجئے۔ پھر اچھائی کے بدلے میں اچھائی کیجئے، لیکن برائی کا بدلہ بھی لیجئے"۔ نظریہ کھیل کی زبان میں اس حکمت عملی کو مختلف ناموں سے پہچانا جاتا ہے: جیسے کو تیسا، بدلہ لینے والا (retaliator)، یا باہم تبادلہ کار (reciprocator)۔ یہ حکمت عملی کچھ مخصوص حالات میں ارتقائی طور سے مستحکم رہتی ہے، کیونکہ باہم تبادلہ کرنے والو ں کی کسی آبادی میں کوئی واحد برا فرد یا واحد نیکو کار مجموعی آبادی کے مقابلے میں بہتر نتائج حاصل نہیں کر سکتا۔ 'جیسے کو تیسا' کی اور بھی کئی اقسام ہیں جو اپنے مخصوص حالات میں بہتر نتائج مہیا کرتی ہیں۔

میں نے ڈارونی دنیا میں رشتہ داری اور باہم تبالے کو ایثار پسندی کے دو ستونوں کے طور پر پیش کیا ہے، لیکن ان ستونوں کے اوپر کچھ ثانوی تعمیراتی ڈھانچے بھی رکھے ہوتے ہیں۔ خاص طور سے انسانی معاشرے میں، جہاں گفتگو کی قابلیت اور بد خوئی کی عادت کی بنا پر ساکھ کو بہ آسانی مجروح کیا جاسکتا ہے۔ کسی شخص کی ساکھ اس کی رحم دلی اور فیّاضی پر مبنی ہو سکتی ہے۔ کوئی دوسرا اپنے دھوکا دینے، معاہدے توڑنے اور بے اعتباری کے لئے مشہور ہو سکتا ہے۔ کوئی تیسرا اعتبار بن جانے کے بعد فیّاض ہوتا ہے اور دھوکا دینے والوں کے ساتھ ظالمانہ رویہّ اختیار کرنے کے لئے جانا جاتا ہے۔ اپنی سادہ ترین حالت میں دو طرفہ ایثار پسندی کا نظریہ ہر جنس کے جانور سے امید کرتا ہے کہ وہ اپنی عادات کو اپنی جنس کے جانوروں کے جیسی عادات کی طرف بے خیالی کےرد عمل پر مبنی کرے گا۔ انسانی معاشرے کے سیاق و سباق میں ہم ساکھ کو پھیلانے کی زبان کی طاقت کو بھی زیر بحث لے آتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ شخص "ش" نے خود آپ کو ذاتی طور پر شراب خانے میں شراب پلانے سے انکار کیا ہو۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ آپ نے صرف افواہ سنی ہو کہ "ش" بہت کنجوس واقع ہوا ہے یا "ق" بہت افواہیں پھیلاتا ہے۔ انسان کے لئے ساکھ بہت اہمیت رکھتی ہے، اور ماہرین حیاتیات اس بات کا اعتراف کر سکتے ہیں کہ صرف اچھا تبادلہ کار ہونا ہی ضروری نہیں بلکہ تبادلہ کار کے طور پر **مشہور** ہونا بھی ایک اہم ڈارونی بقائی قدر ہے۔ میٹ رڈلی کی کتاب "نیکی کی شروعات – The Origins of Virtue" ڈارونی اخلاقیات کے موضوع پر ایک عمدہ کتاب ہونے کے ساتھ ساتھ ساکھ کے مسئلے پر بھی بہت اہم نکات پیش کرتی ہے ۔

ناروے نژاد امریکی ماہر اقتصادیات تھورسٹائن وِیبلن اور اسرائیلی عالم حیوانیات آموتز زحاوی نے ایک اور دلچسپ خیال کا اظہار کیا ہے۔ ایثار پسندانہ رویے اپنے غلبے یا برتری کو باور کرانے کے لئے بھی اپنائے گئے ہو سکتے ہیں۔ بشریات کے ماہر اس کو پوٹلیچ اثر (Potlatch Effect) کے نام سے جانتے ہیں، جو بحر اوقیانوس کے شمال مغربی قبیلوں کی رسم پر مبنی ہے جس میں قبیلے کے سردار ایک دوسرے پر سبقت دکھانے کے لئے بڑی سے بڑی ضیافت کا اہتمام کرتے ہیں۔ شدید حالات میں جوابی کاروائیوں میں تفریحی سرگرمیاں اس قدر زور پکڑ جاتی ہیں کہ فریقین میں سے کوئی ایک دیوالیہ ہو جاتا ہے، جب کہ فاتح سردار کے

---

ساکھ انسانوں تک محدود نہیں ہے۔ حال ہی میں جانوروں میں باہمی ایثار پسندی میں ساکھ کی اہمیت بھی کار فرما پائی گئی۔ صفائی کرنے والی چھوٹی مچھلیوں اور ان کی جوم "گاہک" بڑی مچھلیوں میں باہم زیستانہ تعلقات دیکھنے میں آئے۔ ایک انتہائی اہم تجربے میں، بڑی مچھلیوں نے جو صفائی کرنے والی مچھلی "لابروآڈس ڈمیڈیاٹس– labroides dimdiatus" میں سے ان کا انتخاب کیا جن کو انہوں نے محنت سے صفائی کرتے پایا، اور جن ابروآڈس کو سستی کا مظاہرہ کرتے دیکھا انہیں نظر انداز کر دیا۔ دیکھئے آر ایس برشاری اور ای ایس گرٹر "Image scoring and cooperation in a cleaner fish mutualism"، نیچر ۴۴۱، ۲۲جون ۲۰۰۶، ۸-۹۷۵

پاس کوئی خاص وسائل باقی نہیں رہتے۔ جدید معاشرے کے کئی مبصرین بھی وبلن کے اس نمایاں مصرف (conspicuous consumption) کے تصور سے متاثر ہوئے ہیں۔ زحاوی نے پوٹلیچ اثر کا ایک ارتقائی نمونہ پیش کیا، جس کو کئی سال تک علماء حیاتیات نے نظر انداز کئے رکھا، جب تک کہ ارتقائی نظریہ کار ایلین گرافن کے ریاضی پر مبنی ماڈل نے اس کے خیالات کو صحیح ثابت نہیں کر دیا۔ زحاوی "عربی باتونی Arabian Babbler" نامی ایک پرندے پر تحقیق کرتا ہے، جو بھورے رنگ کے، گروہوں میں رہنے والے اور افزائش نسل کے لئے تعاون کرنے والے پرندے ہیں۔ بہت سے چھوٹے پرندوں کی طرح، یہ پرندے بھی دوسروں کو خبردار کرنے کے لئے چیخ و پکار کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو کھانے کے عطیات بھی دیتے ہیں۔ ایسی ایثار پسندانہ حرکات کی کوئی بھی ڈاروینی تفتیش سب سے پہلے تو پرندوں کے مابین باہمی رشتے کے تعلقات کا مشاہدہ کرے گی۔ جب یہ باتونی پرندہ کسی دوست کو کھانا کھلاتا ہے، تو کیا وہ یہ توقّع بھی رکھتا ہے کہ آئندہ کسی تاریخ پر دوسرا پرندہ اسے بھی ایسے ہی کھانا کھلائے گا؟ یا پھر یہ کہ رحمت وصول کرنے والا پرندہ کوئی قریبی رشتہ دار ہوتا ہے؟ زحاوی کی تفسیر بہت غیر متوقّع ہے ۔اس کے مطابق غالب آنے والے پرندے اپنا غلبہ برقرار رکھنے کے لئے ہی اپنے ماتحتوں کو کھانا مہیا کرتے ہیں۔ اگر ہم بشریت سے بھرپور زبان میں، جو زحاوی کو بہت پسند تھی، اس حرکت کی وضاحت کریں تو غالب پرندہ کچھ ایسی بات کر رہا ہے کہ "دیکھو میں تم سے کتنا افضل ہوں؛ میں تمہیں خوراک مہیا کر سکتا ہوں"۔ یا یہ کہ "دیکھو میں تم سے کتنا افضل ہوں؛ میں ایک اونچی شاخ پر بیٹھ کر اپنے آپ کو خطرے میں ڈال سکتا ہوں تاکہ باقی پرندوں کو جو زمین پر دانہ چگ رہے ہیں حملہ آور سے خبردار کر سکوں"۔ زحاوی اور اس کے ہم عصروں کے مشاہدات سے تو لگتا ہے کہ یہ باتونی پرندے چوکیدار کے خطرناک کام کے لئے باقاعدہ مقابلہ کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی ماتحت پرندہ کسی غالب پرندے کو کھانا پیش کرنے کی جسارت کرے تو اسے بہت برے طریقے سے جھٹک دیا جاتا ہے۔ زحاوی کی بات کا لب لباب یہ ہے کہ غلبے کی اشتہار بازی کی افادیت اس کی قیمت سے ظاہر ہوتی ہے۔ صرف حقیقتاًایک غالب پرندہ ہی اپنے غلبے کے اظہار کے لئے ایک مہنگا تحفہ دینے کی سکت رکھتا ہے۔ یہ پرندے اپنے غلبے کے مہنگے اظہار سے،جس میں ظاہری فیّاضی اور خطرے مول لینا شامل ہیں، کامیابی 'خریدتے' ہیں، مثلاً ازواج کو اپنی جانب راغب کرنا وغیرہ۔

ہمیں اب جانداروں کے آپسی ایثار پسندانہ رویّے، فیّاضی، اور اخلاقیات کے چار بہترین وجوہات موصول ہو چکے ہیں۔ اوّل، رشتہ داری کی مخصوص حالت؛ دوئم، باہمی تبادلے: احسان کا بدلہ چکانا، اور بدلہ چکائے جانے کی توقّع میں احسان کرنا؛ تیسرے، فیّاضی اور رحم دلی کی ساکھ بنا لینے کے ڈاروینی فوائد ؛ اور چوتھے (اگر زحاوی درست ہے تو) نمایاں مصرف کا ایک مخصوص اضافی فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کے عوض آپ اپنے غلبے کی مستند اشتہار بازی کر سکتے ہیں۔

زمانہ ما قبل تاریخ کے دوران انسان ایسے حالات میں رہ رہا تھا جو ایثار پسندی کی ان چاروں صورتوں کے ارتقاء کے لئے نہایت موزوں تھے۔ ہم گاؤں میں رہتے تھے، اور اس سے بھی پہلے بندروں کی طرح خانہ بدوش قبیلوں میں، جو دوسرے گاؤں یا قبیلوں سے تقریباً الگ تھلگ تھے۔ آپ کے قبیلے کے زیادہ تر ممبران آپ کے رشتہ دار ہوں گے، جو دوسرے قبیلے کے ممبران کے مقابلے میں آپ سے زیادہ قربت رکھتے ہوں گے۔ ایسے میں رشتہ داری سے منسلک ایثار پسندی کے پنپنے کے بہت سے مواقع میسّر آتے ہوں گے۔ اور بھلے وہ رشتہ دار ہوں یا نہ ہوں، آپ اپنی ساری زندگی زیادہ تر ان ہی افراد سے ملتے رہیں گے، جو کہ باہمی ایثار پسندی کی ترویج کے لئے نہایت موزوں حالات ہیں۔ ایثار پسندی کی ساکھ بنانے اور اپنی ظاہری فیّاضی کی اشتہار بازی کے لئے یہ مثالی حالات ہیں۔ قدیم انسانوں میں ان میں سے کسی ایک یا سب راستوں سے ایثار پسندی کے جینیاتی رجحانات کو تقویت ملی ہو گی۔ لہٰذا ہمارے لئے یہ سمجھنا بہت آسان ہے کہ ہمارے قدیم آباء و اجداد اپنے ہم قبیلہ سے بے حد خوش اخلاقی سے پیش آتے ہوں گے اور غیر قبیلے کے لوگوں سے نسلی امتیاز کی حد تک برا سلوک کرتے ہوں گے۔ لیکن اب جب کہ ہم بڑے بڑے شہروں میں بستے ہیں اور روزانہ ایسے کئی لوگوں سے ملتے ہیں جو کہ نہ صرف ہمارے رشتہ دار نہیں ہیں بلکہ جن سے ہم دوبارہ شاید ملیں گے بھی نہیں، ہم دوسروں کے ساتھ اچھائی کیوں کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے ساتھ بھی جنہیں غیر جماعتی کہا جا سکتا ہے؟

یہ بہت ضروری ہے کہ قدرتی انتخاب کی پہنچ کے بارے میں غلط بیانی نہ کی جائے۔ انتخاب ایسی کسی علمی بیداری (cognitive awareness )کے ارتقاء کی حمایت نہیں کرتا کہ ہمارے جینز کے لئے کیا اچھا ہے اور کیا نہیں۔ اس بیداری کو علمی سطح تک پہنچنے کے لئے بیسویں صدی کا انتظار کرنا پڑا، اور آج بھی اس کی مکمل سمجھ چند مخصوص سائنسدانوں کی ایک اقلیت تک محدود ہے۔ قدرتی انتخاب آسان اصولوں کا طرف دار ہے، جو ان جینز کو آگے بڑھاتے ہیں جنہوں نے ان اصولوں کو جنم دیا ہے۔ قدرتی طور پر آسان اصول کبھی کبھار ناکارہ بھی ہو جاتے ہیں۔ پرندے کے دماغ میں یہ اصول کہ "اپنے گھونسلے میں چھوٹے بچوں کا خیال رکھو، اور ان کی لال چونچوں میں خوراک ٹپکاؤ" عموماً ان جینز کی بقاء کا کام سر انجام دیتا ہے جنہوں نے اصول بنایا ہے، کیونکہ بالغ پرندے کے گھونسلے میں عموماً لال چونچ والے بچے اس کی اپنی اولاد ہوتی ہیں۔ یہ اصول اس وقت ناکارہ ہو جاتا ہے جب کوئی اور چھوٹا پرندا کسی طرح گھونسلے میں وارد ہو جاتا ہے، جو ایک ایسی صورت حال ہے جو کوئل دانستہ طور پر پیدا کرتی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہماری خوش اخلاقی اصول کے ناکارہ ہو جانے کا ایک نمونہ ہے،

بالکل اسی طرح جیسے نغمہ سنج پرندے کی پدرانہ حس غلط سمت میں ناکارہ ہو جاتی ہے جب وہ کوئل کے بچّے کو پالنے کے لئے جان کی بازی لگا دیتا ہے؟ اس سے بھی زیادہ قریبی موازنہ ہماری کسی کو گود لینے کی خواہش میں نظر آتا ہے۔ میں یہاں یہ وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ "ناکارہ ہونے" کی اصطلاح محض ڈارونی پیرائے میں استعمال کی گئی ہے۔ اس میں تضحیک کا کوئی پہلو شامل نہیں۔

"غلطی" یا "ضمنی پیداوار" کے جس خیال کو میں یہاں پیش کر رہا ہوں کچھ یوں کام کرتا ہے۔ زمانہ قدیم میں جب ہم چھوٹے اور مستحکم گروہوں میں رہتے تھے تب ہی قدرتی انتخاب نے ہمارے اندر ایثار پسندی کی لگن، جنسی بھوک، خوراک کی بھوک، اور اجنبیوں سے نفرت کے احساس وغیرہ کو ہمارے دماغوں میں ترتیب دے دیا تھا۔ ایک ذہین جوڑا ڈارون کی کتاب پڑھ کر یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ ان کی جنسی خواہشات کا حتمی مقصد افزائش نسل ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ عورت فی الحال حاملہ نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ حمل روکنے کی دوا استعمال کر رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی جنسی خواہش میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ جنسی خواہش آخر جنسی خواہش ہے اور فرد کی نفسیات میں اس کی قوّت اس ڈارونی دباؤ سے علیحدہ ہے جس کی وجہ سے خواہش پیدا ہوئی۔ یہ ایک طاقتور خواہش ہے جو اپنی حتمی توجیہہ سے علیحدہ وجود رکھتی ہے۔ میں یہ تجویز کر رہا ہوں کہ شفقت کی ترغیب ، بشمول ایثار پسندی، فیّاضی، ہمدردی اور ترس کے لئے بھی اتنا ہی سچ ہے۔ زمانہ قدیم میں ہمارے پاس ایثار پسندی دکھانے کے مواقع صرف قریبی رشتہ داروں سے ملتے تھے یا ان سے جن سے باہمی تبادلے کی امید کی جاسکتی ہے۔ آج کل اس قسم کی قباحتیں موجود نہیں، لیکن وہ سادہ اصول بدستور قابل عمل ہے۔ اور کیوں نہ ہو؟ یہ بھی جنسی خواہش کی ہی طرح ہے۔ جیسے ہم دوسری جنس کے ارکان کے لئے شہوت محسوس کرتے ہیں، چاہے وہ کسی وجہ سے افزائش نسل کے قابل ہو یا نہ ہو، ٹھیک اسی طرح ہم کسی روتے ہوئے مجبور شخص کو دیکھ کر اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ پاتے چاہے وہ ہمارا رشتہ دار نہ بھی ہو یا بدلے میں کچھ نہ بھی دے سکتا ہو۔ دونوں ہی ناکارگی کے نمونے ہیں: ڈارونی غلطیاں، مبارک، بیش قیمت غلطیاں۔

آپ ایک لمحے کے لئے بھی یہ مت سوچئے کہ ایثار اور فیّاضی کے ان جذبات کو ڈارونی تناظر میں ڈھالنے کا مقصد ان کی تضحیک یا تخفیف ہے۔ نہ ہی جنسی خواہش کے بارے میں ایسا کوئی مقصد پیش نظر ہے۔ جنسی خواہش جب لسانی تہذیب کے آب گزر کے ذریعے ہم تک پہنچتی ہے تو عظیم الشان شاعری اور ڈرامہ کا روپ دھار لیتی ہے: جیسے جان ڈن کی عاشقانہ نظمیں، یا رومیو جولییٹ کا ڈرامہ۔ اور ظاہر ہے ایسا ہی کچھ سلسلہ رشتہ داری اور باہمی تبادلے پر مبنی دردمند جذبات کے ساتھ بھی ہے۔ اپنے سیاق و سباق سے باہر، قرض دار پر رحم بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی اجنبی کے بچّے کو گود لے لیا جائے:

رحم کا جذ بہ محدود نہیں ہے
وہ تو جنّت سے ہلکی بارش کی طرح برستا ہے
نیچے زمین پر۔

بیشتر انسانی عزائم اور جدوجہد کے پیچھے کار فرما قوت جنسی خواہش ہی ہے، اور زیادہ تر ناکامی پر مبنی ہے۔ اگر یہ اصول ہماری قدیم دیہاتی زندگی کا نتیجہ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ فیّاض اور درد مند ہونے کی خواہش کے لئے بھی کار فرما نہ ہو۔ قدرتی انتخاب کے پاس زمانہ قدیم میں ہمارے دماغوں میں دونوں قسم کی خواہشات پیدا کرنے کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ سادہ ترین اصول ترتیب دے دیے جائیں۔

آج بھی ہم پر یہ سادہ اصول کسی کالونسٹ جبریتی (deterministic) انداز میں نہیں، بلکہ ادبیات، تہذیب، قوانین ، روایات اور مذہب کے ذریعے سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ جیسے جنسی خواہش کا قدیم ذہنی اصول تہذیب کی چھانی سے گزرتا ہوا رومیو جولیٹ کے محبت کے سین کی شکل اختیار کر لیتا ہے، ویسے ہی "ہم بمقابلہ دیگر" کے خاندانی دشمنی کے ذہنی اصول کے نتیجے میں اسی ڈرامے میں کیپولیٹ اور مونٹیگیو کی جھڑپوں کے سین بھی نظر آتے ہیں؛ جبکہ ایثار اور درد مندی سے منسلک ذہنی اصول اپنی ناکامی کی بدولت ہمیں آخری سین میں دو سدھرے ہوئے خاندانوں کا ملاپ دیکھنے کو ملتا ہے۔

## اخلاقیات کی بنیادوں کا ایک تحقیقاتی مطالعہ

اگر جنسی خواہش کی طرح ہماری اخلاقی حس کی جڑیں بھی قبل از مذہب ڈارونی تاریخ تک جاتی ہیں تو ہم توقع کر سکتے ہیں کہ انسانی دماغ پر کی جانے والی تحقیق میں ہمیں اخلاقیات کے کچھ دائمی قوانین ملیں گے جو تہذیبی، جغرافیائی اور، سب سے اہم، مذہبی حدود سے ماورا ہوں گے۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے ماہر

حیاتیات مارک ہاؤسر نے اپنی کتاب "اخلاقی ذہن: قدرت نے کیسے ہماری صحیح اور غلط حس کی ترتیب کی – Moral Minds: How Nature Designed Our Sense of Right and Wrong" میں نے تخیّلاتی تجربات کی ایک اہم سمت پر مزید کام کیا ہے، جسے اوائل میں اخلایات کے فلسفیوں نے تجویز کیا تھا۔ ہاؤسر کی تحقیق میں میرے لئے ایک اضافی فائدہ یہ ہے کہ مجھے ان فلسفیوں کے زاویہ نظر کو متعارف کرانے کا موقع بھی مل جائے گا۔ ایک فرضی اخلاقی دشواری کو بحث کے مقصد سے پیش کیا جاتا ہے، اور اسے سلجھانے میں ہمیں جو مشکل پیش آتی ہے اس سے ہمیں اپنی صحیح اور غلط کی حس کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ہاؤسر فلسفیوں پر سبقت لے جاتا ہے کیونکہ وہ حقیقت میں شماریاتی جائزے اور نفسیاتی تجربات کرتا ہے، جیسے کہ انسانوں کی اخلاقی حس کا جائزہ لینے کے لئے انٹرنیٹ پر سوالنامے ڈالنا۔ حالیہ نقطہ نگاہ سے جو دلچسپ بات سامنے آئی وہ یہ ہے کہ جب لوگوں کو ایسی دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے تو زیادہ تر لوگ ایک ہی جیسے فیصلوں کا انتخاب کرتے ہیں ، اور ان کا اتفاق رائے ان کے اپنے فیصلے کی وجہ بیان کرنے کی قابلیت سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ اگر ہمارے اندر کوئی اخلاقی حس ترتیب دی گئی ہے، تو ہمیں ایسے ہی رویّے کی توقع کرنی چاہئے، جیسے جنسی جبلّت یا اونچائی کا خوف یا، بقول ہاؤسر ہمارے زبان کی قابلیت ۔ہاؤسر (ایک تہذیب سے دوسری تہذیب کی تفصیلات میں فرق ہو سکتا ہے، لیکن قواعد کے کلیدی ڈھانچے پوری دنیا میں تقریباً یکساں ہیں)جیسا کہ ہم دیکھیں گے، ان اخلاقی تجزیات کی جانب لوگوں کا رد عمل اور ان کے وجوہات بیان کرسکنے کی عدم قابلیت کا ان کے مذہبی عقائد کی موجودگی یا عدم موجودگی سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ ہاؤسر کی کتاب کا پیغام، اس کے اپنے الفاظ میں، کچھ یوں ہے: ' ایک عالمی اخلاقی قاعدہ ہمارے اخلاقی اندازوں کا انتظام کرتی ہے، ہمارے ذہن کی ایک ایسی قابلیت جو کروڑوں سالوں کے ارتقائی عمل کے ذریعے ممکنہ اخلاقی نظاموں کا ایک سلسلے کی تعمیر کے لئے چند بنیادی اصول مرتب کرتی ہے ۔ زبان کے قواعد کی طرح جو قوانین ہمارے اخلاقی قواعد مرتب کرتے ہیں ہمارے شعور کی سطح سے نیچے رہتے ہیں۔

ہاؤسر کی اخلاقی دشواری کی مختلف مثالیں بے قابو ٹرک یا ریل کی پٹری پر بے قابو ٹرالی کی کہانی پر مبنی ہیں جن سے بہت سے لوگوں کی جان جانے کا خطرہ ہے۔ سب سے آسان مثال جسے ایک انسان آسانی سے سمجھ سکتا ہے وہ یوں بیان کی جاسکتی ہے۔ہم ایک ڈینیس نامی خاتون کا تصوّر کرتے ہیں جو ایک ایسی جگہ کھڑی ہے جہاں سے وہ ٹرالی کی سمت بدل کر اسےپٹری کے بازو میں دھکیل کر پٹری پر پھنسے پانچ لوگوں کی جان بچا سکتی ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ پٹری کے بازو میں ایک آدمی کھڑا ہے۔ لیکن، چونکہ وہ آدمی اکیلا ہے جبکہ پٹری پر پانچ لوگ ہیں، زیادہ تر قاری اس فیصلے سے اتفاق کرتے ہیں کہ یہ اخلاقی طور پر قابل قبول ہے کہ ڈینیس بٹن دبائے اور ٹرالی کو اکیلے آدمی کی جانب موڑ کر پانچ لوگوں کو بچالے۔ اس وقت ہم اس فرضی امکان کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ وہ اکیلا آدمی مشہور موسیقار بیتھوون یا آپ کا کوئی عزیز دوست بھی ہو سکتا ہے۔

اس ذہنی تجربے میں تفصیلات کے اضافے ہمارے سامنے بتدریج اخلاقی معمے پیش کرتے ہیں۔ کیا پل کے اوپر سے ٹرالی کے راستے میں کوئی بڑا وزن پھینکنے سے ٹرالی کو روکا جاسکتا ہے؟ اس سوال کا جواب تو آسان ہے: یقیناً ہمیں وزن پھینکنا چاہئے۔ لیکن اگر پل پر وزنی شے صرف ایک موٹا آدمی ہو، جو وہاں کھڑا غروب آفتاب سے لطف اندوز ہو رہا ہو؟ ہر کوئی اتفاق کرے گا کہ موٹے آدمی کو نیچے پھینک دینا ایک غیر اخلاقی حرکت ہو گی، اگر چہ ایک نقطہ نظر سے یہ اخلاقی معمہ ڈینیس کے معمے جیسا ہی ہے، جہاں بٹن دبانے سے ایک آدمی مرتا ہے اور پانچ بچ جاتے ہیں۔ زیادہ تر لوگوں کو غیر شعوری احساس ہو گا کہ اخلاقی دشواری کی ان دو مثالوں میں ایک اہم فرق ہے، اگر چہ ہم اس کو قابل فہم انداز میں بیان نہیں کر سکتے۔

موٹے آدمی کو پل سے نیچے پھینک دینا ہاؤسر کی بیان کردہ ایک اور دشواری کی یاد دلاتا ہے۔ پانچ مریض ہسپتال میں مختلف اعضا کی بیماریوں کے لئے زیر علاج ہیں۔ ہر کسی مریض کو بچایا جا سکتا ہے اگر اس کے بیمار عضو کی جگہ صحت مند عضو کی پیوند کاری کے لئے اپنا عضو خیرات کرنے والا کوئی مل جائے، لیکن کوئی بھی موزوں شخص میسر نہیں ہے۔ جراح کی نظر ایک صحت مند شخص پر پڑتی ہے جس کے پانچوں اعضا صحت مند ہیں اور پیوند کاری کے لئے موزوں بھی ہیں۔ اس کے باوجود ہم میں سے کوئی بھی اس بات سے اتفاق نہیں کرے گا کہ پانچ کی جان بچانے کے لئے ایک کو مار دینا چاہئے۔

جیسا ہم نے پل پر موجود موٹے آدمی کی مثال میں بھی دیکھا، ہم سب میں یہ حس مشترک ہے کہ ہم کسی معصوم انسان کو اس کی مرضی کے بغیر مشکل میں نہیں دھکیل سکتے اور اسے دوسرے لوگوں کے فائدے کے لئے استعمال نہیں کر سکتے۔ ایمانوئل کانٹ نے یہ اصول وضع کیا کہ کسی باشعور فرد کو اس کی رضا کے بغیر کسی مقصد کے لئے استعمال نہ کیا جائے، چاہے وہ مقصد کسی کی فلاح ہی کیوں نہ ہو۔ اس اصول کی بنیاد پر ہم پل پر کھڑے موٹے آدمی (یا ہسپتال میں موجود صحت مند آدمی) اور ڈینیس والی مثال میں ٹرالی سے ٹکرا جانے والے آدمی کے درمیان تفریق کر سکتے ہیں۔ موٹے آدمی کو دانستہ طور پر ٹرالی کو روکنے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ کانٹ کے اصول کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہے۔ پٹری کے بازو میں کھڑے ہوئے آدمی کو دانستہ طور پر دوسروں کی جان بچانے کے لئے استعمال نہیں کیاجا رہا۔ استعمال تو پٹری کا بازو ہو رہاہے؛ آدمی کی صرف قسمت خراب ہے کہ وہ اس وقت وہاں کھڑا ہے۔ لیکن جب آپ

ایسی کوئی تفریق ایجاد کر لیتے ہیں تو وہ آپ کو مطمئن کیوں کر دیتی ہے؟ کانٹ کے لئے یہ ایک اخلاقی حتمیت تھی؛ ہاؤسر کے نزدیک یہ ایک ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے۔

بے قابو ٹرالی سے منسلک تخیّلاتی صورت حال بتدریج پیچیدہ ہوتی چلی جاتی ہے، اور دو طرفہ اخلاقی دشواریاں مزید مشکل۔ ہاؤسر دو فرضی اشخاص نیڈ اور آسکر کو درپیش دشواریوں کا تقابل کرتا ہے۔ نیڈ ریل کی پٹری کے پاس کھڑا ہے۔ ڈینیس کے برعکس، اگر نیڈ بٹن دبائے گا تو ٹرالی پٹری کے متبادل رستے سے گزرے گی، لیکن مرکزی پٹری پر پھنسے ہوئے پانچ لوگوں سے پہلے پھر پٹری سے جاملے گی۔ ظاہر ہے، نیڈ کے بٹن دبانے سے ان پانچ لوگوں کی جان نہیں بچ سکے گی۔ لیکن متبادل پٹری پر ایک موٹا آدمی کھڑا ہے جو اتنا بھاری ہے کہ اس کے وزن سے ٹرالی رک سکتی ہے۔ کیا نیڈ کو بٹن دبا کر ٹرالی کو متبادل راستے پر ڈال دینا چاہئے؟ زیادہ تر لوگوں کی فطری حس ایسا کرنے کے خلاف ہو گی۔ لیکن نیڈ کی دشواری اور ڈینیس کی دشواری میں کیا فرق ہے؟ غالباً لوگ فطری طور پر کانٹ کے اصول کا اطلاق کرنا چاہیں گے۔ ڈینیس ٹرالی کو پٹری کے بازو میں منتقل کر دیتی ہے، جس سے پانچ لوگ تو بچ جاتے ہیں لیکن بد قسمتی سے بازو میں کھڑا آدمی، ڈانلڈ مسفیلڈ کے الفاظ میں، 'منسلک املاک کا نقصان' ( collateral damage) بن جاتا ہے۔ ڈینیس اسے دوسروں کو بچانے کے لئے استعمال نہیں کر رہی۔ جبکہ نیڈ دانستہ طور پر موٹے آدمی کو ٹرالی روکنے کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ زیادہ تر لوگ (بغیر سوچے سمجھے) اور کانٹ (بہت سوچ وچار کے بعد) اس کو ایک اہم فرق سمجھتا ہے۔

یہ فرق ایک بار پھر آسکر کی دشواری کے بیان کے دوران واضح ہو تا ہے۔ آسکر کی صورت حال بالکل نیڈ جیسی ہے؛ واحد فرق یہ ہے کہ متبادل پٹری پر موٹے آدمی کی بجائے لوہے کا وزن پڑا ہے جو اتنا بھاری ہے کہ ٹرالی کو روک سکتا ہے۔ آسکر کو ٹرالی کا راستہ بدل کر مقابل پٹری پر ڈالنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہونی چاہئے۔ سوائے اس بات کے، کہ وزن کے سامنے سے ایک مسافر گزر رہا ہے۔ وہ بھی نیڈ کے موٹے آدمی کی طرح ٹرالی کے ساتھ تصادم میں مارا جائے گا۔ فرق یہ ہے کہ آسکر کا مسافر ٹرالی روکنے کے لئے استعمال نہیں کیا جا رہا: وہ تو صرف 'املاک کا نقصان' ہے، جیسے ہم نے ڈینیس کی شواری میں دیکھا۔ آسکر کی طرح میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ آسکر کو بٹن دبانے کی اجازت ہے لیکن نیڈ کو نہیں۔ میں اپنے اس فطری احساس کو سمجھا پانے سے قاصر ہوں۔ ہاؤسر کا نقطہ یہ ہے کہ ایسے اخلاقی احساسات کو دانستہ سوچا نہیں گیا ہوتا لیکن ہم اس کے باوجود اپنے ارتقائی ورثے کی بدولت انہیں شدّت سے محسوس کرتے ہیں۔

بشریات کے میدان میں ایک دلچسپ مگر پر خطر موڑ لیتے ہوئے ہاؤسر اور اس کے ہم عصروں نے اپنے اخلاقیاتی تجربات کو وسطی امریکہ کے قبیلے کونا کے لئے موزوں بنانے کے لئے ان میں کچھ رد و بدل کیا۔ کونا کا مغربی تہذیب سے میل ملاپ نہ ہونے کے برابر ہے، اور ان کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ محققین نے "پٹری پر ٹرالی" والے تخیلاتی تجربے کو کونا کے ماحول کی مناسبت سے تبدیل کر دیا، مثلاً مگر مچھ جو ان کی کشتی کی جانب تیر رہے ہیں۔ چند نہایت معمولی فرق چھوڑ کر، کونا کے اخلاقی فیصلے بھی وہی ہوتے جو باقی سب کے رہے تھے۔

اس کتاب کے سیاق و سباق میں ہاؤسر کی جو بات سب سے دلچسپ رہی وہ اس کا یہ سوال تھا کہ کیا مذہبی لوگوں اور لادین لوگوں کے اخلاقی وجدان میں کوئی فرق موجود ہے؟ یقیناً، اگر ہم اپنی اخلاقیات مذہب سے حاصل کرتے ہیں تو ایک واضح فرق نظر آ نا چاہئے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ دونوں میں کوئی قابل ذکر فرق نہیں ہے۔ ہاؤسر نے اخلاقیات کے فلسفی پیٹر سنگر کے ساتھ کام[81] کرتے ہوئے تین تخیلاتی دشواریوں پر اپنی توجہ مرکوز کی اور لادین لوگوں کے فیصلوں کا مذہبی لوگوں کے فیصلوں سے تقابل کیا۔ تینوں دشواریوں کے بارے میں پوچھا گیا کہ آیا وہ واجب ہیں، جائز ہیں یا ممنوع ہیں۔ وہ تین دشماریاں یہ تھیں:

۱. ڈینیس کی دشواری: ۹۰ فی صد لوگوں نے کہا کہ ٹرالی کا راستہ موڑ دینا جائز تھا، تاکہ صرف ایک کو مار کر پانچ کو بچایا جا سکے۔

۲. آپ ایک بچّے کو تالاب میں ڈوبتے ہوئے دیکھتے ہیں اور اس کو بچانے والا کوئی نہیں۔ آپ بچّے کو بچا سکتے ہیں لیکن آپ کی پتلون خراب ہو جائے گی۔ ۹۷ فی صد لوگوں نے اتفاق کیا کہ آپ کو بچّے کو بچانا چاہئے (حیرت کی بات ہے کہ ۳ فی صد ایسے بھی تھے جنہوں نے پتلون بچانے کو ترجیح دی)۔

۳. عضو کی منتقلی کی دشواری: ۹۷ فی صد لوگوں نے اتفاق کیا کہ ایک آدمی کو پکڑ نا تاکہ اس کے اعضاء پانچ لوگوں کے لئے استعمال کئے جا سکیں اخلاقی طور پر ممنوع ہے۔

ہاؤسر اور سنگر کی تحقیق کا مرکزی نتیجہ یہ تھا کہ مذہبی اور لادین لوگوں کے فیصلوں میں کوئی شماریاتی طور پر اہم فرق نہیں تھا۔ یہ اس زاویے سے مطابقت رکھتا ہے جو میں اور مجھ جیسے کئی لوگ رکھتے ہیں ۔ کہ ہمیں اچھا یا برا ہونے کے لئے کسی خدا کی ضرورت نہیں۔

## اگر کوئی خدا نہیں، تو اچھائی کیوں کی جائے؟

ایسے الفاظ میں لکھا جائے تو یہ سوال نہایت گھٹیا لگتا ہے۔ جب کوئی مذہبی شخص مجھ سے یہ سوال ان الفاظ میں کرتا ہے (اور بہت سے کرتے بھی ہیں) تو میری فوری خواہش ہوتی ہے کہ میں ان کو اس جواب کے ساتھ للکاروں: 'کیا آپ مجھے یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ آپ کے اچھے ہونے کی واحد وجہ یہ ہے کہ آپ خدا کی خوشنودی اور انعام حاصل کرنا چاہتے ہیں یا آپ اس کی ناراضی اور سزا سے خوف زدہ ہیں؟ یہ اخلاقیات نہیں، محض خوشامد ہے، مڑ مڑ کر آسمان میں نصب اس نگراں کیمرے کو دیکھنا ہے، یا وہ چھوٹا سا جاسوسی کا آلہ ہے جو آپ کے دماغ میں نصب ہے، آپ کی ہر حرکت کو دیکھتا ہوا، یہاں تک کہ آپ کے بنیادی خیالات پر بھی نظر رکھتا ہوا'۔ جیسا کہ آئنسٹائن نے کہا تھا: 'اگر لوگ محض اس لئے اچھے ہیں کیونکہ وہ سزا سے ڈرتے ہیں اور انعام کی امید رکھتے ہیں، تو ہم یقیناً بہت بیچارے ہیں'۔ "اچھائی اور برائی کی سائنس" میں مائیکل شرمر اس کو اختتام بحث کہتا ہے۔ اگر آپ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ آپ خدا کی عدم موجودگی میں 'ڈاکہ ڈالیں گے، عزّت لوٹیں گے، اور قتل کریں گے' تو آپ خود کو ایک غیر اخلاقی شخص کے طور پر ظاہر کر رہے ہیں، 'اور ہمارے حق میں بہتر ہو گا کہ ہم آپ سے فاصلے پر رہیں'۔ لیکن اس کے بر عکس اگر آپ یہ اعتراف کریں کہ خدائی جاسوسی کی غیر موجودگی کے باوجود آپ اپنی اچھائی پر بدستور قائم رہیں گے تو آپ نے اپنے اس دعوے پر خود ہی مہلک ضرب لگا دی ہے کہ اچھائی کے لئے خدا کا ہونا نا گزیر ہے۔ مجھے شک ہے کہ بہت سے مذہبی لوگ یہی سوچتے ہیں کہ مذہب ہی ان کو اچھائی کی راہ پر گامزن رکھنے کا محرک ہے، خاص طور پر اگر آپ کا عقیدہ ان عقائد میں سے ایک ہے جو آپ کے ذاتی احساس جرم کا استحصال کرتے ہیں۔

میرے خیال میں ایسے شخص کی عزت نفس بہت کمزور ہو گی جو یہ سمجھتا ہو کہ اگر دنیا سے خدا پر یقین ختم ہو جائے تو ہم سب کٹھور اور خود غرض لذّت پسند بن جائیں گے؛ نہ کوئی رحم دلی باقی بچے گی نہ خیرات اور نہ فیّاضی، اچھائی کہلانے والی کوئی بھی چیز نہیں رہے گی۔ عموماً ایسا مانا جاتا ہے کہ دوستوسکی کا بھی یہی خیال تھا، غالباً ان جملوں کی وجہ سے جو اس نے آیون کارامازوو کی زبان سے کہلوائے:

> [آیون] نے بڑی سنجیدگی سے کہا کہ قدرت میں ایسا کوئی قانون نہیں ہے جو آدمی کو انسانیت سے پیار کرنا سکھائے، اگر محبت کا کوئی وجود تھا اور آج تک دنیا میں باقی تھا تو وہ کسی قانون قدرت کے توسط سے نہیں بلکہ کلّی طور پر اس وجہ سے ہوا ہو گا کہ انسان کو اپنے لافانی ہونے پر مکمل یقین ہے۔ ساتھ ہی اس نے اضافتاً یہ بھی کہا کہ قانون قدرت بس اتنا ہی تو تھا، یعنی اگر اپنی لافانیت میں اس کا یقین متزلزل ہو جائے تو نا صرف اس کی محبت کرنے کی قابلیت ختم ہو جائے گی بلکہ وہ اہم قوتیں بھی ختم ہو جائیں گی جن کی وجہ سے زمین پر زندگی قائم ہے۔ مزید بر آں، پھر کچھ بھی لافانی نہیں رہے گا، اور سب کچھ کرنے کی کھلی آزادی ہو گی، یہاں تک کہ آدم خوری کی بھی۔ اور بالآخر، ایسا کہ یہ سب کافی نہیں تھا، اس نے یہ دعویٰ بھی کر دیا کہ ہر ایسے فرد کے لئے، جیسے کہ آپ اور میں، جو خدا پر اور اپنی لافانیت پر یقین نہیں رکھتا، قانون قدرت اس مذہبی قانون کا مکمل الٹ بن جائے گا جو اس سے پہلے موجود تھا، اور خود پسندی کے جرم کی حد تک ، نہ صرف اس کی اجازت ہو گی بلکہ اسے زندگی کی سب سے اہم، سب سے منطقی، اور سب سے عظیم وجہ کے طور پر تسلیم بھی کیا جائے گا[۸۲]۔

شاید سادگی میں میں نے آیون کارامازوو کے مقابلے میں انسانی قدرت کے قدرے کم مایوس کن نظریے کی طرف جھکاؤ کا اظہار کر دیا۔ کیا ہمیں خود غرض اور مجرمانہ زندگی سے اجتناب کے لئے واقعی اپنی نگرانی کی ضرورت ہے، چاہے وہ خدا کی طرف سے ہو یا ایک دوسرے کی طرف سے ہو؟ میں شدت سے یقین کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے اس قسم کی نگرانی کی ضرورت نہیں ہے اور، محترم قاری، نہ ہی آپ کو ہے۔ اس کے بر عکس، محض اپنے اعتماد کو کمزور کرنے کے لئے، سٹیون پنکر کے الفاظ میں مونٹریال میں پولیس کی ہڑتال کی یہ مایوس کن رو داد بھی سن لیجئے، جو اس نے Blank Slate میں بیان کی ہے:

۱۹۶۰ کی رومانوی دیہائی میں قابل فخر حد تک پر امن کینیڈا میں جوان ہوتے ہوئے میں باکنین کی لاقانونیت (anarchism) کا قائل تھا۔ میں اپنے والدین کے اس دعوے کو ہنسی میں اڑا دیتا تھا کہ اگر حکومت ہتھیار ڈال دے تو معاشرے میں تباہی پھیل جائے گی۔ ہماری مد مقابل پیشگویوں کو ۱۷ اکتوبر ۱۹۶۹ صبح ۸ بجے امتحان کا سامنا ہوا، جب مونٹریال کی پولیس ہڑتال پر چلی گئی۔ ۱۱:۲۰ میں بینک پر ڈاکہ پڑ چکا تھا۔ ۱۲ بجے تک وسطی شہر کی زیادہ تر دکانیں لوٹ کی وجہ سے بند ہو چکی تھیں۔ چند گھنٹوں میں ٹیکسی چلانے والوں نے ایک لیموزین سروس کے گیراج کو آگ لگا دی تھی کیونکہ وہ ہوائی اڈے کی سواریوں کے لئے ان سے مقابلے کرتے تھے، چھت پر چڑھے ایک نشانے باز نے صوبائی پولیس کے ایک افسر کو گولی مار دی تھی، بلوائی متعدد ہوٹلوں اور ریستورانوں میں گھس گئے تھے، اور ایک ڈاکٹر نے اپنے مضافاتی مکان میں ایک چور کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ دن کے اختتام پر جب تک ماؤنٹیز (کینیڈین پولیس) نے امن بحال کیا، چھ بینک لوٹے جاچکے تھے، سو سے زائد دکانیں لوٹی گئیں ، بارہ مقامات پر آگ لگائی گئی ، تقریباً چالیس گاڑیوں کی دکانوں کے شیشے توڑے گئے تھے، اور تین ملین ڈالر کی املاک کا نقصان ہو چکا تھا۔ اس فیصلہ کن عملی امتحان نے میرے سیاسی نظریات کو تار تار کر کے رکھ دیا تھا....

اگر میں یہ مانتا ہوں کہ خدا کی نگرانی نہ ہونے کے باوجود انسان اچھے ہی رہیں گے تو شاید مجھے بھی رجائیت پسند کہا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس، مونٹریال کی زیادہ تر آبادی غالباً خدا پر ایمان رکھتی تھی۔ پھر جب دنیاوی پولیس والوں کو عارضی طور پر موقعے سے ہٹا دیا گیا تھا تو خوف خدا نے ان کو روکا کیوں نہیں ؟ کیا اس نظریے کے تجزیے کے لئے کہ خدا ہمیں اچھا بناتا ہے مونٹریال کی ہڑتال کیا ایک نہایت اچھا قدرتی تجربہ نہیں تھی؟ کیا ناقد ایچ ایل مینکن صحیح کہہ رہاتھا کہ 'لوگ کہتے ہیں انہیں خدا کی ضرورت ہے جبکہ حقیقت میں انہیں پولیس کی ضرورت ہوتی ہے'؟

ظاہر ہے مونٹریال میں ہر کسی نے تو پولیس کے ہٹتے ہی غلط کام نہیں شروع کر دیا تھا۔ اگر کوئی خفیف سا شماریاتی رجحان بھی نظر آتا کہ مذہبی لوگوں نے لادین لوگوں کے مقابلے میں کم لوٹ مار کی تھی تو یہ بہت دلچسپ دریافت ہوتی۔ میری انجان پیش گوئی اس سے بالکل الٹ ہوتی۔ عموماً مایوس کن انداز میں یہ کہا جاتا ہے کہ جنگی مورچے میں کوئی دہریے نہیں ہوتے۔ مجھے شبہ ہے (جس کے لئے میرے پاس ثبوت بھی ہے، اگرچہ اس سے نتیجے اخذ کرنا مناسب نہیں) کہ جیلوں میں دہریوں کی تعداد بہت کم ہے۔ میں یہ دعویٰ نہیں کر رہا کہ لادینیت اخلاقیات میں اضافہ کرتی ہے، اگرچہ انسان دوستی کے نظریہ (humanism)کا غالباً یہی ماننا ہے کہ یہ وہ اخلاقی نظام ہے جو لادینیت سے منسلک ہے ۔ ایک اور اہم امکان یہ بھی ہے کہ لادینیت کا کسی تیسرے عنصر سے بھی تعلق ہے، جیسے کہ اعلیٰ تعلیم، ذہانت یا سنجیدگی، جو شاید جرائم کے رجحانات کو روکنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ جو تھوڑے بہت تحقیقاتی شواہد موجود ہیں یقیناً اس نظریے کی حمایت نہیں کرتے کہ مذہبیت اور اخلاقیات کا کوئی باہمی ربط (correlation) ہے۔ باہمی ربط کے شواہد کبھی بھی نتیجہ خیز نہیں ہوتے، لیکن درج ذیل معلومات جو سام ہیرس نے اپنے مقالے "عیسائی قوم کے نام ایک خط–Letter to a Christian Nation" میں فراہم کی ہیں۔وہ بہت حیران کن ہیں:

> اگرچہ امریکہ میں سیاسی جماعتوں کے ساتھ وابستگی کامل حد تک مذہبیت کی نشاندہی نہیں کرتی، یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ 'لال [ریپبلیکن] ریاستیں' قدامت پسند عیسائیوں کے سیاسی اثر و رسوخ کی بدولت لال ہیں۔ اگر عیسائی قدامت پسند اور معاشرتی صحت میں کوئی باہمی ربط ہوتا تو ہم لال ریاستوں میں اس کو عمل پیرا ہوتے دیکھ پاتے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ان ۲۵ شہروں میں جہاں جرائم کی تعداد سب سے کم ہے، ۶۲ فیصد نیلی [ڈیموکریٹ] ریاستوں میں ہیں جبکہ باقی ۳۸ فیصد لال ریاستوں میں ہیں۔ ۲۵ سب سے خطرناک شہروں میں سے ۷۶ فیصد لال ریاستوں میں ہیں جبکہ ۲۴ فیصد نیلی ریاستوں میں ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پانچ سب سے خطرناک شہروں میں سے تین ٹیکساس کی " خدا پرست" ریاست میں ہیں۔ جن بارہ

ریاستوں میں ڈاکے کی شرح سب سے زیادہ ہے وہ تمام کی تمام لال ریاستیں ہیں۔ چوری کے سب سے زیادہ واقعات والی ۲۹ ریاستوں میں سے ۲۴ لال ہیں۔ قتل کے سب زیادہ واقعات والی ۲۲ ریاستوں میں سے ۱۷ لال ریاستیں ہیں ۔

ایک منظم تحقیق ربط باہمی کے معلومات کی حمایت کرتی ہے۔ جریدہ مذہب و معاشرہ ۲۰۰۵ (Journal of Religion and Society) میں گریگوری ایس پال نے نہایت منظم انداز میں ۱۷ اقتصادی طور پر ترقی یافتہ ممالک کا موازنہ کیا اور اس تہلکہ خیز نتیجے پر پہنچا کہ 'جہاں کسی خالق پر ایمان اور اس کی عبادت کی شرح زیادہ تھی وہیں قتل، جواں عمری کی اموات، جنسی بیماری، جواں عمری کے حمل اور اس کو گرانے کے واقعات کی شرح بھی زیادہ تھی'۔

"طلسم شکنی" (Breaking the Spell) میں ڈین ڈینیٹ اپنے مخصوص طنز آمیز انداز میں ایسی تحقیق پر رائے کا اظہار کرتا ہے:

> کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان نتائج نے مذہبی لوگوں میں بہتر اخلاقی اقدار کے دعوے پر ایسی زور دار اور کاری ضرب لگائی ہے کہ ان نتائج کو جھٹلانے کی خاطر مذہبی اداروں کی طرف سے کی جانے والی تحقیق میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے.... ایک بات جس کے بارے میں ہم پر اعتماد ہو سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگر اخلاقی رویے اور مذہبی وابستگی، عمل یا عقیدے میں کوئی تعلق ہے تو وہ بہت جلد دریافت ہو جائے گا، کیونکہ مذہبی اداروں کی کثیر تعداد اپنے روایتی عقائد کو سائنسی تحقیق کے ذریعے ثابت کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ (جب سائنس ان باتوں کی حمایت کرتی ہے جن پر وہ پہلے سے ایمان رکھتے ہیں تو یہ مذہبی لوگ سائنس کی سچ کو کھوج نکالنے کی قابلیت کے خاصے مداح نظر آتے ہیں)۔ ہر مہینہ جو اس ثبوت کی دریافت کے بغیر گزر جاتا ہے ہمارے شک کو مضبوط کرتا ہے کہ ایسا ہونے والا نہیں ۔

تفکّر کرنے والے زیادہ تر لوگ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ نگرانی کی عدم موجودگی میں بھی اخلاقیات پر قائم رہنا ہی حقیقی اخلاقی رویہ ہے اور اس دوغلی اخلاقیات سے کہیں افضل ہے جو پولیس کے ہڑتال پر جاتے ہی ختم ہو جاتی ہے ، یا جب کیمرے کو بند کر دیا جائے غائب ہو جاتی ہے۔ خواہ وہ پولیس کے دفتر میں دیکھا جانے والا کیمرہ ہو یا آسمان میں نصب کوئی فرضی کیمرہ ہو ۔ لیکن "اگر کوئی خدا نہیں، تو اچھائی کیوں کی جائے" والے سوال کا جواب ناقدانہ اور مایوس کن انداز میں دینا بھی مناسب نہیں[§§§§§§§§§§§]۔ ایک مذہبی مفکر کسی فرضی عذر خواہ کے اس بیان کے طرز پر ایک حقیقی طور پر اخلاقی تشریح بھی پیش کر سکتا ہے۔ 'اگر تم خدا پر ایمان نہیں رکھتے تو تم اخلاقیات کے کسی حتمی معیار کو بھی نہیں مانتے۔ تم ایک اچھا انسان بننے کا زبر دست ارادہ رکھ سکتے ہو، لیکن تم یہ فیصلہ کیسے کرو گے کہ کیا اچھا ہے اور کیا برا؟ بالآخر مذہب ہی تمہیں اچھائی اور برائی کا وہ معیار فراہم کر سکتا ہے۔ مذہب کی عدم موجودگی میں تمہیں یہ معیار خود حسب ضرورت تراشنے پڑیں گے۔ ایسی اخلاقیات کسی کتابی اصول کے بغیر استوار ہو گی: منصوبہ بندی کے بغیر اخلاقیات۔ اگر اخلاقیات محض ذاتی انتخاب کا مسئلہ ہے، تو پھر ہٹلر بھی اپنے "نظریہ اصلاح نوع انسانی" (eugenics) کے معیار کی بنا پر اخلاقی انسان ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے، اور دہریہ کسی مختلف معیار کی بنیاد پر زندگی گزارنے کے لئے محض ایک ذاتی انتخاب کر سکتا ہے۔ اس کے بر عکس عیسائی ، یہودی یا مسلمان دعویٰ کر سکتا ہے کہ برائی کا ایک حتمی مطلب ہے، جو ہمیشہ اور ہر جگہ سچ ہے، اور جس کے مطابق ہٹلر صریحاً برا تھا'۔

اگر یہ سچ بھی ہو کہ ہمیں اچھا ہونے کے لئے خدا کی ضرورت ہے، تو بھی یہ خدا کے وجود کو ممکن نہیں محض مرغوب بناتا ہے (زیادہ تر لوگ دونوں حالتوں میں فرق نہیں بتا سکتے)۔ لیکن یہاں مسئلہ یہ نہیں ہے۔ میرے فرضی مذہبی عذر خواہ کو یہ اعتراف کرنے کی کوئی حاجت نہیں کہ اچھائی کرنے کا اصل مقصد خدا کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ بلکہ اس کا دعویٰ تو یہ ہو گا کہ قطع نظر اس سے کہ اچھائی کرنے کا مقصد کیا ہے، خدا کی غیر موجودگی میں اچھائی اور برائی میں فرق پہچاننے کے لئے کوئی معیار ہو گا ہی نہیں۔ ہم میں سے ہر ایک اچھائی کی اپنی تعریف گڑھ سکتا ہے اور اپنی زندگی کے فیصلے اس تعریف کے مطابق کر سکتا ہے۔ جو اخلاقی اصول مذہب پر مبنی ہوتے ہیں (اس کے بر عکس 'سنہرے اصول'، جو عموماً مذہب سے منسوب کر دیے جاتے ہیں کہیں سے بھی

---

یہ بھی غور طلب ہے کہ برطانیہ میں رنگوں کی یہ رسمی تفریق بالکل الٹ ہے، نیلا رنگ کنزرویٹو جماعت کا ہے اور جیسا کہ باقی دنیا میں بھی رائج ہے، لال رنگ بائیں بازو کی پارٹیوں کے لئے مختص ہے۔

[§§§§§§§§§§§] ایچ ایل مینکن نے اپنے مخصوص ناقدانہ انداز میں ضمیر کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ ہمارے اندر کی آواز ہے جو ہمیں متنبہ کرتی ہے کہ شاید کوئی ہمیں دیکھ رہا ہو۔

اخذ کئے جا سکتے ہیں) قطعی (absolutist) کہلائے جا سکتے ہیں۔ اچھائی اچھائی ہے اور برائی برائی ہے، اور ہم مخصوص حالات پر بحث نہیں کرتے کہ کسی کو نقصان پہنچتا ہے یا نہیں۔ میرا مذہبی عذر پسند کہے گا کہ صرف مذہب ہی اچھائی اور برائی میں تمیز کی بنیاد فراہم کر سکتا ہے۔

کچھ فلسفیوں نے، جن میں کانٹ قابل ذکر ہے، غیر مذہبی ذرایع سے حتمی اخلاقی اصول اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ وہ خود ایک مذہبی آدمی تھا، جیسا کہ اس دور کا معمول تھا*************، کانٹ نے خدا کی خاطر فرض کی بجائے فرض کی خاطر فرض کے اصول پر اخلاقیات کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی۔ اس کی مشہور "واضح ضرورت" (categorical imperative) اس اصول پر عمل کرنے کی تاکید کرتی ہے جسے آپ عالمگیر قانون بنانے کا ارادہ نہ کر سکیں۔ اس کو جھوٹ بولنے کی مثال کے لئے بآسانی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ایک ایسی دنیا کا تصوّر کیجئے جہاں لوگ اصولاً جھوٹ بولتے ہیں، جہاں جھوٹ بولنے کو ایک اچھی اور اخلاقی حرکت سمجھتے ہیں۔ ایسی دنیا میں لفظ "جھوٹ" کا کوئی مطلب ہی نہیں رہ جاتا۔ جھوٹ کی تعریف بنانے کے لئے ہمیں سچ کے مفروضے کی ضرورت ہے۔ اگر اخلاقی اصول کوئی ایسی چیز ہے جس کے بارے میں ہم چاہتے ہیں کہ کوئی اس پر عمل کرے، تو جھوٹ بولنا اخلاقی اصول نہیں ہو سکتا کیونکہ اصول خود ہی بے معنی ہو کر ناکارہ ہو جائے گا۔ بطور اصول زندگی، جھوٹ باطنی طور سے غیر مستحکم ہے۔ عمومی طور پر خود غرضی یا دوسروں کی نیک نیتی پر کھلے عام مفت خوری میرے لئے ایک اکیلے خود غرضی کے طور پر کام کر سکتا ہے اور مجھے ذاتی تسکین بھی دے سکتا ہے۔ لیکن میں یہ خواہش نہیں کر سکتا کہ سب لوگ اس خود غرض مفت خوری کی ڈگر پر چل نکلیں، کیونکہ ایسی صورت حال میں میرے پاس مفت خوری کرنے کے لئے کوئی بچے گا ہی نہیں۔

کانٹ کی واضح ضرورت کا نظریہ راست گوئی اور کچھ دوسرے مسائل کے لئے کسی حد تک موزوں ہے۔ لیکن اس کا دیگر اخلاقی معاملات پر اطلاق آسان نہیں۔ ایسے میں میرے فرضی عذر خواہ سے اتفاق کرنا مشکل نہیں کہ حتمی اخلاقیات مذہب سے جنم لیتی ہیں۔ کیا کسی جان لیوا مرض (جیسے کینسر یا ایڈز کے آخری ایام) میں مبتلا شخص کو اس کی درخواست پر تکلیف سے نجات دلانا اخلاقی طور پر ہمیشہ غلط ہو گا؟ کیا اپنی جنس کے کسی شخص کے ساتھ مباشرت کرنا ہمیشہ غلط ہی ہوتا ہے؟ کیا نطفے کو گرانا ہمیشہ غلط ہی ہوتا ہے؟ دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ایسا ہی مانتے ہیں، اور ان کا زاویہ حتمی ہوتا ہے اور وہ کسی قسم کے بحث ومباحثے کی اجازت نہیں دیتے۔ ان سے اختلاف کرنے والے کو حقیقت میں نہیں، صرف استعارۃً گولی مار دی جائے گی۔ ما سوائے چند بے چارے ڈاکٹروں کے جو حمل گرانے کی کلینک میں کام کرتے ہیں (اگلے باب میں ملاحظہ کیجئے)۔ خوش قسمتی سے اخلاقیات کا حتمی ہونا ضروری نہیں۔

صرف اخلاقیات کے فلسفی ہی صحیح اور غلط میں امتیاز کرنے کی ضروری پیشہ ورانہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ جیسے رابرٹ ہنڈ نے جامع انداز میں کہا: وہ اتفاق کرتے ہیں کہ 'اخلاقی اصول اگر استدلال سے اخذ نہ بھی کئے گئے ہوں تو بھی استدلال سے قابل دفاع ضرور ہونے چاہئیں'۔ اگرچہ وہ مختلف اقسام میں اپنی درجہ بندی کرتے ہیں، انہیں عمومی طور پر دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک طرف تو کانٹ کی طرح کے علم الاخلاق کے ماہرین (deontologist) ہیں، جبکہ دوسری جانب جیریمی بینتھم (۱۸۳۲ – ۱۷۴۸) جیسے متعاقبی (consequentionalists) فلسفی موجود ہیں۔ علم الاخلاق اسی نظریہ کا ایک دیدہ زیب نام ہے جسے اخلاقیات کے اصولوں کی پاسداری بھی کہا جاتا ہے۔ ۔ یہ لغوی طور پر اخلاقی پابندی کی سائنس ہے اور یونانی زبان میں اس کا مطلب ہے 'وہ جس کو باندھ دیا جائے'۔ اگرچہ علم الاخلاق کا مطلب یہ نہیں کہ اسے اخلاقی اصول پرستی سمجھ لیا جائے، لیکن مذہب کے موضوع پر کسی بھی کتاب میں اس تفریق کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ اصول پرست یہ مانتے ہیں کہ اچھائی اور برائی کے حتمی درجات ہیں، جو اتنے ناگزیر ہیں کہ ان کا صحیح ہونا ان کے نتائج پر منحصر نہیں۔ متعاقبی فلسفیوں کا ماننا ہے کہ کسی حرکت کی اخلاقی قدر اس کے نتائج سے ہی اخذ کی جاسکتی ہے۔ متعاقبیت کی ایک صورت نظریہ افادیت (utilitarianism) ہے اور بینتھم، اس کے دوست جیمز مل (۱۸۳۶ – ۱۷۷۳) اور مل کے بیٹے جان سٹوارٹ مل (۷۳ – ۱۸۰۶) سے منسلک ہے۔ بد قسمتی سے نظریہ افادیت کا خلاصہ بینتھم کے اس غیر صحیح تکیہ کلام سے منسوب ہو کر رہ گیا: 'اخلاقیات اور قانون دانی کی بنیاد اکثریت کی زیادہ سے زیادہ خوشی پر مبنی ہے ۔ the greatest happiness of the greatrest number is the foundation of morals and legislation'۔

تمام مطلق العنانیت مذہب سے جنم نہیں لیتی ہے۔ لیکن مذہب کے علاوہ کسی اور بنیاد پر مطلقی اخلاقیات کا دفاع بہت مشکل ہے۔ میرے ذہن میں جو واحد متبادل نظر آتا ہے وہ جذبہ حب الوطنی ہے، خصوصاً جنگ کے دورانیہ میں۔ مشہور زمانہ ہسپانوی فلمی ہدایت کار لوئی بنوئل (Luis Bunuel) نے کہا 'خدا اور وطن ایک ناقابل شکست ٹیم ہیں؛ یہ ظلم و ستم اور خونریزی کے تمام ریکارڈ توڑ دیتے ہیں'۔ فوجی افسران اپنے "متاثرین" کے جذبہ حب الوطنی پر بھرپور انحصار کرتے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران جنگ میں حصہ نہ لینے والے نوجوانوں کو (شرمندہ کرنے کے لئے) خواتین سفید پر پیش کرتی تھیں۔

---

************* یہ کانٹ کے نظریات کی مقبول عام تشریح ہے۔ لیکن مشہور فلسفی ای سی گریلنگ نے بحث کی ہے (New Humanist, July – Aug ۲۰۰۶) کہ اگرچہ کانٹ دنیا کو دکھانے کے لئے مذہبی روایتوں کی پاسداری کرتا تھا، درحقیقت وہ دہریہ ہی تھا۔

ہم تمھیں کھونا نہیں چاہتے، لیکن تمھیں جانا ہی چاہئے۔
کیونکہ بادشاہ اور وطن دونوں کو تمہاری ضرورت ہے

لوگ عسکری خدمت سے انکار کرنے والوں کو حقارت آمیز نظروں سے دیکھتے تھے، گرچہ معاملہ دشمن ملکوں کا ہی کیوں نہ ہو، اس کی وجہ یہ تھی کہ حب الوطنی ایک مطلق نیکی تصور کی جاتی تھی۔ کسی فوجی کے 'میرا وطن صحیح یا غلط' والے جذبے سے زیادہ تو کوئی مطلق جذبہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ نعرہ آپ سے یہ وعدہ لیتا ہے کہ جب بھی مستقبل میں کوئی سیاستدان کسی کو آپ کے ملک کا دشمن گردانے گا تو آپ اس کو قتل کرنے کے لئے مکمل طور سے تیّار ہوں گے۔ سیاستدان کا فیصلہ بھلے ہی خودپسندی پر دلالت کرتا ہو ، لیکن اعلان جنگ کے بعد مطلق حب الوطنی مکمل طریقے سےحاوی ہو جاتی ہے،اور اس درجہ کی قوّت و شدّت مذہب کے علاوہ کہیں اور دیکھنے میں نہیں آتی۔ ایک فوجی جو اپنے خندق سے باہر نکلنے کےفیصلے پر خودپسند استدلال کو حاوی ہونے کی اجازت دے گا بہت جلد اپنے آپ کو فوجداری عدالت یا پھانسی کے تختے پر پائے گا ۔

اخلاقی فلسفے پر اس بحث کی شروعات اس فرضی مذہبی دعوے سے ہوئی تھی کہ خدا کی عدم موجودگی میں اخلاقیات اضافی اور صوابدیدی ہے۔ کانٹ اور دوسرے اخلاقی فلسفیوں کو چھوڑ کر، اور حب الوطنی کی جذباتیت کی قدر کرتے ہوئے، مطلق اخلاقیات کا ترجیحی مصدر ایک کتاب ہوتی ہے، جس کو تشریح میں ایسے اختیار سے نواز دیا جاتا ہے جس کا جواز دینے کی اس کی تاریخ میں سکت نہیں ہوتی۔ مقدس کتب کے صوابدیدی اختیار کے پیروکار ان کتابوں کے تاریخی ماخذ کے بارے میں پریشان کن حد تک کم تجسس کا اظہار کرتے ہیں۔ اگلے باب میں ہم آپ کو یہ دکھائیں گے کہ جو لوگ اپنی اخلاقیات کسی مذہبی کتاب سے اخذ کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں حقیقت میں ایسا نہیں کر رہے ہوتے۔ اچھا ہی ہے! شاید ان کتابوں پرغور و خوض کے بعد وہ بھی اس سے اتفاق کریں۔

# باب ۷ : 'پاک' کتاب اوراس کی بدلتی ہوئی اخلاقی روح عصر

سیاست کی گردن پر ہزاروں کا خون ہے۔ لیکن مذہب کی گردن پر لاکھوں کا خون ہے۔ (شان او کیسی)

الہامی کتابیں دو طریقوں سے ہمارے لئے اخلاقیات یا قوانین حیات کا سرچشمہ ہو سکتی ہیں۔ ایک تو براہ راست ہدایت کے ذریعہ (جنہیں ہم احکامات کہتے ہیں)، مثلاً موسیٰ کے دس احکامات کے ذریعے، جو کہ امریکہ کے دور افتادہ علاقوں کے تہذیبی اختلافات کے دوران کشیدگی کا باعث بنے رہتے ہیں۔ دوسرا طریقہ مثالوں کے ذریعے سمجھانے کا ہے (جسے ہم متشابہات کہتے ہیں): یہاں ہم خدا یا انجیل میں ملنے والی کسی اور شخصیت کومثال کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ اگر الہام کے ان دونوں راستوں پر مکمل مذہبی جذبے کے ساتھ چلا جائے تو یہ ہمیں اخلاقیات کے ایک ایسے نظام کی جانب راغب کرتے ہیں جو کسی بھی تہذیب یافتہ انسان کو۔ چاہے وہ مذہبی ہو یا نہ ہو۔ نہایت نفرت آمیز لگیں گے، اور میں یہ بات اس سے زیادہ شائستگی سے نہیں کہہ سکتا۔

سچ پوچھئے تو انجیل کا بیشتر حصہ منظّم انداز میں برا نہیں ہے بلکہ محض عجیب و غریب ہے، جیسا کہ آپ کسی بھی غیر منظم دستاویزات کی بیاض سے توقع کر سکتے ہیں۔ جنہیں نو صدیوں کے عرصے میں ایسے سینکڑوں گمنام مصنفین، مدیران، اور کاتبین نے رقم کیا یا مرتب کیا،ترمیم کی،ترجمہ کیا، مسخ کیا یا بہتر بنایا، جنہیں نہ ہم جانتے ہیں اور جو نہ ایک دوسرے کو جانتے تھے۔[۸۳] شاید اس سے انجیل کے نرالے پن اور بے میل ہونے کی کچھ وضاحت ہو سکے۔ بد قسمتی سے یہ وہی عجیب و غریب کتاب ہے جو ہمیں اخلاقیات اور اصول زندگی کے معصوم ذرائع کے توسط سے مذہبی تشدّد سے روکتی ہے۔ جو لوگ انجیل کو حرف بہ حرف اپنی اخلاقیات کی بنیاد بنانا چاہتے ہیں انہوں نے یا تو اسے پڑھا ہی نہیں یا پھر سمجھا نہیں، جیسا کہ بشپ جان شیلبی سپونگ نے اپنی کتاب " صحیفے کا گناہ- The Sins of Scripture" میں کہا ہے۔ ویسے بشپ سپونگ آزاد خیال بشپ کی ایک عمدہ مثال ہے جس کے خیالات اس قدر ترّقی پسند ہیں کہ وہ خودکو عیسائی کہنے والے زیادہ ترلوگوں کی سمجھ سے بھی بالاتر ہیں۔ برطانیہ میں سپونگ کا مد مقابل رچرڈ ہالووے ہے، جو حال ہی میں ایڈنبراہ کے بشپ کے عہدے سے دستبردار ہوا ہے۔ ہالووے اپنے بارے میں کہتا ہے کہ وہ ایک 'رو بہ صحت ہونے والا عیسائی' ہے۔ میں نے ایڈنبراہ میں اس سے سرعام مباحثہ کیا تھا، جو میری زندگی کی چند بہت ہی متحرک اور دلچسپ ملاقاتوں میں سے ایک ہے[۸۴]۔

## صحیفۂ قدیم

## The Old Testament

آیئے انجیل کے باب "آغاز – Genesis" میں نوح کی ہردل عزیز کہانی سے شروع کرتے ہیں جو بابل کے دیو مالائی قصے " اتا ناپسِتھم" سے لی گئی ہے، جو پرانی تہذیبوں کے دیو مالائی قصوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ جانوروں کا جوڑوں کی شکل میں کشتی میں سوار ہونے کی کہانی دل کو موہ لیتی ہے۔ لیکن نوح کی کہانی کا سبق نہایت ہولناک ہے۔ خدا کو انسانوں کی حرکات ناپسند تھیں، اس لئے اس نےماسوائے ایک خاندان کے تمام انسانیت کو، (بشمول اطفال) اور غالباً معصوم جانوروں کو سیلاب میں ڈبو دیا۔ ظاہر ہے، اس بات پر علماء دین خفا بھی ہوتے ہیں اور احتجاج بھی کرتے ہیں کہ دور جدید میں کتاب آغاز کو لغوی طور پر نہیں پڑھا جانا چاہئے۔ میرا سارا مدعاء بھی یہی تو ہے!!! ہم خود سے انتخاب کر لیتے ہیں کہ الہامی کتاب کے کس حصے کو رکھا جائے، کسے رد کر دیا جائے، اور کسے متشابہات قرار دے دیا جائے۔ اس قسم کے انتخابی فیصلے ذاتی فیصلے ہیں، جیسے کسی دہریے کا کسی حتمی بنیاد کے بغیر ایک یا دوسرے اخلاقی قواعد پر عمل کرنے کا فیصلہ ذاتی فیصلہ ہوتا ہے۔ اگر ان میں سے ایک "اندھا دھند بھاگتی ہوئی اخلاقیات" ہے، تو پھر دوسری بھی ایسی ہی ہے۔

بہرطور، عالم دین کی نیک نیتی کے باوجود، لوگوں کی ایک کثیر تعداد الہامی کتب، بشمول نوح کی کہانی کو، لغوی معنوں میں سچ مانتی ہے۔ گیلپ سروے کے مطابق، ۵۰ فیصد امریکی ووٹر اسی طرح سوچتے ہیں۔ اور بلا شبہ ایشیا کے وہ تمام مذہبی اکابرین بھی جنہوں نے ۲۰۰۴ کے سونامی کا الزام زمین کی پلیٹ ہلنے کی بجائے انسانوں کے گناہوں پر تھوپ دیا تھا[۸۵]، جن میں بار میں جا کر شراب نوشی کرنے اور ناچنے سے لے کر روز سبت (Sabbath) کے قانون کی خلاف ورزی جیسی معمولی غلطی کا ذکر موجود تھا۔ نوح کی کہانی میں رچے بسے اور انجیل کی تعلیم کے علاوہ ہر دنیاوی علم سے نابلد ان لوگوں کو کون مورد الزام ٹھہرا سکتا ہے؟ ان کے پورے تعلیمی نظام نے ان کو ہرقدرتی طوفان اور آفت کو انسانی زندگی سے منسلک کرنا سکھایا ہے، جیسے یہ زمین کی پلیٹ کے ہلنے سے نہیں بلکہ کسی انسانی جرم کی پاداش میں سزا کے طور پر نازل کئے گئے ہوں۔ ازراہ گفتگو، یہ ماننا بھی کیسی بے باک انا پرستی ہے کہ زمین کو ہلا دینے والے ان واقعات کا انسانی زندگیوں سے بھی کوئی تعلق ہو سکتا ہے،جواپنے پیمانے کے لحاظ سے ایک خدا (یا ارضی پلیٹ) کے شایان شان ہیں۔ ایک معبود ہستی کو، جس کے ذہن پر تخلیق

اور ابدیت جیسے مسائل چھائے ہوئے ہوں، اسے انسان کی چھوٹی چھوٹی بدمعاشیوں سے بھلا کیا علاقہ ہو گا؟ ہم انسان خواہ مخواہ اپنے آپ کو اتنی اہمیت دے لیتے ہیں کہ اپنی معمولی 'غلطیوں' کو بڑھا چڑھا کر آسمانی درجے پر بیٹھا دیتے ہیں۔

جب میں نے ٹیلی ویژن کے لئے مشہور امریکی اسقاط حمل کے مخالف ریورنڈ مائیکل برے کا انٹرویو کیا تو میں نے ان سے پوچھا کہ تبلیغی عیسائی لوگوں کی نجی جنسی حرکات، مثلاً ہم جنس پرستی وغیرہ، کو لے کر خبط کا شکار کیوں ہو جاتے ہیں جب کہ اس کا تعلق دوسروں کی زندگی سے نہیں ہوتا ہے۔ ان کا جواب کچھ ذاتی دفاع کی نوعیت کا رہا۔انہوں نے کہا کہ جب خدا کسی بستی پر اس کے ساکنوں کی جنسی بے راہ روی کی وجہ سے قدرتی آفت نازل کرتا ہے تو بستی کے معصوم لوگ بھی زیرعتاب آ جاتے ہیں۔ ۲۰۰۵ میں سمندری طوفان کترینہ کے نتیجے میں نیو اورلینز شہر شدید سیلاب میں ڈوب گیا۔ ریورنڈ پیٹ رابرٹسن، جو ٹیلی ویژن پر آنے والے مشہور امریکی مبلغ اور سابقہ صدارتی امیدوار ہیں، انہوں نے مبینہ طور پر اس طوفان کا ذمہ دار ایک ہم جنس پرست خاتون مزاح نگار کو ٹھہرایا جو نیو اورلینز کی رہائشی تھی ۔ آپ کو اس خیال کا آنا قطعاً تعجب کی بات نہیں کہ ایک قادر مطلق خدا گناہ گاروں کو تباہ کرنے کے لئے سے بہتر ہدف پر مبنی طریقہ بھی استعمال کر سکتا تھا: پورے شہر کو اس وجہ سے تباہ کردینے کی بجائے کہ وہاں ایک ہم جنس پرست خاتون مزاح نگار رہتی ہے اس واحد گناہ گار خاتون کو دل کا دورہ بھی تو دیا سکتا تھا۔

نومبر ۲۰۰۵ میں ڈوور، پینسلوینیا کے شہریوں نے مقامی سکول بورڈ کے تمام رجعت پسند ممبران کو خارج کرنے کے حق میں ووٹ دے دیا کیونکہ ان کے "ذہین ترتیب" کو تعلیمی نصاب میں شامل کرنے کے فیصلے کی وجہ سے شہر کی بہت جگ ہنسائی ہوئی تھی۔ جب پیٹ رابرٹسن کو رجعت پسندوں کے جمہوری عمل کے ذریعے شکست کا علم ہوا تو اس نے ڈوور کے خلاف ایک سخت تنبیہ جاری کی:

> میں ڈوور کے اچھے شہریوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر تمہارے علاقے میں کوئی تباہی یا آفت آئے تو خدا سے رجوع مت کرنا۔ تم نے ابھی اپنے شہر سے اسے مسترد کیا ہے؛ اب جب شہر پر مصیبتیں آئیں تو حیران مت ہونا کہ اس نے مصیبت میں تمہارا ساتھ کیوں نہیں دیا۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ مصیبتیں آئیں گی، لیکن اگر آئیں تو یاد رکھنا تم نے ابھی ابھی اسے ووٹ کے ذریعے اپنے شہر سے بے دخل کیا ہے۔ اور اگر ایسا ہی ہے، تو پھر اس سے مدد نہ مانگنا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ موجود نہ ہو[۸۶]۔

ہم پیٹ رابرٹسن کو بے ضرر مزاح نگار کے زمرے میں شامل کردیتے ، اگر وہ اس طبقے کی غمازی نہ کر رہا ہوتا جو آج کل ریاست ہائے متحدہ میں طاقت اور اثر و رسوخ رکھتا ہے۔

سدوم اور عمورہ کی تباہی کی داستان میں نوح کے مساوی ابراہیم کا بھتیجہ لوط تھا جسے اس کی پاکبازی کی بدولت خاندان سمیت بچا لیا گیا۔ لوط کو آنے والی تباہی سے متنبہ کرنے کے لئے سدوم میں دو مرد فرشتوں کو بھیجا گیا۔ لوط نے انہیں اپنے گھر میں خوش آمدید کہا، لیکن شہر کے تمام مرد لوط کے گھر کے باہر جمع ہو گئے اور مطالبہ کرنے لگے کے کہ فرشتوں کو ان کے حوالے کیا جائے تاکہ وہ ان کے ساتھ اغلام بازی (اور کیا؟) کا ارتکاب کر سکیں: 'کہاں ہیں وہ مرد جو رات میں تمہارے پاس آئے؟ انہیں ہمارے سامنے لاؤ، تاکہ ہم انہیں جان سکیں'۔ (آغاز ۔ 19:5)۔ ہاں، مستند مسودے میں 'جاننے' کا مطلب بڑے لطیف انداز سے بیان کیا جاتا ہے، جو کہانی کے سیاق و سباق میں بہت مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے ۔ لوط کا بہادری کے ساتھ شہر والوں کی فرمائش کو رد کرنا خدا کی مشیت معلوم ہوتی ہے؛ شاید خدا جانتا تھا کہ سارے سدوم میں ایک لوط ہی اچھا انسان تھا۔ لیکن لوط کے انکار کی شرائط اس کی پاک بازی کا پردہ چاک کرتی

---

†††††††††††† اگرچہ اس کی سچائی میں ابہام ہے۔ یہ خبر اس لنک پر پڑھی ی جاسکتی ہے
http://datelinehollywood.com/archives/۲۰۰۵/۰۹/۰۵/robertson-blames-hurricane-on-choice-of-ellen-deneres-to-host-emmys/، ۔
سچ ہے یا جھوٹ، بہت سے لوگ اسے سچ ہی مانتے ہیں، کیونکہ یہ پادریوں، بشمول رابرٹسن، کی طرف سے کترینہ جیسی تباہیوں کے بارے میں جاری ہونے والے بیانات کی ہی مثال ہے۔ مثلاً:
www.emediawire.com/releases/۲۰۰۵/۹/emw۲۸۱۹۴۰.htm.۔ یہ ویب سائٹ کہتی ہے کہ کترینہ والی کہانی غلط ہے اور
(www.snopes.com/katrina/satire/robertson.asp) رابرٹسن سے یہ اقتباس کرتی ہے: 'میں اورلانڈو کو متنبہ کرتا ہوں کہ تم لوگ سنگین سمندری طوفانوں کے راستے میں پڑتے ہو، اور اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو شاید یہ جھنڈے لہرا کر خدا کو یوں نہ چڑھا رہا ہوتا'۔

دکھائی دیتی ہے: 'بھائیوں ! میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ اس ظلم سے باز رہیں۔ یہ دیکھئے! میری دو جوان بیٹیاں ہیں جو ابھی تک مردوں کو نہیں جانتیں (کنواری ہیں)؛ مجھے اجازت دیجئے کہ میں انہیں آپ کے پاس باہر لے آؤں؛ اور آپ ان کے ساتھ جو سلوک مناسب سمجھیں کریں۔ لیکن ان مردوں کو بخش دیں۔ کیونکہ یہ میرے گھر، میری پناہ میں آئے ہیں' (آغاز ۔ ۸ - ۱۹:۷)۔

یہ عجیب و غریب کہانی ہمیں اور جوکچھ بھی بتاتی ہو، لیکن اس انتہائی مذہبی تہذیب میں عورت کی عزت اور اس کے وقار کے بارے میں ضرور بہت کچھ بتا جاتی ہے۔ خیر، لوط کا اپنی بیٹیوں کے کنوارپن کا یوں سودا کرنا بے سود رہا کیونکہ فرشتوں نے اپنی عزتیں بچانے کی خاطر شہر کے سارے مردوں کو اندھا کر دیا۔ ساتھ ہی انہوں نے لوط کو خبردار کر دیا کہ وہ اپنے خاندان اور مویشی لے کر یہاں سے نکل جائیں کیونکہ شہر تباہ ہونے والا ہے۔ یوں لوط کی بیوی کے علاوہ سارا خاندان کوچ کرنے میں کامیاب ہو گیا، جبکہ خدا نےان کی بیوی کو نمک کے ستون میں تبدیل کر دیا کیونکہ اس نے پیچھے مڑ کر تباہی کا تماشا دیکھنے کی جسارت کی تھی، جو کہ باقی حالات کو دیکھتے ہوئے خاصہ معمولی جرم تھا۔

یہاں لوط کی دونوں بیٹیاں تھوڑی دیر کے لئے کہانی میں دوبارہ نمودار ہوتی ہیں۔ ان کی ماں کے نمک کے ستون میں تبدیل ہو جانے کے بعد دونوں بیٹیاں اپنے والد کے ساتھ ایک غار میں رہنے لگیں ۔ مردانہ لمس کی خواہش مند ان لڑکیوں نے اپنے باپ کو شراب پلا کر اس کے ساتھ ہم بستری کرنے کا فیصلہ کیا۔ کہانی کے مطابق لوط اس قدر شدید نشے کی حالت میں تھا کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ کب بڑی لڑکی اس کے بستر میں آئی اور کب چلی گئی۔ لیکن اس نیم بے ہوشی کے باوجود وہ اسے حاملہ کرنے میں کامیاب رہا۔ اگلی رات دونوں لڑکیوں نے اتفاق کیا کہ اب چھوٹی کی باری ہے۔ ایک بار پھر لوط نشے میں اتنا دھت تھا کہ اسے کچھ پتا نہیں چلا اور اس نے چھوٹی بیٹی کو بھی حاملہ کر دیا (آغاز ۔ ۲-۱۹:۳۱)۔ اگر یہ غیر فعال خاندان سدوم کا سب سے اعلیٰ اخلاقی اقدار کا حامل خاندان تھا تو آپ کا خدا اور اس کے منصفانہ گندھک (judicial brimstone) کے لئے تھوڑی سی ہمدردی کا مظاہرہ کر لینا واجب ہے۔

لوط اور سدوم کے شہریوں کی کہانی کی باز گشت کتاب منصفین (Book of Judges) کے باب ۱۹ میں سنائی دیتی ہے، جہاں ایک گمنام لیوائیٹ پادری جبعہ میں اپنی داشتہ کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ انہوں نے رات ایک مہمان نواز بوڑھے کے گھر میں گزاری۔ جب وہ کھانا کھا رہے تھے تو شہر کے تمام مرد حضرات آن پہنچے اور دروازہ پیٹ کر مطالبہ کرنے لگے کہ مرد کو ان کے حوالے کیا جائے تا کہ 'وہ اسے جان سکیں'۔ تقریباً لوط جیسے الفاظ میں ہی اس بوڑھے نے بھی یہی کہا: ' نہیں میرے بھائیوں، نہیں! میں آپ سب سے التجا کرتا ہوں کہ ایسا ظلم نہ کرو؛ یہ جانتے ہوئے کہ یہ آدمی میرے گھر میں (مہمان بن کر) آیا ہے، ایسی غلطی نہ کرو۔ دیکھو! یہاں میری کنواری بیٹی بھی ہے اور اس آدمی کی داشتہ بھی؛ میں ان دونوں کو باہر لے آتا ہوں۔ تم لوگ ان کے ساتھ جیسا چاہو سلوک کرو ؛ لیکن اس آدمی کے ساتھ ایسی نجس حرکت نہ کرو' (منصفین ۴-۲۳ :۱۹)۔ ایک بار پھر، عورت مخالف اقدار ہمارے سامنے آتی ہیں۔ مجھے یہ الفاظ ان کے ساتھ جیسا چاہو سلوک کرو' خاص طور سے انتہائی خوفناک لگے۔ میری بیٹی اور اس آدمی کی داشتہ کی عزت پامال کر کے لطف حاصل کیجئے لیکن میرے مہمان کی، جو کہ بالآخر مرد ہے، کی عزت آپ پر لازم ہے۔ کہانی میں مشابہت کے باوجود بوڑھے کی لڑکی اور پادری کی داشتہ کا حال لوط کی بیٹیوں کے مقابلے میں بہت برا ہوا۔

پادری نے اپنی داشتہ کو ہجوم کے حوالے کر دیا جو ساری رات اس کے ساتھ اجتمائی عصمت دری کرتے رہے: 'وہ ساری رات صبح ہونے تک اسے 'جانتے' اور رسوا کرتے رہے، جب دن نکلنے لگا تو انہوں نے اسے جانے دیا۔ وہ عورت صبح کے وقت واپس لوٹی اور بوڑھے کے دروازے کے آگے گر گئی جہاں اس کا مالک تھا، جب تک کہ سورج کی روشنی پھیل نہ گئی' (منصفین ۲-۲۵ :۱۹)۔ صبح کے وقت جب پادری نے اپنی داشتہ کو دروازے پر گرا ہوا پایا تو ، بے رحمی سے ،بولا 'اب اٹھو۔ ہم یہاں سے چلتے بنیں'۔ لیکن وہ نہیں ہلی۔ وہ مر چکی تھی۔ تو 'اس نے ایک خنجر لیا، داشتہ کے مردہ جسم کے بارہ ٹکڑے کئے، اور اسرائیل کے بارہ ساحلوں میں بھجوا دیے'۔ جی ہاں ! آپ نے بالکل صحیح پڑھا۔ "منصفین ۱۹:۲۹ " میں آپ خود ملاحظہ کر سکتے ہیں ۔ چلئے، اس کو بھی ہم انجیل کی ہر دم موجود عجیب فطرت کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ ویسے، حقیقت میں یہ اتنا بھی حماقت خیز نہیں ہے جتنا پہلی نظر میں دکھائی دیتاہے۔ اس کا ایک مقصد تھا – اور وہ تھا بدلے کے لئے اشتعال دلانا – جس میں وہ کامیاب رہے، اور بنجامن قبیلے کے خلاف بدلے کی ایک جنگ چھڑ گئی جس میں، "منصفین باب ۲۰ " کے محبت بھرے الفاظ میں، ۶۰٫۰۰۰ افراد مارے گئے۔ پادری کی داشتہ کی کہانی لوط کی بیٹیوں کی کہانی سے اس قدر ملتی جلتی ہے کہ آپ یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مسودے کا کوئی ٹکڑا کہیں غلطی سے کسی بھولے بھٹکے حجرہ کاتبین میں رہ تو نہیں گیا تھا: مقدس نصوص کے اصل مسکن کی بے ترتیبی کی ایک عمدہ مثال ہے۔

لوط کے چچا ابراہیم تینوں 'عظیم' توحیدی مذاہب کا بانی تھا۔ اس پدرانہ رتبے کی بدولت اس کو خدا سے بس چند ہی درجے کم تر مثالی شخصیت کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دورحاضر میں کون سا معلم اخلاقیات ہو گا جو ابراہیم کی پیروی کرنا چاہے گا؟ زندگی کے اوائل میں ہی وہ ایک قحط سے

بچنے کے لئے اپنی بیوی سارہ کے ساتھ نقل مکانی کر کے مصر چلا گیا۔ اس کو یہ ادراک ہوا کہ اس جیسی خوبصورت عورت مصریوں کے لئے جاذب نظر ہو سکتی ہے لہٰذا اس نے اپنی جان کو خطرے سے بچانے کے لئے اسے بیوی کے بجائے بہن بتانا شروع کردیا۔ اسی حیثیت سے وہ فرعون کے حرم میں داخل کی گئی، اوراس سبب سے ابراہیم کو فرعون کی نظر عنایت میسر ہوئی اور وہ مالدار ہوگیا۔ خدا کو یہ آرام دہ انتظام ناگوار گزرا اور اس نے فرعون اور اس کے گھر پر آفتیں نازل کر دیں (خود ابراہیم پر کیوں نہیں؟)۔ دکھوں کے مارے فرعون نے پوچھا کہ ابراہیم نے اسے بتایا کیوں نہیں تھا کہ سارہ اس کی بہن نہیں بیوی ہے۔ پھر اس نے سارہ کو واپس ابراہیم کے حوالے کردیااور دونوں کو مصر سے بے دخل کر دیا۔ (آغاز ۔ ۱۹ –۱۸ :۱۲)۔ عجیب بات ہے کہ اس جوڑے نے جرار کے بادشاہ ابی ملیخ (King Abimelech) کے ساتھ بھی یہی کارستانی کرنے کی کوشش کی۔ ابراہیم نے ابیملیخ کو بھی یقین دلا دیا کہ سارہ اس کی بہن ہے اور اسے اکسانے کی کوشش کی کہ وہ اس کی "بہن" سے شادی کر لے (آغاز ۔ ۵ – ۲ :۲۰)۔ اس نے بھی فرعون سے ملتے جلتے الفاظ میں اپنی خفگی کا اظہار کیا؛ ہم ان دونوں سے ہمدردی جتائے بغیر نہیں رہ سکتے ۔ کیاان کہانیوں میں مماثلت عبارت کے ناقابل اعتبار ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے؟

ابراہیم کی کہانی کے ناخوشگوار واقعات ان کے بیٹے اسحاق کی قربانی کےمذموم واقعہ کے بالمقابل گناہ صغیرہ معلوم ہوتے ہیں ۔ (مسلم صحیفہ کے مطابق یہ واقعہ ان کے دوسرے بیٹے اسماعیل سے منسوب ہے) خدا نے ابراہیم کو حکم دیا کہ وہ منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہونے والے اپنے بیٹے اسحاق کی پکی ہوئی قربانی پیش کرے۔ بایں ہمہ ابراہیم نےایک قربان گاہ بنائی، اس میں لکڑیاں جمع کیں، اور اسحاق کےہاتھ پیر باندھ کر لکڑیوں پر لٹا دیا۔ ابراہیم خنجر کا وار کرنے ہی والا تھا کہ ایک فرشتہ نے بڑے ڈرامائی انداز میں مداخلت کرتے ہوئے یہ خوشخبری دی کہ خدا نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے: خدا تو یونہی "مذاق" کر رہا تھا، اور ابراہیم کے ایمان کا امتحان لے رہا تھا۔ دور جدید کا ماہر اخلاقیات یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ ایک بچّہ اس قسم کے نفسیاتی صدمے سے کیسے نجات پا سکے گا۔ جدید اخلاقیات کے نقطۂ نظر سے یہ شرمناک قصہ بیک وقت بچّوں کے استحصال، دو مختلف اطراف میں غنڈہ گردی، اور تاریخ میں پہلی بار نیورمبرگ بر دفاع 'میں تو صرف احکامات کی بجا آوری کر رہا تھا' کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کے باوجود یہ قصہ تینوں مذاہب کی عظیم ترین بنیادی روایات میں سے ایک ہے۔

ایک بار پھر، دور حاضر کے علماء دین احتجاج کریں گے کہ ابراہیم کے اسحاق کو قربان کرنے کے قصے کو حرف بہ حرف حقیقت تسلیم نہ کرلینا چاہئے۔ اور ایک بار پھر، اس کا مناسب جواب دو رویا ہے۔ اولاً، آج بھی بے شمار لوگ اس قصے کو حرف بہ حرف حقیقت ہی تسلیم کرتے ہیں، اور یہ لوگ ہمارے اوپر، خاص طور پر امریکہ اور اسلامی دنیا میں، بے انتہا سیاسی اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ دوئم، اگر اس کہانی کو حرف بہ حرف حقیقت تسلیم نہ کیا جائے تو کیسے دیکھا جائے؟ بطور تمثیل کے؟ اگر ایسا ہے، تو کس چیز کی تمثیل کے طور پر؟ یقیناً کسی قابل تعریف بات کے تو نہیں۔ تو کیابطور اخلاقی سبق؟ لیکن اس گھناؤنی کہانی سے کونسے اخلاقی سبق سیکھے جا سکتے ہیں؟ یاد رکھئے؛ میں اس لمحہ صرف یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ در حقیقت ہم اپنی اخلاقیات الہامی کتب سے حاصل نہیں کرتے۔ یا اگر کرتے بھی ہیں تو اچھے اچھے حصے چن کر برے حصوں کو مسترد کر دیتے ہیں۔ تو پھر ہمارے پاس کوئی غیر الہامی کسوٹی ہو گی جس کی بنیاد پر ہم یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اخلاقی حصے کون سے ہیں: ایک ایسی کسوٹی جو چاہے کہیں سے بھی آتی ہولیکن اس الہامی کتاب سےتو ہرگز نہیں آئی جس کو کسوٹی پر پرکھا جا رہا ہے، اور جو ہمارے مذہبی اعتقادات سے قطع نظرغالباً ہم سب کو میسر ہے۔

عذر خواہ اس شرمناک کہانی میں خدا کے کردار کے وقار کو بچانے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ کیا آخری لمحے خدا کا اسحاق کی جان بخش دینا ایک اچھا فیصلہ نہیں؟ اگرچہ اس کا امکان تو کم ہی ہے، لیکن اگر میرے قارئین وکالت کے اس بیہودہ نمونے سے متاثر ہونے والے ہوں، تو میں ان کی توجہ انسانی قربانی کے ایک اور قصے کی طرف مبذ ول کرانا چاہوں گا، جس کا اختتام قدرے ناخوشگوار رہا۔ "کتاب المصنفین باب ۱۱ " میں عسکری قائد جیفتہ (Jephthah) نے خدا سے سودا کیا کہ اگر خدا اسےو بنی عمون (Ammonites) پر فتح یاب کر دے، تو واپسی پر جو بھی اس کے گھر سے سب سے پہلے اسے ملنے نکلے گا جیفتہ اس کی پکی ہوئی قربانی پیش کرے گا۔ جیفتہ نے واقعی بنی عمون کو شکست فاش دی، ('ایک عظیم قتل عام کے ساتھ'، جو کہ کتاب المصنفین میں عام بات ہے) اور فاتح لوٹا۔ اس کی اکلوتی بیٹی اس کا استقبال کرنے دف پر ناچتی ہوئی گھر سے نکل آئی اور بدقسمتی سے وہ پہلی جاندار چیز تھی جو اس کے

گھر سے باہر نکلی۔ ظاہر ہے کہ جیفتہ نے غم میں نڈھال ہو کر اپنا گریبان چاک کر ڈالا، لیکن وہ سودے کے آگے بے بس تھا۔ خدا بھی قربانی کی راہ دیکھ رہا تھا، اور حالات کو دیکھتے ہوئے بیٹی نے قربان ہونے کو قبول کر لیا۔ اس نے صرف اتنی درخواست کی کہ اسے دو ماہ کی مہلت دی جائے تاکہ وہ پہاڑوں پر جا کر اپنے کنوارے مرنے کا ماتم کر سکے۔ وہ مقررہ وقت پر لوٹی، جیفتہ نے اسے قربان کر کے پکایا، اور اس موقع پر خدا نے اس کی جان بخشنا مناسب نہیں سمجھا۔

جب بھی خدا کی محبوب قوم کسی دوسرے خدا کو معبود بنالیتی ہے تواس کے نتیجہ میں خدا کا بے حساب غیض و غضب ایک بد ترین قسم کے جنسی

حسد جیسی صورت میں اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ جدید ماہرین اخلاقیات کو اس میں کوئی اچھی مثال نظر نہیں آنی چاہئے۔ جنسی بے وفائی کی ترغیب ان کو بھی سمجھ آتی ہے جو اس کا شکار نہیں ہوتے اور یہ نسخہ افسانے اور ڈرامے میں شکسپیئر سے لے کر بیہودہ مزاح میں عام طور سے پایا جاتا ہے۔ لیکن ہم جیسے جدید لوگ دیگر خداؤں کے ساتھ روحانی بدکاری کی خواہش کی بظاہر ناقابل برداشت تحریص کے ساتھ ہمدردی کرنے سے قاصر ہیں۔ میری سادہ نظروں میں "تم میرے علاوہ کسی دوسرے کو خدا تصور نہیں کروگے" ایک ایسا حکم ہے جسے ماننا نہایت آسان ہونا چاہئے: "تم اپنے پڑوسی کی بیوی (یا اس کے گدھے یا بیل) پر بری نظر نہیں رکھو گے" کے مقابلے میں تو پہلے حکم کی بجا آوری میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہئے۔ اس کے باوجود پورے صحیفۂ قدیم میں بیہودہ مزاح جیسی شاندار باقاعدگی سے خدا کو بس ایک لمحے کے لئے اپنی پیٹھ پھیرنی ہوتی ہے کہ اسرائیل کی قوم "بعل" یا کسی اور دیوی کی شبیہ، اور ایک قیامت خیز موقعے پر، سنہرے بچھڑے کے ساتھ معاشقے بڑھا لیتے ہیں ۔

ابراہیم سے بھی زیادہ، موسیٰ ان تینوں مذاہب کے لئے ایک مثالی شخصیت کی حیثیت رکھتا ہے۔ ابراہیم تمام مذاہب کا پدر ضرور ہے، لیکن یہودیت اور اس کے مختلف مکتب فکر کی نظریاتی اساس کا بانی موسیٰ ہی ہے۔ سنہرے بچھڑے والے واقعہ کے دوران موسیٰ بحفاظت منظر نامہ سے دور طور سینا پر خدا سے کلام میں مصروف تھا اور پتھر کی سلوں پر احکامات کندہ کروا رہا تھا۔ یہاں نیچے وادی میں جمع لوگ، جن کے لئے طور کی پہاڑی کو چھونے پر ہی موت کی سزا تھی، موسیٰ کے انتظار میں اپنا وقت ضایع نہیں کر رہے تھے :

> جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ نے پہاڑی سے لوٹنے میں تاخیر کر دی، تو وہ وقت ضایع کئے بغیر ہارون کے پاس گئے اور اس سے التجاء کی اٹھو! اور ہمارے لئے ایسے خدا بناؤ جنہیں ہم اپنے آگے لے کر چل سکیں؛ کیونکہ جہاں تک موسیٰ کا سوال ہے، جو ہمیں مصر سے نکال کر یہاں تک لایا، ہم نہیں جانتے کہ اس کا کیا ہوا (کتاب الاخراج Exodus ۳۲:۱)۔

ہارون نے سب لوگوں کو اکٹھا کیا، ان سے اپنا سونا لانے کو کہا، اور سونے کو پگھلا کر ایک سنہرا بچھڑا بنایا، اور اس نئے تراشیدہ خدا کے لئے ایک قربان گاہ بنائی جہاں اس کے سامنے قربانیاں پیش کی جا سکیں ۔

اب انہیں اچھی طرح معلوم ہونا چاہئے تھا کہ خدا کے پیٹھ پیچھے ایسی احمقانہ حرکتیں نہ کرتے۔ خدا بھلے ہی پہاڑ پر موجود ہو گا، لیکن بالآخر تھا تو ہمہ داں ہی؛ اس نے وقت ضایع کئے بغیر موسیٰ کو اپنا قانون نافذ کرنے والے کی حیثیت سے نیچے بھیجا۔ موسیٰ خدا کے دس احکامات کی سلیٹیں اٹھائے بھاگتا ہوا نیچے آیا۔ نیچے پہنچ کر جب اس نے سنہرے بچھڑے کو دیکھا تو وہ غصے سے آگ بگولہ ہو گیا اور سلیٹیں پٹخ دیں، جو گرتے ہی ٹوٹ گئیں۔ (بعد میں خدا نے اسے نئی سلیٹیں عطا کر دیں، لہٰذا کوئی نقصان نہیں ہوا)۔ موسیٰ نے بچھڑے کو جلا دیا، اور اس کی راکھ کو پانی میں ملا کر لوگوں کو نگلنے کے لئے کہا ۔ پھر اس نے پادریوں کے قبیلے لیوائی کو کہا کہ وہ تلوار اٹھائیں اور جتنے بھی لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار سکیں اتار دیں۔اس طرح قریب تین ہزار لوگ جاں بحق ہوئے اور قیاس کیاجاسکتا ہے کہ اس طرح ناراض خدا کے حسد کو تسکین ملی ہو گی۔ لیکن نہیں؛ ابھی خدا کو مزید قہر ڈھانا تھا۔ اس دلدوز باب کی آخری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے باقی ماندہ لوگوں پر طاعون کو عذاب الٰہی کے طور پر نازل کر دیا، 'اور یہ سب اس لئے تھا کہ انہوں نے بچھڑا بنایا تھا، جسے فی الحقیقت انہوں نے نہیں ہارون نے بنایا تھا'۔

انجیل کی کتاب الاعداد (The Book of Numbers) ہمیں بتاتی ہے کہ خدا نے موسیٰ کو اہل مدین (Midianites) پر حملہ کرنے کے لئے کس طرح اکسایا۔ اس کی افواج نے لوگوں کو تہ تیغ کرنے میں ذرا بھی تاخیر نہ کی ۔ اور شہر کے شہر جلا کر خاک کر دیئے، لیکن بچوں اور عورتوں کی جان بخش دی۔ اپنی افواج کی یہ رحم دلی موسیٰ کو ایک آنکھ نہ بھائی، اور اس نے حکم دیا کہ تمام بچّوں اور عورتوں کو بھی مار دیا جائے 'لیکن صرف کنواری بچیوں کو اپنے لئے زندہ رہنے دو'۔ (کتاب العداد The Book of Numbers ۳۱:۱۸)۔ موسیٰ یقیناً جدید اخلاقیات کے لئے ایک اچھی مثال نہیں تھا۔

حتی الامکان جدید مذہبی مصنفین اہل مدین کے قتل عام کی علامتی یا تمثیلی وضاحتیں پیش کرپاتے ہیں،جبکہ یہ علامتیں ہمیں غلط سمت میں لے جاتی

---

یہ مزاحیہ خیال مجھے جانیتھن فشر نے تجویز کیا لیکن حیرانی کی بات ہے کہ اس نے کبھی اسے اپنے خاکے Beyond the Fringe میں شامل نہیں کیا۔ میں اس کا اس علمی کتاب کی سفارش کرنے پر بھی شکر گزار ہوں، جس پر یہ خیال مبنی ہے: Halbertal and Margalit ۱۹۹۲

ہیں۔ انجیل کے مطابق تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ اہل مدین کا بدقسمتی سے اپنے ہی ملک میں قتل عام کیا گیا۔ ۔ لیکن عیسائی روایت میں ان کے نام صرف اس نظم میں ہی زندہ رہ گئے (جسے پچاس سال گزرنے کے باوجود آج بھی میں دو مختلف اور افسردہ دھنوں میں گن گنا سکتا ہوں):

اے عیسائی! دیکھا تو نے انہیں
مقدس زمین پر؟
کیسے مدین کی فوج
گشت کرتی ہے گھوم کر؟
عیسائی! اٹھ اورانہیں ہلاک کردے،
شمار کر اپنا فائدہ، نہ کہ نقصان۔
وار کران پر اس شان سے
جو مقدس صلیب کی ہے۔

افسوس، بیچارے مدین کے بہتان زدہ مقتول لوگ، جن کی واحد یاد ایک وکٹورین دور کی حمد میں آفاقی برائی کی شعری علامت کے طور پرزندہ ہے۔

حریف خدا بعل ہمیشہ سے عبادت گزاروں کو بہکانے والا رہا ہے۔ کتاب الاعداد باب ۲۵ کے مطابق اسرائیلی عبادت گزاروں کو بعل کے حضور قربانی پیش کرنے کے لئے موآبی عورتوں کے ذریعہ ورغلایا گیا ۔ ۔ حسب معمول، خدا کا رد عمل قہر آلود تھا۔ اس نے موسیٰ کو حکم دیا کہ 'سب کے سر لو اور انہیں اپنے پروردگار کے حضور سورج کے سامنے لٹکا دو، تا کہ تمہارے پروردگار کا غیض و غضب اسرائیل سے دور ہوسکے'۔ ایک بار پھر، حریف خدا سے راہ و رسم بڑھانے کی پاداش میں خدا کے شدید ظالمانہ نقطہ نظر پر حیران ہوئے بغیر نہیں رہا جا سکتا ہے۔ ہمارے جدید اقدار و انصاف کے رویے اپنی بیٹی کو اجتماعی زنا کے حوالے کرنے کے مقابل تو محض صغیرہ گناہ معلوم ہوتے ہیں۔یہ الہامی اور جدید (میں اسے تہذیب یافتہ کہنا چاہتا ہوں) اخلاقیات میں رابطہ منقطع ہونے کی ایک اور واضح مثال ہے۔ اسے ثقافتی اعداد کے نظریے اور کسی خدا کے اعداد کے تالاب میں بچنے اور پنپنے کے لئے ضروری خصوصیات کے تناظر میں سمجھنا آسان ہے۔ خدا کاحریف خداؤں سے دیوانہ وار حسد کی المیہ / مزاحیہ داستان صحیفہ قدیم میں بار بار دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ حسد دس احکامات (پتھر کی سلیٹ والے، جو موسیٰ نے توڑ دیئے؛ کتاب الاخراج ۲۰، قانون دوئم۵ (Book of Deutronomy ) میں سے پہلے حکم کی تحریک مہیا کرتا ہے، اور ٹوٹی ہوئی سلیٹوں کے عوض ملنے والی نئی سلیٹوں پر کندہ نئے احکامت میں اور بھی نمایاں نظر آتا ہے (کتاب الاخراج ۳۴)۔ اموریوں (Amorites)، کنعانیوں (Canaanites)، حتیوں (Hittities)، فرزی (Perizzites)، حویوں (Hivites) اور یبوسیوں (Jebusites) کو ان کے وطن سے بے دخل کرنے کا وعدہ فرمانے کے بعد خدا نے اپنی توجہ سب سے اہم مسئلے 'حریف خدا' کی طرف مبذول کی۔!!

.... تم ان کی قربان گاہیں تباہ کردو ، ان کے بتوں کو توڑ دو ، ان کےکھلیان برباد کر دو ۔ اور تم کسی اور خداکی عبادت مت کرو ۔ کیونکہ تمہارا مالک، جس کا نام "حاسد" ہے، ایک حسد کرنے والا خدا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اس زمین کے باشندوں کے ساتھ کوئی معاہدہ کر لو، اور وہ اپنے خداؤں کے ساتھ بدعتیں کریں، اور ان کے سامنے قربانیاں پیش کریں، اور ان میں سے ایک تمہیں بھی پکارے، اور تم اس قربانی میں سے کھاؤ؛ اپنے بیٹوں کے لئے ان کی بیٹیوں کا انتخاب کرو، پھر ان کی بیٹیاں اپنے خداؤں کے ساتھ بدعتیں کریں، اور تمہارے بیٹوں کو بھی بدعت پر راغب کریں۔ تم اپنے لئے کوئی پگھلے ہوئے دھات کا خدا مت بنانا۔ (کتاب الاخراج ۱۷-۱۳ :۳۴)۔

میں جانتا ہوں؛ہاں ! میں جانتا ہوں کہ زمانہ بدل چکا ہے اور آج کوئی مذہبی پیشوا (ما سوائے طالبان یا امریکی عیسائی کے) موسیٰ کی طرح نہیں سوچتا ہے ۔ میرااصل مدعا بھی تو یہی ہے۔ میں بس اتنا ہی ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ ہم جو قائم کر رہے ہیں وہ جدید اخلاقیات ہے۔ اور یہ کہیں سے بھی اخذ کرتے ہوں لیکن انجیل سے یقیناً نہیں کرتے ہیں۔ عذرخواہ یہ دلیل دے کر نہیں بچ سکتے کہ مذہب انہیں اچھائی اور برائی کی تعریف کرنے کی قابلیت دیتا ہے – یہ ایک ایسی

مراعات ہے جو دہریویوں کو میّسر نہیں۔ اگر وہ اپنے محبوب پینترے کے ذریعہ صحیفہ کے منتخب حصے کی علامتی تفہیم جائز قرار دے کر بقیہ کو لغوی معنی میں لیتے ہیں تو اس حربے سے بھی وہ پیچھا نہیں چھڑا سکتے ہیں ۔ آخر ایسی کونسی کسوٹی ہے جس کی بدولت آپ یہ فیصلہ کرسکتے ہیں کہ کونسا الہام علامتی ہے اور کونسا لغوی؟

موسیٰ کے دور میں شروع کی گئی نسل کشی 'یشوع کی کتاب The Book of Joshua' میں اپنے عروج پر پہنچتی ہے، جو اپنے خون آشام قتل عام کی داستان اور اس کے بیان کی اغیار دشمن لطف اندوزی کے لئے قابل ذکر ہے۔ جیسے کہ دل کو لبھانے والے اس قدیمی گیت میں بڑے فخریہ انداز میں یہ بیان ملتا ہے : "یشوع نے شہر جیریکو فتح کیا، اور دیواریں ڈھا دی گئیں؛ جیریکو کی جنگ میں، یشوع جیسا کوئی نہیں"۔ بزرگ یشوع نے اس وقت تک چین کا سانس نہیں لیا جب تک "شہر میں جو بھی مرد، عورت، بوڑھے، بچے، بیل، بھیڑ، گدھے تھے سب کو تلوار کے زور پر تباہ نہیں کردیا۔ "۔ (یشوع ٦:٢١ )۔

علماء دین پھروا ویلا کریں گے کہ ایسا نہیں ہوا تھا۔ صحیح بات ہے، اگر آپ English Standard Version پڑھیں توایسا نہیں ہوا تھا۔ وہاں تو محض اتنا لکھا ہے کہ مردوں کے شور اور باجوں کی آوازوں سے دیواریں زمیں بوس ہو گئیں اور یشوع کی فوج فاتحانہ شہر میں داخل ہو گئی۔ لیکن بحث طلب نقطہ یہ نہیں کہ یہ سچ ہے یا جھوٹ، بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ، انجیل کو ہماری اخلاقی اقدار کے ماخذ کا درجہ حاصل ہے۔ اور انجیل میں یشوع کے ہاتھوں شہرجیریکو کی تباہی اور ارض موعودہ (The Promised Land) کا قصہ اخلاقی اعتبار سے ہٹلر کی پولینڈ پر چڑھائی یا صدام کے کردوں کے قتل عام سے قطعی مختلف نہیں ہے۔ انجیل یقیناً فن تحریر کا ایک جاذب اور شاعرانہ نمونہ ہے، لیکن یہ ایسی کتاب نہیں جسے آپ اپنے بچوں کو ان کی اخلاقیات استوار کرنے کے لئے دینا چاہیں گے۔ اب ہوا کچھ یوں ہے کہ یشوع اور جیریکو کی کہانی بچّوں کی اخلاقیات کے متعلق ایک بڑا ہی دلچسپ تجربہ ہے، جس پر ہم اس باب میں آگے چل کر بات کریں گے۔

آپ ایک لمحے کے لئے بھی یہ مت سوچئے گا کہ اس کہانی میں خدا کے کردار نے ارض موعود کی کشور کشائی کے دوران ہونے والے قتل عام اور نسل کشی کے بارے میں کسی شک و شبہ کا اظہار کیا ہو گا۔ اس کے بالکل برعکس، خدا کے احکامات، مثلاً قانون دوئم (Deutronomy) میں، بے رحم حد تک واضح تھے۔ اس نے اس زمین کے باسیوں میں کہ جس پر اس کی نظر تھی اور ان لوگوں میں جو کہ بہت دور رہتے تھے امتیاز روا رکھا۔اس نے حکم دیا کہ وہاں کے باسیوں کو پر امن طریقے سے ہتھیار ڈالنے کی دعوت دی جائے۔ اگر وہ انکار کریں تو تمام مردوں کو مار دیا جائے اور عورتوں کو افزائش نسل کے لئے بندی بنا لیا جائے۔ اس قدرے ہمدردانہ روّیے ے کے مقابلے میں ان قبیلوں کے ساتھ جو پہلے سے ارض موعود میں قیام پزیر تھے کیا سلوک کیا گیا، اس کی مثال یہاں دیکھیں: "...لیکن جو شہر تمہارے پروردگار نے تمہیں میراث کے طور پر عطا کیا ہے ،اس میں تم کسی بھی ذی روح کو زندہ مت چھوڑو انہیں مکمل طور پر تباہ کر دو خواہ وہ : اموریی، کنعانی، حتی، پیریزائٹس، ہیوائٹس، اور یبوسی کوئی بھی ہوں ؛ جیسا کہ تمہارے پروردگار نے تمہیں حکم دیا ہے۔"۔

کیا وہ لوگ جو انجیل کو اخلاقی دیانتداری کا محرک گردانتے ہیں ،انہیں ذرا سا بھی اندازہ ہے کہ اس میں کیا لکھا ہوا ہے؟ کتاب الاحبار ٢٠ Leviticus کے مطابق آپ کو درج ذیل گناہوں کی پاداش میں سزائے موت دی جاسکتی ہے: والدین کو بد دعا دینا، بد کاری کرنا، اپنی سوتیلی ماں یا اپنی بہو کے ساتھ مباشرت کرنا، ہم جنس پرستی، ایک عورت اور اس کی بیٹی دونوں سے بیاہ کرنا، جانور کے ساتھ مباشرت (اور ظلم کی انتہا یہ ہے کہ اس میں بے زبان جانور کے لئے بھی موت کی سزا ہے)۔ اس کے علاوہ چھٹی کے دن کام کرنے پر بھی موت ہی کی سزا ہے، اور یہ نقطہ صحیفہ قدیم میں بار بار دہرایا جاتا ہے۔ کتاب الاعداد ١٥ میں ذکر ہے کہ قوم اسرائیل کو ایک آدمی چھٹی کے روز جنگل میں لکڑیاں جمع کرتے ہوئے ملا۔ انہوں نے اس کو حراست میں لیا اور خدا سے پوچھا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ اس دن خدا کا ادھورے کام کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ خدا نے موسیٰ سے کہا کہ اس شخص کو یقیناً موت کی سزا دی جائے گی: پورا مجمع اس کو بستی سے باہر ملنے والے پتھروں سے سنگسار کرے گا۔ مجمع اس آدمی کو بستی سے باہر لے آیا، اس پر پتھراؤ کیا گیا، اور وہ مر گیا"۔ کیا لکڑیاں جمع کرنے والے اس بے ضرر انسان کی موت پر ماتم کرنے والے کوئی بیوی بچّے بھی تھے؟ کیاوہ پہلا پتھر چلنے کے وقت خوف سے کانپا، اور جب اس کے سر پر پتھروں کی بارش ہوئی تو کیا وہ درد سے بلبلایا؟ آج مجھے جو بات حیران کرتی ہے وہ یہ نہیں کہ یہ واقعات پیش آئے تھے یا نہیں، شاید نہیں آئے ہوں ۔لیکن مجھے تو یہ بات حیران کرتی ہے کہ موجودہ دور میں بھی لوگ اپنی زندگیوں کی بنیاد یہواہ (Yahweh)جیسے خوفناک نمونے پر رکھ سکتے ہیں – اور اس سے بھی بد تر، کہ وہ اس بھیانک درندے کو (چاہے وہ حقیقت ہے یا افسانہ) ہم سب پر مسلط بھی کرنا چاہتے ہیں۔

امریکہ میں موسیٰ کے دس احکامات کے کتبے اٹھائے پھرنے والوں کی سیاسی قوت افسوسناک ہے، خاص طور سے ایک ایسی عظیم جمہوریہ میں جس کا آئین غیر مذہبی زبان میں ایسے حضرات نے لکھا تھا جو اٹھارویں صدی کی روشن خیالی کے انقلاب (Enlightenment) سے مرعوب تھے۔ اگر ہم ان دس احکامات کے بارے میں سنجیدگی کا اظہار کریں تو ہمیں غیر خداؤں کی عبادت اور بت تراشی کو پہلے اور دوسرے گناہ کا درجہ دینا پڑے گا۔ جس کی پاداش میں

طالبان کی ناقابل بیان غارت گری کی مذمت کی بجائے ہم ان کے صالح تقویٰ کی تعریف کریں گے ۔ جس میں انہوں نے افغانستان کے پہاڑوں میں بنے بامیان کے بدھا کے ۱۵۰ فٹ اونچے بت کو بارود سے تباہ کر دیا تھا۔ جسے آج ہم غارت گری کہتے ہیں اس کا محرک یقیناً مذہبی اشتیاق اور جوش ہی تھا۔ اس کا واضح ثبوت ایک عجیب و غریب کہانی سے ملتا ہے جو ٦ اگست ۲۰۰۵ کے Independent (لندن) کی سب سے بڑی خبر تھی۔ پہلے صفحے کے شہ سرخی "مکّہ کی تباہی" کے نیچے اخبار نے یہ خبر چھاپی تھی:

> تاریخی مکّہ، جو کہ اسلام کی جائے پیدائش ہے، مذہبی انتہا پسندوں کی یلغار کے نیچے دبتا جا رہا ہے۔ اس مقدس شہر کی بھرپور اور تہ در تہ تاریخ ختم ہو چکی ہے....اب محمد کی جائے پیدائش کو بھی بل ڈوزر سے خطرہ لاحق ہو چکا ہے۔ اور اس حرکت میں سعودی مذہبی انتظامیہ بھی ملوث ہے، جن کی اسلام کی انتہا پسند تشریح انہیں اپنے ہی تاریخی اور ثقافتی ورثے کو تباہ کرنے پر مجبور کر رہی ہے.... اس تباہ کاری کے پیچھے کار فرما محرک وہابی فرقے کا خوف ہے مذہبی اور تاریخی توجہ کی حامل جگہیں بت پرستی یا شرک کی راہ ہموار کر سکتی ہیں، جس میں بہت سارے ممکنہ خداؤں کی عبادت کا خطرہ بھی موجود ہے۔ سعودی عرب میں آج بھی بت پرستی کی سزا گردن زدنی ہے[§§§§§§§§§§§§]۔

مجھے یقین ہے کہ دنیا میں ایک بھی ایسا دہریہ نہیں ہے جو مکّہ کو تباہ کرنا چاہے گا – یا شارترے، یارک منسٹر یا نوٹرے ڈام کو، یا شوے ڈاگون یا کیوٹو کے مندروں کو، یا بامیان کے بدھا کو۔ جیسا کہ نوبل انعام یافتہ امریکی ماہر طبیعیات سٹیون وائینبرگ نے کہا 'مذہب انسانی وقار کی توہین ہے۔ اس کے ساتھ یا اس کے بغیر، اچھے لوگ اچھائی کرتے رہیں گے اور برے لوگ برائی کرتے رہیں گے۔ لیکن اچھے لوگوں کے برائی کرنے کے لئے مذہب درکار ہے'۔ بلیز پاسکال (وہی شرط والا) اس بات کو یوں کہتا ہے: 'انسان کسی اور بنیاد پر اس کامل حد تک اور خوشی سے بدی نہیں کرتا جتنا وہ مذہبی اعتقاد کی بنیاد پر کرتا ہے"۔

یہاں میرا یہ دکھانے کا مقصد نہیں تھا کہ ہمیں اپنی اخلاقیات الہامی کتب سے حاصل نہیں کرنی چاہئیں (اگرچہ میرا ذاتی خیال یہی ہے)۔ میرا مقصد تو یہ دکھانا تھا کہ ہم (اور اس میں بیشتر مذہبی لوگ شامل ہیں) واقعی اپنی اخلاقیات الہامی کتب سے حاصل نہیں کرتے۔ اگر کرتے، تو ہم سبت (Sabbath) کی چھٹی پر سختی سے عمل کرتے اور ہر اس شخص کو جو ایسا نہیں کرتا موت کی سزا دینا صحیح اور منصفانہ سمجھتے۔ ہر نو بیاہتا دلہن کو جس کا دلہا اس سے مطمئن نہیں اور جو اپنا کنوارہ پن ثابت نہ کر سکے اس کو سنگسار کردیتے۔ ہم نا فرمان بچّوں کو بھی موت کی سزا دیتے۔ ہم .... لیکن ٹھہریے۔ شاید میں نے بے جا نا انصافی سے کام لیا ہے۔ اچھے عیسائی تو اس پورے حصے کے دوران سراپا احتجاج رہے ہوں گے: سب جانتے ہیں کہ صحیفۂ قدیم بہت ناخوشگوار ہے۔ عیسیٰ کا صحیفۂ جدید اس نقصان کا ازالہ کرتا ہے اور غلطیاں درست کرتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟

## کیا صحیفۂ جدید قدرے بہتر ہے؟

### Is the New Testament Any Better?

خیر، اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے عیسیٰ صحیفۂ قدیم کے ظالم اور جابر دیو سے بہت بہتر ہے۔ واقعی عیسیٰ، اگر اس کا وجود تھا (اور اگر نہیں تھا تو پھر جس نے بھی اس کا کردار تحریر کیا تھا) یقیناً اخلاقی جدّت کا ایک عظیم تاریخی نمونہ تھا۔ "پہاڑی کا یہ واعظ– Sermon on the Mount" اپنے وقت سے بہت آگے تھا۔ اس کا "دوسرا گال سامنے کرنے" والی بات ۲۰۰۰ سال پہلے سے گاندھی اور مارٹن لوتھر کنگ کی پیش گوئی کرتی ہے۔ میں نے کسی وجہ سے ہی "دہریے: عیسیٰ کے حق میں– Athiests for Jesus " کے عنوان سے مقالہ لکھا تھا (میں اس وقت بہت محظوظ ہوا جب مجھے تحفے میں ایک ٹی شرٹ دی گئی جس پر یہی عبارت درج تھی)[^۸]۔

لیکن عیسیٰ کی اخلاقی بلندی ہی میرے نقطے کو ثابت کرتی ہے۔ عیسیٰ اپنی اخلاقیات اپنے ماحول میں موجود الہامی کتابوں سے حاصل کرنے پر مطمئن نہیں تھا۔ اس نے واضح طور پر ان سے علیحدہ روش اختیار کی، مثلاً جب اس نے سبت کے دن کام کی ممانعت اور انتباہ کو رد کیا۔ 'سبت انسان کے لئے بنایا گیا

---

[§§§§§§§§§§§§]ہم سب اس سعودی تعصب کی پشت پناہی کرتے ہیں 'یوہان ہاری کا ایک مضمون ہے جس میں اس نے برطانیہ میں سعودی وہابی اثر و رسوخ کو بے نقاب کیا ہے۔ پہلی بار ۸ فروری ۲۰۰۷ کو شائع ہونے کے بعد یہ کئی بار دیگر ویب سائٹ پر بھی شائع ہو چکا ہے، جس میں یہ لنک http://richarddawkins.net بھی شامل ہے۔

تھا، انسان سبت کے لئے نہیں' ایک مشہور محاورہ بن چکا ہے۔ کیونکہ اس باب کا محور یہ اصول ہے کہ ہم نہ تو اپنی اخلاقیات الہامی کتابوں سے لیتے ہیں اور نہ ہمیں لینی چاہئے، اس لئے عیسیٰ اس اصول کی بہترین مثال کے طور پر عزت کا حقدار ہے۔

ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ عیسیٰ کے دیے گئے خاندانی اقدار ایسے نہیں تھے جن پر وقت برباد کیا جاسکے۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ منہ پھٹ حد تک سخت گو تھا، اور اپنے معتقدوں سے امید کرتا تھا کہ وہ اس کا ساتھ دینے کے لئے اپنے خاندانوں کو چھوڑ دیں۔ 'اگر کوئی شخص میرے پاس آتا ہے اور وہ اپنے باپ سے نفرت نہیں کرتا، اپنی بیوی، ماں، بچے، بھائی، بہن حتیٰ کہ اپنی زندگی کو بھی چھوڑ نہیں سکتا، تو وہ میرا مرید نہیں بن سکتا'۔ امریکی مزاحیہ اداکارا جولیا سوینی نے اپنے سٹیج شو "خدا کو جانے دو–Letting Go of God[88]" میں اپنی شدید حیرانی کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے 'کیا نو مولود فرقے اسی طرح نہیں کرتے ہیں؟ کیا فرقے میں شمولیت کے لئے آپ کو اپنا خاندان چھوڑنے کی شرط نہیں لگا دیتے ہیں؟'[89]۔

عیسیٰ کے مشکوک خاندانی اقدار سے قطع نظر، اس کی اخلاقی تعلیمات قابل ستائش ہیں، خصوصاً جب ان کو صحیفۂ قدیم کی تباہ شدہ اخلاقیات کے مقابلے میں دیکھا جائے؛ لیکن صحیفۂ جدید میں ایسی کئی تعلیمات ہیں جنہیں کسی اچھے انسان کی حمایت حاصل نہیں ہونی چاہئے۔ میرا اشارہ خاص طور پر عیسائیت کے مرکزی نظریے کی طرف ہے: بنیادی گناہ کا کفارہ–the atonement of Original Sin۔ یہ سبق، جو صحیفۂ جدید کی الہیات کا محور ہے، اخلاقی طور پر اتنا ہی قابل نفرت ہے جتنا ابراہیم کا اسحاق کو قربانی کے لئے لے جانے کی کہانی ہے، جس سے اس کی خاصی مماثلت بھی پائی جاتی ہے – اور بقول گیزا ورمیز یہ کوئی حادثہ نہیں، جیسا کہ اس نے اپنی کتاب " عیسیٰ کے بدلتے چہرے–The Changing Faces of Jesus" میں بیان کیا ہے۔ بنیادی گناہ کا تصوّر صحیفہ قدیم میں پائے جانے والے آدم اور حوّا کے قصّے سے منسلک ہے۔ ان کا گناہ، شجر ممنوعہ کا پھل کھانا، اتنا ہلکا لگتا ہے کہ اس کے لئے صرف ایک ڈانٹ ہی کافی ہے۔ لیکن اس پھل کی علامتی حیثیت (اچھے اور برے کا علم، جو در حقیقت اس بات کا علم نکلا کہ دونوں برہنہ تھے) ان کی سیب چرانے (scrumping) کی شرارت تمام گناہوں کی بنیاد بنانے کے لئے کافی تھی[**************]۔ جس کی پاداش میں آدم و حوّا اور ان کی تمام نسلوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باغ عدن سے بے دخل دیا گیا، ابدی حیات کا تحفہ چھین لیا گیا، اور تکلیف دہ محنت، کھیت میں بھی اور زچگی میں بھی، ان کی قسمت میں لکھ دی گئی۔

یہاں تک بہت کینہ پرور: صحیفہ قدیم کے ہم پلّہ، صحیفہ جدید کی الہیات ایک نئے ظلم کا اضافہ کرتی ہے، جس کا اختتام ایک نئی ایذا پسندی پر ہوتا ہے جس کی خباثت (viciousness) کا مقابلہ صحیفہ قدیم بمشکل ہی کر پاتا ہے۔ اگر آپ ذرا غور کریں تو یہ بڑا عجیب لگتا ہے کہ ایک مذہب ظلم اور موت کے اوزار کو اپنی علامت بنا کر پیش کرے، جسے عموماً گلے میں پہنا جاتا ہے۔ لینی بروس نے اس حوالے سے بڑا خوبصورت طنز کیا ہے کہ 'اگر عیسیٰ آج سے بیس سال پہلے مرا ہوتا تو کیتھولک سکول کی لڑکیاں اپنے گلے میں صلیب کی جگہ چھوٹی چھوٹی بجلی والی کرسیاں پہنتیں'۔ لیکن اس کے پس پردہ الہیات اور جزا و سزا کا نظریہ اس سے بھی زیادہ بھیانک ہے۔ آدم و حوّا کے گناہ کے بارے میں یہی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ مرد کے ذریعے اگلی نسلوں میں منتقل ہوا – جبکہ سینٹ آگسٹائین کے مطابق نطفے کے ذریعے۔ یہ کیسا اخلاقی فلسفہ ہے جو ہر بچّے کو اس کی پیدائش سے پہلے ہی ایک قدیم پشتینی نسل کے گناہ کا وارث قرار دے دیتا ہے؟ بنیادی گناہ (original sin) کی اصطلاح وضع کرنے کا سہرا آگسٹائین کے سر جاتا ہے، جو اپنے آپ کو گناہ کے موضوع پر ماہر سمجھتا تھا۔ اس سے پہلے اسے اجداد کا گناہ (ancestral sin) کہا جاتا تھا۔ آگسٹائین کے بیان اور اس کی بحثوں کے خلاصہ کے مدّ نظر میرے خیال میں ابتدائی عیسائی علماء کا تصور گناہ غیر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنے کاغذ اور نصیحتیں آسمان اور اس میں چمکتے ستاروں، یا پہاڑوں اور سرسبز جنگلات، یا سمندروں اور افق کی تعریف پر بھی صرف کر سکتے تھے۔ گاہے بہ گاہے اس کا ذکر بھی آتا ہے، لیکن عیسائیوں کی توجہ صرف ایک ہی چیز پر مرکوز ہے: گناہ گناہ گناہ گناہ۔ آپ کی پوری زندگی پر حاوی یہ کیسی گھناؤنی سوچ ہے؟ "عیسائی قوم کے نام خط – Letter to a Christian Nation" میں سام ہیرس نے غضب کا زہر اگلا ہے: 'لگتا ہے آپ کو سب سے زیادہ فکر اس بات کی ہے کہ کائنات کا خالق کسی ایسی بات پر سخت خفا ہو گا جو لوگ ننگے پن کی حالت میں کرتے ہیں۔ آپ کی یہ بناوٹی شرم و حیا روزانہ انسانیت کے دکھ اور اندوہ میں اضافہ کرتی ہیں'۔

اور اب، ایذا رسانی اور مزدکیت (sado-masochism)۔ خدا نے جسمانی اوتار لیا اور عیسیٰ کے روپ میں آیا تاکہ اذیتیں جھیل کر آدم کے موروثی

---

[**************] مجھے احساس ہے کہ میرے قارئین کے لئے scrumping کی اصطلاح غیر مانوس ہو گی۔ لیکن مجھے غیر مانوس امریکی الفاظ پڑھنے اور لغت میں ان کے معنی دریافت کرکے اپنے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کرنے میں بہت لطف محسوس ہوتا ہے۔ میں نے اسی لئے دانستہ طور پر چند مزید علاقائی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ Scrumping محض غیر معمولی اختصار سے بھرپور ایک موزوں لفظ ہی نہیں ہے۔ اس کا مطلب صرف چوری کرنا ہی نہیں ہے: یہ خاص طور سے سیب۔ اور صرف سیب ہی۔ کی چوری کو بیان کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ کسی لفظ کا اس سے زیادہ موزوں ہونا مشکل ہے۔ بے شک کتاب الآغاز کی کہانی خصوصاً یہ نہیں کہتی کہ پھل سیب ہی تھا۔ لیکن ایک لمبے عرصے سے یہی روایت مروّج ہے۔

گناہ کا کفارہ ادا کیا جا سکے۔ جب سے سینٹ پال نے یہ نفرت انگیز نظریہ واضح کیاہے، ہم اپنے گناہوں کے نجات دہندہ کے طور پر عیسیٰ کی عبادت کرتے چلے آ رہے ہیں۔ نہ صرف آدم کے گزشتہ گناہ کے نجات دہندہ کے طور پر بلکہ مستقبل میں ابن آدم سے ہونے والے گناہ کا بھی ، چاہے مستقبل کے لوگوں نے انہیں کرنے کا فیصلہ کیا ہو یا نہ کیا ہو!

دوسرے زاویۂ نظر سے ، بہت سے لوگوں کے ذہن میں یہ خیال آچکا ہے کہ تاریخ نے بیچارے یہوداہ اسکریوتی (Judas Iscariot) کے ساتھ زیادتی کی ہے، جبکہ اس کی بیوفائی آسمانی منصوبے کا حصہ تھی۔ رابرٹ گریوز نے بھی اپنے ناول "بادشاہ عیسیٰ–King Jesus" میں اس بات کا ذکر کیا ہے۔ اور یہی بات عیسیٰ کے مبیّنہ قاتلوں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ اگر عیسیٰ کی یہی خواہش تھی کہ اس کے ساتھ بے وفائی کی جائے اور اس کا قتل کیا جائے تاکہ وہ ہم سب کی نجات کا سبب بن سکے، تو کیا یہ کچھ غیر منصفانہ نہیں لگتا ہے کہ وہ لوگ جو اپنے آپ کو عیسیٰ کی شفاعت سے بہرہ مند سمجھتے ہیں اپنا سارا غصہ یہوداہ اور یہودیوں کی نسلوں پر نکالتے آئیں؟ میں پہلے ہی غیر الہامی اناجیل کی (non-canonical gospels) فہرست دے چکا ہوں ۔ حال ہی میں ایک مسودے کا ترجمہ کیا گیا ہے جس کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ یہوداہ کی انجیل ہے، اور ترجمے کے باعث اسے اچھی خاصی شہرت حاصل ہوگئی ہے[٩]۔اگرچہ اس کی دریافت کے حالات متنازع رہے ہیں ، یہ مسودہ غالباً بیسویں صدی کی چھٹی یا ساتویں دہائی میں مصر میں دریافت ہوا تھا۔ یہ پپائیرس کے باسٹھ صفحات پر قبطی رسم الخط (Coptic script) میں لکھا ہوا ہے۔ Carbon dating کے مطابق یہ تقریباً ۳۰۰ عیسوی میں لکھا گیا ہے لیکن غالباً کسی پرانے یونانی مسودے پر مبنی ہے۔ اس کا مصنف جو بھی ہو، یہ انجیل یہوداہ اسکریوتی کا نقطۂ نظر بیان کرتی ہے اور یہ دعویٰ کرتی ہے کہ یہوداہ نے عیسیٰ کے ساتھ بے وفائی خود اسکے ہی کہنے پر کی تھی۔ یہ سب عیسیٰ کو مصلوب کروانے کے منصوبے کا حصہ تھا تاکہ وہ ساری انسانیت کی نجات کروا سکے۔ یہ نظریہ نہایت ناقابل برداشت ہے، اور اس امر کی ناگواری میں اضافہ کرتا ہے کہ یہوداہ کو ہمیشہ سے ذلیل و رسوا کیا جا رہا ہے ۔

جیسا کہ میں نے عیسائیت کے مرکزی نظریے کفّارہ کو بیہودہ، ایذا رساں مساکیت، اور نفرت انگیز کہہ کر بیان کیا ہے۔ اگر اس کی حاضر و ناظر شناسائی نے ہماری غیر جانبداری کو کند نہ کر دیا ہو تو ہمیں اسے پرلے درجے کا پاگل پن بھی کہنا چاہئے۔ اگر خدا ہمارے گناہ معاف کرنا ہی چاہتا ہے تو وہ اپنے آپ کو تشدد کا نشانہ بنانےاور صلیب پر لٹکنے کی بجائے ہمیں براہ راست معاف ہی کیوں نہیں کر دیتا، اوراسی طرح یہودیوں کے مستقبل کی دور افتادہ نسلوں کا منظم قتل عام اور " مسیح کے قاتلوں" کو لعنت و ملامت سے بچا کیوں نہیں لیتا: یا کیایہ گناہ بھی نطفے کے ذریعے ہر نسل میں منتقل ہوتا رہتاہے؟

جیسے کہ یہودی عالم گیزا ورمیز نے واضح کیا ہے، پال اس قدیم یہودی دینی اصول میں رچا بسا تھا کہ خون بہائے بغیر کفّارہ ممکن نہیں"[٩]۔ "یہودیوں کے نام خط –(۹:۲۲) Epistle to the Hebrews" کے مصنف نے بھی اسی طرح کہا تھا۔ آج کے ترّقی پسند علماء اخلاقیات تو سزا کے کسی بھی مکافاتی نظریے کا دفاع نہیں کر پاتے تو 'قربانی کے بکرے'( scapegoat) کے نظریے یعنی گناہگاروں کے جرم کا مداوا کرنے کے لئے کسی معصوم کی جان لے لینے کا دفاع تو دور کی بات ہے۔ ویسے بھی (اور ہم یہ سوچے بغیر رہ بھی نہیں سکتے) آخر خدا کس پر رعب جھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا؟ غالباً اپنے آپ پر –منصف خود ہی فیصلہ کرنے والا اور خود ہی سزا پانے والا۔ اور ان سب پر طرّہ یہ کہ اس بنیادی گناہ کے مبینہ مرتکب آدم کا کوئی وجود تو تھا ہی نہیں: ایک ایسی ناگوار حقیقت ہے جس کے بارے میں پال کا لاعلم ہونا قابل معافی ہے لیکن غیب کا علم رکھنے والے خدا کو (اور عیسیٰ کو اگر آپ یہ مانتے ہیں کہ عیسیٰ خدا ہی تھا) تو غالباً اس بات کا علم ہو گا جو اس پیچیدہ اور ناگوار نظریے کی بنیاد کو ہی کھوکھلا کر دیتی ہے۔ ارے، میں تو بھول ہی گیا تھا؛ آدم اور حوّا کی کہانی تو علامتی ہے، ہے نا؟ علامتی؟ یعنی، اپنے آپ کو مرعوب کرنے کے لئے، عیسیٰ نے ایک غیر موجود شخص کے علامتی گناہ کی نیابتی سزا کے طور پر اپنے آپ کو تکلیف پہنچائی، اور مصلوب ہوا؟ اور جیسا کے میں نے پہلے بھی کہا، یہ مکمل پاگل پن، اور شدید تکلیف دہ ہے۔

انجیل کے موضوع سے برخاست ہونے سے پہلے میں آپ کی توجہ اس کی اخلاقی تعلیمات کے ایک نا قابل برداشت پہلو کی طرف مبذول کراناچاہتا ہوں۔ عیسائیوں کو اس بات کا احساس شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ صحیفۂ قدیم و جدید میں غیروں کے لئے جن اخلاقی رویوں کا پرچار کیا جاتا ہے وہ شروعات میں صرف ایک محدود گروہ کے لئے تھیں جن کی تعریف بہت مخصوص بنیادوں پر کی گئی تھیں۔ 'ہمسائے کے ساتھ شفقت سے پیش آؤ' کا وہ مطلب نہیں تھا جو ہم آج سمجھتے ہیں، بلکہ صرف اتنا تھا کہ 'یہودی کے ساتھ شفقت سے پیش آؤ'۔ اس نقطے کو امریکی طبیب اور ماہر ارتقائی بشریات جان ہارٹنگ نے بہت عمدہ انداز سے بیان کیا ہے۔ اس نے انجیلی تاریخ میں جماعتی اخلاقیات کی ارتقاء پر ایک مقالہ لکھا ہے – اور اس میں مزید جماعت سے علیحدہ عداوتوں پر بھی روشنی ڈالی

---

ایلین پیگلز اور کیرن ایل کنگ کی کتاب Reading Judas ہماری کتاب کی سخت جلد کی اشاعت کے بعد چھپی، لیکن اب بازار میں میسر ہے۔ کیرن کنگ کے ترجمے پر مبنی یہ کتاب اس بے وفا اعظم کو ہمدردانہ زاویے سے دیکھتی ہے۔

ہے۔

## ہمسائے سے شفقت برتیں

## Love Thy Neighbour

جان ہارٹنگ کا سیاہ مزاح شروع سے ہی عیاں ہو جاتا ہے[92]، جہاں وہ جہنم میں ریاست الاباما سے تعلق رکھنے والے گنہگاروں کی روحوں کے شمار کرنے کی جنوبی بپٹسٹ پادریوں (Southern Baptist) کی ایک تحریک کے بارے میں بتاتا ہے۔نیو یارک ٹائیمز اور نیوزڈے اخباروں میں چھپنے والے حتمی نتائج کے مطابق ایسی روحوں کی تعداد ۸۶ء۱ ملین ہے۔ یہ عدد ایک خفیہ فارمولے کے مطابق نکالا گیا جہاں میتھوڈسٹ مسلک کے لوگوں کا آخرت کی سزا سے بچ جانے کے امکانات رومن کیتھولک مسلک سے زیادہ دکھائے گئے تھے، جبکہ 'ہر ایسی روح جو کسی بھی مسلک سے تعلق نہ رکھتی ہو جہنم رسیدہ قرار دے دی گئی'۔ ان لوگوں کی ماورائے طبع خود اعتمادی آج کل کی "بے خود – rapture" ویب سائٹ میں ظہور پزیر ہوتی ہے، جن میں کالم لکھنے والے کو اپنے بارے میں کامل اعتماد ہوتا ہے کہ وہ تو یقیناً اٹھائے جانے والے خوش قسمتوں میں شامل ہو گا جو "آخرت" کے آتے ہی "آسمان" میں روپوش ہو جائیں گے۔ Rapture Ready یعنی "اٹھائے جانے کے لئے تیار" نامی ویب سائٹ میں ایک مصنف کے یہ الفاظ اس سوچ کاایک مثالی نمونہ ہیں: 'اگر اٹھائے جانے کا عمل پیش آ جانے کی صورت میں میں غیر حاضر ہو جاؤں تو مصیبت کے ولیوں (tribulation saints) پر لازم ہو گا کہ وہ اس سائٹ کی مالی معاونت کریں یا اس جیسی دیگر سائٹ بنائیں'
۔

ہارٹنگ کی تشریح کے مطابق انجیل عیسائیوں کی اس خود اعتمادی اور بے پرواہی کے ضمن میں کوئی ثبوت فراہم نہیں کرتی ہے۔ عیسیٰ نے آخرت میں بچ جانے والوں کے اندرونی گروہ کو صرف یہودیوں تک ہی محدود رکھا تھا، اور اس ضمن میں وہ صحیفۂ قدیم کی روایات پر ہی قائم تھا، کیونکہ اس کے علاوہ وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ ہارٹنگ صاف انداز میں واضح کرتا ہے کہ "تم کسی کو نہیں مارو گے" کا کبھی بھی وہ مقصد نہیں تھا جو ہم آج سمجھتے ہیں۔ بڑے ہی مخصوص انداز میں، اس حکم کا مطلب یہ تھا کہ تم کسی یہودی کو نہیں مارو گے۔ اور وہ تمام احکامات جو "تمہارے ہمسائے" کے بارے میں ہیں اسی طرح مستثنیٰ ہیں۔ "ہمسایہ" کا مطلب صرف یہودی ساتھی ہے۔ بارہویں صدی کا مشہور یہودی طبیب اور ربّی موسیٰ بن مائیمون (Moses Maimonides) "تم کسی کو نہیں مارو گے" کی تشریح یوں بیان کرتا ہے: 'اگر کوئی ایک اسرائیلی کو بھی مارے تو وہ ایک منفی حکم کا مرتکب ہو گا، کیونکہ الہامی کتب یہ بتاتی ہیں کہ تم خون نہیں بہاؤ گے۔ اگر کوئی دانستہ طور پر گواہوں کی موجودگی میں کسی کا خون کرتا ہے تو تلوار کے وار سے اس کا سر تن سے جدا کر دیا جائے گا۔ اور یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ اگر کوئی کسی کافر کا خون کردے تو اسے موت کی سزا نہیں دی جائے گی'۔یہ بات اس قدر عام فہم ہے کہ اس کے کہنے کی کوئی ضرورت نہیں!

ہارٹنگ اسی طرز پر سین ہیڈرن (یہودی عدالت عظمیٰ Sanhedrin جس کا سربراہ سب سے اہم مذہبی پیشوا ہوتا تھا) سے اقتباس پیش کرتا ہے جس میں ایک شخص نے غلطی سے ایک یہودی کو مار دیاجبکہ اس کی نیت کسی کافر یا جانور کو مارنے کی تھی۔ یہ اخلاقی معمہ ایک اہم نقطے کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اگر یہ شخص نو آدمیوں کے ایک گروہ میں پتھر پھینکتا جن میں سے صرف ایک اسرائیلی ہوتا اور باقی سب کافر، لیکن پتھر اسرائیلی کو ہی جا لگتا، تو پھر؟ بہت بڑی مشکل پیدا ہو جاتی! لیکن اس مشکل کا حل بھی حاضر ہے۔ 'پھر اس کو اس توجیہہ پر بری الذمہ سمجھا جاتا کہ عمومی طور پر گروہ کافر ہی تھا'۔

ہارٹنگ ارض موعودہ (Promised Land) کی فتح کے بارے میں انجیل سے موسیٰ، یشوع اور باب المنصفین سے وہی حوالے دیتا ہے جو میں نے اس باب میں استعمال کئے ہیں۔ میں نے احتیاطاً اس بات کا اعتراف بھی کر لیا کہ مذہبی لوگ اب انجیل کے انداز میں نہیں سوچتے۔ میرے لئے یہ اس بات کا اظہار تھا کہ چاہے ہم مذہبی ہوں یا نہ ہوں ہماری اخلاقیات کا سرچشمہ کہیں اور سے پھوٹتا ہے؛ اور وہ سرچشمہ جو بھی ہو ہم سب کو، چاہے ہم مذہبی ہوں یا نہ ہوں بلا امتیاز میسّر ہے۔ ہارٹنگ ہمیں اسرائیلی ماہر نفسیات جارج ٹامارن کی ایک خوفناک تحقیق کے بارے میں بتاتا ہے۔ ٹامارن نے سو کے قریب دس سے چودہ سال کے طلبہ کے سامنے کتاب یشوع میں جیریکو کی جنگ کا قصہ پیش کیا:

> یشوع نے لوگوں سے کہا، '۔چلّاؤ؛ کہ خداوند نے تمہیں شہر عطا کیا ہے۔اور یہ شہر، اور اس کے اندر جو کچھ بھی ہے، خداوند کے حضور تباہی کے لئے حاضر ہے.... لیکن سارا سونا ، چاندی، ، دھات اور تانبے کے برتن، خداوند کے حضور مقدس میں ہیں؛

---

ہو سکتا ہے آپ کو اس جملے میں استعمال کی گئی اصطلاحtribulation saints سمجھ نہ آسکی ہو۔اس کی پرواہ نہ کریں؛آپ کے پاس کرنے کے لئے اس سے بہتر بھی کام ہیں۔

یہ سب خداوند کے خزانے میں جائیں گے'... پھر انہوں نے تلوار کی دھار پر شہر میں سب کچھ تباہ کر دیا، مرد اور عورتیں، بچّے اور بوڑھے، بیل، بکری، اور گدھے ... اور انہوں نے شہر اور اس کے اندر ہر شے کو آگ لگادی؛ بس سونا ، چاندی، ، دھات اور تانبے کے برتن خداوند کے خزانے میں جمع کرا دیے۔

اب ٹامارن نے طلبہ سے ایک سادہ سا اخلاقی سوال کیا: 'آپ کے خیال میں یشوع اور اسرائیلیوں کی یہ حرکت صحیح تھی یا غلط'؟ طلبہ کوجواب کے لئے تین صورتوں میں سےایک کا انتخاب کرنا تھا (ا) مکمل اتفاق، (ب) جزوی اتفاق اور (ج) مکمل عدم اتفاق۔ نتائج تقطیب پزیر (polarized) نکلے: ٦٦ فیصد نے مکمل اتفاق کیا اور ٢٦ فیصد نے مکمل اختلاف کیا، اور صرف ٨ فیصد نے درمیان میں جزوی اتفاق کیا۔ مکمل اتفاق والے گروہ (ا)کے تین مثالی جوابات ذیل میں ملاحظہ کیجئے:

میرے خیال میں عیسیٰ اور بنی اسرائیل نے صحیح کیا، اور اس کی یہ وجوہات ہیں: خداوند نے انہیں یہ ملک دینے کا وعدہ کیا تھا، اور فتح کرنے کی اجازت دی تھی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے اور قتل و غارت نہ کرتے تو وہ غیر یہودیوں کے معاشرے میں سما کر گم ہو جاتے۔

میرا خیال ہے عیسیٰ نے صحیح کیا، اور اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ خداوند نے اسے اس شہر کے لوگوں کو ختم کرنے کا حکم دیا تھا، تاکہ قوم اسرائیل ان میں بس جائے اور ان کی بری عادات اپنانے سے محفوظ رہ سکے۔

عیسیٰ نے اچھا کام کیا، کیونکہ اس شہر کے رہنے والے کسی دوسرے مذہب کے ماننے والے تھے، اور جب عیسیٰ نے انہیں مار دیا تو اس نے ان کے مذہب کو بھی نیست و نابود کر دیا۔

ہر جواب میں عیسیٰ کے ہاتھوں اس نسل کش قتل عام کا جواز مذہبی ہی تھا۔ گروہ (ج) میں بھی عیسیٰ کے اقدامات سے مکمل اختلاف کرنے والوں میں سے کچھ طلبہ نے مذہبی وجوہات کی بنا پر ہی اختلاف کیا تھا۔ مثال کے طور پر ایک لڑکی نے عیسیٰ کی جیریکو پر فتح کو اس لئے ناپسند کیا کیونکہ فتح کرنے کے لئے اسے شہر میں داخل ہونا پڑا اور:

میرے خیال میں ایسا کرنا غلط ہے، کیونکہ عرب ناپاک ہوتے ہیں اور ناپاک شہر میں داخل ہونے سے وہ بھی ناپاک ہو جائے گا اور ان کی لعنت اس پر بھی آ جائے گی۔

مکمل اختلاف کرنے والے دو اور لوگوں نے یہ وجہ دی کہ عیسیٰ نے جانور اور املاک سمیت سب کچھ تباہ کر دیا، جبکہ اس کا کچھ حصہ بنی اسرائیل کے لئے مال غنیمت کے طور پر بچایا بھی جا سکتا تھا:

میرے خیال میں عیسیٰ نے مناسب طور پر عمل نہیں کیا۔ جانوروں کو بنی اسرائیل کے لئے بچایا جا سکتا تھا۔

میرے خیال میں عیسیٰ کا فیصلہ مناسب نہیں تھا؛ اسے جیریکو کی املاک چھوڑ دینی چاہئے تھی۔ اگر اس نے املاک تباہ نہ کی ہوتی تو وہ بنی اسرائیل کی ملکیت میں شمار ہوجاتی۔

ایک بار پھر ہسپانوی فلسفی موسیٰ بن مائیمون کسی شک شبہ میں نہیں کہ وہ اس مسئلے کے بارے میں کیا سوچتا ہے: 'ان سات قوموں کو تباہ کرنے کا حکم ایک مثبت حکم ہے، کیونکہ کہا ہی یہی گیا ہے کہ تم ان کو مکمل تباہ کر دو ۔ اگر کوئی ان میں سے کسی ایک کو بھی اپنے قبضے میں آ جانے کے بعد موت کے گھاٹ نہیں اتارتا تو وہ ایک منفی حکم کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو گا: تم ایسی کسی چیز کو زندہ نہ چھوڑو جو سانس لیتی ہو۔

موسیٰ بن مائیمون کے برعکس ٹامارن کی تحقیق میں شامل طلبہ ابھی دور معصومیت میں تھے۔ غالباً ان بچّوں نے جن وحشی خیالات کا اظہار کیا وہ انہوں نے اپنے والدین سے مستعار لئے تھے یا اس تہذیبی گروہ سے جس میں ان کی نشوو نما ہوئی۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ خارج القیاس نہیں کہ ایسے ہی جنگ دریدہ ملک میں رہنے والے فلسطینی بچّے بھی مختلف سمت میں اپنے وحشی خیالات کا اظہار کرتے ہوں گے۔ یہ تحفظات مجھے شدید غمزدہ کر دیتے ہیں۔ یہ خیالات مذہب کی قوموں کو بانٹنے اور تاریخی دشمنیوں اور موروثی جھگڑوں کو بڑھاوا دینے کی بے انتہا قوّت کا ایک خوفناک مظاہرہ ہیں، اور خاص کر جب یہ کام بچّوں کی تربیت کے ذریعے سر انجام دیا جاتا ہو۔ میں اس بات کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ٹامارن نے گروہ (الف) کے جن تین جوابات کو شائع کیا ان میں سے دو نے معاشرتی انجذاب کو ایک برائی قرار دیا اور تیسرے میں کسی مذہب کو مٹانے کے لئے اس کے پیروکاروں کے قتل عام کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا۔

ٹامارن نے اپنی تحقیق میں ایک بڑے دلچسپ "پابند گروہ" (control group) کا استعمال بھی کیا۔ ۱۶۸ اسرائیلی بچّوں کو کتاب عیسیٰ سے وہی متن فراہم کیا گیا لیکن عیسیٰ کی جگہ نام بدل کر فرضی نام "جنرل لن" استعمال کیا گیا اور بنی اسرائیل کو "۳۰۰۰ سال پرانی چینی سلطنت" سے تبدیل کر دیا گیا۔ اب تحقیق کے نتائج یکسر الٹ نکلے۔ صرف ۷ فیصد نے جنرل لن کے اقدامات کی حمایت کی جبکہ ۷۵ فیصد نے سخت مخالفت کی۔ دوسرے الفاظ میں، جب یہودی مذہب کے ساتھ وفاداری کو خارج البحث کر دیا گیا تو بچّوں کی اکثریت نے وہی اخلاقی رویے اختیار کئے جن پر تمام جدید انسان متفق ہیں۔ عیسیٰ کا اقدام بہیمانہ قتل عام کا ایک واقعہ ہے۔ لیکن مذہبی نقطۂ نظر سے یہ سب بہت مختلف لگتا ہے۔ اور یہ اختلاف زندگی کے اوائل میں ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اس تحقیق میں ہم نے دیکھا کہ ایک سفّاکانہ نسل کشی کی واردات کی حمایت یا مخالفت کا دار و مدار صرف مذہبی وابستگی پر تھا۔

ہارٹنگ اپنے مقالے کے دوسرے حصے میں صحیفۂ جدید کو اپنی توجہ کا مرکز بناتا ہے ۔ اگر اس کے مقالے کا مختصر خلاصہ کیا جائے تو کچھ یوں ہو گا۔ عیسیٰ اسی اندرونی جماعتی اخلاقیات اور بیرونی گروہ کی نفرت کا معتقد تھا جو صحیفۂ قدیم میں بغیر کسی شرط کے قابل قبول مانی جاتی ہے۔ عیسیٰ ایک وفادار یہودی تھا۔ یہودی خدا کو غیر یہودیوں تک پھیلانے کاخیال پال نے ایجاد کیا تھا۔ مجھ میں اس بے باکی کی ہمّت نہیں جو اس بات کو کہنے میں ہارٹنگ نے دکھائی: 'اگر عیسیٰ کو خبر ہوتی کہ پال اس کے منصوبے کو سوؤروں تک لے جائے گا تو وہ اپنی قبر میں لوٹ رہا ہوتا'۔

ہارٹنگ نے کتاب الکشف (The Book of Revelation) کا خوب تمسخر اڑایا؛ یہ کتاب انجیل کی کتابوں میں سے بھی بہت عجیب و غریب۔ اس کے بارے میں یہی مشہور ہے کہ یہ سینٹ جان کی تصنیف کردہ ہے اور، جیسا کہ کتاب "کین کی راہنمائے انجیل–Ken's Guide to the Bible" میں لکھا ہوا ہے، اگر جان کے خطوط پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ جان نے چرس کا دم مارا ہوا ہے تو الکشف میں جان نے ایل ایس ڈی منشیات کے کش پہ کش لگائے ہوئے ہیں[۹۳]۔ ہارٹنگ کتاب الکشف کی دو آیات کی طرف ہماری توجہ دلاتاہے جس میں 'مہر بند' (sealed) لوگوں کی تعداد ۱۴۴،۰۰۰ بتائی گئی ہے (جنہیں کچھ مسلک مہر بند کی بجائے 'بچائے گئے –saved' کہتے ہیں)۔ ہارٹنگ کا نقطہ یہ تھا کہ ان سب کا یہودی ہونا ضروری تھا: ۱۲ قبیلوں میں ہر قبیلے سے ۱۲،۰۰۰ لوگ۔ کین سمتھ مزید یہ وضاحت بھی کرتا ہے کہ ان منتخب ۱۴۴،۰۰۰ لوگوں نے 'کبھی عورت کے ساتھ تعلق بنا کر اپنے آپ کو ناپاک نہیں کیا تھا'، جس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ ان ۱۴۴،۰۰۰ میں عورتیں تو نہیں ہو سکتی تھیں۔ خیر، انجیل سے ایسی بات کی امید تو کی ہی جاسکتی ہے۔

ہارٹنگ کے تفریح سے بھرپور مقالے میں ایسی اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔ میں ایک بار پھر آپ کو اس مقالے کو پڑھنے کی صلاح دوں گا۔ فی الحال اس اقتباس میں اس کا خلاصہ پیش کرتا ہوں:

> انجیل جماعت کی اندرونی اخلاقیات کا ایک نقشہ ہے، جس میں نسل کشی، غیر جماعت کو غلام بنانے اور دنیا پر قبضہ جمانے کے لئے ہدایات شامل ہیں۔ لیکن انجیل اپنے مقاصد، یا قتل، ظلم اور عصمت دری کی تحلیل کی وجہ سے بری نہیں ہے۔ بہت سی قدیمی کتابیں ایسا ہی کرتی ہیں – یونانیوں کی الیاد، آئیس لینڈ کی قدیم داستانیں، قدیم شامیوں کے قصے، جنوبی امریکہ کی مایا تہذیب کی تحریریں۔ لیکن اصل مسئلہ یہیں پر ہے کہ الیاد کو کوئی اخلاقیات کی بنیاد کے طور پر نہیں بیچ رہا ہے جبکہ انجیل

محض کتاب نہیں ہے ۔ یہ لوگوں کی زندگی کے رہنما اصولوں کے مجموعے کے طور پر بیچی اور خریدی جاتی ہے۔ اور دنیا کی سب سے زیادہ بکنے والی کتاب ہے۔

اگر کسی کو یہ وہم ہو کہ روایتی یہودیت کے امتیازات دیگر مذاہب سے منفرد ہیں تو وہ آئیساک واٹس (۱۷۴۸ - ۱۶۷۴) کی ایک حمد کے درج ذیل اشعار پڑھ لے:

یہ سب تمہارا کرم ہے آقا
یہ کوئی حادثہ نہیں
کہ میں عیسائی پیدا ہوا ہوں
یہودی یا کافر نہیں

ان اشعار کے بارے میں جو چیز مجھے پریشان کر رہی ہے وہ ان کی اختصاصیت نہیں بلکہ ان کی منطق ہے۔ کیونکہ بہت سے لوگ عیسائیت کے علاوہ دیگر مذاہب میں پیدا ہوئے تھے ، خدا نے کیسے فیصلہ کیا کہ مستقبل میں کن لوگوں کو پیدائش کی اس التفات سے نوازا جائے گا؟ صرف آئیزک واٹس پر اور ان لوگوں پر جو اس کے خیال میں یہ حمد پڑھیں گے یہ نوازش کیوں؟ آئیزک واٹس کا اپنی ماں کے رحم میں آنے سے پہلے، یہ التفات جس ہستی پر کی گئی ہو گی اس کی حیثیت کیا تھی؟ یہ بہت گہرے پانی کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن الہیات میں ڈوبے ہوئے ذہن کے لئے اتنے بھی گہرے نہیں کہ ان سے تیر کر نکل نہ جائے۔ آئیزک واٹس کی حمد اس دعا سے مشابہت رکھتی ہے جو کٹّر مذہبی (Orthodox) اور قدامت پسند (Conservative) یہودیوں کو (لیکن اصلاح یا Reform والے نہیں) سکھایا جاتا ہے: 'مبارک ہو تم کہ مجھے غیر یہودی نہیں بنایا۔ مبارک ہو تم کہ مجھے عورت نہیں بنایا۔ مبارک ہو تم کہ مجھے غلام نہیں بنایا'۔

بے شک مذہب میں تقسیم کرنے کی بے پناہ طاقت ہے، اور یہ اس پر لگائے جانے والے الزامات میں سے ایک اہم الزام ہے۔ لیکن عموماً یہ کہا جاتا ہے اور یہ سچ بھی ہے کہ مذہبی گروہوں اور مسلکوں میں جنگ اور تنازعات شاذ و نادر ہی مذہبی اختلافات کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ جب السٹر پروٹسٹنٹ کا تخریب کار ایک کیتھولک کا قتل کرتا ہے تو وہ زیر لب یہ نہیں بڑبڑا رہا ہوتا 'یہ لے! استحصال پسند (transubstantiationist)، مریم کے پجاری، بخور کی بد بو والے حرامی'۔ بلکہ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ کسی اور کیتھولک کے ہاتھوں کسی اور پروٹسٹنٹ کی موت کا بدلہ لے رہا ہے جو شاید نسلوں پر محیط کسی مسلکی لڑائی کے تسلسل کا حصہ ہے۔ مذہب تو محض اندرونی جماعتوں اور خارجی جماعتوں کی دشمنیوں اور خاندانی لڑائیوں کا سر نامہ ہے ، اور یہ رنگ، زبان یا پسندیدہ فٹبال ٹیم کے سرناموں سے زیادہ مختلف نہیں، لیکن عام طور سے باقی سب سر ناموں کے مقابلے میں قدرے آسانی سے میسّر ہو جاتا ہے۔

ہاں بالکل یہ درست ہے کہ شمالی آئیرلینڈ کے مسائل سیاسی ہیں، یہاں واقعی صدیوں سے ایک گروہ کے ہاتھوں دوسرے گروہ کا معاشی اور سیاسی استحصال ہوتا رہا ہے ۔ یہاں حقیقی شکایتیں اور نا انصافیاں موجود ہیں، اور ان کا مذہب سے بہت کم تعلق نظر آتا ہے؛ سوائے اس بات کے ،جو عموماً نظرانداز کر دی جاتی ہے، کہ مذہب کی غیر موجودگی میں یہ فیصلہ کرنے کا اور کوئی معیار نہیں بچ جاتا کہ کس کا استحصال کیا جائے اور کس کا بدلہ لیا جائے۔ اور شمالی آئیرلینڈ میں اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہ سر نامے نسل در نسل منتقل ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ کیتھولک لوگ، جن کے باپ، دادا، پر دادا اور دیگر نسلیں کیتھولک سکولوں میں پڑھتے آئے ہیں، اپنے بچّوں کو کیتھولک سکولوں میں پڑھنے کے لئے بھیجتے ہیں۔ پروٹسٹنٹ لوگ، جن کے باپ، دادا، پر دادا اور دیگر نسلیں پروٹسٹنٹ سکولوں میں پڑھتے آئے ہیں، اپنے بچّوں کو پروٹسٹنٹ سکولوں میں پڑھنے کے لئے بھیجتے ہیں۔ یہ دونوں جماعتیں ایک ہی رنگ کی ہیں، ایک ہی زبان بولتی ہیں اور ایک ہی جیسی چیزیں پسند کرتی ہیں، لیکن اس کی تاریخی تقسیم اتنی گہری ہے کہ یوں لگتا ہے جیسے یہ دو مختلف اجناس سے ہیں۔ مذہب اور مذہبی امتیاز کی بنا پر دی جانے والی تعلیم کے بغیر یہ تقسیم ممکن ہی نہیں تھی۔ دونوں جنگجو قبیلے آپس میں شادی بیاہ کرتے کرتے ایک دوسرے میں رچ بس گئے ہوتے۔ کوسوو سے لیکر فلسطین تک، عراق سے لیکر سوڈان تک، السٹر سے لیکر بر صغیر ہند تک، دنیا کے کسی بھی خطے میں جہاں آپ کو مد مقابل گروہوں میں بے لگام دشمنی اور تشدد نظر آئے، اس کا بغور جائزہ لیں۔ میں دعوے سے تو نہیں کہوں گا لیکن اتنا ضرور ہے کہ آپ کو یہاں اندرونی اور خارجی جماعتی سرنامے ملیں گے، لیکن میرے خیال

میں ایسا ہونے کے بہت امکانات ہیں۔

ہندوستان میں تقسیم ہند کے وقت ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی فسادات میں دس لاکھ سے زیادہ لوگ مارے گئے، اور ڈیڑھ کروڑ بے گھر کر دیے گئے۔ مذہبی شناخت کے علاوہ اور کوئی علامت نہیں تھی جس کی بنا پر یہ فیصلہ کیا جاتا تھا کہ کس کو قتل کرنا ہے کس کو نہیں۔ آخر کار، ہندوستانیوں کو تقسیم کرنے کے لئے مذہب کے علاوہ کوئی اور وجہ نہ مل سکی۔ ۔ ہندوستان میں مذہبی قتل عام کے حالیہ واقعات نے سلمان رشدی کو ایک مقالہ لکھنے پر مجبور کر دیا جس کا عنوان تھا 'مذہب ہمیشہ کی طرح زہر بن کر ہندوستان کے خون میں گردش کر رہا ہے[۹۴]'۔اس مقالہ کے اختتامی پیرا گراف میں لکھتے ہیں:

> اس میں، یا ان سب جرائم میں جو آجکل مذہب کے خوفناک نام پر پوری دنیا میں کئے جا رہے ہیں، احترام والی کون سی بات ہے؟ مذہب کتنی آسانی سے اور کتنے خوفناک نتائج کے ساتھ دیوتا کھڑے کر دیتا ہے اور ہم ان کے نام پر قتل کرنے کے لئے کتنے مشتاق ہو جاتے ہیں! اور جب ہم کافی دفع ایسا کر چکے ہوتے ہیں تو ہماری حس گناہ بالکل مردہ ہو جاتی ہے اور ہمیں آئندہ بھی ایسا کرنے میں آسانی محسوس ہونے لگتی ہے۔
>
> تو پھر ہندوستان کا مسئلہ پوری دنیا کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ ہندوستان میں جو کچھ بھی ہوا وہ خدا کے نام پر ہوا۔
>
> یعنی مسئلے کا نام خدا ہے۔

مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ اپنی جماعت کے ساتھ وفاداری اور غیر جماعت کے ساتھ نفرت انسان کی فطری جبلّتیں ہیں ، یہ مذہب کی غیر موجودگی میں بھی اپنا وجود رکھتی ہیں ۔ فٹبال ٹیموں کے حمایتی چھوٹے پیمانے پر اسی رجحان کی مثال ہیں۔ فٹبال کے حمایتی بھی کبھی کبھی مذہبی خطوط پر تقسیم ہو جاتے ہیں، جیسے گلاسگو رینجرز اور گلاسگو کیلٹک۔ زبانیں (جیسے بلجیم میں)، نسل اور قبیلے (جیسے افریقہ میں) قوموں کو تقسیم کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مگر مذہب نقصان کو تین طریقوں سے مزید بڑھاتاا اور بگاڑتا ہے:

- بچوں پر سرنامے لگانا۔ بچوں کو چھوٹی عمر سے ہی 'کیتھولک بچّہ'، 'پروٹسٹنٹ بچّہ' وغیرہ کہہ کر پکارنا جبکہ ابھی وہ فیصلہ بھی نہیں کر پائے ہوتے کہ وہ مذہب کے بارے میں کیا سوچتے ہیں (بچپن میں اس ظلم کے موضوع پر میں باب ۹ میں تفصیل سے بات کروں گا)۔
- علیحدہ سکول۔ چھوٹی عمر سے ہی بچّوں کو اپنے مذہبی ہم جماعتوں کے ساتھ تعلیم دی جاتی ہے اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کے بچّوں سے دور رکھا جاتا ہے۔ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اگر شمالی آئیرلینڈ سے علیحدہ سکول ختم کر دیے جائیں تو ایک ہی نسل میں مسائل کا خاتمہ ہوجائے گا۔
- 'اپنی جماعت سے باہر شادی ،بیاہ کی ممانعت ۔ یہ جھگڑا ختم کرنے، سبھی جماعتوں کو ملنے سے روک کر موروثی تنازعات اور جھگڑوں کو بڑھاوا دیتا ہے۔ اگر جماعتوں کے مابین شادی کرنے کی اجازت ہو تو قدرتی طور پر ہی یہ دشمنیاں ماند پڑ جائیں گی۔

شمالی آئیرلینڈ کے گاؤں گلیناآرم میں آنٹریم کے نوابوں (Earls of Antrim) کی گدی ہے۔ حالیہ تاریخ میں ایک نواب نے ایک ممنوع حرکت کر ڈالی: اس نے ایک کیتھولک لڑکی سے شادی کر لی۔ فوراً ہی گلیناآرم کے گھروں کی کھڑکیوں کے پردے ماتم میں گرا دیئے گئے ۔ یہودیوں میں بھی مذہب سے باہر شادی کرنے کا خوف عام ہے۔ من درجہ بالا اقتباسات میں بہت سے بچّوں نے جنگ جیریکو میں عیسیٰ کی حرکات کا دفاع معاشرے میں گھل مل جانے کے خطرات کی دلیل پر ہی کیا تھا۔ جب دو مختلف مذاہب کے لوگ شادی کرتے ہیں تو دونوں اطراف کے لوگ اسے مستقبل میں پیش آنے والے خطرات کی پیشگوئی کرتے ہوئے 'مخلوط شادی' کہتے ہیں اور عموماً ہونے والے بچّوں کی پرورش کے سلسلے میں طویل بحثیں اور لڑائیاں ہوتی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں بچّہ تھا اور اینگلکن چرچ کی شمع روشن لئے پھرتا تھا تو رومن کیتھولک چرچ کے اس اصول کے بارے میں سن کر حیران رہ گیا تھا کہ اگر ایک اینگلکن شخص کسی کیتھولک شخص سے شادی کر لے تو بچّے ہر حال میں کیتھولک انداز سے ہی پرورش کئے جائیں گے۔ مجھے یہ تو سمجھ آتا تھا کہ دونو ں اطراف کے پادری لوگ بچے کی پرورش اپنے

مسلک کے مطابق کرنا چاہیں گے، لیکن ایک مسلک اپنی اجارہ داری قائم کرنے کی کوشش کرے گا، یہ بات نہ اس وقت سمجھ آتی تھی اور نہ اب آتی ہے۔ اینگلکن پادریوں نے جوابی کاروائی کرتے ہوئے اپنے مسلک کے مطابق پرورش پر اسرار کیوں نہیں کیا؟ شاید وہ کم کٹھور اور سنگدل ہیں۔ میرا پرانا پادری اور بینجامین کے "ہمارے پادری" دونوں کچھ زیادہ ہی نفیس انسان تھے۔

عمرانیات کے ماہرین نے ہم مذہب لوگوں سے شادی اور دوسرے مذاہب کےلوگوں سے شادی پر شماریاتی تحقیق کی ہے۔ آسٹن میں یونیورسٹی آف ٹیکساس کے نوروال ڈی گلین نے ۱۹۷۸ تک ایسی کئی تحقیقات کے نتائج جمع کئے اور ان کا مشترکہ تجزیہ کیا[۹۵]۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ عیسائیوں میں ہم مذہب شادی کا رجحان بہت نمایاں ہے (پروٹسٹنٹ کی شادی پروٹسٹنٹ سے ہی ہوتی ہے اور کیتھولک صرف کیتھولک سے ہی شادی کرتے ہیں۔ اور یہ 'پڑوسی کے لڑکے یا لڑکی' تک محدود نہیں ہے۔) لیکن یہ رجحان یہودیوں کے یہاں کچھ زیادہ ہی نمایاں ہے۔ سوالنامہ کا جواب دینے والے ۶,۰۲۱ لوگوں میں سے ۱۴۰ نے اپنا مذہب یہودیت بتایا اور ان میں سے ۸۵٫۷ فی صد نے یہودیوں سے ہی شادی کی۔ یہ شرح تناسب ہم مذہب شادیوں کے متوقع تناسب سے کہیں زیادہ ہے۔ اور ظاہر ہے یہ کسی کے لئے تعجب کی بات نہیں۔ عبادت گزار یہودیوں کو "باہر شادی" کرنےسے سختی سے منع کیا جاتا ہے، اور یہ ممانعت یہودی لطیفوں میں جلوہ گر ہوتی ہے جن میں یہودی مائیں اپنے لڑکوں کو "سنہرے بالوں والی کافرہ" سے بچنے کی تاکید کرتی ہیں جو انہیں اپنی اداؤں کے جال میں پھنسانے کے لئے گھات لگائے بیٹھی ہوتی ہیں۔ تین امریکی ربیوں کے بیانات نمونے کے طور پر درج ذیل ہیں:

- 'میں بین المذاہب شادی کی رسومات کروانے سے انکار کرتا ہوں'۔
- 'میں جوڑوں کی شادی کروانے کی حامی اس وقت بھرتا ہوں جب وہ یہودی طریقے سےبچّوں کی پرورش کرنے کا وعدہ کرتے ہیں'۔
- 'میں شادی کروانے کی حامی اس وقت بھرتا ہوں جب جوڑے شادی سے پہلے مشاورت پر رضا مندی کا اظہار کریں"۔

ایسے ربی جو ایک عیسائی پادری کے شانہ بہ شانہ شادی کےرسومات پوری کروانے کے لئے رضامند ہوں امریکہ میں بہت مشکل سے ملتے ہیں۔

اگر مذہب از خود نقصان دہ نہ بھی ہوتا تو بھی اس کی شوخ اور احتیاط سے سنواری گئی تقسیم کرنے کی صفت – انسانیت کی اندرونی جماعتوں کی حمایت اور خارجی گروہوں کی مخالفت کرنے کی فطری جبلّت کی دانستہ اور شائستہ دلّالی، اس کو دنیا میں برائی کی ایک قوت گردانے کے لئے کافی ہے۔

## اخلاقی روحِ عصر

## The Moral Zeitgeist

یہ باب اس امر کے مظاہرے سے شروع کیا گیا تھا کہ ہم ، بشمول مذہبی لوگ ، اپنی اخلاقی اقدار کی بنیاد مقدس کتابوں سے نہیں اخذ کرتے ہیں، قطع نظر اس کے ہم اپنے مشتاقانہ تصوّر اور تخیل میں کیا سوچتے ہیں۔ پھر ہم صحیح اور غلط کے درمیان تمیز کیسے کرتے ہیں؟ ہم اس سوال کا جواب کیسے بھی دیں، ایک بات پر ہم سب متفق ہیں کہ ہم حقیقتاً کس بات کو صحیح اور کس کو غلط سمجھتے ہیں: اورحیران کن حد تک یہ اتفاق بڑے پیمانے پر موجود ہے۔ اس اتفاق کا مذہب سے بظاہر کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ اس کے باوجود بیشتر مذہبی لوگ بھی اس کا حصہ ہیں، قطع نظر اس بات سے کہ وہ سمجھتے ہیں یا نہیں کہ ان کی اخلاقیات الہامی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ افغانی طالبان اور ان کے امریکی متبادل قابل ذکر نمونوں کو چھوڑ کر، زیادہ تر لوگ ان اخلاقی اصولوں کے آزادخیال اتّفاق کا زبانی جمع خرچ بھرتے ہیں۔ ہم میں سے اکثر لوگ دوسروں کو غیر ضروری تکلیف نہیں پہنچاتے؛ ہم آزادئ گفتار پر یقین رکھتے ہیں اور کہی گئی بات سے اختلاف کرتے ہوئے بھی اس حق کا دفاع کرتے ہیں؛ ہم دھوکہ نہیں دیتے، قتل نہیں کرتے، خونی رشتہ داروں سے مباشرت نہیں کرتے، اور دوسروں کے ساتھ ایسی کوئی حرکت نہیں کرتے جسے ہم اپنے لئے پسند نہ کرتے ہوں۔ ان شاندار اصولوں میں سے چند ایک مقدّس کتابوں میں بھی پائے جاتے ہیں، لیکن ایسے مواد کے ساتھ دفن شدہ ہوتے ہیں جس کی تقلید کوئی بھی مہذب انسان پسند نہیں کرے گا: اور یہ مقدّس کتابیں اچھے اصول اور برے اصول کے درمیان تمیز کرنے کے لئے کوئی راہ نمائی فراہم نہیں کرتی ہیں۔

اتفاق پر مبنی اس جدید اخلاقیات کو بیان کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ انہیں ایک "نئے دس احکامات" میں مرتّب کر دیا جائے۔ بہت سے افراد اور اداروں نے اس کی کوشش بھی کی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ سب ایسے نتائج پیش کرتے ہیں جو ایک دوسرے سے بہت ہی مشابہت رکھتے ہیں، ان فہرستوں

میں مرتب کے وقت و حالات کی خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔ آج کے دور کے اعتبار سے " دس نئے احکامات" کی ایک نئی فہرست ملاحظہ کیجئے جو مجھے ایک دہریے ویب سائٹ پر ملی[۹۲]۔

- دوسروں کے ساتھ وہ نہ کرو جو تم نہیں چاہتے کہ دوسرے تمہارے ساتھ کریں۔
- ہر کام میں کوشش کرو کہ کسی کو کوئی نقصان نہ ہو۔
- اپنے دوستوں، جانداروں، اور بالعموم دنیا کے ساتھ پیار، سچّائی، وفاداری اور عزّت سے پیش آؤ۔
- برائی کو نظر انداز نہ کرو اور انصاف قائم کرنے سے نہ ہچکچاؤ، لیکن جو خندہ پیشانی سے اپنی غلطی تسلیم کرے اور صدق دل سے پچھتاوے کا اظہار کرے، اسے معاف کرنے کے لئے تیار رہو۔
- زندگی کو خوشی اور تعجب و حیرت کے احساس کے ساتھ گزارو۔
- ہمیشہ کچھ نیا سیکھنے کی جستجو میں رہو۔
- ہر چیز کو پرکھو؛ ہمیشہ اپنے خیالات کو حقائق و شواہد کی کسوٹی پر پرکھو، اور اپنے روایتی عقائد کو بھی رد کرنے سے نہ کتراؤ، اگر وہ کسوٹی پر پورا نہ اتریں۔
- کبھی اپنے آپ کو اختلاف رائے سے علیحدہ نہ کرو ؛ ہمیشہ دوسروں کے حق اختلاف رائے کی عزّت کرو۔
- اپنے منطق اور تجربات کی بنیاد پر اپنی آزادانہ رائے قائم کرو؛ دوسروں کو تمہیں اندھی تقلید پر مجبور کرنے کی اجازت نہ دو۔
- ہر چیز کو سوالیہ نظروں سے دیکھو۔

یہ مجموعہ احکام کسی نبی یا ذہین فتین ماہر اخلاقیات کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ یہ محض ایک عام سے ویب بلاگر کی دل فریب کوششوں کا ثمرہ ہے، جس نے بائیبل کے دس احکام کے مقابلے میں موجودہ زندگی کے اچھے اصولوں کا خلاصہ بیان کیا ہے۔

جب میں نے ویب سرچ انجن میں " دس نئے احکامات" کے الفاظ ٹائپ کئے تو سب سے پہلے یہی فہرست سامنے آئی، اور میں نے عمداً مزید تلاش نہیں کی۔ سارا نقطہ ہی یہی ہے کہ آج کے دور میں کوئی بھی مہذب شخص اسی نوعیت کی فہرست مرتّب کرے گا۔لیکن ہر شخص انھی دس احکامات کی فہرست نہیں بنا پائے گا۔ فلسفی جان رالز شاید اپنی فہرست میں کچھ اس طرح کی باتیں شامل کرے گا: 'ہمیشہ اپنے اصول ایسے استوار کرو جیسے تمہیں بالکل معلوم نہ ہو کہ تم انبار حکم (pecking order) میں اپنے آپ کو سب سے اوپر پاؤ گے یا سب سے نیچے'۔ انیوت (Inuit) قبیلے میں کھانا تقسیم کرنے کا طریقۂ کار رالز کے اصول کی ایک حقیقی مثال ہے: یہاں کھانا بنانے والے کو سب سے آخر میں دیا جاتا ہے۔

میں اپنے ترمیم شدہ دس احکامات کے لئے مذکورہ بالا احکامات میں سے چند کاانتخاب کروں گا اور ان میں بقیہ درجہ ذیل احکامات کو بھی شامل کرنا چاہوں گا:

- اپنی جنسی زندگی سے بھرپور لطف حاصل کرو، (بشرطیکہ اس سے کسی دوسرے کو نقصان نہ پہنچتا ہو) اور دوسروں کو ان کی زندگی سے لطف اندوز ہونے دو، چاہے ان کے جو بھی رجحانات ہوں، کیونکہ یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔
- رنگ ، نسل اور (جہاں تک ممکن ہو سکے) جنس کی بنیاد پر نہ تو امتیاز کرو اور نہ ظلم کرو۔
- اپنے بچّوں کو کسی عقیدہ کی تلقین نہ کرو۔ بلکہ انہیں خود سے سوچنے ، شواہد کو پرکھنے ، اور تم سے اختلاف کرنا سکھاؤ۔
- مستقبل کی قدر اپنی عمر سے زیادہ طویل پیمانۂ وقت پر کرو۔

ترجیحات کے ان چھوٹے چھوٹے اختلافات کو چھوڑیئے۔ اصل مدعا یہ ہے کہ ہم لوگ انجیل کے دور سے بہت آگے جا چکے ہیں ۔ غلامی، جسے انجیل اور اکثر و بیشتر تاریخ میں قابل قبول سمجھا گیاتھا، انیسویں صدی میں تمام مہذب ممالک میں ختم کر دی گئی تھی۔ تمام مہذب قومیں اس بات کو قبول کرتی ہیں جس سے ۱۹۲۰ تک انکار کیا جاتا تھاایک عورت کا ووٹ، چاہے وہ انتخابات میں ہو یا پنچایت (jury) کے رکن کے طور پر، مرد کے برابر ہے۔ آج کے روشن

خیال معاشرے میں (ایک ایسی قسم جس میں سعودی عرب جیسے ممالک کی شمولیت صریحاً محال ہے) عورتیں ملکیت نہیں سمجھی جاتی ہیں، جیسا کہ انجیل کے دور میں سمجھی جاتی تھیں۔ کسی بھی جدید عدالتی نظام میں ابراہیم کو بچّوں کے ساتھ زیادتی کے الزام میں سزا سنا دی گئی ہوتی۔ اور اگر وہ واقعی اسحاق کی جان لینے میں کامیاب ہو جاتا تو آج کی عدالت میں اسے قتل کے الزام میں قید ہو جاتی۔ اس کے باوجود، اس دور کے رسم و رواج کے مطابق، اس کی حرکات صریحاً قابل تحسین تھیں، اور خدا کے احکامات کی بجا آوری کے زمرے میں آتی تھیں۔ مذہبی ہوں یا نہ ہوں، ہم صحیح اور غلط کے بارے میں اپنے رویّوں میں شدید حد تک بدل چکے ہیں۔ اس تبدیلی کی نوعیت اور اس کے محرّکات کیا ہیں؟

ہر معاشرے میں ایک عجیب و غریب سی موافقت موجود ہوتی ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ دہائیوں میں بدلتا رہتا ہے اور جسے جرمن زبان میں zeitgeist یا روح عصر کہا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ عورتوں کی حق رائے دہی ہر مہذب معاشرے میں موجود ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس حق کی حصولیابی حیران کن حد تک حالیہ ہے۔ درج ذیل فہرست میں چند ملکوں میں یہ حق دیے جانے کی تاریخیں فراہم کی گئی ہیں:

| | |
|---|---|
| نیو زی لینڈ | ۱۸۹۳ |
| آسٹریلیا | ۱۹۰۲ |
| فن لینڈ | ۱۹۰۶ |
| ناروے | ۱۹۱۳ |
| ریاست ہائے متحدہ امریکہ | ۱۹۲۰ |
| برطانیہ | ۱۹۲۸ |
| فرانس | ۱۹۴۵ |
| بلجیم | ۱۹۴۶ |
| سوئٹزرلینڈ | ۱۹۷۱ |
| کویت | ۲۰۰۶ |

بیسویں صدی میں تاریخوں کا یہ تواتر بدلتی ہوئی روح عصر کا ایک پیمانہ ہے۔ نسل کے معاملے میں ہمارا رویّہ اسی نوعیت کا ایک اور پیمانہ ہے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں برطانیہ میں تقریباً ہر شخص آج کے معیار کے مطابق نسل پرست مانا جاتا تھا۔ زیادہ تر سفید فام لوگ سمجھتے تھے کہ سیاہ فام لوگ (جس میں تمام افریقیوں کے علاوہ، ہندوستانی، آسٹریلیائی اور میلا نیشیائی گہری رنگت والے غیر متعلقہ لوگوں کو من حیث القوم شمار کیا جاتا تھا) سفید فام لوگوں سے ہر زمرے میں کم تر تھے، بڑے مربیانہ انداز میں، ماسوائے موسیقی کی "تال" کے۔ ۱۹۲۰کی دہائی کے جیمز بانڈ کا متبادل وہ خوش مزاج و خوش اخلاق لڑکپن کا ہیرو "بل ڈوگ ڈرمنڈ " تھا۔ ایک ناول "سیاہ گروہ–The Black Gang" میں ڈرمنڈ 'یہودیوں، غیر ملکیوں اور دیگر گنوارلوگوں' کے بارے میں بات کرتا ہے۔ " The Female of the Species" کے نقطۂ عروج (climax scene) میں ڈرمنڈ نے اپنے بد ترین دشمن کے سیاہ فام خادم پیڈرو کا روپ دھارا ہوا ہے۔ اپنی حقیقت کے ڈرامائی انکشاف کے لئے – اور قاری و دشمن کے لئے بھی وہ کہہ سکتا تھا: 'تمہیں لگ رہا تھا میں پیڈرو ہوں۔ تم جانتے تک نہیں کہ میں چہرے پر سیاہی لگائے ہوئے تمہارا دشمن ڈرمنڈ ہوں'۔ اس کے برعکس اس نے ان الفاظ کا انتخاب کیا: 'ہر داڑھی نقلی نہیں ہوتی، لیکن ہر سیاہ فام شخص بدبو دار ہوتا ہے۔ یہ داڑھی نقلی نہیں ہے میر جان، اور یہ سیاہ فام باس نہیں مارتا۔ میں سوچ رہا ہوں کہیں تو گڑبڑ ہے'۔ میں نے یہ کتاب ۱۹۵۰ کی دہائی میں پڑھی، اس کے لکھے جانے کے قریب تیس سال بعد، اور اس دور میں بھی (تقریباً) ممکن تھا کہ ایک بچّہ ناول کے نسلی تعصبانہ رویے کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف کہانی کے تجسس سے محظوظ ہو سکے۔ لیکن آجکل ایسا نا ممکن ہے۔

اپنے دور کے معیار کے مطابق تھامس ہینری ہکسلے ایک روشن خیال اور آزاد خیال ترقی پسند تھا۔ لیکن اس کا دور ہمارا دور نہیں تھا، ۱۸۷۱ میں اس نے لکھا:

> کوئی منطقی انسان، حقائق سے باخبر، یہ نہیں مانتا کہ سیاہ فام کسی سفید فام سے بہتر تو کیا اس کے برابر بھی ہو سکتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے، تو بڑی حیرانی کی بات ہو گی کہ اس کی تمام تر معزوریاں ہٹا دی جائیں، اور ہمارے اس بڑے جبڑے والے رشتہ دار کے راستے کی ہر رکاوٹ بھی ہٹا دی جائے اور اسے کوئی مراعات بھی نہ دی جائے،اور نہ ہی اس پر کوئی ظلم کیا جائے، تو وہ اپنے بڑے دماغ اور چھوٹے جبڑے والے حریف کے مقابل کسی ایسے مقابلے میں سبقت لے جائے جو جبڑے سے کاٹنے کی بجائے خیالات کا ہو۔ تہذیب کی سب سے اونچی منزلیں یقیناً ہمارے گہرے رنگ والے ہمزاد کی دسترس سے باہر ہیں[۹۷]۔

یہ عام مقولہ ہے کہ پائے کے مورخین گزرے وقتوں کے بیانات پر اپنے دور کے حساب سے فیصلے صادر نہیں کرتے۔ ہکسلے کی طرح ابراہم لنکن بھی اپنے وقت سے آگے تھا لیکن نسلی امتیاز کے معاملے میں اس کے خیالات ہمارے مقابلے میں بہت قدامت پسندانہ ہیں۔ ۱۸۵۸ میں سٹیفن ڈگلس کے ساتھ ایک مباحثے میں وہ اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتا ہے:

> تو میں یہ کہوں گا کہ میں نہ تو سفید فام اور سیاہ فام لوگوں میں کسی قسم کی سیاسی اور سماجی برابری کے حق میں ہوں اور نہ کبھی تھا؛ نہ تو میں سیاہ فام لوگوں کو منصفین کی پنچایت (jury) کا رکن بنانے یا انتخابات میں حق رائے دہی استعمال کرنے کے حق میں ہوں اور نہ کبھی تھا، اور نہ ان کے سیاسی منصب پر فائز ہونے کے اور نہ سفید فام لوگوں سے شادیاں رچانے کے حق میں ہوں؛ مزید برآں میں یہ بھی کہوں گا کہ سفید فام اور سیاہ فام لوگوں میں ایک جسمانی فرق ہے جو ہمیشہ ان دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ سیاسی اور معاشرتی برابری اور ہم آہنگی کے ساتھ رہنے میں رکاوٹ بنی رہے گی۔ اور جس حد تک کہ یہ دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے، ان کے درمیان برتری اور کمتری کا امتیاز موجود رہے گا، اور کسی بھی شخص کی طرح میں بھی برتری کا رتبہ سفید فام لوگوں کو تفویض کئے جانے کے حق میں ہی ہوں[۹۸]۔

اگر ہکسلے اور لنکن ہمارے دور میں پیدا ہوئے ہوتے تو وہ ہمارے ہمراہ اپنے وکٹورین جذبات اور چرب زبانی پر کراہت محسوس کرنے والوں میں سر فہرست ہوتے۔ میں نے ان کے اقتباسات صرف یہ دکھانے کے لئے شامل کئے ہیں کہ روح عصر وقت کے ساتھ کیسے تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اگر ہکسلے جو اپنے دور کے عظیم ذہنوں میں سے ایک تھا، اور لنکن جس نے سیاہ فام غلاموں کو آزاد کروایا، بھی اس طرح کی باتیں کہہ سکتے ہیں تو آپ تصوّر کیجئے کہ وکٹورین دور کا عام انسان کیسے سوچتا ہو گا۔ اٹھارویں صدی پر نظر دوڑائیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ واشنگٹن، جیفرسن اور روشن خیالی کے انقلاب (Enlightenment) کے دوسرے اکابرین غلام رکھتے تھے۔ روح عصر اتنی آہستگی سے آگے بڑھتی ہے کہ کبھی کبھی ہم اس کے بارے میں بے پرواہ سے ہو جاتے ہیں، اور بھول جاتے ہیں کہ یہ تبدیلی اپنے آپ میں ایک معجزاتی حقیقت ہے۔

ایسی اور بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ جب ملّاح پہلی بار موریشس میں لنگر انداز ہوئے انہوں نے بے ضرر عنقا (dodo) کو دیکھا تو ان کے ذہن میں سوائے اس خیال کے کہ ان کو ڈنڈوں سے پیٹ پیٹ کر مار دیا جائے، اور کوئی خیال نہیں آیا۔ وہ اس جانور کو کھانا تک نہیں چاہتے تھے (کہا گیا کہ وہ کھانے کے قابل نہیں)۔ غالباً ایک بے کس، خو گر، بے پرواز پرندے کے سر پر ڈنڈےمارنے کے لئے اس طرح کاکچھ کیا گیا تھا۔ آج کل تو ایسی حرکت کا سوچا بھی نہیں جا سکتا اور عنقا کی طرح کسی جانور کے حادثاتی طور پر یا دانستہ انسانی درندگی کے نتیجے میں ناپید ہو جانا ایک سانحہ تصوّر کیا جاتا ہے۔ آج کی ثقافتی آب و ہوا کے معیار کے مطابق تسامنی بھیڑئے (Tasmanian wolf) کے ناپید ہو جانے کا حالیہ واقعہ اتنا ہی بڑا سانحہ ہے۔ ۱۹۰۹ تک اس بے چاری مخلوق کے سر پر انعام تھا۔ افریقہ کے بارے میں لکھے جانے والے وکٹورین دور کے ناولوں میں 'ہاتھی'، 'شیر' اور 'ہرن' سب 'شکار' تصوّر کئے جاتے تھے، اور شکار کے ساتھ آپ

ذہن میں دوسرا خیال لائے بغیر جو کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ اسے گولی مارتے ہیں۔ اعترافاً، دولت مند اور سست 'شکاری' اپنی لینڈ روور کی محفوظ جگہ سے جنگلی افریقی جانوروں کا شکار کرتے ہیں اور ان کے بھوسے سے بھرے سر واپس گھر لے جاتے ہیں۔ لیکن ایسا کرنے کے لئے انہیں بہت بھاری رقم ادا کرنی پڑتی ہیں، اور ایسے 'شکار' کی وجہ سے وہ خاصے قابل نفرت بھی سمجھے جاتے ہیں۔ جنگلی حیات اور ماحولیات کے تحفظ کو آج وہی اخلاقی حیثیت حاصل ہے جو کبھی سبت کے وقار یا بتوں سے دور رہنے کو حاصل تھی۔

ساٹھ کی دہائی اپنی آزاد خیال جدّت کے لئے افسانوی رتبے کی حامل ہے۔ لیکن دہائی کے اوائل میں وکیل استغاثہ "لیڈی چیٹرلی کا عاشق – Lady Chatterly's Lover" ناول میں عریانی کے مقدمے کی پیروی کرتے ہوئے منصفین سے یہ سوال کر سکتا تھا: 'کیا آپ پسند کریں گے کہ آپ کے جوان بیٹے بیٹیاں اس کتاب کو پڑھیں؟ کیونکہ لڑکیاں بھی لڑکوں کی طرح اس کتاب کو پڑھ سکتی ہیں (کیا آپ کو یقین آتا ہے کہ اس نے یہ کہا تھا؟) کیا آپ اس کتاب کو لا پرواہی سے پڑا چھوڑ سکتے ہیں؟ کیا آپ اپنی بیوی یا نوکر کو یہ کتاب پڑھنے کی اجازت دیں گے'؟ یہ آخری خطیبانہ سوال روح عصر کی تیز رفتار تبدیلی کی عمدہ مثال ہے۔

غیر فوجی ہلاکتوں کی وجہ سے عراق پر امریکہ کی کشور کشائی کی پوری دنیا میں مزمت کی گئی، لیکن ان ہلاکتوں کی تعداد دوسری جنگ عظیم میں ہونے والی اموات سے کئی درجے کم تھی۔ کسی بات کے اخلاقی طور پر قابل قبول ہونے کا معیار ہر وقت بتدریج بدلتا رہتا ہے۔ ڈانلڈ رمسفیلڈ، جو آج ہمیں بہت کٹھور اور گھنونا محسوس ہوتا ہے، دوسری جنگ عظیم میں وہی باتیں کرتے ہوئے ایک دکھی دل والا آزاد خیال انسان لگتا ہے۔ پچھلی دہائیوں میں کچھ تو بدل ہی گیا ہے۔ ہم سب میں ہی کچھ تبدیلی رونما ہوئی ہے، اور اس تبدیلی کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ یہ تبدیلی مذہب کے باوجود ہوئی ہے، مذہب کی وجہ سے نہیں۔

یہ تبدیلی ایک مسلسل قابل شناخت سمت میں ہی ہو رہی ہے، جسے ہم میں سے زیادہ تر لوگ بہتری ہی کہیں گے۔ ایڈولف ہٹلر بھی، جس نے بدی کی ایک نئی معراج کو چھوا تھا، اپنی بربریت میں شاید رومی بادشاہ کلیگولا یا چنگیز خان کے پاؤں کی خاک ہوتا۔ یقیناً ہٹلر نے چنگیز خان سے زیادہ لوگوں کو قتل کیا تھا، لیکن اسے بیسویں صدی کی صنعتی ترقی کی ایجادات میسّر تھیں۔ اور کیا ہٹلر بھی مرنے والوں کے لواحقین کی آہ و فغاں سے لطف اندوز ہوتا تھا، جیسا کہ چنگیز خان کے بارے میں مشہور ہے؟ ہم ہٹلر کی بدی کو دور حاضر کے معیار پر تولتے ہیں، اور صنعتی ترّقی کے ساتھ ساتھ روح عصر بھی کلیگولا کے زمانے سے آگے بڑھ چکی ہے۔ ہٹلر محض ہمارے زمانے کے بے ضرر معیار کے مطابق ہی اس قدرشدید برا نظر آتا ہے۔

میں نے اپنی زندگی میں ہی بہت سے لوگوں کو دوسروں کے لئے بڑی لاپرواہی سے ہتک آمیز عرف استعمال کرتے دیکھا ہے: Frog, Wop, Dago, HunYid, Coon, Nip, Wog (ان ناموں کے اردو تراجم ان کی ہتک آمیزی کا مظاہرہ نہیں کر سکتے)۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ یہ نام ناپید ہو گئے ہیں، لیکن شائستہ حلقوں میں ان کے استعمال کو اب بہت بری نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ "نیگرو" (سیاہ فام) کا لفظ اگرچہ اپنے آپ میں قابل اعتراض نہیں، لیکن اس کا استعمال ہمیں انگریزی ادب کے چند فن پاروں کی عمر کا اندازہ لگانے میں مدد دیتا ہے۔ تعصبات واقعی کسی تصنیف کی عمر کے بارے میں ہم پر بہت سے راز افشاء کرتے ہیں۔اپنے دور میں کیمبرج کے قابل عزّت عالم دین ای سی بوقیٹ (A. C. Bouquet)نے اپنی کتاب "تقابل ادیان – Comparative Religion" میں اسلام سے متعلق باب کو ان الفاظ سے شروع کیا تھا: 'عرب باشندے قدرتی طور پر وحدانیت پسند نہیں ہیں، جیسا کہ انیسویں صدی کے وسط تک سمجھا جاتا تھا۔ وہ مظاہر پرست (animist) ہیں '۔ تہذیب کے مقابلے میں نسل کا جنون اور صنف واحد کے استعمال سے ('عرب باشندہ .... مظاہر پرست ہے') ایک پوری قوم کو ایک 'قسم' میں بدل دینے کی کوشش اپنے آپ میں قابل مذمت نہیں ہے۔ لیکن یہ مستقل بدلتی ہوئی روح عصر کا ایک اور ہلکاسا اشارہ ہے۔ آج کیمبرج میں دینی علوم یا کسی اور شعبے کا کوئی پروفیسر ایسی زبان استعمال نہیں کرے گا۔ بدلتے ہوئے رواجوں کے یہ نازک اشارے ہمیں بتاتے ہیں کہ بوقیٹ نے اپنی کتاب بیسویں صدی کے وسط کے قریب تحریر کی ہو گی۔ در حقیقت، یہ کتاب ۱۹۴۱ میں شائع ہوئی۔

چار دہائیاں مزید پیچھے چلے جایئے آپ کو بدلتے ہوئے معیار اور بھی واضح طور پر نظر آنے لگیں گے۔ اپنی ایک اور کتاب میں میں نے ایچ جی ویلز کی مثالی "نئی جمہوریہ – New Republic " کا ذکر کیا تھا، اور یہاں بھی کروں گا، کیونکہ یہ میرے مدعے کوایک حیرت انگیز مثال فراہم کرتی ہے۔

اور یہ نئی جمہوریہ کم تر نسلوں کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرے گی؟ وہ سیاہ فام کے ساتھ کیسے معاملہ کرے گی ... پیلی رنگت

والے کو... یہودی کو... کالے، اور بھورے، پیلے، اور میلے سفید لوگوں کے جم غفیر کو جو ضروریات کا ادراک کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے؟ خیر دنیا آخر دنیا ہے، کوئی خیراتی ادارہ تو ہے نہیں، پھر میرے خیال میں تو ان سب کو ہی جانا پڑے گا... اور اس نئی جمہوریہ کے لوگوں کا اخلاقی نظام، وہ اخلاقی نظام جو اس عالمی ریاست میں غالب ہو گا، ایسے خطوط پر بنائی جائے گی جو انسانیت میں ہر اس چیز کی افزائش کی حوصلہ افزائی کرے گا جو نفیس ،مؤثر اور خوبصورت ہے — خوبصورت اور صحت مند جسم، شفاف اور طاقت ور ذہن.... قدرت نے آج تک دنیا کو سنوارنے کے لئے جو نظام اپنایا ہے، جس کے مطابق کمزور سے کمزور کی افزائش کو روکا گیا ہے، یہ موت کا نظام ہے.... اس نئی جمہوریہ کے پاس معاشرے کا ایک ایسا کامل تصوّر ہو گا جس کی خاطر قتل کرنا جائز ہو گا۔

یہ پیرا ۱۹۰۲ میں لکھا گیا تھا اور ویلز کو اپنے دور میں ترّقی پسند سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ ۱۹۰۲ میں ایسے جذبات پر مکمل اتفاق تو موجود نہیں تھا لیکن دعوت طعام میں ایسی بحثوں کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کے برعکس جدید قارئین ایسے الفاظ پڑھ کر خوف سے اپنے ہواس کھو بیٹھتے ہیں۔ ہم یہ ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہٹلر، انتہائی ہولناک شخصیت ہونے کے باوجود، اپنے وقت کی روح عصر سے اتنا بھی دور نہیں تھا جتنا کہ وہ آج کے نقطہ ٔ نگاہ سے لگتا ہے۔ کس قدر تیزی سے بدلتی ہے روح عصر — اور یہ تعلیم یافتہ دنیا میں تقریباً ایک ہی رفتار سے آگے بڑھتی ہے۔

معاشی شعور میں یہ اجتماعی اور مستحکم تبدیلیاں کیسے اور کہاں سے نمودار ہوتی ہیں؟ بار ثبوت مجھ پر نہیں ہے۔ میرے مقاصد کے لئے اتنا کہنا کافی ہے کہ مذہب سے یقیناً نہیں آئیں۔ اگر مجھے کوئی نظریہ پیش کرنے پر مجبور کر بھی دیا جائے تو میں اسے ان خطوط پر استوار کروں گا۔ ہمیں اس بات کی وضاحت کرنے کی ضرورت ہے کہ روح عصر کی یہ تبدیلی لوگوں کی اتنی بڑی تعداد میں کیسے ہم آہنگ (synchronized) ہوتی ہے؟ اور ہمیں اس کے یک طرفہ سمت کی وضاحت بھی کرنی ہو گی۔

اوّل یہ تبدیلی لوگوں کی اتنی بڑی تعداد میں کیسے ہم آہنگ ہوتی ہے؟ یہ ایک ذہن سے دوسرے ذہن میں پھیلتی چلی جاتی ہے، کبھی شراب خانوں اور طعام کی محفلوں کی گفتگو کے ذریعے، کبھی کتابوں اور ان کے تبصروں کے راستے، اخباروں اور نشریات سے، اور اب انٹرنیٹ کے سہارے۔ ہمیں اخباروں کے اداریوں میں، ریڈیو پروگراموں میں، سیاسی تقریروں میں، مزاح نگاروں کی باتوں میں، طویل المدت ڈراموں میں، مقننہ کی قانون سازی کی کاروائیوں میں اور ان قوانین پر منصفین کی تشریح میں اخلاقی آب و ہوا کی تبدیلیوں کے اشارے ملتے ہیں۔ اس اثر کو ثقافتی اعداد کے تالاب (meme pool) میں اعداد کی بدلتی ہوئی ارتعاش (frequencies) کی طرز پر بھی بیان کیا جاسکتا ہے، لیکن میں اس سے گریز کروں گا۔

ہم میں سے کچھ لوگ ابھی بھی روح عصر کی بڑھتی ہوئی لہر سے پیچھے ہیں، اور کچھ آگے نکل آئے ہیں۔ اکیسویں صدی میں ہم میں سے بیشتر لوگ ایک دوسرے سے متعلقہ ہیں اور قرون وسطیٰ یا ابرا ہیم کے دور یا ۱۹۲۰ کی دہائی کے ہم منصبوں سے بہت آگے ہیں۔ یہ لہر بڑھتی رہتی ہے، اور کسی گذشتہ صدی کے ہراول دستے (ٹی ایچ ہکسلے اس کی ایک اچھی مثال ہے) بھی خود کو کسی بعد کی صدی کے ست رو دستوں سے پیچھے پائیں گے۔ یہ تبدیلی ایک ہموار ڈھلوان نہیں، بلکہ آری کے دانتوں (sawtooth) کی طرح مڑ گشتی کرتی ہوئی بڑھتی ہے۔مقامی اور عارضی ناکامیاں پیش آتی رہتی ہیں، جیسے کہ سنہ ۲۰۰۰ کے بعد سے امریکہ میں حکومتوں کی وجہ سے پیش آ رہی ہیں۔ لیکن ایک طویل مدّت پر دیکھئے تو ترّقی کا رجحان واضح ہے اور اس کے جاری رہنے کے امکانات روشن ہیں۔

اس رجحان کو متواتر ایک ہی سمت میں قائم رکھنے والی قوت کیا ہے؟ یہاں ہمیں انفرادی قائدین کی خدمات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے جو اپنے وقت سے آگے ہوتے ہوئے، قیادت کی ذمہ داریاں قبول کرتے ہیں اور باقی لوگوں کو اپنے ساتھ آگے بڑھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ امریکہ میں نسلی برابری کے فروغ میں مارٹن لوتھر کنگ کے پائے کے سیاسی قائدین، اور پال روبسن، سڈنی پوائٹیر، جیسی اوونز اور جیکی رابنسن جیسے فنکاروں، کھلاڑیوں اور دیگر عوامی لوگوں اور مثالی اشخاص نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ غلاموں اور عورتوں کی آزادی مقناطیسی شخصیت رکھنے والے قائدین کی مرہون منت ہے۔ ان میں سے کچھ مذہبی تھے؛ کچھ نہیں تھے۔ چند مذہبی لوگوں نے یہ اچھے کام اس لئے کئے کہ وہ مذہبی تھے۔ کچھ اور موقعوں پر ان کا مذہب بالکل ضمنی تھا۔ اگرچہ مارٹن لوتھر کنگ عیسائی تھا، اس نے تشدد سے عاری اپنی سول نافرمانی کا فلسفہ گاندھی سے اخذ کیا، جو کہ مذہبی نہیں تھا۔

اس کے علاوہ تعلیم میں بہتری کا بھی ایک اہم کردار ہے، خاص طور پر ہماری بڑھتی ہوئی سمجھ کہ ہم میں سے ہر ایک شخص ایک عام انسانیت میں دیگر قوموں، نسلوں اور دوسری جنس کے ساتھ برابر کا حصے دار ہے – دونوں ایسے غیر انجیلی خیالات ہیں جو حیاتیاتی سائنس، خاص کر ارتقاء، سے حاصل ہوئے ہیں۔ سیاہ فام مردوں، عورتوں، اور نازی جرمنی، یہودیوں اورخانہ بدوشوں کے ساتھ برا سلوک کئے جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہیں مکمل انسان نہیں سمجھا جاتا تھا۔ "جانوروں کی آزادی – Animal Liberation" میں فلسفی پیٹر سنگر نے اس خیال کی بھرپور وکالت کی ہے کہ ہمیں نوع پرستی (speciesist) کے بعد کی حالت کی طرف چلے جانا چاہئے جہاں ہر اس نوع کے ساتھ انسانیت پر مبنی سلوک کیا جائے جو اس سلوک کی قدر کرنے کی ذہنی قابلیت کی حامل ہو۔ شاید یہ ہمیں اس سمت کا اشارہ دیتی ہے جس کی طرف روح عصر مستقبل میں بڑھنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ یہ ماضی کی اصلاحات غلامی کے خاتمہ اور آزادی نسواں جیسی تحریکوں کی بنیاد پر مستقبل کی تبدیلیوں کی قدرتی پیش گوئی (extrapolation) ہے۔

روح عصر کے اس اجتماعی انداز میں ترّقی کے بارے میں تفصیلی وضاحت فراہم کرنا نفسیات اور عمرانیات میں میری غیر پیشہ ورانہ قابلیت سے باہر ہے۔ میرے مقاصد کے لئے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ ایک مشاہدہ شدہ حقیقت ہے کہ یہ بڑھتی ضرور ہے، اور اس کا محرّک مذہب نہیں ہے اور صحیفے تو قطعی نہیں۔ شاید یہ کشش ثقل کی طرح کی کوئی ایک قوت نہیں ہے بلکہ کمپیوٹر کی طاقت میں توضیحی ترّقی کو بیان کرنے والے قانون مور (Moore's Law) کو چلانے والی قوتوں کی طرح مختلف قوتوں کا پیچیدہ تعامل (interplay) ہے۔ وجہ جو بھی ہو، روح عصر کی ترّقی کا صریح رجحان اس دعوے کو جھٹلانے کے لئے کافی ہے کہ اچھا بننے کے لئے یا اچھائی کی پہچان کرنے کے لئے ہمیں کسی خدا کی ضرورت ہے۔

## ہٹلر اور سٹالن کے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ دہریے تو نہیں تھے؟

### What About Hitler and Stalin? Weren't They Athiests?

روح عصر بڑھتی ہے اور بالعموم ترّقی پسند سمت میں بڑھتی ہے، لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا، یہ ترّقی ہموار نہیں بلکہ آری کے دانتوں کی طرح غیر ہموار ہوتی ہے۔ اور کبھی کبھار بڑی خوفناک الٹ پھیر(reversal) بھی ہو جاتی ہے۔ بیسویں صدی کے آمر ہمیں اس الٹ پھیر کے بڑے مایہ ناز نمونے فراہم کر گئے ہیں۔ ہٹلر اور سٹالن جیسے انسانوں کے خوفناک ارادوں کو ان کے عملی جامہ پہنانے کی بے پناہ طاقت سے الگ کر کے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہو ں کہ ہٹلر کے خیالات اور ارادے اپنے آپ میں کیلیگولا کے ارادوں سے زیادہ شر آمیز نہیں تھے، یا سلطنت عثمانیہ کے سلطانوں کے نفرت انگیز کارناموں سے، جنہیں نوئل باربر نے "خلیج باسفورس کے مالک — Lords of the Golden Horn " میں بیان کیا ہے۔ ہٹلر کے پاس بیسویں صدی کا اسلحہ اور بیسویں صدی کے ذرائع ابلاغ موجود تھے ۔ بہر طور، ہٹلر اور سٹالن حیران کن حد تک شر انگیز انسان تھے۔

'ہٹلر اور سٹالن دہریے تھے۔ اس کے بارے میں آپ کا کیا کہنا ہے'؟ میں جب بھی مذہب کے موضوع پر درس دیتا ہوں، درس کے بعد یہ سوال ضرور اٹھایا جاتا ہے۔ ریڈیو پر انٹرویو میں بھی یہ سوال ایک بھدّے انداز میں پوچھا جاتا ہے، اور خفگی کے عالم میں دو مفروضوں کی درپردہ شمولیت کے ساتھ بھی پوچھا جاتا ہے کہ : نہ صرف (۱) ہٹلر اور سٹالن دہریے تھے، بلکہ (۲) انہوں نے اپنے گھناؤنے مظالم اس لئے کئے کیونکہ وہ دہریے تھے۔ مفروضہ (۱) سٹالن کے بارے میں درست اور ہٹلر کے بارے میں مشکوک ہے۔ لیکن مفروضہ (۱) غیر متعلقہ ہے کیونکہ مفروضہ (۲) جھوٹ ہے۔ اور اگر یہ مفروضہ (۱) سے اخذ ہوتا ہے تو یہ ایک غیر منطقی مفروضہ ہے۔ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ دونوں دہریے تھے، تو یہ بھی تو سچ ہے کہ دونوں کی مونچھیں تھیں ، جو کہ صدام حسین کی بھی تھیں۔ پھر کیا؟ دلچسپ سوال یہ نہیں کہ برے (یا اچھے) لوگ مذہبی تھے یا دہریے تھے۔ ہم نہ تو شر انگیزوں کی گنتی کر رہے ہیں اور نہ ہی دو بدمعاشوں کی بے انصافیوں کی متقابل فہرستیں تیّار کر رہے ہیں۔ یہ حقیقت کہ نازی فوجیوں کی بیلٹ بکس (belt buckle) پر "خدا ہمارے ساتھ ہے – Gott mit uns" کچھ ثابت نہیں کرتا، کم از کم ایک طویل اور سیر حاصل بحث کے بغیر تو نہیں۔ اہم بات یہ نہیں کہ ہٹلر اور سٹالن دہریے تھے یا نہیں؛ اہم یہ ہے کہ دہریت لوگوں پر برائی سرزد کرنے کے لئے دانستہ اثر انداز ہوتی ہے یا نہیں۔ ایسے معمولی سے بھی شواہد موجود نہیں جو اس الزام کو ثابت کر سکیں۔

اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ سٹالن در حقیقت دہریہ تھا۔ اس نے اپنی تعلیم ایک آرتھوڈوکس مدرسے میں حاصل کی ۔ اس کی ماں کو ہمیشہ مایوسی رہی کہ اس نے ماں کی خواہش کے مطابق پادری سلسلے میں شمولیت اختیار نہیں کی – ایک ایسی حقیقت جو بقول ایلین بلّوک، سٹالن کے لئے ہمیشہ باعث تفریح رہی[99]۔ شاید یہ پادری سلسلے کے لئے دی جانے والی تربیت کا نتیجہ تھا کہ بڑی عمر کا سٹالن روسی آرتھوڈوکس چرچ پر، عیسائیت پر، اور بالعموم مذہب پر اتنی شدید تنقید کرتا تھا ۔ لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ اس کی لادینیت اس کے ظلم و بربریت کی موجب تھی۔ اس کی اوائل عمری کی مذہبی تربیت کا بھی بربریت سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا، سوائے اس کے کہ اس تربیت نے اسے مطلق عقیدے، طاقتور صاحب اقتدار اور نتائج کے اسباب کا جواز پیش کرنے کے

نظریے کی تعظیم سکھائی ہو۔

ہٹلر کے دہریہ ہونے کی داستان کو بڑی محنت اور توجہ سے پروان چڑھایا گیا ہے، یہاں تک کہ بہت سے لوگ اسے بغیر سوال کئے سچ مانتے ہیں اور مذہبی عذر خواہ اسے باقاعدگی اور دلیری سے استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ اس مسئلہ کی حقیقت بہت مبہم ہے۔ ہٹلر کیتھولک گھرانے میں پیدا ہوا، اور بچپن میں کیتھولک سکول اور چرچ بھی جاتا رہا۔ ظاہر ہے یہ اپنے آپ میں تو اہم نہیں ہے: ہو سکتا ہے اس نے عیسائیت ترک کر دی ہو، جیسے سٹالن نے روسی آرتھوڈوکس عقیدے کو تفلس کے دینی مدرسے کو چھوڑنے کے بعد خیر آباد کہہ دیا تھا۔ لیکن ہٹلر نے کبھی اعلانیہ عیسائیت کو ترک نہیں کیا تھا اور ہمیں ایسے شواہد بھی ملتے ہیں کہ وہ ساری زندگی مذہبی ہی رہا۔ اگر وہ کیتھولک نہیں بھی رہا تھا تو بھی اس کا کسی قسم کی الوہی قدرت پر یقین بر قرار رہا۔ مثال کے طور ر وہ اپنی آپ بیتی "میری کہانی – Mein Kampf" میں لکھتا ہے کہ جب پہلی جنگ عظیم کا اعلان ہوا 'تو میں سجدے میں گر پڑا اور اپنے دل کی گہرائیوں سے رب کا شکر ادا کیا کہ میں اس اہم دور میں جی رہا ہوں'[۱۰۰]۔ خیر یہ ۱۹۱۴ کی بات ہے، جب وہ صرف ۲۵ سال کا تھا۔ شاید وہ اس کے بعد بدل گیا ہو؟

۱۹۲۰ میں جب ہٹلر ۳۱ برس کا ہوا تو اس کے قریبی دوست روڈولف ہیس جو بعد میں نائب لیڈر (Deputy Führer) بنا، اس نے باواریا کے وزیر اعظم کو خط لکھا 'میں جناب ہٹلر کو ذاتی طور پر جانتا ہوں اور ان کے بہت قریب ہوں۔ وہ ایک معزز شخصیت، رحم دل، مذہبی اور ایک اچھے کیتھولک ہیں'[۱۰۱]۔ بلا شبہہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہیس سے ہٹلر کو 'معزز شخصیت' اور 'رحم دل' سمجھنے میں غلطی ہوئی اس لیے اس نے اسے 'اچھا کیتھولک' بھی غلط ہی سمجھا ہو گا! ہٹلر کو شاید ہی کسی ناجیے سے 'اچھا' کہا جا سکتا ہے۔ اس سے مجھے ہلٹر کو دہریہ قرار دینے کے حق میں دیے گئے انتہائی مزحکہ خیز اور جرات مندانہ دلائل یاد آتے ہیں۔ اس سلسلے کے متعدد ماخذوں کا خلاصہ یہ ہے؛ چونکہ ہٹلر ایک برا آدمی تھا اور عیسائیت اچھائی کی تعلیم دیتی ہے، لہٰذا ہٹلر عیسائی نہیں ہو سکتا! مجھے لگتا ہے کہ ہٹلر کے بارے میں گوئرنگ کا تبصرہ کہ 'وہ واحد کیتھولک تھا جو جرمنی کو متحد کر سکتا تھا'، اس کا مطلب یہ رہا ہو گا کہ ہٹلر کی پرورش بحیثیت کیتھولک ہوئی تھی نہ کہ وہ ایمان رکھنے والا کیتھولک تھا۔

برلن میں ۱۹۳۳ میں ایک تقریر کے دوران ہٹلر نے کہا، 'ہم یہ سمجھ گیے تھے کہ لوگوں کو اس عقیدہ کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے ملحدانہ تحریک کے خلاف جنگ چھیڑی ہے، اور یہ صرف چند نظریاتی اعلانات کی شکل میں نہیں ہے: ہم نے اس پر مہر لگا دی ہے۔'[۱۰۲] یہ صرف ایک واقعہ ہو سکتا تھا کہ بہت سے دیگر لوگوں کی طرح ہٹلر بھی "ایمان پر یقین" رکھتا تھا۔ لیکن ۱۹۴۱ میں بھی ہٹلر نے اپنے معاون عہدیدار (adjutant) جرنیل گیرہارڈ اینگل سے یہی کہا کہ 'میں ہمیشہ کیتھولک ہی رہوں گا'۔

اگر وہ ایک سچّا ایماندار عیسائی نہیں بھی تھا، تب بھی یہ ایک بہت غیر معمولی واقعہ ہوتا کہ اس نے سالوں کی اس عیسائی روایات سے اثر قبول نہ کیا ہو جو یہودیوں کو عیسیٰ کے قتل کا مورد الزام ٹھہراتی ہیں۔ ۱۹۲۳ میں میونخ میں تقریر کے دوران ہٹلر نے کہا 'ہمارا سب سے پہلا کام [جرمنی] کو یہودیوں سے آزاد کرانا ہے جو ہمارے ملک کو تباہ کر رہے ہیں.... ہم اپنے جرمنی کو اس تکلیف دہ موت سے بچانا چاہتے ہیں جو ایک اور نئے صلیب پر برداشت کی تھی'[۱۰۳]۔ جن ٹولینڈ اپنی کتاب "ہٹلر: حتمی سوانح — Hitler: The Definitive Biography" میں 'آخری حل' (The Final Solution) کے دور میں ہٹلر کی مذہبی حیثیت کے بارے میں لکھتا ہے :

> کلیسائے روم کے تنظیمی ڈھانچے سے نفرت کرنے کے باوجود چرچ میں ہٹلر کو ایک اچھا مقام حاصل تھا اور وہ اس کی ان تعلیمات کو عزیز رکھتا تھا کہ یہودی عیسیٰ کا قاتل ہے۔ لہٰذا ضمیر پر بغیر کسی بار کے یہودیوں کی بیخ کنی کی جاسکتی تھی، کیونکہ وہ تو محض خدا کے بدلے کے لئے ایک ذریعہ کے طور پر کام کر رہا تھا — اس طرح یہ کام غیر معمولی انداز سے بغیر کسی ظلم و زیادتی کے کیا گیا۔

عیسائیوں کی یہودیوں سے نفرت صرف کیتھولک مسلک تک محدود نہیں۔ مارٹن لوتھر یہودیوں سے سخت نفرت کرتا تھا۔ اس نے ورمز میں منعقد کئے جانے والے سرکاری اجلاس (Diet of Worms) میں کہا 'سب یہودیوں کو جرمنی سے نکال دینا چاہئے'۔ اور اس نے ایک کتاب بھی لکھی 'یہودی اور ان کے

جھوٹ –The Jews and Their Lies' جس نے کئی صدیوں بعد ہٹلر کو بہت متاثر کیا۔ لوتھر نے یہودیوں کو سانپ کی اولاد کہہ کر مخاطب کیا تھا اور ۱۹۲۲ میں ہٹلر نے اپنی ایک تقریر میں اس جملے کا استعمال کیا، اوراپنے عیسائی ہونے کی حقیقت کو بار بار دہرایا ہے :

> عیسائی ہونے کا احساس مجھے اپنے رب اور مسیحا کی جانب راغب کرتا ہے۔ وہ مجھے اس آدمی کے طرف لئے جاتا ہے جس نے کبھی صرف چند ساتھیوں کے ساتھ تنہائی کی حالت میں ان یہودیوں کی حقیقت کو بھانپ لیا تھا اور لوگوں کو ان کے خلاف لڑنے کے لئے جمع کیا تھا،اور شان خدا! جو سب سے ارفع ہے ۔ وہ مصیبت زدہ نہیں بلکہ سب سے اعلیٰ جنگجو تھا۔ ایک عیسائی اور ایک انسان کی حیثیت سے میں نے بے پناہ محبت سے کتاب کے اس حصے کا مطالعہ کیا جس میں ہمیں بتایا گیا کہ کیسے ہمارا رب اپنی شان و شوکت میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس سانپوں اور افعیوں کی اولاد کو مندرسے نکال باہر کیا۔ کیسی شاندار تھی اس کی لڑائی یہودیوں کے زہر کے خلاف۔ آج، دو ہزار سال بعد، میں فرط جذ بات میں بڑی گہرائی سے یہ اعتراف کرتا ہوں کہ یہی وہ منزل تھی جس کی خاطر اس نے صلیب پر اپنا خون بہایا۔ بحیثیت عیسائی، دھوکے کا شکار ہونا مجھ پر واجب نہیں، لیکن یہ میرا فرض ہے کہ میں سچ اور انصاف کا سپاہی بنوں.... اور اگر کوئی ایسی چیز ہے جو ہمیں یہ دکھا سکتی ہے کہ ہم صحیح راستے پر ہیں تو وہ یہ ہے کہ دنیا میں رنج و تکلیف ہے جو روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ کیونکہ بحیثیت عیسائی، اپنے لوگوں کے لئے بھی میرا کوئی فرض ہے"[۱۰۴]۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ ہٹلر نے یہ فقرہ 'سانپ کی اولاد' لوتھر سے ہی مستعار لیا تھا، یا براہ راست متّی۳ : ۷ سے لیا، جہاں سے غالباً خود لوتھر نے لیا تھا۔ اور جہاں تک یہودیوں کی ایذا رسائی میں خدا کی مرضی ہونے کا سوال ہے، تو ہٹلراپنی آپ بیتی "میری کہانی" میں اس کی طرف دوبارہ لوٹتا ہے: 'لہٰذا آج میرا یہ ایمان ہے کہ میں خالق کائنات کی منشا کے مطابق ہی کام کر رہا ہوں: یہودیوں سے اپنا دفاع کر کے، میں رب کی فرمانبرداری کر رہا ہوں۔ یہ ۱۹۲۵ کی بات ہے۔ اس نے یہی بات ۱۹۳۸ میں جرمن مقننہ(Reichstag)میں بھی کہی ، اور اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں وہ ایسی ہی باتیں کرتا رہا۔

اس نوعیت کے اقتباسات کا موازنہ اس کی کتاب "میز پہ گفتگو –Table Talk" سے لئے گئے اقتباسات سے کرنا چاہئے جس میں ہٹلر نے اپنے شدید زہریلے یہود مخالف خیالات کا اظہار کیا تھا جو اس کے سیکریٹری نے قلم بند کئے تھے۔ مندرجہ ذیل تمام اقتباسات ۱۹۴۱ سے ماخوذ ہیں:

> انسانیت پر لگنے والی کاری ضرب عیسائیت ہی کی دین تھی۔ انتہا پسند اشتراکیت (Bolshevism) عیسائیت کی ناجائز اولاد ہے۔ دونوں ہی یہودیوں کی ایجاد کردہ ہیں۔ مذہب کے معاملے میں دنیا میں دانستہ جھوٹ عیسائیت نے متعارف کرایا....
>
> قدیم دنیا اتنی پاک، ہلکی اور پرسکون اس لئے تھی کہ وہ ان دو بڑی گندگیوں چیچک اور عیسائیت سے بچی ہوئی تھی
>
> تمام باتوں کا جائز ہ لینے کے بعدہمیں ایسی خواہش رکھنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اطالوی اور ہسپانوی قومیں اپنے آپ کو عیسائیت کے نشے سے آزاد کرائیں۔ آیئے ہم ہی وہ واحد قوم بنیں جو اس بیماری سے محفوظ ہیں۔

"میز پہ باتیں" میں ایسے مزید کئی جملے درج ہیں جو کہیں تو عیسائیت کو اشتراکیت کے برابر بتاتے ہیں اور کہیں کارل مارکس اور سینٹ پال کا موازنہ کرتے ہوئے قاری کو اس بات کی یاد دہانی بھی کروا دیتے ہیں کہ یہ دونوں یہودی تھے (لیکن حیرانی کی بات ہے کہ ہٹلر ہمیشہ بضد رہا کہ عیسیٰ خود یہودی نہیں تھا)۔ یہ ممکن ہے کہ ۱۹۴۱ تک ہٹلر یا تو مذہب سے بدظن ہو چکا تھا یا اعتقاد کھو چکا تھا؛ یا ہٹلر کے بیانات میں ان تضادات کا حل یہ ہے کہ ہٹلر دراصل ایک موقعہ پرست جھوٹا تھا جس کی بات کا دونوں جانب اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔

یہ دلیل بھی دی جاسکتی ہے کہ اس کے اپنے اور حواریوں کے الفاظ کے باوجود ہٹلر درحقیقت مذہبی نہیں تھا بلکہ محض کلبی طریقے سے اپنے قارئین

کی مذہبیت کا استحصال کر رہا تھا۔ شاید وہ نپولین سے اتفاق کرتا تھا کہ 'مذہب عام لوگوں کو خاموش رکھنے کے لئے بہت فائدہ مند ثابت ہوتا ہے' یا سینیکا اصغر (Seneca the Younger) کا حامی تھا کہ 'عام لوگ مذہب کو سچ سمجھتے ہیں، عاقل اسے جھوٹ جانتے ہیں، اور حاکم مفید سمجھتے ہیں'۔ اس بات سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ ہٹلر پوری طرح اس قسم کی منافقت کا حامل تھا۔ اگر اس کا مذہبیت کا ڈھونگ رچانے کا یہی مقصد تھا، تو ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس نے یہ سارے مظالم اکیلے ہی نہیں ڈھائے تھے۔ وہ خوفناک کام تو اس کے سپاہیوں اور فوجی افسروں نے کئے تھے، جن کی اکثریت یقیناً عیسائی تھی۔ در حقیقت جرمن قوم کی عیسائیت زیر بحث مفروضے کی بنیاد ہے — ایک ایسا مفروضہ جس سے ہم ہٹلر کی مذہبی مبینہ منافقت کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یا شاید ہٹلر کو محسوس ہوا کہ عیسائیت کے حق میں اسے کچھ علامتی ہمدردی تو دکھانی ہی پڑے گی، ورنہ عیسائی چرچ سے اسے وہ حمایت حاصل نہ ہو سکتی تھی جو اسے میسّر آئی۔ یہ حمایت مختلف زاویوں سے ظاہر ہوئی جن میں پاپائے اعظم پائیس (بارہ) کا نازیوں پر تنقید کرنے سے انکار بھی شامل تھا — جو دور حاضر کے عیسائی چرچ کے لئے باعث شرمندگی ہے۔ یا تو ہٹلر کے عیسائیت کے دعوے جھوٹے تھے یا اس نے جرمنی کے عیسائیوں اور عیسائی چرچ کی حمایت حاصل کرنے کے لئے یہ ڈھونگ رچا۔ دونوں صورتوں میں ہٹلر کی حکومت کی بدکاری اور ظلم و زیادتی دہریت سے مستعار نہیں کہے جا سکتے ہیں۔

جب وہ عیسائیت کے خلاف لعن طعن کر رہا تھا تب بھی وہ خدا کے فضل، اس کی قدرت کا انکار نہیں کرتا تھا: ایک ایسی غیبی طاقت جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ اس طاقت نے اسے خدائی مشن کو مکمل کرنے کے لئے جرمنی کی قیادت عطا کی ہے۔ ۱۹۳۸ میں آسٹریا کے جرمنی میں ضم ہو جانے کے واقعے کے بعد جب وہ ویانا میں فاتحانہ داخل ہوا تو اس نے اپنی فخریہ تقریر میں خدا کے فضل کا بھی ذکر کیا: 'میرا خیال ہے کہ اس میں خدا کی مشیّت تھی کہ یہاں کے ایک لڑکے کو جرمن ریاست میں بھیجے، وہاں اس کی نشو ونما ہو، اور وہ اس قوم کا قائد بن کے اپنے آبائی ملک کو اس جرمن ریاست میں شامل کرائے'[۱۰۵]۔

نومبر ۱۹۳۹ میں میونخ میں قتل کے حملے میں بال بال بچ جانے کے بعد ہٹلر نے اس واقعے کا تمام تر سہرا فضل خدا کی مداخلت کے نام کر دیا، جس کی بدولت اس دن ہٹلر نے اپنا شیڈول تبدیل کیا تھا: 'اب میں بالکل مطمئن ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ میں برگن براؤکیلر (Bürgerbräukeller) ہال سے مقرّرہ وقت سے پہلے ہی رخصت ہو گیا، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا کا فضل میرے مقاصد کی تکمیل میں میری مدد کرنے کی نیت رکھتا ہے'[۱۰۶]۔ اس ناکام اقدام قتل کے بعد میونخ کے اسقف اعظم (archbishop) مائیکل فاؤل ہابر نے حکم جاری کیا کہ اس کے چرچ میں ہٹلر کے حق میں حمد شکرانہ (Te Deum) کی دعا کرائی جائے تاکہ 'ہٹلر کی جان بچ جانے کی خوشی میں اسقف اعظم کے زیر سرپرستی علاقے کی جانب سے فضل خدا کا شکر ادا کیا جا سکے'۔ ہٹلر کے حمایتی گوئبلز کی شہ پر اس خیال کو بڑھاوا دینے لگے کہ نازی ازم کو از خود ایک مذہب کی شکل دے دی جائے۔ یونائیٹڈ ٹریڈ یونین کے صدر کا مندرجہ ذیل بیان دعائیہ معلوم ہوتا ہے، اور عیسائیوں کی دعائے خداوند (The Lord's Prayer) اور ان کے معتقدات سے ہم آہنگ ہے:

> ایڈولف ہٹلر! ہم صرف تمہارے ساتھ متحد ہیں! اس لمحے میں ہم اپنے عہد و پیمان کی تجدید کرتے ہیں: اس دنیا میں ہم صرف تم ہی پر یقین کرتے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ عوامی اشتراکیت (National Socialism) ہی ایک ایسا عقیدہ ہے جو ہماری قوم کو بچا سکتا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ آسمانوں میں ایک خدا ہے جس نے ہمیں بنایا ہے۔ وہ ہماری قیادت کرتا، ہمیں راہ دکھاتا ہے اور اپنے فضل سے نوازتا ہے۔ اور ہمارا ایمان ہے کہ خداوند کریم نے ایڈولف ہٹلر کو ہمارے پاس اس لئے بھیجا ہے، تاکہ جرمنی آنے والی دنیا کی بنیاد بن سکے[۱۰۷]۔

جوناتھن گلوور نے اپنی شاندار کتاب "انسانیت: بیسویں صدی کی اخلاقی تاریخ — Humanity: A Moral History of the Twentieth Century" میں لکھتا ہے:

> بہت سے لوگوں نے سٹالن کے مذہبی فرقے کو بھی قبول کر لیا، جسے ایک لیتھونیائی لکھاری نے ان الفاظ میں بیان کیا: 'میں سٹالن کی تصویر کی طرف بڑھا اور اسے دیوار سے اتار کر میز پر رکھا اور اپنے سر کو اپنے ہاتھوں میں لئے اس پر غور کرنے

لگا اور مراقبے کی حالت میں چلا گیا۔ میں کیا کروں؟ قائد کا چہرہ ہمیشہ کی طرح پر سکون، صاف و شفاف آنکھیں جن کی نظر بڑے فاصلے پر آر پار ہو جاتی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ نظر میرے کمرے کو چیرتی ہوئی پوری دنیا کو اسیر کرنے نکل پڑی ہے.... اس لمحے مجھے اپنے شریانوں ، رگوں اور خون کے ہر قطرے میں محسوس ہو رہا ہے کہ اس محبوب چہرے کے علاوہ پوری دنیا میں کچھ بھی موجود نہیں'۔

گلوور کی کتاب میں نیم مذہبی چاپلوسی کا یہ ذکر سٹالن کے مظالم کے ذکر کے فوراً بعد آتا ہے اور اس وجہ سے اور بھی نفرت انگیز محسوس ہوتاہے۔

سٹالن غالباً دہریہ تھا اور ہٹلر غالباًدہریہ نہیں تھا؛ لیکن اگر دونوں دہریے تھے تب بھی اس بحث کا نقطہ بہت سیدھا ہے۔ اکلوتے دہریے ظالمانہ اور بری حرکات کر سکتے ہیں، لیکن وہ یہ حرکتیں دہریت کے نام پر نہیں کرتے۔ سٹالن اور ہٹلر نے شدید حد تک برے کام کئے ہیں لیکن بالترتیب کٹر اور اصولی مارکس ازم کی خاطر ، اور ہٹلر کے سلسلے میں تو اصلاح نوع انسانی (eugenics) کے ایک احمقانہ اور غیر سائنسی نظریے کی وجہ سے کئے ہیں، جس میں ویگنر (Wagner) کی دیوانگی کی آمیزش بھی تھی۔ مذہبی جنگیں تو مذہب کے نام پر ہی لڑی گئیں، اور تاریخ میں بکثرت ہوتی آئی ہیں۔ مجھے ایسی کسی جنگ کے بارے میں علم نہیں جو دہریت کے نام پر لڑی گئی ہو۔ اور کیوں لڑی جائے؟ جنگ اقتصادی لالچ ، سیاسی عزائم، نسلی تعصب ، گہرے زخم یا انتقام کے لئے لڑی جاتی ہے، یا پھر قوم کی تقدیر میں محب وطن عقیدے کی بنیاد پر لڑی جاتی ہے۔ اور ان سب سے زیادہ قرین قیاس وہ ناقابل شکست ایمان ہے کہ ہمارا اپنا مذہبی عقیدہ ہی واحد سچّا عقیدہ ہے، جو ایک مقدس کتاب پر مبنی ہے، اس سے انکار کرنے والوں اور دوسرے عقیدے کے ماننے والوں کو موت کا عندیہ سناتی ہے اور اس کے نام پر شہید ہونے والے خدا کے سپاہیوں کو جنّت میں خاص مقام کی خوش خبری دیتی ہے۔ جیسا کہ عموماً ہوتا ہے، یہاں "عقیدے کا خاتمہ – The End of Faith میں "سام ہیرس کی بات بالکل درست معلوم ہوتی ہے:

مذہبی عقیدے کا سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ وہ اچھے بھلے انسانوں کو دیوانگی کا پھل کاٹنے اور اسے مقدّس سمجھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ انسانی تہذیب آج بھی حماقت خیزی کی قوتوں کے نرغے میں ہے، کیونکہ بچّوں کی ہر نئی نسل کو یہی سکھایا جاتا ہے کہ دیگر سوالات کے مقابلے میں مذہبی سوالات کی وضاحت پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہم آج بھی قدیم ادبی فن پاروں کے دفاع میں ایک دوسرے کی جانیں لے رہے ہیں۔ کون سوچ سکتا تھا کہ اس قدر المناک لغویات کا وجود ممکن تھا؟

اس کے برعکس، عقیدے کی غیر موجودگی کی خاطر بھلا کوئی کیوں جنگ کرے گا؟

# باب ۸: مذہب کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟اتنی شدید مخالفت کیوں؟

مذہب نے انسان کو یہ یقین دلا دیا ہے کہ آسمان میں ایک اندیکھا آدمی رہتا ہے جو آپ کی ہر حرکت کو ہر دن ہر منٹ دیکھتا ہے۔ اور اس اندیکھے آدمی کے پاس ان دس چیزوں کی ایک خاص فہرست موجود ہے جو وہ نہیں چاہتا کہ آپ کریں۔ اور اگر آپ ان دس چیزوں میں سے کوئی ایک بھی کریں تو اس کے پاس ایک خاص جگہ ہے، جو آگ ، دھوئیں، جلن، تشدد اور غم سے بھری ہوئی ہے، جہاں وہ آپ کو ہمیشہ ہمیش کے لئے تکلیف اٹھانے ، آگ میں جلنے ، دھوئیں میں سانس لینے اور رونے ، چلّانے کے لئے بھیج دے گا.... لیکن اس کے باوجود وہ آپ سے بہت پیار کرتا ہے۔ (جارج کارلن)

میں فطری طور پر محاذ آرائی سے گریز کرتا ہوں۔ مجھے نہیں لگتا کہ معاندانہ انداز سچ تک پہنچنے کے لئے بحث کا مناسب طریقہ کار ہے، اور میں بڑی باقاعدگی سے مباحثوں میں شرکت کی دعوتوں سے معذرت کر لیتا ہوں۔ ایک بار مجھے ایڈنبرا میں یارک کے اسقف اعظم نے بحث کے لئے دعوت دی۔ یہ میرے لئے بڑے فخر کی بات تھی اور میں نے دعوت قبول کر لی۔ بحث کے بعد، مذہبی ماہر طبیعیات رسل سٹینارڈ نے اپنی کتاب "خدا سے چھٹکارا– Doing Away with God" میں ایک خط کی نقل شائع کی جو اس نے اخبار آبزرور Observer کو لکھا تھا:

> جناب! 'سائنس کی شان و شوکت کے سامنے خدا ایک ثانوی کردار نظر آتا ہے' اس شہ سرخی کے نیچے آپ کے سائنس کے نامہ نگار نے (سب دن کی عید الفصح( Easter)اتوار کو) خبر شائع کی کہ کیسے رچرڈ ڈاکنز نے سائنس اور مذہب کے موضوع پر مباحثے میں یارک کے اسقف اعظم کو 'بھاری دانشورانہ زخم دیے'۔ ہمیں خود پسندی میں غرق دہریوں کی کھلی مسکراہٹوں کے بارے میں بتایا گیا' اور 'شیر : ۱۰ عیسائی ۰ 'کا سکور بھی سنایا گیا۔

آگے چل کر سٹینارڈ نے اس کے اور میرے مابین ایک دوسرے مقابلے کے بارے میں خبر شائع نہ کرنے پر بھی آبزرور کو سرزنش کی، جس ملاقات میں برمنگھم کا بشپ اور مشہور عالم فلکیات رائل سوسائٹی کے سر ہرمن بونڈی بھی شریک ہوئے تھے، اور جو کہ ایک معاندانہ ملاقات نہ ہونے کی وجہ سے مقابلتاً تعمیری ثابت ہوئی تھی۔ میں اس کے معاندانہ انداز بحث کی مخالفت کی تائید کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں خصوصاً نظریہ تخلیق کے پیروکاروں سے قطعی بحث کرنا پسند نہیں کرتا§§§§§§§§§§§§§، اور اس کی وجوہات میں نے "ابلیس کا امام –A Devil's Chaplain" میں بیان کی ہیں۔

مناظرہ بازی سے میری نفرت کے باوجود، میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی مذہب سے الجھے رہنے کی ساکھ جمع کر رکھی ہے۔ ہم عصر جو مجھ سے خدا کی غیر موجودگی اور اخلاقیات کے لئے مذہب کی عدم ضرورت کے بارے میں اتفاق کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم غیر مذہبی الفاظ میں بھی مذہب اور اخلاقیات کی وضاحت دے سکتے ہیں، پھر بھی پریشانی کے عالم میں مجھ سے استفسار کرتے ہیں۔ تم اتنی شدید مخالفت کیوں کرتے ہو؟ آخر مذہب میں برائی کیا ہے؟ کیا یہ واقعی اتنا نقصان دہ ہے کہ ہمیں دانستہ طور پر اس کے خلاف جد و جہد کرنی چاہئے؟ 'جیو اور جینے دو' کی روش کیوں نہ اپنا لی جائے، جیسا ہم علم نجوم یا مکاشفہ کی توانائی(crystal energy) یا زمین پر برق کے راستوں (ley lines) کے ساتھ کرتے ہیں۔ کیا یہ سب بے ضرر بکواس نہیں ہیں؟

میں ایسے سوالوں کا یہ بھی جواب دے سکتا ہوں کہ میں اور میرے رفقاء کار کبھی کبھار مذہب کے خلاف جس نفرت اور غصے کا اظہار کرتے ہیں وہ الفاظ تک محدود ہے۔ میں محض نظریاتی اختلاف کی بنیاد پر کسی پر بم گرانے والا نہیں، نہ ہی ان کی گردن کاٹنے یا سنگسار کرنے والا ہوں، نہ کسی کو چوب پر باندھ کر جلانے یا فلک بوس عمارتوں میں جہاز ٹکرانے والا ہوں۔ لیکن مجھ سے سوال کرنے والا بات کو یہاں پر ختم ہونے نہیں دیتا ہے۔ وہ گفتگو میں آگے جا کر یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ "کیا تمہاری نفرت تمہیں بنیاد پرست دہریہ نہیں بنا دیتی، اپنے انداز سے اتنا ہی بنیاد پرست جتنے بائیبل بیلٹ کے دیوانے اپنے انداز میں ہیں"؟ مجھے بنیاد پرستی کے اس الزام کو غلط ثابت کرنا ہی ہو گا، کیونکہ یہ الزام بڑی باقاعدگی سے مجھ پر تھوپا جاتا ہے۔

---

§§§§§§§§§§§§§ مجھ میں ان وجوہات کا استعمال کرنے کی دیدہ دلیری نہیں جو میرے ایک اور سائنسی ہم عصر استعمال کرتے ہیں جب بھی انہیں کوئی تخلیق پسند بحث کے لئے مدعو کرتا ہے (میں ان کا نام نہیں لوں گا، لیکن ان کے ان الفاظ کو آسٹریلیائی تلفظ میں پڑھا جانا چاہئے)"یہ آپ کی فہرست کو ائیف پر تو اچھا لگے گا، لیکن مجھ پر نہیں"۔

## بنیاد پرستی اور سائنس کی ماتحتی

**Fundamentalism and the Subservience of Science**

بنیاد پرستوں کو یقین ہوتا ہے کہ وہ صحیح ہیں، کیونکہ انہوں نے سچ ایک الہامی کتاب میں پڑھا ہوتا ہے اور وہ پہلے سے ہی جانتے ہیں کہ وہ اپنے عقیدے سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ الہامی کتاب کا سچ ایک کلیہ ہے، استدلال کا نتیجہ نہیں۔ کتاب سچی ہے، اور اگر شواہد کتاب سے اختلاف کریں تو شواہد کو رد کر دیا جائے گا، نہ کہ کتاب کو۔ اس کے برعکس، میں بحیثیت ایک سائنسدان جو بھی مانتا ہوں وہ اس لئے نہیں کہ میں نے اسے کسی الہامی کتاب میں پڑھا تھا بلکہ اس لئے کہ میں نے ثبوت اور شواہد کا مطالعہ کیا تھا۔ یہ واقعی بالکل ہی علیحدہ مسئلہ ہے۔ ارتقاء کے بارے میں لکھی جانے والی کتابیں اس لئے نہیں مانی جاتیں کہ وہ مقدس ہیں بلکہ اس لئے مانی جاتی ہیں کیونکہ وہ ناقابل فہم تعداد میں شواہد پیش کرتی ہیں جو ایک دوسرے کی پشت پناہی کرتی ہیں۔ اصولی طور پر کسی بھی قاری کے لئے ان شواہد کا مطالعہ ممکن ہے۔ جب سائنس کی کوئی کتاب غلط ہوتی ہے تو کوئی نہ کوئی اس غلطی کو پکڑ ہی لیتا ہے، اور آنے والی کتابوں میں اس غلطی کی تصحیح کرلی جاتی ہے۔ یہ ایک نمایاں حقیقت ہے کہ مقدس کتابوں کے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوتا۔

فلسفی خاص کر وہ شوقیہ فلسفی جن کی فلسفے کی تربیت بہت قلیل ہے، اور ان سے بھی زیادہ وہ جو ثقافتی نسبتیت (cultural relativism) کی بیماری میں مبتلا ہیں، یہاں غلط راستہ دکھانے کی کوشش کریں گے: سائنسداں کا شواہد پر "ایمان" دراصل ایک طرز کا بنیاد پرست عقیدہ ہی تو ہے۔ میں اس مسئلے سے کہیں اور بھی نپٹ چکا ہوں اور یہاں میں مختصراً اپنے آپ کو دہراؤں گا۔ اپنی عام زندگی میں ہم سب شواہد پر ہی یقین کرتے ہیں، بھلے ہی ہم اپنی غیر تربیت یافتہ فلسفی کے اوتار میں کچھ بھی کہتے رہیں۔ اگر مجھ پر قتل کا الزام ہو، اور وکیل استغاثہ مجھ سے پوچھے کہ کیا یہ سچ ہے کہ میں قتل کی رات کو شکاگو میں تھا، تو میں فلسفیانہ حیلے بہانے کر کے بچ نہیں سکتا کہ: 'یہ تو اس پہ منحصر ہے کہ "سچ" کیا ہے'۔ اور نہ ہی اس بشریاتی نسبتی اقبال سے: 'میں شکاگو میں صرف "میں" کے بارے میں آپ کی مغربی سائنسی سوچ کے مطابق موجود تھا۔ بونگولی قوم کے پاس "میں" کا ایک بالکل منفرد زاویہ ہے، جس کے مطابق آپ کسی بھی جگہ "میں" حقیقی طور پر اسی وقت ہو سکتے ہیں جب آپ ایک ممسوح رہنما (anointed elder)ہیں جسے بکرے کے سکھائے گئے فوطے (scrotum) سے نسوار کھانے کا حق ہے'[۱۰۸]۔

شاید سائنسدان "سچ" کی کوئی تجریدی تعریف پیش کرنے میں بنیاد پرست ہی ہوتے ہیں۔ لیکن ایسا تو سبھی کرتے ہیں۔میں ایسا کہنے کی وجہ سے زیادہ بنیاد پرست ثابت نہیں ہو جاتا ہوں کہ عمل ارتقاء ایک حقیقت ہے بہ نسبت اس کے کہ نیوزی لینڈ جنوبی کرّہ ارض میں واقع ہے۔ ہم ارتقاء کی حقیقت کو اس لئے تسلیم کرتے ہیں کیونکہ شواہد اس کی تائید کرتے ہیں، اس کے برعکس اگر نئے شواہد اس کو غلط ثابت کرتے ہوں تو ہم پلک جھپکتے میں اسے رد کر دیں گے۔ کوئی سچّا بنیاد پرست کبھی بھی اس قسم کا دعویٰ نہیں کرے گا۔

بنیاد پرستی کو جذباتیت سے خلط ملط کرنا قطعاً مشکل نہیں۔ جب میں ایک بنیاد پرست تخلیق پسند کے سامنے عمل ارتقاء کا دفاع کرتا ہوں تو جذبات کی رو میں بہہ بھی جاتا ہوں، لیکن یہ میرے اپنے مخالف بنیاد پرستی کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ اس وجہ سے ہے کہ ارتقاء کے حق میں بے پناہ شواہد موجود ہیں، اور مجھے اس بات سے کوفت ہوتی ہے کہ میرا مد مقابل ان شواہد کو دیکھ نہیں پا رہا – یاجیسا کہ زیادہ تر ہوتا ہے، دیکھنے سے انکار کرتا ہے کیونکہ شواہد اس کی مقدس کتاب کے منافی ہیں۔ اور جب میں یہ سوچتا ہوں کہ یہ بنیاد پرست اور ان کے معتقد اپنے آپ کو کس علم سے محروم کر رہے ہیں تو میرے جذبات اور بھی مشتعل ہو جاتے ہیں۔ ارتقاء کے حقائق ، دیگر سائنسی حقائق کی طرح دلچسپ ، دلکش اور خوبصورت ہیں؛ کتنے رنج کی بات ہے کہ انسان ان سب سے محرومی کی حالت میں فوت ہو جائے! یقیناً میں ایسا سوچ کر جذباتی ہو جاتا ہوں۔ کیسے نہ ہو جاؤں؟ لیکن ارتقاء پر میرا اعتماد بنیاد پرستی نہیں، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرا ذہن تبدیل کرنے کے لئے کیا درکار ہے، اور اگر ضروری شواہد فراہم کر دیے جائیں تو میں بخوشی اپنا ذہن تبدیل کر لوں گا۔

اور ایسا ہو بھی جاتا ہے۔ میرے زمانۂ طالب علمی میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے شعبہ حیوانات کے ایک بزرگ معلم کا قصہ میں پہلے بھی سنا چکا ہوں۔ کئی سال تک اس نے بڑے انہماک سے یہ پڑھایا تھا کہ Golgi Apparatus (خلیّے کے اندر ایک خرد حصہ) حقیقی نہیں: مصنوعی ہے، نظر کا دھوکا ہے۔ ہر پیر کی شام پورے شعبے کا معمول تھا کہ کسی مہمان مدرس کی تحقیق اس کے اپنے الفاظ میں سنیں۔ ایک شام، ایک امریکی خلیاتی حیاتیات کا ماہر ہمارا مہمان مقرر تھا، جس نے نہایت قابل یقین شواہد فراہم کئے کہ Golgi Apparatus ایک حقیقت ہے۔ درس کے اختتام پر بزرگوار کمال متانت کے ساتھ کمرۂ تدریس کے سامنے آئے، امریکی ماہر سے مصافحہ کیا، اوربڑے جذباتی انداز سے فرمایا: "عزیزم! میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ میں پہلے پندرہ سال سے غلط ہی تھا"۔ تالیاں

بچاتے بچاتے ہمارے ہاتھ سرخ ہو گئے۔ کوئی بھی بنیاد پرست ایسی بات کہہ ہی نہیں سکتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تمام سائنسدان بھی ایسے نہیں ہیں۔ لیکن تمام سائنسدان کم از کم اس رویّے سے ہمدردی ضرور جتاتے ہیں۔ سیاستدانوں کے برعکس، جو غالباً اس کو زبان سے پھر جانا کہیں گے۔ اس واقعے کو یاد کر کے میں آج بھی آب دیدہ ہو جاتا ہوں۔

ایک سائنسدان کی حیثیت سے میں بنیاد پرست مذہب کے خلاف ہوں کیونکہ وہ سائنس کی مہم میں رخنہ اندازی کرتا ہے۔ وہ ہمیں سکھا تاہے کہ ہم اپنا ذہن نہ بدلیں، اور ایسی دلچسپ معلومات کو جاننے کی چاہت بھی نہ کریں جو جاننے کے لئے میسر ہیں۔ وہ سائنس کے خلاف بغاوت کرتا ہے اور فہم و فراست کو بیمار کر دیتا ہے۔ میرے مشاہدے میں اس کی سب سے افسوس ناک مثال ماہر ارضیات (geology) کرٹ وائیز کی ذات میں ملتی ہے، جو آجکل برائین کالج، ڈیٹن، ٹینیسی میں مرکز تحقیق آغاز (Centre for Origins Research) کا سربراہ ہے۔ یہ کوئی حادثہ نہیں کہ کالج کا نام ولیم جیننگز برائین کی تعظیم میں رکھا گیا ہے، جو ۱۹۲۵ میں سائنس کے استاد جان سکوپس کے خلاف لڑے جانے والے مقدمے میں وکیل استغاثہ تھا "Dayton "Monkey Trial" of ۱۹۲۵)۔ وائیز ارضیات کا پروفیسر بننے کے اپنے بچپن کے خواب کی تعبیر کسی اصل یونورسٹی میں بھی دیکھ سکتا تھا جس کا اصول عمل (motto) کچھ یوں ہوتا "تنقیدی انداز میں سوچیۓ" نہ کہ "تنقیدی اور انجیلی انداز میں سوچیۓ"۔ اس نے شکاگو یونیورسٹی سے ارضیات میں ڈگری بھی پائی، جس کے بعد ہارورڈ سے ارضیات اور قدیم حیاتیات (paleontology) میں اعلیٰ ڈگریاں بھی حاصل کیں اور سٹیفن جے گولڈ جیسے پائے کے استاد سے تعلیم حاصل کی۔ وہ بہت تعلیم یافتہ نوجوان سائنسدان تھا جس کا مستقبل تابناک تھا اور جو ایک اچھی یونیورسٹی میں سائنس کی تدریس اور تحقیق کے خواب کی تکمیل کی طرف گامزن تھا۔

لیکن پھر ایک سانحہ ہ پیش آیا اور وہ خارجی نہیں، بلکہ اس کے اپنے ذہن کی اختراع تھا، ایک ایسا ذہن جو اپنے بچپن کی بنیاد پرست مذہبی تعلیم و تربیت کے باعث کمزور اور برباد ہو چکا تھا کیونکہ اس کی مذہبی تعلیم اسے یہ ماننے پر مجبور کر رہی تھی کہ ارض ،جس کے بارے میں وہ شکاگو اور ہارورڈ میں تعلیم حاصل کر چکا تھا،دس ہزار سال سے بھی کم پرانا ہے۔ وہ اتنا ذہین تھا تو بھلاکیسے اپنے مذہب اور سائنس کے درمیان ہونے والے تصادم کو نہ پہچان پاتا، اس کا ذہنی خلفشار اس کے لئے بہت تکلیف دہ ہوتا جا رہا تھا۔ ایک روز جب دباؤ برداشت سے باہر ہو گیا تو اس نے قینچی پکڑی اور مسئلے کو حل کر دیا۔ اس نے ایک انجیل اٹھائی اور ورق بہ ورق ہر اس آیت کو کاٹتا گیا جسے سائنسی نقطۂ نظر کے سچ ہونے کی صورت میں رد کرنا پڑتا۔ اس بے رحم مگر سچّی اور محنت طلب کاوش کے بعد، اس کی انجیل کا اتنا تھوڑاسا حصہ باقی بچا تھا کہ

> مربوط حاشیوں کے باوجود، میں کتنی بھی کوشش کرتا، میرے لئے انجیل کو یوں اٹھانا ناممکن تھا کہ اس کے دو ٹکڑے نہ ہو جائیں۔ مجھے ارتقاء اور الہام میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہی تھا۔ یا تو الہام سچّا تھا اور ارتقاء جھوٹ، یا ارتقاء سچّا تھا اور مجھے انجیل کو اٹھا کر پھینک دینا چاہیۓ... وہاں اس رات میں نے احکام خدا کو تسلیم کر لیا اور ہر اس بات کو رد کر دیا جو اس کے خلاف جا سکتی تھی، بشمول ارتقاء کے۔ اس کے ساتھ ہی، شدید غم کی حالت میں، میں نے سائنس سے منسلک اپنے سب خواب اور امیدیں بھی آگ میں جھونک دیں۔

مجھے یہ پڑھ کر بہت دکھ ہوتا ہے؛ جہاں Golgi Apparatus والے واقعے میں میری آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکل آئے تھے، وہاں کرٹ وائیز کی کہانی صریحاً افسوس ناک ہے — افسوس ناک اور قابل مذمت۔ اپنی زندگی کی خوشی اورکرئیر کو اس نے خود ہی گھاؤ لگایا تھا؛ بالکل غیر ضروری، قابل فرار۔ اس کو صرف اتنا کرنا تھا کہ انجیل کو اٹھا کر پھینک دیتا۔ یاعلماء دین کی طرح اس کی علامتی اور تمثیلی تشریح کر دیتا۔ اس کے برعکس، اس نے بنیاد پرستوں والی حرکت کی اور سائنس ، شواہد اور منطق کو اٹھا کر پھینک دیا، اور ساتھ ہی ساتھ اپنے خوابوں اور امیدوں کا بھی گلا گھوٹ دیا۔

کرٹ وائیز بنیاد پرستوں میں منفرد ہے کیونکہ وہ سچّا ہے — تباہ کن، اذیت ناک اور حیران کن حد تک سچّا۔ اسے ٹمپلٹن انعام سے نوازا جانا چاہیۓ؛ شاید وہ اس کا پہلا سچّا حقدار ہے۔ مذہبی عقائد سے اختلاف کرنے والے سائنسی شواہد پیش کئے جانے پر بنیاد پرستوں کے ذہنوں میں جو در پردہ اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں، وائیز انہیں منظر عام پر لے آتا ہے۔ اس کا حرف آخر ملاحظہ کیجئے:

اگرچہ زمین کے کم عمر ہونے کی سائنسی وجوہات بھی ہیں، لیکن میں زمین کی کم عمری اپنے صحیفہ سے اخذ کرتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے کئی سال پہلے کالج میں اپنے پروفیسروں کو بھی کہا تھا، اگر کائنات میں موجود سارے شواہد "تخلیق" کے خلاف جمع ہو جائیں، تو انہیں قبول کرنے والا میں سب سے پہلا شخص ہوں گا، لیکن میں تخلیق پسند ہی رہوں گا، کیونکہ خدا کا کلام یہی اشارہ دیتاہے۔ مجھے اپنے موقف پر قائم رہنا ہو گا[۹۰]۔

اگرچہ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ وائیز اپنے انداز میں مارٹن لوتھر سے متاثر ہے، جب لوتھر نے وٹنبرگ کے گرجا گھر کے دروازے پر اپنے دعوے کیل سے چسپاں کر دیے تھے، مجھے تو بیچارہ وائیز جارج آرویل کے ناول ۱۹۸۴ کے مرکزی کردار ونسٹن سمتھ سے زیادہ ملتا جلتا لگتا ہے – جواس بات پر یقین کرنے کی جدو جہد میں مصروف ہے کہ دو جمع دو پانچ ہوتے ہیں کیونکہ 'بڑے بھائی – Big Brother' نے ایسا کہا ہے۔ وائیز کی دوہری سوچ – Doublethink (ایک ہی وقت میں دو متضاد خیالات سوچنے کی قابلیت) ،جسمانی اذیت کے فعل امرونہی سے نہیں بلکہ ،کچھ لوگوں کے لئے بظاہر اتنے ہی ناقابل تردید اثر، مذہب سے: جو کہ ایک طرز کی ذہنی اذیت ہی ہے۔ میرے مذہب سے اختلاف کی وجہ وہ سب تبدیلیاں ہیں جو وائیز میں رونما ہوئیں۔ اور اگر ہارورڈ کافارغ التحصیل ایک ماہر ارضیات اس کا شکار ہو سکتا ہے تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ ان کا کیا حال ہو گا جو وائیز سے کم تعلیم یافتہ اور کم ذہین ہیں۔

بنیاد پرست مذہب ہزاروں معصوم، بے تاب، خوش نیت ذہنوں کی سائنسی تعلیم کو تباہ کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا رہا ہے۔ شاید غیر بنیاد پرست، 'سمجھدار' مذہب ایسا نہ کر رہا ہو۔ لیکن وہ بچّوں کو اوائل عمری سے ہی یہ سکھا کر کہ بے حجّت عقیدہ ایک نیکی ہے، دنیا کو بنیاد پرستی کے لئے محفوظ بنا دیتاہے۔

## مطلق العنانیت کا تاریک پہلو

### The Dark Side of Absolutism

گزشتہ باب میں، بدلتی ہوئی اخلاقی روح عصر کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے آزاد خیال، باشعور، مہذب لوگوں کے بڑے پیمانے پر اتفاق رائے کو اپنے حق میں استعمال کیا تھا۔ میں نے گلاب چشم مفروضہ اپنایا کہ 'ہم' سب بالعموم اتفاق رائے کے حق میں ہی ہیں، کچھ اوروں سے زیادہ، اور ایسا لکھتے ہوئے میرے ذہن میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جن کا یہ کتاب پڑھنے کا امکان ہے، چاہے وہ مذہبی ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام لوگ تو اس اتفاق رائے کے حق میں نہیں ہو سکتے، (اور نا ہی سب لوگ یہ کتاب پڑھنے کی خواہش رکھیں گے)۔ اس بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ مطلق العنانیت ابھی بھر پور طریقے سے زندہ ہے۔ در حقیقت وہ ابھی تک دنیا کی ایک کثیر آبادی کے ذہنوں پر قابض ہے، خاص طور سے مسلم ممالک میں اور نوزائیدہ امریکی ملّائیت میں۔ ( فلپ کی کتاب American Theocracy ملاحظہ کیجئے)۔ ایسی مطلق العنانیت شدید مذہبی عقیدے سے جنم لیتی ہے، اور اس تجویز کے لئے ایک اہم وجہ فراہم کرتی ہے کہ مذہب دنیا میں برائی کی جڑ ہے۔

صحیفۂ قدیم میں قائم کردہ سزاؤں میں سے توہین رسالت کی سزا گھناؤنی ترین سزاؤں میں سے ایک ہے۔ کچھ ممالک میں آج بھی یہ سزا رائج ہے۔ تعزیرات پاکستان کی دفعہ C-۲۹۵ کے مطابق اس جرم کی سزا موت ہے۔ ۱۸ اگست ۲۰۰۱ کو ڈاکٹر یونس شیخ جو ایک طبی ڈاکٹر اور لکچرر تھا، اس کو توہین رسالت کے جرم میں سزائے موت سنائی گئی۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے اپنے شاگردوں کے سامنے یہ کہہ دیا کہ رسول اسلام محمد چالیس سال کی عمر تک اسلام کی ایجاد سے پہلے مسلمان نہیں تھا۔ اگیارہ طلبہ نے انتظامیہ کے سامنے اس 'جرم' کی شکایت درج کی۔ پاکستان میں توہین رسالت کا قانون عموماً عیسائی اقلیت کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے، جیسے کہ آگسٹائین عاشق 'کنگڑی' مسیح، جسے سنہ ۲۰۰۰ میں فیصل آباد میں موت کی سزا سنائی گئی۔ عیسائی ہونے کی وجہ سے مسیح کو اپنی محبوبہ سے شادی کرنے کی اجازت نہ مل سکی کیونکہ وہ مسلمان تھی اور حیرانی کی بات ہے کہ پاکستانی (اور اسلامی) قوانین مسلمان عورت کو غیر مسلم مرد سے شادی کی اجازت نہیں دیتا۔ لہٰذا مسیح نے اسلام قبول کرنے کی کوشش کی، لیکن اب اس پر الزام لگ گیا کہ اس نے شہوانی مقاصد کے لئے اسلام قبول کرنا چاہا تھا۔ جو خبریں میری نظر سے گزریں ان سے یہ واضح نہیں ہو سکا کہ آیا اس کا جرم یہ تھا یا اس نے مبیّنہ طور پر رسول کی اخلاقیات کے بارے میں کوئی بات کہی تھی۔ خواہ کسی بھی رو سے دیکھئے، یہ کوئی ایسا جرم نہیں جس کے لئے اسے کسی ایسے ملک میں موت کی سزا ملتی جہاں کے قوانین مذہبی تعصب سے پاک ہیں۔

افغانستان میں ۲۰۰۶ میں عبدالرحمان کو عیسائی مذہب قبول کرنے کے جرم میں موت کی سزا ہوئی۔ کیا اس نے کسی کو قتل کیا تھا، کسی کو عذر پہنچایا

تھا، کچھ چرایا تھا، یا کوئی املاک تباہ کی تھی؟ نہیں۔اس کا جرم اتنا تھا کہ اس نے اپنا ذہن تبدیل کیا تھا۔ اندرونی طور پر؛ ذاتی طور پر؛ اس نے اپنا ذہن تبدیل کر لیا تھا۔ اس نے اپنے ذہن میں محض چند خیالات کو آنے دیا جو حکمران جماعت کو نا پسند تھے۔ اور یاد رکھیے، میں طالبان کے افغانستان کی بات نہیں کر رہا بلکہ حامد کرزئی کے اس 'آزاد' افغانستان کی بات کر رہا ہوں جو امریکیوں نے کھڑا کر کے دیا تھا۔ عبدالرحمان کو موت سے بچنے کے لئے پاگل پن کی تشخیص اور شدید بین الاقوامی دباؤ کا سہارا لینا پڑا۔ کٹر متعصب لوگوں کے ہاتھوں ان کے مذہبی فرض کی تکمیل میں قتل ہونے سے بچنے کے لئے اس نے اٹلی سے پناہ کی درخواست کی ہے۔ آج بھی 'آزاد شدہ' افغانستان کے آئین میں مرتد کے لئے موت کی سزا ہی لکھی ہوئی ہے۔ یاد رکھیے، ارتداد کا مطلب کسی کے جان یا مال کو نقصان پہچانا نہیں۔ یہ کلّی طور پر ذہنی جرم ہے، یا جارج اورویل کی ۱۹۸۴ میں لکھی ہوئی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے، thoughtcrime ہے، اور اسلامی قانون کے تحت اس کی سزا موت ہے۔ ایک ایسی مثال کا حوالہ دیتے ہوئے جہاں یہ سزا حقیقتاً پوری کی گئی، ۳ ستمبر ۱۹۹۲ کو قانونی طور سے توہین رسالت اور ارتداد کا مرتکب پائے جانے کے بعد صادق عبدالکریم مال اللہ کا سر قلم کر دیا گیا"۔

ایک بار ٹیلی وژن پر میری ملاقات سر اقبال سکرانی سے ہو گئی، جس کا ذکر میں باب۱ میں برطانیہ کے صف اوّل کے 'معتدل' مسلمان کے طور پر کر چکا ہوں۔ میں نے ارتداد کے جرم میں سزائے موت کا مسئلہ اس کے سامنے رکھا۔ وہ بے چینی کی حالت میں تلملاتا رہا لیکن نہ تو اس قانون سے انکار کر سکا اور نہ ہی اس کی مذمت۔ وہ مسلسل موضوع بدلنے کی کوشش کرتا رہا اور کہتا رہا کہ یہ ایک غیر اہم نقطہ ہے۔ اس آدمی کو برطانوی حکومت نے 'بین المذاہب تعلقات' بہتر کرنے کے صلے میں knighthood سے نوازا ہے۔

اور ہمیں عیسائیت کے لئے بھی ہمدردی دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ۱۹۲۲ میں برطانیہ میں جان ولیم گوٹ کو توہین رسالت کے جرم میں۹ ماہ قید کی سزا ہوئی کیونکہ اس نے عیسیٰ کا موازنہ سرکس کے مسخرے سے کیا تھا۔ حیران کن طور پر، آج بھی برطانیہ کی تعزیرات میں توہین رسالت کا جرم موجود ہے"'، اور ۲۰۰۵ میں ایک عیسائی گروہ نے بی بی سی پر"جیری سپرنگر؛ منظوم ڈرامہ – Jerry Springer; the Opera" نشر کے جرم میں مقدمہ دائر کرنے کی کوشش کی۔

دور حاضر کے امریکہ میں "امریکی طالبان" کی اصطلاح جنم لینے کے لئے تڑپ رہی تھی، اور گوگل پر تلاش کرنے سے آپ کو درجنوں ایسی ویب سائٹ مل جائیں گی جنھوں نے یہ اصطلاح بنا بھی لی ہے۔ امریکی مذہبی علماء اور سیاستدانوں کے جن اقتباسات کا انتخاب کیاجاتا ہے وہ طالبان، آیت اللہ خمینی، اور سعودی وہابیوں کے تنگ نظر تعصب، شرمناک بربریت اور بے رحم سفّاکی کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔ "امریکی طالبان – The American Taliban" نامی ویب پیج قابل نفرت، عقل سے پیدل اقتباسات کی ایک شاندار فہرست ہے، جو شروع ہی کسی این کولٹر (Ann Coulter) کے اس اقتباس سے ہوتی ہے جس کے بارے میں میرے امریکی دوستوں نے مجھے یقین دلایا کہ یہ مزاحیہ جریدے The Onion کی شرارت نہیں بلکہ حقیقی خاتون ہیں جن کے نوادرات کچھ یوں ہیں : "ہمیں ان ملکوں پر حملہ کرنا چاہئے، ان کے قائد کو قتل کر دینا چاہئے، اور عوام کو عیسائی بنا لینا چاہئے"'"۔ دیگر نمونوں میں کانگریس کے رکن باب ڈورنین کا یہ بیان کہ 'ہم جنس پرست کا لفظ (gay) مت استعمال کریں، سوائے جب آپ یہ پوچھنا چاہیں کہ "ایڈز ہوگیا کیا؟– Got Aids Yet?"، اور جنرل ولیم جی بویکن کا بیان ہے کہ 'جارج بش کو امریکی ووٹر نے منتخب نہیں کیا، خدا نے تعینات کیا ہے'۔ اس کے تمام اجزاء اس انداز کے ہیں: غلط سمجھے گئے ایک پرانے پیغام کے ساتھ غلامانہ استقامت؛ عورت، جدّت، مقابل مذاہب، سائنس اور لطف اندوزی سے نفرت؛ سزا سے پیار، غنڈہ گردی، اور ہر ایک کی حیات کے متعدد زاویے میں تنگ نظر حاکمانہ مداخلت۔ افغان طالبان اور امریکی طالبان ہمیں صحیفے کو من و عن اور سنجیدگی سے مان لینے کے اثرات کی بہت اعلیٰ مثالیں فراہم کرتے ہیں۔ وہ ہمیں موجودہ دور میں صحیفہ قدیم کی ملّائیت کی نہایت خوفناک تشریح پیش کرتے ہیں۔ کمبرلی بلیکر نے اپنی کتاب "انتہا پسندی کی بنیاد: امریکہ میں عیسائی دائیں بازوکا وجود– The Fundamentals of Extremism: The Christian Right in America " عیسائی طالبان کے خطرے کو بے نقاب کرتا ہے۔

## ایمان اور ہم جنس پرستی

### Faith and Homosexuality

جب افغانستان طالبان کے زیر اثر تھا تو ہم جنس پرستی کی سزا موت تھی، اور مجرم کے اوپر دیوار گرا کر اس کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ 'جرم' ایک ذاتی فعل تھا جو دو لوگوں کے درمیان برضاو رغبت ہوا جس سے کسی اور کو کوئی نقصان نہیں پہنچ رہاتھا؛ ایک بار پھر مطلق العنانیت کے تمام مروّجہ طرۂ امتیاز ہمارے سامنے ہیں۔ میرے اپنے ملک کو بھی فخریہ مسکراہٹ دکھانے کا حق نہیں۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ برطانیہ میں بھی ہم جنس پرستی ۱۹۶۷ تک

ایک جرم تھا۔ ۱۹۵۴ میں ماہر ریاضیات ایلن ٹیورنگ (Alan Turing) نے، جسے جان فان نیومین کے ساتھ بابائے کمپیوٹر تسلیم کیا جاتا ہے، اس نے ذاتی طور پر ہم جنس پرستی کا مرتکب ہونے کے جرم میں سزا سنائی جانے کے بعد خودکشی کر لی۔ ہم مان لیتے ہیں ٹیورنگ کو ٹینک کے دھکّے سے دیوار گرا کر دفنایا نہیں گیا۔ اسے دو ممکنہ سزاؤں میں انتخاب کرنے کا موقعہ دیا گیا: ایک طرف ۲ سال کی قید (اور آپ تصوّر کر سکتے ہیں کہ ٹیورنگ جیسے آدمی کے ساتھ جیل میں کیا سلوک ہوتا) اور دوسری طرف ہارمون کے ٹیکوں کا کورس جو کیمیائی نس بندی کے مترادف تھا اور جس کے ضمنی اثر کے طور پر اس کی چھاتی پر پستان ابھر آتے۔ اس کا آخری اور ذاتی انتخاب ایک سیب تھا جس میں اس نے سایانائیڈ زہر کو بذریعہ انجکشن بھر دیا تھا"[13]۔

جرمنوں کی اینگمہ کوڈ (Enigma Code) کا راز دریافت کرنے والے گروہ کے مرکزی دانشور کے طور پر ٹیورنگ نے نازیوں کی شکست میں شاید چرچل اور آئیسن ہاور سے زیادہ اہم خدمات سرانجام دی تھیں۔ بلیچلی پارک میں ٹیورنگ اور اس کے "الٹرا" رفقاء کار کے کارناموں کی بدولت ہی اتحادی جرنیل جنگ کے دوران جرمن جرنیلوں کے منصوبوں سے اتنی جلدی آگاہ ہوتے رہے کہ جرمنوں کو ان منصوبوں پر عمل درآمد کرنے کا موقعہ ہی نہ ملتا تھا۔ جنگ کے اختتام کے بعد، جب ٹیورنگ کی خدمات صیغۂ راز میں نہیں رہی تھیں،اس وقت اسے قوم کے محسن کے طور پر نوازا جانا چاہئے تھا اور نائیٹ کا خطاب ملنا چاہئے تھا۔ اس کے برعکس، اس نرم، ہکلاتے ہوئے سنکی دانشور کی زندگی ایک ایسے 'جرم' کی وجہ سے تباہ کر دی گئی جس سے کسی دوسرے کو کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا تھا۔ ایک بار پھر ہم دیکھتے ہیں کہ عقیدے سے سرشار ہمارے اخلاقی واعظ کا طرۂ امتیاز صرف یہ ہے کہ وہ بڑی جذباتیت سے اس چیز پر دھیان دیتا ہے کہ دوسرے لوگ اپنی ذاتی زندگی میں کیا کرتے ہیں (یا سوچتے بھی ہیں)۔

ہم جنس پرستی کی جانب امریکی طالبان کا رویّہ ان کی مذہبی مطلقیت کی بھرپور غمّازی کرتا ہے۔لبرٹی یونیورسٹی کے بانی ریورنڈ جیری فالویل کا بیان ملاحظہ کیجئے: 'ایڈز صرف ہم جنس پرستوں پر ہی خدا کا عذاب نہیں ہے؛ یہ اس معاشرے پر بھی خدا کا عذاب ہے جو ہم جنس پرستی کو برداشت کرتی ہے'[14]۔ ان لوگوں کی جو بات سب سے پہلے میری نظر سے گزری ہے وہ ان کے صدقے اور رحم کی شاندار عیسائی روایت ہے۔ کس قسم کے ووٹر الیکشن در الیکشن شمالی کیرولائنہ کے ریپبلکن سنٹر جیسی ہیلمز جیسے بے خبر متعصب آدمی منتخب کر سکتے ہیں؟ یہ وہ شخص ہے جس نے تمسخرانہ انداز میں کہا تھا: 'نیو یارک ٹائمز اور واشنگٹن پوسٹ تو خود ہم جنس پرستوں سے بھرے پڑے ہیں۔ وہاں تقریباً ہر کام کرنے والا ہم جنس پرستی میں ملوث ہے'[15]۔ میرے سوال کا جواب غالباً یہ ہو گا کہ ایسے ووٹر وہ لوگ ہیں جو اخلاقیات کو اپنی مذہبی تنگ نظری کی عینک سے دیکھتے ہیں اور ہر ایسے شخص سے خطرہ محسوس کرتے ہیں جو ان کے مطلق العنان عقیدے کا حامی نہیں ہے۔

میں عیسائی اتحاد (Christian Coalition) کے بانی پیٹ رابرٹسن سے پہلے ہی اقتباس پیش کر چکا ہوں۔ ۱۹۸۸ میں اس نے ریپبلکن جماعت کی طرف سے صدارتی امیدوار منتخب ہونے کے لئے سنجیدہ کوشش کی تھی، اور اپنی انتخابی مہم پر کام کرنے کے لئے تیس لاکھ سے زائد رضاکار اور ایک خطیر رقم جمع کر لی تھی۔ اس اونچے درجے کی حمایت بے چینی کا باعث ہے، خصوصاً جب کہ رابرٹسن کو ایسے بیان دینے کی عادت ہے: '[ہم جنس پرست] گرجا گھروں میں آکر عبادت میں خلل ڈالنا چاہتے ہیں اور ہر طرف خون چھینک کر لوگوں کو ایڈز کا مرض لگانا چاہتے ہیں اور پادریوں کے منہ پر تھوکنا چاہتے ہیں'۔ '[خاندانی منصوبہ بندی – Planned Parenthood] بچّوں کو عمل جنابت سکھا رہی ہے، بالغ لوگوں کو حرام کاری اور جانوروں کے ساتھ بدکاری اور ہم جنس پرستی سکھا رہی ہے – ہر وہ بات جس سے انجیل منع فرماتی ہے'۔ عورتوں کی طرف بھی رابرٹسن کا رویّہ ایسا تھا جو طالبان کے سیاہ دلوں کو بھی گرما دے: 'مجھے اندازہ ہے کہ خواتین کے لئے یہ سننا بہت تکلیف دہ ہے، لیکن اگر آپ نے شادی کی ہے، تو آپ نے ایک مرد کی سربراہی کو قبول کر لیا ہے۔ مسیح گھرانے کا سربراہ ہے اور خاوند اپنی بیوی کا سربراہ ہے۔ اور ایسا ہی ہے؛ بس'!

کیتھولک مسلک کے گروہ عیسائی سیاسی تحریک (Christian Political Action) کے صدر گیری پوٹر کا یہ کہنا ہے: 'جب عیسائی اکثریت اس ملک پر قابض آ جائے گی تو شیطانی گرجا گھر نہیں رہیں گے، فحش نگاری کی مفت اشاعت نہیں ہو گی، ہم جنس پرستوں کے حقوق کی بات نہیں ہو گی۔ عیسائی اکثریت کے ملک میں انتظامی اختیارات سنبھال لینے کے بعد کثرت وجود الٰہی غیر اخلاقی گناہ قرار دے دیا جائے گا اور کسی کو برائی کا ارتکاب کرنے کا اختیار نہیں ہو گا'۔ جیسا کہ اس اقتباس سے ظاہر ہے، یہاں 'برائی' سے مراد کوئی ایسی حرکت نہیں جس سے کسی دوسرے کو نقصان پہنچ سکتا ہو، بلکہ لوگوں کے نجی خیالات اور حرکات ہیں جو 'عیسائی اکثریت' کی ذاتی پسند سے مختلف ہیں۔

ویسٹ بورو بپٹسٹ چرچ کا پادری فریڈ فیلپس ایک اور ایسا مدرس ہے جسے ہم جنس پرستوں سے جنون کی حد تک نفرت ہے۔ جب مارٹن لوتھر کنگ کی بیوہ کی وفات ہوئی تو فلپس نے اس کے جنازے کے خلاف دھرنا دیا اور یہ اعلان کیا: 'خدا ہم جنس پرستوں سے نفرت کرتا ہے، اور ان سے بھی جو ان کی

حمایت اور مدد کرتے ہیں! لہٰذا، خدا کوریٹہ سکاٹ کنگ سے بھی نفرت کرتا ہے اور اس وقت اسے وہاں آگ اور تیزاب میں اذیت دے رہا ہے جہاں حشرات کبھی مرتے نہیں اور آگ ٹھنڈی نہیں پڑتی، اور اس کی اذیت کا دھواں ہمیشہ ہمیشہ اوپر اٹھتا رہے گا"[۱۶]۔ اس کی اپنی ویب سائٹ کے مطابق، فلپس ۱۹۹۱ سے لے کر آج تک ہم جنسی کے خلاف امریکہ، کینیڈا، اردن اور عراق میں ۲۲،۰۰۰ مظاہرے منعقد کر چکا ہے (جو اوسطاًروزانہ ۴ بنتے ہیں)، جہاں اس قسم کے نعرے نمایاں ہوتے ہیں **'ایڈز کے لئے خدا کا شکر ہے'**۔ اس کی ویب سائٹ کی دل کو موہ لینے والی ایک خصوصیت ناموں کی وہ فہرست ہے جس کے مطابق آپ دیکھ سکتے ہیں کہ کوئی آنجہانی ہم جنس پرست کتنے دنوں سے جہنم کی آگ میں جل رہا ہے۔

ہم جنس پرستی سے منسلک رویّے مذہب سے متاثر ہونے والی اخلاقیات کے بارے میں ہمیں بہت کچھ سکھاتے ہیں۔ اسقاط حمل اور انسانی حیات کی حرمت کی بحث میں بھی ہمیں اتنی ہی سبق آموز مثال ملتی ہے۔

## ایمان اور انسانی جان کی حرمت

### Faith and the Sanctity of Human Life

جنین (embryo) انسانی حیات کا ایک نمونہ ہے۔ لہٰذا مذہبی مطلقیت کی رو سے اسقاط حمل غلط ہے: بھرپور قتل۔ مجھے سمجھ نہیں آتا کہ میں اپنے اس ذاتی مشاہدے کے بارے میں کیا کہوں کہ وہ لوگ جو اسقاط حمل کی سب سے زیادہ مخالفت کرتے ہیں بالغوں کی جان لینے کے لئے سب سے زیادہ اتاولے بھی ہوتے ہیں۔ سچ پوچھیئے تو عام طور پر کیتھولک مسلک پر اس مشاہدے کا اطلاق نہیں ہوتا، اگرچہ وہ اسقاط حمل کے شدید مخالفین میں شامل ہیں۔ عیسائیت کی طرف لوٹا ہوا صدر جارج ڈبلیو بش دور حاضر کے مذہبی عروج کی عمدہ مثال ہے۔ بش اور اس جیسے لوگ انسانی حیات کی دفاع کا ہراول دستہ ہیں، یہ انسانی جان کی دفاع اس وقت کرتے ہیں جب تک کہ وہ جنین کی صورت میں ہو (یا جان لیوا مرض میں مبتلا ہو) ـ یا سینکڑوں جانیں بچا سکنے والی طبی تحقیق کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی حد تک بھی[۱۷]"۔ سزائے موت کی مخالفت کرنے کی سب سے واضح وجہ انسانی زندگی کی حرمت ہے۔ جب سے عدالت عظمیٰ نے ۱۹۷۶ میں سزائے موت سے پابندی ہٹائی ہے، پورے ملک کی ایک تہائی موت کی سزائیں ٹیکساس کی ریاست میں دی گئی ہیں۔ اور اس ریاست کی تاریخ میں بش نے سب سے زیادہ سزائیں جاری کیں، جو اوسطاً ہر ۹ دن بعد ایک کے حساب سے دی گئیں۔ شاید وہ صرف اپنا فرض ادا کر رہا تھا اور ریاست کے قوانین پر عمل درآمد تھا"[۱۸]؟ تو پھر ہم سی این این (CNN) کے صحافی ٹکر کارلسن کی مشہور رپورٹ کے بارے میں کیا کریں؟ کارلسن جو خود بھی سزائے موت کی حمایت کرتا ہے، بش کی طرف سے ایک سزا یافتہ عورت کی رحم کی درخواست کی مزاحیہ نقل کو دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا: "'خدا را'، بش اس عورت کی آواز میں روتا ہے اور جھوٹی گھبراہٹ میں اپنے ہونٹ سکیڑتا ہے، 'مجھے مت مارو'"[۱۹]۔ شاید اس عورت کو بش کی جانب سے زیادہ ہمدردی اس وقت ملتی جب وہ اس کو یہ بتاتی کہ کبھی وہ بھی جنین تھی۔ جنین پر غور و فکر واقعی عقیدت مند لوگوں پر بڑے ہی غیر معمولی اثرات مرتب کرتا ہے۔ کلکتہ کی مدر ٹریسا نے نوبل انعام قبول کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا 'اسقاط حمل امن کا سب سے بڑا دشمن ہے'۔ کیا کہا؟! جس عورت کا نقطۂ نظر اس قدر احول چشم ہو، اسے نوبل انعام دینا تو دور، کسی بھی موضوع پر سنجیدگی سے کیسے لیا جاسکتا ہے؟ کوئی بھی شخص جو اس تقدّس زدہ دوغلی عورت کے جھانسے میں آنے کے لئے کمر کس رہا ہو پہلے کریسٹوفر ہچنز کی کتاب "تبلیغی مقام: مدر ٹریسا کے نظریات اور حقیقت–The Missionary Position: Mother Teresa in Theory and Practice" کا مطالعہ ضرور کرے۔

لیکن ہم امریکی طالبان کی جانب لوٹتے ہیں۔ "آپریشن ریسکیو" جو ایک ایسا ادارہ ہے جو اسقاط حمل کی سہولیات فراہم کرنے والوں کو ڈرانے دھمکانے کا کام کرتا ہے،اس کے بانی رینڈل ٹیری کا یہ بیان ملاحظہ کیجئے۔ 'جب میں، یا مجھ جیسے لوگ، اس ملک کی باگ ڈور سنبھال لیں گے تو تمہارے لئے ملک سے فرار ہو جانا بہتر ہو گا۔ کیونکہ ہم تمہیں ڈھونڈ نکالیں گے، تمہارے اوپر مقدمے چلائیں گے، اور تمہیں موت کی سزائیں دلوائیں گے۔ میں اپنے ایک ایک لفظ پر قائم ہوں۔ میں اس کو اپنے مقاصد کا حصہ بنا لوں گا کہ ان لوگوں پر مقدمے بنیں اور ان کو سزائیں ملیں'۔ یہاں ٹیری ان ڈاکٹروں سے مخاطب تھا جو اسقاط حمل کے مطب چلاتے ہیں، اور اس کی باتوں کا عیسائی اثر دیگر بیانات سے مزید واضح ہو جاتا ہے:

> میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ تعصب کی موجوں میں ڈوب جاؤ۔ میں چاہتا ہوں کہ تم نفرت کی موجوں میں ڈوب جاؤ۔ ہاں!
> نفرت کرنا اچھا ہے.... ہمارا نصب العین ایک عیسائی ملک ہے۔ ہماراایک دینی فریضہ ہے۔ ہمیں خدا نے اس ملک کو فتح کرنے

کے لئے تیار کیا ہے۔ ہمیں برابری نہیں چاہئے۔ ہمیں کثرت وجود نہیں چاہئے۔

ہمارا مقصد سیدھا ہونا چاہئے۔ ہمیں خدا کے قانون اور موسیٰ کے دس احکامات پر مبنی ایک ملک بنانا چاہیے۔ اس کے لئے کوئی عذر نہیں"[120]۔

ایک عیسائی فسطائی ریاست بنانے کی کوشش امریکی طالبان کی سوچ کا مثالی نمونہ ہے۔ اور یہ اس اسلامی فسطائی ریاست کا عکس ہے جو دنیا کے دوسرے کونوں میں رائج کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ رینڈل ٹیری ابھی تک تو حکومت میں نہیں ہے۔ لیکن امریکی سیاسی صورت حال کا کوئی بھی تجزیہ نگار سکون سے نہیں بیٹھ سکتا۔

نتیجہ پسند (consequentialist) یا افادیت پسند (utilitarian) اسقاط حمل کے سوال کو بہت مختلف زاویے سے دیکھیں گے اور انسانی تکلیف کو اعداد میں تولنے کی کوشش کریں گے۔ کیا جنین کو تکلیف ہوتی ہے؟ (غالباً نہیں۔ اگر اسقاط حمل اعصابی نظام کے بننے سے پہلے ہی مکمل کر لیا جائے؛ یااگر اعصابی نظام بن بھی چکا ہو تو یقیناً اس کی تکلیف اس گائے کی تکلیف سے بھی کم ہو گی جسے ذبح کیا جا رہا ہو)۔ کیا اسقاط نہ کرنے کی صورت میں حاملہ عورت اور اس کا خاندان تکلیف سے دوچار ہو سکتے ہیں؟ عین ممکن ہے؛ اور ویسے بھی، اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ جنین کا اعصابی نظام مکمل نہیں ہے، کیا فیصلہ کرنے کا حق ماں کے مکمل شدہ اور بھرپور اعصابی نظام کو نہیں ملنا چاہئے؟

اس امر سے انکار نہیں کہ نتیجہ پسندوں کے پاس اسقاط حمل کے خلاف ٹھوس دلائل ہو سکتے ہیں۔ نتیجہ پسند چکنی ڈھلان (slippery slope) کی نوعیت کی توجیہات بھی گڑھ سکتے ہیں (اگرچہ میں ایسی صورت میں ایسا خطرہ مول نہ لیتا)۔ شاید جنین کو تکلیف نہیں ہوتی: لیکن کسی ایسی تہذیب میں جہاں انسان کی جان لینے کو برداشت کیا جا سکتا ہے، منطق کے خطرناک حد تک دور نکل جانے کا خطرہ منڈلاتا رہتا ہے: آپ منطق کو کہاں جا کر روکیں گے؟ طفل کشی پر؟ پیدائش کا لمحہ ہمیں ایک ایسے موڑ پر لا کھڑا کرتا ہے جس سے پیچھے نہیں ہٹا جا سکتا، اور جہاں سے ہم قوانین بنانے کا سلسلہ شروع کرتے ہیں۔ رحم میں جنین کی زندگی کے دور میں ایسا کوئی لمحہ نہیں ملتا جہاں سے قانون سازی کا عمل شروع کیا جا سکے۔ لہٰذا چکنی ڈھلان کے دلائل ہمیں پیدائش کے لمحے کو اس سے زیادہ اہمیت دینے پر مجبور کر سکتے ہیں جو نظریہ افادیت کی رو سے ممکن ہو۔

طبی بنیادوں پر رحمانہ قتل(euthanasia) کے مسئلے کو بھی چکنی ڈھلوان کے دلائل میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ آیئے ایک اخلاقیات کے فلسفی کی جانب سے ایک فرضی بیان گڑھ لیتے ہیں: 'اگر آپ ڈاکٹروں کو یہ اجازت دے دیں کہ وہ کسی بھی مہلک بیماری کے مریض کو اس کی تکلیف سے نجات دلانے کی نیت سے اس کی زندگی ختم کر سکتے ہیں تو بہت جلد آپ کو ایسی مثالیں ملنی شروع ہو جائیں گی کہ لوگوں نے اپنی نانی ، دادی کو جائیداد ہتھیانے کی غرض سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہم فلسفی بھلے ہی مطلقیت سے آگے بڑھ چکے ہوں، لیکن معاشرے کو مطلق العنان قوانین کی ضرورت رہے گی، جیسے کہ "کسی کی جان نہیں لوگے"، ورنہ معاشرے کو کیسے معلوم ہو سکے گا کہ حد کہاں ہے؟ چند مخصوص حالات میں مطلقیت کے ضمنی پیداوارات، اگرچہ وہ غلط وجوہات کی بنا پر ہوں گے، خود سیدھے سادے نتیجہ سے بہتر ہو سکتے ہیں! ہم فلسفیوں کے لئے ایسے انسانوں کو کھانے پر پابندی لگانا جو پہلے ہی لاوارث موت مر چکے ہیں، مشکل ہو گا — مثال کے طور پر سڑک پر حادثاتی موت مرنے والے بھکاری۔ لیکن چکنی ڈھلان کی وجوہات کی بنیاد پر آدم خوری پر لگائی جانے والی مطلق العنان پابندی بے حد اہمیت کی حامل ہے'۔

چکنی ڈھلان کی توجیہات نتیجہ پسندوں کو بلا واسطہ مطلق العنانیت کی بحث میں دوبارہ شامل کرنے کا ایک راستہ فراہم کرتی ہیں۔ لیکن اسقاط حمل کے مذہبی دشمن چکنی ڈھلان کا سہارا لینے کی زحمت بھی نہیں کرتے۔ ان کے لئے تو سارا مسئلہ بہت ہی آسان ہے۔ جنین ایک 'بچّہ' ہے؛ اس کو مارنا قتل ہے، اور بس: بحث ختم۔ اس مطلق العنان رویے سے مزید مسائل جنم لیتے ہیں۔ پہلے تو یہ کہ طبی سائنس کے لئے اس کے فوائد کے باوجود جنینی ساق کے خلیوں پر تحقیق (stem cell research) پر پابندی لگنی چاہئے، کیونکہ یہ جنین کے خلیوں کی موت کے بغیر ممکن نہیں۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرہ مصنوعی جفتہ سازی (in vitro fertilization – IVF) کے فوائد کوتسلیم کرتا ہے ، جس میں ڈاکٹر عورتوں کے اعضاء کو اس طرح تحریک دیتے ہیں کہ وہ ایک وقت میں بہت سے انڈے پیدا کر سکیں جن کی جفتہ سازی جسم سے باہر ہی کر لی جائے — تو اسقاط حمل سے دشمنی کی یہ غیر مطابقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے۔ اس عمل سے درجن بھر قابل استعمال بار آور بیضے (zygote) بنائے جا سکتے ہیں، جن میں سے دو یا تین رحم میں رکھ دیے جاتے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ

ان میں سے ایک یا دو بچ رہیں گے۔ لہٰذا یہ عمل دو مراحل میں جنین کو مارتا ہے، لیکن معاشرے کو بالعموم کبھی اس بات سے فرق نہیں پڑا، حالانکہ یہ بھی جنین کا قتل ہی ہے۔ پچیس سال سے یہ عمل بے اولاد ماں باپ کی زندگیوں میں خوشیاں لارہا ہے۔

مذہبی مطلقیت پسند لوگوں کو اس IVF سے اختلاف ہو سکتاہے۔ ۳ جون ۲۰۰۵ کو گارڈین اخبار نے ایک عجیب خبر شائع کی کہ 'عیسائی جوڑے IVF سے باقی بچ جانے والے جنین کو بچانے کی پکار کو لبّیک کہتے ہیں'۔ خبر Snowflakes نامی ایک ادارے کے بارے میں تھی جو IVF کلینک کے چھوڑے ہوئے جنین کو "بچانے" کی کوشش کرتا ہے۔ ریاست واشنگٹن کی ایک ایسی عورت نے کہا، جس کا اپنا چوتھا بچہ 'رجعت پسند عیسائیوں اور IVF ولادتوں کی دنیا کے اس غیر متوقع اتحاد' کے نتیجے میں دنیا میں آیا تھا، 'ہمیں شدّت سے احساس ہوا کہ خدا ہمیں پکاررہا ہے کہ ہم ان جنین- ان بچوں- کو زندگی کا موقع دیں'۔ اس 'اتحاد' سے پریشان اس کے خاوند نے گرجاگھر کے ایک رہنما سے مدد کے لئے رجوع کیا، جس نے یہ صلاح دی: 'غلاموں کو آزاد کرانے کے لئے کبھی کبھی غلاموں کے بیوپاری سے سودے بازی بھی کرنی پڑتی ہے'۔ اگر ان لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس عمل سے بننے والے زیادہ تر جنین یوں بھی خود بخود عمل کے دوران ہی ضایع ہو جاتے ہیں تو یہ لوگ کیا کہیں گے۔ مجھے تو یہ قدرت کے معیار کو برقرار رکھنے کے انتظام سے زیادہ کچھ نہیں لگتا۔

یہ ایک خاص طرح کی مذہبی ذہنیت ہے جو خلیوں کے ایک چھوٹے سے جھنڈ کو مارنے اور ایک بالغ ڈاکٹر کو مارنے کے درمیان اخلاقی فرق کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ میں رینڈل ٹیری اور 'آپریشن ریسکیو' سے تو پہلے ہی اقتباس پیش کر چکا ہوں۔ مارک جیر گنزمئیر(Mark Juergensmeyer) نے دل کو دہلا دینے والی اپنی کتاب "خدا کے ذہن میں دہشت– Terror in the Mind of God" میں ایک تصویر شائع کی جس میں دو پادری، مائیکل برے اور پال ہل ایک علم اٹھائے ہوئے ہیں جس پر یہ عبارت درج ہے: 'کیا معصوم بچوں کے قتل کو روکنا غلط ہے'؟ دونوں صاحبان دیکھنے میں اچھے سکولوں سے فارغ التحصیل خوش پوشاک جاذب نظر مسکراہٹوں والے نوجوان لگتے ہیں، جنونی ہوّنکوں کے بالکل برعکس۔ لیکن یہ، اور "خدائی فوجدار" (Army of God) میں شامل ان کے دوست اسقاط حمل کی کلینک کو آگ لگاتے ہیں اور ڈاکٹروں کو قتل کرنے کی خواہش رکھنے کے بارے میں ذرا بھی شرمندہ نہیں ہیں۔ ۲۹ جولائی ۱۹۹۴ کو پال ہل نے ڈاکٹر جان برٹن اور اس کے محافظ کو پینساکولا فلوریڈا میں واقع برٹن کی کلینک کے سامنے بندوق کی گولی سے ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی گرفتاری پیش کر دی اور کہا کہ اس نے یہ ایک قتل مستقبل میں بہت سی 'معصوم جانوں' کے قتل کو روکنے کے لئے کیا۔

مائیکل برے اپنے دوست پال ہل کے ایسے اقدامات کا دفاع نہایت شائستگی اور بظاہر اعلیٰ اخلاقی اقدار کے مقصد سے کرتا ہے؛ جب میں نے اپنی ٹیلی ویژن پر چلنے والی دستاویزی فلم کے لئے کولوراڈو سپرنگز(Colorado Springs) کے ایک باغ میں اس کا انٹرویو کیا تو میرا بھی اس کے بارے میں یہی مشاہدہ رہا[*]۔ اسقاط حمل کا سوال اٹھانے سے پہلے میں نے برے کی انجیل پر مبنی اخلاقیات کا اندازہ لگانے کے لئے کچھ ابتدائی سوال پوچھے۔ میں نے اس سے انجیل کے اس قانون کے بارے میں پوچھا جس کے مطابق بدکاروں کو سنگسار کر کے مارنے کا حکم ہے۔ مجھے توقع تھی کہ وہ اس مثال کو بحث کے لئے ناقابل استعمال گردان کر اس سے انکار کرنے کی کوشش کرے گا، لیکن اس نے مجھے حیران کر دیا۔ اس نے بڑے اعتماد سے یہ قبول کیا کہ قانونی کاروائی کے بعد بدکاروں کو موت کی سزا ہی دینی چاہئے۔ یہاں میں نے اس کی توجہ اس بات کی طرف مرکوز کی کہ پال ہل نے برے کی مکمل حمایت کے ساتھ قانونی کاروائی کے تقاضے پورے کرنے کی بجائے قانون کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور ایک ڈاکٹر کا قتل کر دیا تھا۔ برے نے اپنے ساتھی پادری کی حرکت کا دفاع انہی الفاظ میں کیا جو اس نے جیر گنزمئیر کو دیئے گئے انٹرویو میں استعمال کئے تھے، اور کسی ریٹائیرڈ ڈاکٹر کے مکافاتی قتل کو کسی ایسے ڈاکٹر کے قتل سے مختلف بتایا جو ابھی کام کر رہا ہو، تاکہ اسے 'کئی بچّوں کے باقاعدگی سے قتل' کرنے سے روکا جا سکے۔ پھر میں نے اس سے سوال کیا کہ اگرچہ پال ہل کے عقائد مخلص تھے، اگر ہم ہر شخص کو اس کے ذاتی عقیدے کی بنیاد پر قانون اپنے ہاتھوں میں لینے کی اجازت دے دیں تو معاشرہ شدید لاقانونیت میں ڈوب جائے گا۔ کیا صحیح طریقہ کار یہ نہیں کہ قانون ہی کو جمہوری طریقوں سے بدلنے کی کوشش کی جائے؟ برے نے جواب دیا: 'دیکھئے، یہ مسئلہ پیدا ہی اس وقت ہوتا ہے جب ہمارے قوانین مستند قوانین نہ ہوں؛ جب ہمارے قوانین لوگوں نے موقعہ پر من مرضی کرتے ہوئے بنائے ہوں، جیسا کہ ہم نے نام نہاد حقوق اسقاط حمل سے منسلک قوانین کے سلسلے میں دیکھا، جو کہ چند منصفین نے ہمارے اوپر زبردستی لاد دیے ہیں.... ' یہاں ہم امریکی آئین اور قوانین کے ماخذ کو لے کر بحث میں الجھ گئے۔ ان معاملات میں برے کا رویّہ برطانیہ میں مقیم ان عسکریت پسند مسلمانوں جیسا نکلا جو علی الاعلان کہتے پھرتے ہیں کہ وہ صرف اسلامی قوانین کو مانتے ہیں، اپنے نئے ملک کے جمہوری طریقے سے بنائے ہوئے قوانین کو نہیں۔

---

[*] آزادئ حیواں کی تحریک چلانے والے جو لوگ ان سائنسدانوں کے خلاف تشدد کی دھمکی دیتے ہیں جو اپنے تجربات میں جانوروں کا استعمال کرتے ہیں اپنی حرکات کے دفاع میں ایسے ہی اعلیٰ اخلاقی مقصد کا ذکر کریں گے۔

پال ہل کو ۲۰۰۳ میں ڈاکٹر برٹن کے قتل کے الزام میں سزائے موت دے دی گئی، لیکن مرتے دم تک اس کا یہی کہنا تھا کہ اگر اسے موقعہ ملے تو غیر مولود بچّوں کو بچانے کے لئے وہ دوبارہ یہی حرکت کرے گا۔ فراخ دلی سے اپنی موت کا انتظار کرتے ہوئے، اس نے صحافیوں کی کانفرنس میں یہ کہا کہ 'مجھے کامل یقین ہے کہ مجھے مار کر ریاست مجھے شہادت کے رتبے پر پہنچا دے گی'۔ بائیں بازو کے سزائے موت کے مخالف لوگ، دائیں بازو سے آئے ہوئے اسقاط کے مخالف لوگ جو سزا رکوانا چاہ رہے تھے، کے ساتھ صف آراء ہو گئے اور ریاست فلوریڈا کے گورنر جیب بش سے استدعا کرنے لگے کہ پال ہل کو "شہید" بننے سے روکا جائے۔ ان کا نقطۂ استدلال یہ تھا کہ پال کا یہ 'قانونی قتل' ایسے عناصر کو روکنے کی بجائے مزید قتل کرنے میں ان کی حوصلہ افزائی کرے گا۔ پال بھی مسکراتا ہوا کمرۂ سزا تک یہ کہتا ہوا چلاگیا کہ 'مجھے جنّت میں بہت بڑے انعام کی توقع ہے.... میں شدّت سے اس عظیم رتبے کا منتظر ہوں'[۲۱]۔ اس نے یہ بھی تجویز کیا کہ اوروں کو بھی اس کی اس پر تشدد تحریک کو لے کر آگے بڑھنا چاہئے۔ پال ہل کی 'شہادت' پر بدلہ لینے کی غرض سے ممکنہ حملوں کی تیاری میں پولیس بے حد چوکنّا ہو گئی، اور مقدمے سے منسلک بہت سے افراد کو دھمکی آمیز خطوط بھی موصول ہوئے، جن میں ہر لفافے میں ایک گولی بھی رکھی گئی تھی۔

یہ سارا خوفناک مسٔلہ ادراک کے فرق سے جنم لیتا ہے۔ کچھ لوگ اپنے مذہبی عقائد کی وجہ سے سمجھتے ہیں کہ اسقاط حمل قتل ہے اور وہ جنین کے دفاع میں، جسے وہ "بچہ" کہتے ہیں، جان لینے کے لئے بھی تیار ہیں۔ بحث کے دوسری جانب وہ لوگ ہیں جو اسقاط حمل کے اتنے ہی مخلص حمایتی ہیں، جن کے عقائد یا تو مختلف ہیں یا سرے سے ہیں ہی نہیں، اور جن کی اخلاقیات غور و فکر سے لیس اور نتیجہ پسندی پر مبنی ہیں، وہ بھی اپنے آپ کو مثالیت پسند (idealist) ہی سمجھتے ہیں جو ایسے مریضوں کو ضروری طبی امداد فراہم کر رہے ہیں جو اس امداد کی غیر موجودگی میں اندھیری گلیوں میں ناقابل نیم حکیموں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ دونوں فریقین اپنے مد مقابل کو قاتل یا قتل کا وکیل سمجھتے ہیں۔ دونوں فریقین، اپنے اپنے نقطۂ نظر سے برابر مخلص ہیں۔

اسقاط حمل کی ایک اور کلینک کے ترجمان نے پال ہل کو ایک خطرناک نفسیاتی مریض کہا۔ لیکن اس جیسے لوگ خود اپنے آپ کو نفسیاتی مریض نہیں سمجھ رہے ہوتے؛ وہ تو اپنے آپ کو اچھے، اخلاقی لوگ سمجھتے ہیں جنہیں خدا کی راہ نمائی حاصل ہے۔ میں پال ہل کو نفسیاتی مریض نہیں سمجھتا۔ بس، شدید مذہبی سمجھتا ہوں۔ اپنے مذہبی عقیدے کے تناظر میں پال کا ڈاکٹر برٹن کو گولی مار دینے کا فیصلہ صحیح اور اخلاقی تھا۔ مسٔلہ تو پال کے مذہبی عقیدے میں تھا۔ جب میں مائیکل برے سے ملا تو وہ بھی مجھے نفسیاتی مریض نہیں لگا۔ بلکہ مجھے تو وہ کسی حد تک اچھا بھی لگا۔ میں نے اسے سچا، مخلص، نرم گفتار اور متفکر پایا، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس کے ذہن کو زہریلی مذہبی بکواس نے جکڑ لیا تھا۔

اسقاط حمل کے شدید مخالفین عموماً شدید مذہبی بھی ہوتے ہیں۔ اسقاط کے مخلص حمایتی ذاتی طور پرمذہبی ہوں یا نہ ہوں، وہ عموماً کسی غیر مذہبی اور نتیجہ پسند اخلاقی فلسفے کو مانتے ہیں اور اپنے ذہنوں میں شاید جیریمی بینتھم کا سوال دہراتے رہتے ہیں "کیا انہیں تکلیف ہو سکتی ہے"؟ پال ہل اور مائیکل برے کو ایک جنین کے قتل اور ایک ڈاکٹر کے قتل میں کوئی اخلاقی فرق نظر نہیں آتا تھا، ما سوائے اس کے کہ ان کی نظر میں جنین معصوم "بچّہ" تھا۔ اس کے برعکس نتیجہ پسندوں کو دونوں اموات میں دنیا جہان کا فرق نظر آ جاتا ہے۔ کسی اوائلی ایام کے جنین کی ہیٔت اور احساس مینڈک کے جنین سے زیادہ نہیں ہوتی ۔ اس کے برعکس ایک ڈاکٹر بالغ ہوش مند ہستی ہوتا ہے جس سے امیدیں، محبتیں، خواہشات، خوف، انسانی معلومات کے ذخیرے، اور گہرے جذبات محسوس کرنے کی قابلیت منسلک ہوتی ہے اور جو اپنے پیچھے بیوہ، یتیم بچّے، اور پیار کرنے والے بوڑھے ماں باپ چھوڑ جاتا ہے۔

پال ہل کی حرکت نے ایسے لوگوں پر تکلیف کے حقیقی، گہرے اور دیر پا اثرات چھوڑے جن کے اعصابی نظام تکلیف محسوس کرنے کے قابل بھی تھے۔ جس ڈاکٹر کو اس نے قتل کیا اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ اوائلی جنین جن کے اعصابی نظام ابھی تک تیار نہیں ہوئے ہوتے اس قسم کی جسمانی یا ذہنی تکلیف کا احساس نہیں کر سکتے۔ اگرچہ ہر قسم کی تکلیف قابل مذّمت ہے، اگر بعد کے کسی درجے کے جنین کو اسقاط حمل کے دوران تکلیف پہنچی بھی ہو تو وہ تکلیف اس نوعیت کی نہیں ہو سکتی جو انسانوں کو ہوتی ہے، کیونکہ جنین ابھی انسان کی تعریف پر پورا نہیں اترا ہوتا ہے۔ ہمارے پاس یہ تصوّر کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ انسانی جنین کسی گائے یا بکری کے جنین کے مقابلے میں مساوی ارتقائی مرحلے میں زیادہ تکلیف محسوس کر سکتا ہو گا۔ اور ہمارے پاس یہ فرض کرنے کی بے شمار وجوہات موجود ہیں کہ تمام جنین، چاہے وہ انسانی ہوں یا حیوانی، ذبح خانے میں ذبح کی جانے والی گائے اور بکریوں سے کم ہی تکلیف سے گزرتے ہیں، خاص طور سے ان رسمی ذبح خانوں میں جہاں جانور کے گلے پر رسمی انداز سے چھری پھیرنے کے موقع پر اس کا ہوش میں ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

تکلیف کی پیمائش ایک مشکل کام ہے[۲۲]، اور تفصیلات متنازع ہیں۔ لیکن میرے مرکزی نقطے پر، جو کہ لادینی نتیجہ پسندی کے فلسفے اور مذہبی مطلق

العنان اخلاقیات کے فلسفے کے درمیان فرق بیان کرنے سے متعلقہ ہے، اس بات سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ ایک مکتبۂ فکر اس مسئلے کے بارے میں سوچتا ہے کہ جنین تکلیف محسوس کر سکتا ہے یا نہیں، جبکہ دوسرا اس امر کو لے کر پریشان ہے کہ جنین انسان ہے یا نہیں۔ مذہبی عالم اخلاقیات ایسے سوال کرتے ہیں کہ 'ترقی کے مراحل سے گزرتے ہوئے، جنین کس مرحلے پر ایک شخص بن جاتا ہے ۔' لا دین عالم اخلاقیات کا یہ سوال پوچھنے کا امکان زیادہ ہے کہ 'ایک انسان قطع نظر اس سے کہ وہ انسان ہے یا نہیں (خلیوں کے ایک جھنڈ کے بارے میں ایسا کہنے کا مطلب بھی آخر کیا ہے؟)؛ جنین کس مرحلے پر تکلیف کا احساس کرنے کے قابل ہو جاتا ہے؟

## بیٹھوون کا مغالطۂ عظیم

### The Great Beethoven Fallacy

الفاظ کی اس شطرنج بازی میں اسقاط حمل کے مخالفین کی اگلی چال کچھ اس طرح کھیلی جاتی ہے۔ مسئلہ یہ نہیں کہ جنین تکلیف محسوس کر سکتا ہے یا نہیں۔ مسئلہ تو اس کی فطری صلاحیت (potential) کے مستقبل کے امکانات کا ہے۔ اسقاط نے اس جنین کو مستقبل میں ایک بھرپور زندگی گزارنے کے موقعے سے محروم کر دیا ہے۔ اس خیال کو ایک فصیح و بلیغ دلیل میں سمویا گیا ہے جس پر لگائے جانے والے بے ایمانی کے الزام کے خلاف واحد ممکنہ دفاع اس دلیل کی انتہائی حماقت خیزی ہے۔ میں بیٹھوون سے منسلک عظیم مغالطے کا ذکر کر رہا ہوں، جو مختلف صورتوں میں موجود ہے۔ پیٹر اور جین میڈاوار نے The Life Science میں اسے نارمن سنجان سٹیواس (اب لارڈ سنجان) سے منسوب کیا ہے، جو برطانوی مقننہ کا رکن اور ایک اہم رومن کیتھولک پروہت ہے۔ اس کو اپنی بساط میں یہ موریس بیرنگ (۱۹۴۵ - ۱۸۷۴) سے ملی جو ایک نو ساختہ رومن کیتھولک اور جی کے چیسٹرٹن اور ہلیئر بیلاک جیسے عظیم رومن کیتھولک مصنفوں کا قریبی ساتھی تھا۔ اس نے اسے دو ڈاکٹروں کے درمیان ایک فرضی مکالمے کی صورت میں پیش کیا۔

> 'اسقاط حمل کے بارے میں میں آپ کے خیالات جاننا چاہتا ہوں۔ جنین کا باپ آتشک (syphilis) کا مریض تھا اور ماں تپ دق (tuberculosis) میں مبتلا تھی۔ اس جوڑے سے جو چار بچّے پیدا ہوئے ان میں سے پہلا اندھا تھا، دوسرا فوت ہو گیا، تیسرا گونگا بہرا تھا، اور چوتھا تپ دق کا مریض۔ آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے'؟
>
> 'میں اس حمل کو ضایع کر دیتا'۔
>
> 'تو پھر آپ نے بیٹھوون کو مار دیا ہوتا'۔

انٹرنیٹ زندگی کی حمایت کرنے والی ایسی کئی ویب سائٹ سے بھری پڑی ہے جہاں یہ احمقانہ قصّہ بار بار استعمال ہوتا ہے، جن میں بنیادی حقائق کو بڑی بے رحمی سے بدل دیا جاتا ہے۔ اسی قصّے کی ایک اور مثال ملاحظہ کیجئے۔ 'اگر آپ کسی حاملہ عورت کو جانتے ہیں جس کے آٹھ بچّے ہیں، جن میں سے تین بہرے ہیں، دو اندھے ہیں اور ایک ذہنی مریض ہے (کیونکہ ماں کو آتشک تھا)، تو کیا آپ اس عورت کو حمل گرانے کی تجویز دیں گے؟ تو پھر آپ نے بیٹھوون کو مار دیا ہو گا'[۱۲۳]۔ قصّے کی اس صورت میں جناب موسیقار کوولادت کی فہرست میں پانچویں سے نویں نمبر پر منتقل کر دیا، بہرے بچّوں کی تعداد کو بڑھا کر تین کر دیا اور اندھوں کو دو، اور آتشک کا مرض باپ کی بجائے ماں کو لگا دیا۔ میں نے کہانی کی مختلف صورتوں کی تلاش کرتے ہوئے جن تینتالیس ویب سائٹ کا مطالعہ کیا ان میں سے بیشتر نے کہانی کو موریس بیرنگ کی بجائے یو سی ایل ای میڈیکل سکول کے کسی پروفیسر ایل آر ایگنیو سے منسوب کیا تھا، جس نے مبینہ طور پر اپنے طلبہ کے سامنے یہ گومگو(dilemma) حالت پیش کی تھی، اور ان سے کہا تھا 'مبارک ہو! آپ نے بیٹھوون کو مار دیا'۔ ہم پروفیسر ایل آر ایگنیو کے وجود پر شک کرتے ہوئے اسے برّی الذمہ قرار دے سکتے ہیں ــ لیکن یہ کہانیاں کس کامیابی سے پھیلتی ہیں اس پر ہم حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میں یہ دریافت کرنے سے قاصر رہا کہ قصہ بیرنگ نے لکھا تھا یا اس سے پہلے سے رائج تھا۔

---

†††††††††††† اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ تمام امکانات صرف ہو چکے ہیں۔ امریکی عیسائیوں کی ایک بہت بڑی اکثریت اسقاط حمل کے بارے میں مطلق العنان زاویے کی حامل نہیں ہے اور اسقاط کے حقوق کے حق میں ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے. the Religious Coalition for Reproductive Choice, at www.rcrc.org/

سر پیٹر میڈاوار کو ۱۹۶۰ میں فیزیالوجی اور میڈیسن میں نوبل انعام ملا۔

کیونکہ ایجاد تو یہ یقیناً تھا۔ یہ کہانی مکمل جھوٹ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ لڈوگ فان بیتھوون اپنے والدین کا نہ تو پانچواں بچّا تھا اور نہ نوواں۔ وہ سب سے بڑا تھا – صحیح بات تو یہ ہو گی کہ وہ دوسرا بچّہ تھا، لیکن جیسا کہ اس دور کا معمول تھا، اس کا بڑا بھائی چند ماہ کہ عمر میں ہی فوت ہو گیا تھا اور جہاں تک ہماری معلومات ہیں نہ تو اندھا تھا، نہ گونگا نہ بہرا، اور نہ ہی ذہنی مریض۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا کہ اس کے والدین میں سے کوئی بھی آتشک کا مارا ہوا تھا، اگر چہ یہ سچ ہے کہ اس کی ماں آخر کار تپ دق کی وجہ سے ہی فوت ہوئی تھی، جو اس زمانے میں بہت عام تھی۔

در حقیقت یہ ایک مکمل ایجاد شدہ جھوٹی کہانی ہے جو ایسے لوگوں نے دانستہ طور پر پھیلائی ہے جن کو اس کی اشاعت سے فائدے کی امید ہو سکتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے جھوٹ ہونے یا نہ ہونے سے ہماری بحث کا کوئی تعلق نہیں۔ اگر یہ کہانی جھوٹ نہ بھی ہوتی، تو بھی اس سے اخذ کی گئی دلیل نہایت بھونڈی دلیل ہی ہوتی۔ پیٹر اور جین میڈاوار کو دلیل کے مغالطے کی نشاندہی کرنے کے لئے کہانی کے جھوٹ کو بے نقاب کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی: 'اس مکروہ دلیل کی منطق کا مغالطہ قاری کو دم بخود کر دیتا ہے؛ اگر یہاں یہ تجویز نہیں کیا جا رہا کہ آتشک میں مبتلا باپ اور تپ دق کی مریض ماں اور فن کے ماہر موسیقار کی پیدائش میں کوئی موجب رشتہ (causal connection) ممکن ہے، تو پھر اسقاط حمل کے نتیجے دنیا کا بیتھوون سے محروم ہو جانے کے امکانات اتنے ہی ہیں جتنے مباشرت سے پاکباز اجتناب میں ہے"[۲۴]۔ میڈاوار نے اس قصہ کی منطق کو جس معنی خیز اور حقارت بھرے انداز سے خارج کر دیا ہے اس کا جواب دینا مشکل ہے (ہم رولڈ ڈاہل کے سنجیدہ افسانوں میں سے ایک کا خاکہ مستعار لیتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ حمل نہ گرانے کے فیصلے کے ایک حسین اتفاق کے نتیجے میں ۱۸۸۸ میں دنیا کو ایڈولف ہٹلر نصیب ہوا)۔ لیکن بات سمجھنے کے لئے آپ کو تھوڑی بہت ذہانت یا شاید ایک مخصوص مذہبی پرورش سے آزادی ، تو یقیناً درکار ہے۔ کتاب کا یہ حصہ تحریر کرنے کے روز میں نے جن تینتالیس اسقاط مخالف ویب سائٹ کا مطالعہ کیا جہاں بیتھوون کی یہ فرضی کہانی شامل کی گئی تھی، ان میں سے کسی ایک نے بھی دلیل کے غیر منطقی ہونے کی نشاندہی نہیں کی۔ سب کی سب اس مغالطہ کا شکار ہو گئیں (اور میں از راہ گفتگو بتاتا چلوں کہ یہ تمام مذہبی ویب سائٹ تھیں) ۔ ان میں سے ایک نے تو میڈاوار کے احسان کا اعتراف بھی کیا۔ یہ لوگ اپنے عقیدے سے ہم مزاج اس مغالطے پر یقین کرنے کے لئے اتنے اتاولے تھے کہ وہ یہ بھی نہ سمجھ پائے کہ پیٹر اور جین میڈاوار نے اس قصے کو محض اس کی منطق کو غلط ثابت کرنے کے لئے استعمال کیا تھا۔

پیٹر اور جین میڈاوار نے درست نشاندہی کی تھی کہ "انسانی فطری صلاحیت – human potential" کی دلیل کا منطقی انجام تو یہ ہے کہ ہم جب بھی جنسی مباشرت کا موقعہ ضایع کرتے ہیں ہم کسی روح کو وجود کے تحفے سے محروم کر رہے ہیں۔ اس حماقت خیز منطق کے مطابق اولاد پیدا کرنے کے قابل کسی بھی شخص کا مباشرت سے انکار ایک "ممکنہ " بچّے کے قتل کے مترادف ہے! یہاں تک کہ عصمت دری کی کوشش کے خلاف مزاحمت کرنے کو بھی ایک ممکنہ بچّے کے قتل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے (اور، از راہ گفتگو، "زندگی" کے حق (pro life) میں محرّک لوگوں کی ایک کثیر تعداد ایسی بھی ہے جو ان عورتوں کو بھی اسقاط حمل کی سہولت فراہم نہیں ہونے دے گی جن کو وحشیانہ عصمت دری کا نشانہ بنایا گیا ہو)۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ بیتھوون والی دلیل نہایت کمزور منطق پر مبنی ہے۔ اس کی لاشعوری حماقت کو مونٹی پائیتھن کی فلم "زندگی کا مقصد – The Meaning of Life" (اگر آپ نے ابھی تک نہیں دیکھی تو ضرور دیکھ لیجئے) میں مائیکل پیلن کے گیت "ہر نطفہ مقدس ہے – Every sperm is sacred" کو بڑے خوبصورت انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ بیتھوون کا عظیم مغالطہ منطقی مشکلات کے اس انبار کا ایک مثالی نمونہ ہے جو ہمارے ذہنوں پر مذہبی مطلق العنانیت کی گرفت کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں۔

غور فرمایئے کہ "زندگی کے حق میں" کا حقیقی مطلب ہرگز یہ نہیں کہ یہ لوگ "زندگی" کے حق میں ہیں؛ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ صرف انسانی زندگی کے حق میں ہیں۔ جنس Homo Sapiens کے خلیات کو خصوصی حقوق تفویض کرنے کی حرکت کا عمل ارتقاء کی حقیقت کے ساتھ مصالحت ایک بہت مشکل کام ہے۔ بلاشبہ اس بات سے ان کثیر التعداد اسقاط مخالف لوگوں کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی جو یہ سمجھ ہی نہیں پاتے ہیں کہ ارتقاء واقعی ایک حقیقت ہے! لہٰذا میں یہاں مختصراً ان سائنس سے ناشناس اسقاط مخالف کارکنان کے فائدے کے لئے عمل ارتقاء کو بیان کرنے کی کوش کروں گا۔

ارتقاء کا نقطہ بہت سیدھا سادہ ہے۔ کسی جنین کے خلیوں کا "انسان پن – *humanness*" اس جنین کو کوئی حتمی غیر مسلسل اخلاقی رتبہ عطا نہیں کر سکتا۔ اور اس کی وجہ وہ ارتقائی تسلسل ہے جس میں ہم بن مانس اور، کچھ فاصلے پر، کرّہ ارض پر موجود ہر جاندار کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے ارتقائی تسلسل پر ایک درمیانی جنس کا تصوّر کیجئے؛ ہم اسے آسٹریلوپیتھکس افرینسس کا فرضی نام دے دیتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ یہ بچ گئی اور افریقہ کے کسی دور افتادہ جنگل میں دریافت ہوئی۔ کیا اس مخلوق کو انسانوں میں گنا جائے یا نہیں؟ مجھ جیسے نتیجہ پسند کی نظر میں یہ سوال کسی جواب کا مستحق ہی نہیں ہے، کیونکہ اس سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ ہمارے لئے یہی باعث حیرت و افتخار ہونا چاہئے کہ ہمیں ایک اور "لوسی" سے ملاقات کا موقع مل رہا ہے۔ نتیجہ پسند

کے مقابلے میں اگر مطلقیت پسند (absolutist) انسانوں کو صرف اس وجہ سے ایک منفرد اور خاص درجے سے نوازنا چاہتا ہے کیونکہ وہ انسان ہیں تو اس پر اس سوال کا جواب دینا لازم ہو جاتا ہے۔ اگر بحث اس حد تک بڑھ جاتی تو یہ بھی قابل قیاس ہے کہ ایسی عدالتیں بھی لگانی پڑتیں جو جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کے زمانے جیسا یہ فیصلے کرتیں کہ کوئی فرد "انسان" ہونے کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔

اگر آسٹریلوپتھکس کے معاملے میں ایک سیدھا جواب دینے کی کوشش کی بھی جائے، تو حیاتیاتی ارتقاء میں رچا بسا بتدریج تسلسل کا عنصر ہمیں یہی بتاتا ہے کہ کہیں ایک اور درمیانی جنس موجود ہو گی جو حیوان اور انسان کے درمیان 'سرحد' کے اتنے قریب ہو گی کہ اخلاقیات کے اصول مندمل ہو جائیں گے اور ان کی مطلقیت بے معنی ہو جائے گی۔ اس مسئلے کو زیادہ آسان الفاظ میں کچھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ 'عمل ارتقاء میں کوئی قدرتی سرحدیں نہیں ہوتیں'۔ ارتقائی تسلسل کے بہت سے درجے ناپید ہو جانے کی وجہ سے ہم سرحدوں کے معاملے میں کم بصری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہم چاہیں تو اس امر پر استدلال کر سکتے ہیں کہ انسانوں میں تکلیف کا احساس زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ یہ سچ بھی ہو سکتا ہے اور اس بنیاد پر ہمیں انسانوں کو مخصوص رتبہ بھی تفویض کرنا چاہئے۔ لیکن ارتقائی تسلسل ہمیں دکھاتا ہے کہ ارتقاء کے درجات کوئی حتمی امتیاز ہیں ہی نہیں۔ ارتقاء کی حقیقت مطلقیت پر مبنی اخلاقی امتیاز کو بے دردی سے مجروح کر دیتی ہے۔ شاید اس حقیقت کی تکلیف دہ آگاہی بھی تخلیق پسندوں کو ارتقاء کی مخالفت کے لئے محرّک کرتی ہو: انہیں اس نظریے کے اخلاقی نتائج سے خوف آتا ہے۔ ان کا ایسا سوچنا غلط ہے؛ بہر حال، یہ بڑی ہی عجیب بات ہے کہ حقیقی دنیا کے سچ کو صرف اس وجہ سے رد کر دیا جائے کہ اخلاقی طور پر کیا قابل قبول ہونا چاہئے۔

## عقائد کی 'اعتدال پسندی' کیسے جنونیت کو بڑھاوا دیتی ہے

**How 'Moderation' in Faith Fosters Fanaticism**

مطلقیت کے گھناؤنے رخ کی تمثیل میں میں نے اسقاط حمل کی کلینک کو بم سے اڑانے والے امریکی عیسائیوں اورناقابل بیان دردناک مظالم (خصوصاً عورتوں کے خلاف) ڈھانے والے افغان طالبان کا ذکر کیا تھا۔ میں ایران کے آیت اللہ اور سعودی عرب کے شہزادوں کا ذکر بھی کر سکتا تھا جن کے ملکوں میں عورتوں کو گاڑی تک چلانے کی اجازت نہیں اور جن کے لئے گھر سے کسی مرد کے بغیر (جو کہ ایک چھوٹا بچّہ بھی ہو سکتا ہے) نکلنے کی وجہ سے مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ جین گوڈون کی کتاب "عزت کی قیمت – The Price of Honour" میں سعودی عرب اور دیگر مذہبی ریاستوں میں عورتوں کی حالت سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ یوہان ہاری، جو انڈیپنڈنٹ اخبار کا سب سے زندہ دل کالم نگار ہے،اس نے ایک مقالہ لکھا جس کا عنوان ہی مضمون کے مطلب کو واضح کر دیتا ہے: "جہادیوں کو نیچا دکھانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ مسلمان عورتوں میں بغاوت کی آگ بھڑکا دی جائے[۳۵]"۔

یہ نظر عیسائیت کی طرف موڑتے ہوئے، میں امریکہ میں رہنے والے " سرمست" (rapture) عیسائیوں کا ذکر بھی کر سکتا تھا جن کا امریکہ کی مشرق وسطیٰ کی خارجہ حکمت عملی پر گہرا اثر و رسوخ اس انجیلی عقیدے پر مبنی ہے کہ اسرائیل کو فلسطین پر قبضہ کرنے کا حق خدا کی طرف سے دیا گیا ہے"[۳۶]۔ کچھ سرمست عیسائی تو اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں اور کھلم کھلا جوہری جنگ کے خواہاں ہیں کیونکہ وہ "معرکہ خیر و شر– Armageddon " کو جوہری جنگ سے تعبیر کرتے ہیں جو ان کی کتاب مکاشفہ (book of Revelation) کی نہایت عجیب و غریب لیکن مقبول عام تشریح کے مطابق عیسیٰ کی آمد ثانی (Second Coming) کو قریب لے آئے گی۔ میں سام ہیرس کی تنقید سے بہتر تبصرہ نہیں کر سکتا جو اس نے "عیسائی قوم کے نام خط – Letter to a Christian Nation" میں کی ہے:

> لہٰذا یہ کہنا مبالغہ آرائی نہیں ہو گی کہ اگر نیو یارک یکایک آگ کے گولے میں بدل جائے تو امریکی آبادی کا ایک بڑا حصہ جوہری دھماکہ کے بادلوں میں روشنی کی کرنیں دیکھ رہا ہو گا کیونکہ ان کو اس بادل سے یہ نوید مل رہی ہو گی کہ ان کی زندگی میں جو بہترین واقعہ پیش آنا ممکن ہے وہ پیش آیا چاہتا ہے: یعنی عیسیٰ کا نزول۔ یہ روز روشن کی طرح عیاں ہونا چاہئے کہ اس قسم کے عقائد ہمیں اپنے لئے ایک پائیدار مستقبل بنانے کی راہ میں رکاوٹ ہیں – سماجی، اقتصادی، ماحولیاتی، اور جغرافیائی طور پر اگر امریکہ کی حکومت کا کوئی اہم ادارہ یہ یقین کر لے کہ دنیا ختم ہونے والی ہے اور یہ اختتام بہت شاندار

اور پر جلال ہو گا، تو آپ اس کے نتائج کا تصوّر کر سکتے ہیں۔ اس حقیقت کو اس وجہ سے کہ امریکہ کی تقریباً آدھی آبادی اس عقیدے پر محض مذہبی بنیاد پر یقین رکھتی ہے ایک اخلاقی اور عقلی ناگہانی صورت حال تسلیم کیا جانا چاہئے۔

اس کے علاوہ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے مذہبی عقائد ان کو اخلاقی روح عصر کے روشن خیال اتفاق سے باہر کھڑا کر دیتے ہیں۔ یہ مذہبی مطلقیت کے سیاہ رخ کی نمائندگی کرتے ہیں اور عموماً انہیں انتہا پسند بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن باب کے اس حصے میں میرا اصل نقطہ یہ ہے کہ نیک اور معتدل مذہب بھی وہ ماحول ضرور مہیا کر دیتا ہے جس میں انتہا پسندی قدرتی طور پر پروان چڑھتی ہے۔

جولائی ۲۰۰۵ میں لندن کو خود کش حملوں کا نشانہ بنایا گیا: تین دھماکے لندن کے زیر زمین ریل کے نظام (subway) میں کئے گئے اور ایک بس میں۔ یہ حملے ۲۰۰۱ کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر والے حملوں جتنے مہلک یا غیر متوقع نہیں تھے (در حقیقت، تیار تو ہم اس وقت ہی سے ہو گئے تھے جب ٹونی بلئیر نے ہم سے پوچھے بغیر ہمارے ملک کو رضاکارانہ طور پر صدر بش کی عراق پر کشور کشائی میں حصہ دار بنا دیا تھا)، پھر بھی ان دھماکوں نے برطانیہ کو خوفزدہ کر دیا۔ اخبارات کے کالم ان محرّکات کی درد بھری تشخیص سے بھرے پڑے تھے جن کی بنا پر چار نوجوانوں نے اپنے آپ کو بموں سے اڑا دینے اور ساتھ میں کئی معصوم جانوں کو بھی ضایع کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ قاتل تو برطانوی شہری تھے، کرکٹ کے شائق تھے، تمیز دار تھے، بالکل اس طرح کے نوجوان جن کی صحبت سے آپ محظوظ ہو سکیں۔

تو پھر ان کرکٹ سے پیار کرنے والے نوجوانوں نے یہ حرکت کیوں کی؟ اپنے فلسطینی ہم عصروں، یا جاپان کے کامی کازی، یا سری لنکا کے تامل ٹائگرس کے برعکس، ان جیتے جاگتے بموں کو ایسی کوئی امید نہیں تھی کہ ان کی قربانی کے بعد ان کے خاندانوں کو معاشرے میں عزت و تکریم حاصل ہو گی، ان کی دیکھ بھال کی جائے گی یا انہیں شہداء کی پنشن ملے گی۔ بلکہ ان کے رشتہ داروں کو تو رو پوش تک ہونا پڑا۔ ایک آدمی نے تواس لاابالی پن کے نتیجے میں اپنی حاملہ بیوی کو بیوہ اور شیر خوار بچّے کو یتیم بھی کر چھوڑا۔ ان چار نوجوانوں کی یہ حرکت نہ صرف خود ان کے لئے بلکہ ان کے اپنے اور باقی مرنے والوں کے خاندانوں اور پورے برطانوی مسلم معاشرے کے لئے ایک تباہی ثابت ہوئی، جو اب ہر وقت ایک شدّت آمیز ردّ عمل کی زد میں رہتا ہے۔ بھلے مانس اور مہذب انسانوں کو اس قسم کی دیوانگی پر آمادہ کرنے کے لئے صرف مذہبی عقیدہ ہی ہے جو اتنی بھرپور تحریک مہیا کر سکتا ہے۔ ایک بار پھر سام ہیرس نے بڑے حساس اور صاف الفاظ میں اس مسئلے کو بیان کیا، اور اپنے مدعے کی وضاحت میں القاعدہ کے قائد اسامہ بن لادن کی مثال کو استعمال کیا (جس کا لندن کے حملوں سے کوئی تعلق نہیں)۔ کوئی بھی ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور اس میں موجود لوگوں کو یوں نیست و نابود کیوں کرنا چاہے گا۔ صرف بن لادن کو شر پسند کہہ کر ہم اتنے اہم سوال کو اس کے صحیح نام سے پکارنے کی ذمہ داری سے کترا رہے ہیں۔

> اس سوال کا جواب تو واضح ہے – اے کاش کہ خود بن لادن بھی بڑے صبر سے دنیا کے سامنے یہ جواب بار بار دہرا دیا کرتا۔ جواب یہ ہے کہ کیا بن لادن جیسے لوگ واقعی ان باتوں پر یقین رکھتے ہیں جن کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ وہ یقین رکھتے ہیں۔ وہ قرآن کے لغوی سچ پر یقین رکھتے ہیں۔ انیس تعلیم یافتہ متوسط درجے کے مردوں نے ہمارے ہزاروں ہمسایوں کو مارنے کے عوض اپنی دنیاوی زندگیوں کا سودا کیوں کر دیا؟ کیونکہ انہیں یقین تھا کہ ایسا کرنے کے فوراً بعد وہ سیدھے جنّت میں پہنچ جائیں گے۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ انسانی اعمال کی اتنی تسلّی بخش وضاحت میسّر آ سکے[۲۷]۔

معروف صحافی میورئل گرے نے ۲۴ جولائی ۲۰۰۵ کو جریدہ "ہیرالڈ" (گلاسگو) میں لندن کے حملوں کے بارے میں لکھتے ہوئے ایسا ہی نقطہ اٹھایاہے۔

> بدمعاشوں کی جوڑی (villainous duo) جارج بش اور ٹونی بلئیر سے لے کر برطانیہ کے مسلم علاقوں کی بے عملی تک ہم سب کو الزام دے رہے ہیں۔ لیکن آج سے پہلے اس سے زیادہ عیاں کبھی نہیں ہوا تھا کہ حقیقتاً صرف ایک ہی جگہ جہاں

سارا الزام ڈالا جاسکتا ہے، اور وہ کچھ یوں ہے۔ ان تمام مصائب، افراتفری، تشدد، دہشت گردی اور جہالت کی جڑ تو مذہب ہی ہے، اور اگر اتنی واضح حقیقت کو بیان کرنا مضحکہ خیز لگ رہا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ حکومت اور ذرائع ابلاغ بڑی محنت سے یہ تاثر دے رہے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔

ہمارے مغربی سیاستدان 'مذہب' کا نام استعمال کرنے سے کتراتے ہیں اور اس کی بجائے اپنی جدّوجہد کو "دہشت کے خلاف جنگ" کا نام دیتے ہیں، جیسے کہ دہشت کوئی روح یا طاقت ہو جو اپنے دماغ اور مرضی سے سب کچھ کر رہی ہو۔ یا وہ یہ دلیل دیتے رہے ہیں کہ دہشت گردوں کو کامل "شر" (pure "evil") سے تحریک حاصل ہوتی ہے۔ لیکن ان کو شر سے تحریک حاصل نہیں ہوتی۔ ہم ان کو کتنا بھی گمراہ سمجھ لیں، لیکن ان کے اعمال کے محرّکات بھی اسقاط کے ڈاکٹروں کے عیسائی قاتلوں کی طرح وہی باتیں ہیں جنہیں وہ راست بازی اور تقویٰ سمجھتے ہیں اور جن پر وہ وفاداری سے عمل کرتے ہیں۔ وہ نفسیاتی مریض بھی نہیں ہیں؛ وہ مذہبی مثالیت پسند (idealists) ہیں جو اپنی نظر میں بڑے منطقی ہیں۔ وہ اپنے اعمال کو اچھا سمجھتے ہیں لیکن کسی بگڑی ہوئی ذاتی ذہنی خصوصیت کی وجہ سے نہیں، اور نہ ہی اس وجہ سے کہ ان پر شیطان غالب آ جاتا ہے، بلکہ اس لئے کہ پیدائش سے موت تک ان کی پرورش کے دوران بغیر حیل و حجّت اپنے عقیدے پر قائم رہنے کی تربیت دی گئی ہے۔ سیم ہیرس ایک فلسطینی خود کش بمبار کے بارے میں اقتباس پیش کرتا ہے جو اپنی کوشش میں ناکام ہو گیا تھا وہ بتاتا ہے کہ فلسطینی اسرائیلیوں کو مارنے کی وجہ تھی 'شوق شہادت.... میں کسی بات کا بدلہ نہیں لینا چاہ رہا تھا؛ میں تو بس شہید ہونا چاہتا تھا'۔ ناصرہ حسن نے ایسے ہی ایک اور ناکام خود کش بمبار کا انٹرویو کیا جو جریدہ The New Yorker کی ۱۹ نومبر ۲۰۰۱ کی اشاعت میں چھاپا گیا۔ یہ ایک ۲۷سالہ نہایت تمیز دار فلسطینی نوجوان تھا جسے ہم یہاں 'س' کا نام دیں گے۔ 'س' کا یہ بیان جنّت کے بہلاوے کی خوبصورت شاعرانہ تصویر کھینچتا ہے جس کی تبلیغ آج کل کے اعتدال پسند مذہبی علماء اور معلم حضرات کرتے ہیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ اس بیان کو یہاں تفصیل سے شائع کرنا چاہئے:

'شہادت میں کیا کشش ہے'، میں نے سوال کیا۔

'روح کی طاقت ہمیں اوپر کی جانب کھینچتی ہے جبکہ مادّی اشیاء کی طاقت ہمیں نیچے کی طرف کھینچتی ہے'، اس نے جواب دیا۔ 'شہادت کے لئے تیار شخص مادی تناؤ سے آزاد ہو جاتا ہے۔ ہمارے منتظم نے پوچھا "اگر مشن ناکام ہو گیا تو پھر کیا ہو گا؟" ہم نے اس سے کہا "بہر حال رسول اللہ اور ان کے صحابہ سے تو ہماری ملاقات ہو جائے گی، انشاء اللہ"۔

'ہم اس احساس کی لہروں پر تیر رہے تھے کہ عنقریب ہمیں ابدیت حاصل ہو جائے گی۔ ہمیں کوئی شک یا شبہ نہیں تھا۔ ہم نے خدا کو حاضر و ناظر جان کر قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی کہ ہم ثابت قدم رہیں گے۔ اس قسم کو 'بیت الرضوان' کہتے ہیں، اور اسے جنّت کے اس باغ سے منسوب کیا جاتا ہے جہاں رسول اللہ اور شہداء رہیں گے۔ مجھے معلوم ہے جہاد کرنے کے اور بھی طریقے ہیں — لیکن یہ بہتر ہے، سب سے بہترین۔ شہادت کے تمام حملے، اگر اللہ کی راہ میں کئے جائیں، تو مچھر کے کاٹے سے بھی کم تکلیف دیتے ہیں'۔

'س' نے مجھے ایک ویڈیو بھی دکھائی جس میں حملے کی حتمی تیاریاں فلم بند کی گئی تھیں۔ اس فلم میں میں نے اسے اور دو اور نوجوانوں کو شان شہادت کے بارے میں رسمی سوال و جواب میں مصروف پایا....

سجدہ کے بعد تینوں نوجوان اور ان کا منتظم جلسے کی حالت میں بیٹھے اور قرآن پر ہاتھ رکھا۔ منتظم نے ان سے کہا: 'کیا تم تیّار ہو؟ کل تم جنّت میں ہو گے'[۱۲۸]۔

اگر میں 'س' کی جگہ ہوتا تو میں نے یقیناً منتظم سے کہا ہوتا 'اگر ایسا ہی ہے، تو تم ہی کیوں اپنی گردن قربانی کے لئے پیش نہیں کر دیتے؟ تم ہی کیوں خود کش حملے میں حصہ لے کے سیدھے جنّت میں نہیں چلے جاتے'؟ لیکن جو بات ہمارے لئے سمجھنی بہت مشکل ہے — اور میں اس بات کو دہرانا چاہتا ہوں

کیونکہ یہ بہت اہم ہے – کہ یہ لوگ جس بات کے بارے میں کہہ رہے ہیں کہ یہ اسے مانتے ہیں، یہ واقعی اسے مانتے ہیں۔ اس بحث سے اخذ کرنے والا پیغام یہ ہے کہ ہمیں الزام خود مذہب پر لگانا چاہیئے، مذہبی انتہا پسندی پر نہیں، جیسے کہ یہ محض حقیقی، مہذب مذہب کی کوئی بری طرح بگڑی ہوئی شکل ہو۔ والٹیئر نے دو صدیوں پہلے کیاہی خوب بات کہی تھی: 'جو آپ کو حماقتوں کا یقین دلا سکتا ہے وہ آپ سے مظالم بھی کروا سکتا ہے'۔ برٹرینڈ رسل نے اسی پیرائے میں یہ کہا: 'زیادہ تر لوگ سوچنے پر وفات پانے کو فوقیت دیں گے۔ اور وہ پا بھی جاتے ہیں'۔

جب تک ہم اس اصول کو مانتے رہیں گے کہ ہم پر مذہبی عقائد کا احترام محض اس لئے لازم ہے کہ وہ مذہبی عقائد ہیں، ہمارے لئے اسامہ بن لادن اور خود کش بمباروں کے عقائد کا احترام نہ کرنا بہت مشکل ہو گا۔ اس کا متبادل، جو اس قدر عیاں ہے کہ اس کے لئے کسی حوصلہ افزائی کی بھی ضرورت نہیں ہونی چاہیئے، یہ ہے کہ مذہبی عقائد کے اضطراری احترام کے اصول کو ترک کر دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ میں لوگوں کو صرف 'انتہاء پسندی' سے نہیں ہر طرح کی مذہبی عقیدت مندی سے خبردار کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہتا ہوں۔ 'اعتدال پسند' مذہب کی تعلیمات اگرچہ خود انتہاء پسند نہیں لیکن انتہاء پسندی کے لئے ایک کھلا دعوت نامہ ضرور ہیں۔

ایسا بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ صفت مذہب تک محدود نہیں۔ کیا ملک یا نسلی گروہ کے لئے جذبۂ حب الوطنی بھی اپنی مخصوص انتہا پسندی کی وجہ سے دنیا کو غیر محفوظ نہیں بنا دیتا ہے ؟ یقیناً، جیسے کہ جاپان کے کامی کازی یا سری لنکا کے تامل ٹائیگر۔ لیکن مذہبی عقائد میں استدلالی قیاس کی آواز کو خاموش کرانے کی قابلیت کا کوئی ثانی نہیں۔ مجھے شک ہے کہ اس کی اصل وجہ وہ گمراہ کن وعدہ ہے کہ موت کہانی کا اختتام نہیں، اور شہید کی جنّت تو خاص طور سے شاندار ہوتی ہے۔ لیکن کچھ حد تک اس بات کا بھی قصور ہے کہ مذہب قدرتی طور پر ہی سوال کرنے کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔

اسلام کی طرح عیسائیت بھی بچّوں کو یہی سکھاتی ہے کہ سوالات سے پاک ایمان ایک فضیلت اور نیکی ہے۔ آپ کو اپنے عقیدے کو ثابت کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اگر کوئی شخص اعلانیہ یہ کہتا ہے کہ فلاں بات اس کے عقائد کا حصہ ہے تو پھر باقی معاشرے پر، چاہے وہ اس کا ہم عقیدہ ہو یا کسی اور عقیدے سے تعلق رکھتا ہو یا کسی بھی عقیدے سے تعلق نہ رکھتا ہو، رواج کے مطابق یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ بغیر حیل و حجّت اس شخص کے عقیدے کا 'احترام' کرے؛ اس دن تک جب تک وہ عقیدہ کسی بھیانک قتل عام میں اپنے آپ کو ظاہر نہ کر لے، جیسے کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کا سانحہ یا لندن اور میڈرڈ کے بمبار حملے۔ مسلمان مذہبی پیشوا اور قائدین برادری (ویسے ان کو منتخب کون کرتا ہے؟) زور و شور سے ان حملہ آوروں کے اسلام کے دائرے سے خارج ہونے کا راگ الاپتے ہیں اور سمجھاتے پھرتے ہیں کہ انتہا پسندی "سچّے" عقائد کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ لیکن عقائد میں بگاڑ کیسے کیا جا سکتا ہے، جبکہ کسی منطقی جواز کی عدم موجودگی میں عقائد کے پاس ایسا کوئی قابل اثبات معیار ہی نہیں جسے بگاڑا جاسکے؟

دس برس پہلے ابن ورّاق نے اپنی شاندار کتاب "میں کیوں مسلمان نہیں ہوں – Why I'm not a Muslim" میں اسلام سے باخبر ایک عالم کے نقطۂ نظر سے ایسی ہی بات کی تھی۔ واقعی ورّاق کی کتاب کا متبادل نام "معتدل اسلام کی دیو کتھا– The Myth of Moderate Islam" بھی ہو سکتا تھا، اور جو سپیکٹیٹر (لندن) میں ۲۰ جولائی ۲۰۰۵ کو چھپنے والے ایک مقالے کا حقیقی نام بھی ہے، جسے "ادارۂ تحقیق برائے اسلام و عیسائیت – Institute for Study of Islam and Christianity" کے مدیر پیٹرک سکھدیو نے تحریر کیا ہے۔ 'مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت اپنی زندگی تشدد کے بغیر گزارتی ہے کیونکہ قرآن بھی "حسب ذائقہ" انتخاب کرنے کا ایک نسخہ ہے۔ اگر آپ امن کے خواہاں ہیں تو آپ کو امن پسند آیات مل جائیں گی۔ اگر آپ کو جنگ پسند ہے تو آپ کو لڑنے سے متعلق آیات بھی مل جائیں گی'۔

آگے چل کر سکھدیو یہ بھی واضح کرتا ہے کہ قرآن میں موجود تضادات سے نمٹنے کی غرض سے علماء اسلام نے ایک اصول تنسیخ تراش لیا ہے جس کے مطابق بعد میں نازل ہونے والی آیات کو پہلے اتری ہوئی آیات کی تنسیخ کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اب مشکل یہ ہے کہ زیادہ تر امن پسند آیات قرآن کے شروع کے مکّی دور میں اتاری گئی ہیں۔ جنگ کے حق میں زیادہ تر آیات مدنی دور میں ہجرت کے واقعے کے بعد نازل ہوئی ہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ

> 'اسلام امن کا دین ہے' کا منتر ۱۴۰۰سال پرانا ہو چکا ہے۔ اسلام صرف پہلے ۱۳ سال تک 'امن اور صرف امن' رہا.... آج کے انتہا پسند مسلمان کے لئے ، جیسے کہ قرون وسطٰی کے فقہاء جنہوں نے مستند اسلام کی داغ بیل ڈالی ، یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ 'اسلام جنگ و جدل' کا نام ہے۔ برطانیہ میں مقیم ' الغربہ' نام کا ایک انتہا پسند مسلم گروہ نے لندن کے خود

کش حملوں کے بعد یہ کہا 'جو مسلمان یہ کہتا ہے کہ تشدد اسلام کا حصہ نہیں وہ کافر ہے'۔ کافر جو خدا پر ایمان نہ رکھتاہو(اسے غیر مسلم بھی کہا جاتا ہے)،یہ اصطلاح دوسروں کے لئے اہانت کا باعث ہے....

کیا یہ ممکن ہے کہ جن نوجوانوں نے وہ خود کش حملے کئے نہ تو وہ برطانوی اسلامی معاشرے کی خارجی حدود پر تھے اور نہ ہی اپنے مذہب کی کسی انتہائی سنکی تشریح کے معتقد تھے، بلکہ وہ مسلم معاشرے کے مرکز سے تعلق رکھتے تھے اور اسلام کی مقبول عام تشریح سے ہی متاثر تھے؟

عمومی طور پر (اور اس کا عیسائیت پر بھی اتنا ہی اطلاق ہوتا ہے جتنا اسلام پر) فساد کی اصل جڑ یہ ہے کہ بچّوں کو یہ سکھایا جائے کہ ایمان اپنے آپ میں ایک نیکی ہے۔ ایمان ایک بدی ہے کیونکہ وہ نہ تو بحث کو برداشت کرتا ہے نہ کوئی توجیہ پیش کرتا ہے۔ دیگر اجزائے ترکیبی کی موجودگی میں، جن کی دستیابی کوئی مشکل کام نہیں، بچّوں کو یہ سکھانا کہ بلا حجّت ایمان ایک نیکی ہے ان کے ذہنوں کو مستقبل کے جہاد اور صلیبی جنگوں کے لئے ایک مہلک ہتھیار کے طور پر تیار کر دیتا ہے۔ شہید کا جنّت کے وعدے کی بنیاد پر موت کے خوف سے بے پروا ئی حقیقی ایمان والے ہتھیاروں کی فہرست میں تیر کمان، جنگی گھوڑے، ٹینک اور کلسٹر بم کے شانہ بہ شانہ بڑے اونچے مقام کے مستحق ہیں ۔ اگر بچّوں کو بلا حجّت ایمان کی اعلیٰ فضیلت سکھانے کی بجائے ان کو اپنے عقائد کے بارے میں سوال کرنے اور سوچنے کی قابلیت دی جائے تو اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ خود کش بمبار ناپید ہو جائیں گے۔ خود کش بمبار جو کرتے ہیں وہ اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں اپنے سکولوں میں سکھائی گئی باتوں پر کامل یقین ہے: کہ حقوق اللہ کی بجا آوری تمام ترجیحات پر حاوی ہے، اور اس کی خدمت میں شہادت نصیب ہونے کے نتیجے میں جنّت کے باغات انعام میں دیے جائیں گے۔ اور یہ سبق انہیں کسی انتہاء پسند جنونی نے نہیں پڑھایا بلکہ تہذیب یافتہ، نرم مزاج، عام مذہبی اساتذہ نے پڑھایا ہے، جو ان بچّوں کو مدرسوں میں قطار اندر قطار بٹھا کر طوطوں کی طرح اپنی مقدّس کتاب کے ہر لفظ کو زبانی یاد کرواتے ہیں۔ ایمان ایک بہت مہلک طاقت ہے، اور چھوٹے بچّوں کے معصوم ذہنوں میں اسے دانستہ یوں پیوست کرنا ایک گھناؤنا ظلم ہے۔ اگلے باب میں ہم اپنی توجہ بچپن، اور مذہب کے ہاتھوں بچپن کی بربادی کی طرف موڑیں گے۔

# باب ۹: بچپن، اذیت اور مذہب سے فرار

ہر گاؤں میں ایک شمع ہوتی ہے ــ یعنی معلم؛ اور ایک شمع بجھانے والا ــ یعنی پادری۔

(وکٹر ہیوگو)

میں انیسویں صدی کے اٹلی کے ایک قصے سے شروع کرتا ہوں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ اس افسوس ناک واقعے جیسا کوئی واقعہ آج کے دور میں بھی پیش آ سکتا ہے۔ لیکن یہ قصہ جن ذہنی رجحانات کی نشاندہی کرتا ہے وہ آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں، اگرچہ اب ان پر عمل درآمد نہیں ہوتا۔ انیسویں صدی کا یہ المناک واقعہ بچّوں کے تئیں مذہب کے رجحانات کو بے رحمی سے بے نقاب کرتا ہے۔

۱۸۵۸ میں کلیسائی پولیس نے بلوگنا میں رہائش پزیر ایک یہودی والدین کے چھ سالہ بچے ایڈگارڈو مورتارا کو کلیسائی محکمہ تفتیش (The Inquisition) کے حکم سے حراست میں لے لیا۔ ایڈگارڈو کو زبردستی اپنی روتی ہوئی ماں اور صدمے سے نڈھال باپ سے الگ کر کے Catechumens لے جایا گیا، جو روم میں یہودیوں اور مسلمانوں کو عیسائیت میں داخل کرنے کا سرکاری ادارہ تھا۔ مذہب کی اس تبدیلی کے بعد ایڈگارڈو کی پرورش رومن کیتھولک طرز پر کی گئی۔ پادری کی زیر نگرانی کی گئی چند قلیل المدّت ملاقاتوں کے علاوہ ایڈگارڈو اس کے بعد اپنے ماں باپ سے کبھی نہیں مل پایا۔ ڈیوڈ کرٹزر نے یہ کہانی اپنی شاندار کتاب "ایڈگارڈو مورتارا کا اغوا ــ The Kidnapping of Edgardo Mortara" میں بیان کی ہے۔

اس دور کے اٹلی میں ایڈگارڈو کی کہانی کسی بھی صورت غیر معمولی نہیں تھی، اور پادریوں کے ہاتھوں ان اغوا کے واقعات کی ہمیشہ ایک وجہ ہی بتائی جاتی تھی۔ ہر واقعہ میں بچّے کو پہلے کسی موقعہ پر خفیہ طور پر عیسائیت میں شمولیت کی رسمیں (baptism) مکمل کر کے عیسائی بنا دیا گیا تھا ــ عموماً یہ کارنامہ اس کی اپنی کیتھولک آیا کا سرانجام دیا ہوا ہوتا تھا اور محکمۂ تفتیش کو کچھ عرصے بعد اس کی خبر لگتی تھی۔ رومن کیتھولک نظامِ عقائد کا ایک مرکزی جزو یہ بھی تھا کہ اگر کوئی بچّہ داخلِ مذہب کر دیا گیا ہے ــ خواہ کتنے ہی غیر سرکاری اور پر اسرار انداز سے کیا گیا ہو ــ تو وہ ناقابلِ تنسیخ طور پر ایک عیسائی میں تبدیل ہو گیا ہے۔ ان کی خیالی دنیا میں ایک "عیسائی" بچّے کا اس کے یہودی والدین کے ساتھ رہنا ممکن نہیں، اور عالمگیر غم و غصّے کی موجودگی میں بھی وہ اس ظالمانہ موقف پر نہایت ڈھٹائی اور ثابت قدمی سے برقرار رہے، اگرچہ بہت خلوص کے ساتھ.... کیتھولک اخبار "سویلتا کیتولکا ــ Civilta Cattolica" نے اس عامی اظہار غم کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا کہ یہ محض امیر یہودیوں کی بین الاقوامی طاقت کا مظاہرہ تھا ــ یہ طعنہ کچھ جانا پہچانا سا نہیں لگتا؟

تشہیر کے علاوہ ایڈگارڈو مورتارا کی تاریخ اس قسم کے کئی واقعات کا ایک نمونہ ہی تھی۔ کبھی بچپن میں چودہ سالہ آنا موریسی نامی ایک ان پڑھ کیتھولک لڑکی نے اس کی دیکھ بھال کی تھی۔ ایڈگارڈو بیمار ہوا تو وہ گھبرا گئی کہ کہیں بیچارہ مر ہی نہ جائے۔ آنا کی پرورش اس کیتھولک تعلیم کے ساتھ ہوئی تھی کہ اگر کسی بچّے کی شمولیتِ مذہب کی رسومات ادا نہ کی گئی ہوں تو وہ موت کے بعد ہمیشہ ہمیش کے لئے جہنم کی آگ میں جلے گا۔ اس نے اپنی ایک کیتھولک پڑوسن سے رسومات سیکھی، گھر واپس گئی، بالٹی سے تھوڑا سا پانی ایڈگارڈو کے ماتھے پر چھڑکا اور کہا 'میں تمہیں باپ، بیٹے اور روح القدس کے نام پر عیسائیت میں داخل کرتی ہوں'، اور بس وہ شامل ہو گیا۔ اس لمحے سے ایڈگارڈو قانونی طور پر عیسائی بن چکا تھا۔ جب محکمہ تفتیش کے پادریوں کو کئی سال بعد اس واقعہ کا پتہ چلا تو ادارہ اپنی حرکات کے غمناک نتائج کی پروا کئے بغیر فوراً اور حتمی طور ہر حرکت میں آ گیا۔

حیرانی کی بات ہے کہ کیتھولک چرچ اس رسم کو ادا کرنے کی اجازت ہر کسی کو دیتا تھا (اور ہے) جس کے نتائج ایک پورے خاندان کے لئے اتنے دور رس ثابت ہو سکتے ہیں اور کوئی بھی شخص کسی کو بھی داخلِ عیسائیت کر سکتا ہے۔ رسم ادا کرنے والے کا پادری ہونا ضروری نہیں۔ بچّے، اس کے والدین، یا کسی اور کی اجازت کی ضرورت بھی درکار نہیں۔ کوئی کاغذی کاروائی بھی نہیں چاہئے اور نہ گواہان درکار ہیں۔ پانی کا چھڑکاؤ، کچھ الفاظ، ایک لاچار بچّہ، ایک توہم پرست اور ذہنی طور پر مفلوج آیا مل جائے تو کام چل جائے گا۔ در حقیقت ان میں سے آخری جزء ہی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اگر بچّہ بہت چھوٹا ہوا تو وہ کیا گواہی دے پائے گا۔ ایک امریکی دوست جس کی پرورش بحیثیت کیتھولک کے ہوئی تھی اس نے مجھے خط میں یہ لکھا: 'ہم اپنی گڑیا کو عیسائی بنایا کرتے تھے۔ مجھے یاد تو نہیں کہ ہم نے کبھی اپنے کسی پروٹسٹنٹ دوست کو عیسائی بنانے کی کوشش کی ہو، لیکن یقیناً ایسا ہوا ہو گا اور آج بھی ہوتا ہے۔ ہم اپنی گڑیا کو کیتھولک بناتے، انہیں گرجا گھر لے کر جاتے، انہیں مقدس عشائے ربّانی (Holy Communion) کھلاتے، وغیرہ وغیرہ۔ ہم اچھی کیتھولک مائیں بننے کی تیّاری میں تھے'۔

اگر انیسویں صدی کی لڑکیاں میری جدید دوست سے تھوڑی سی بھی مماثلت رکھتی تو یہ بڑی حیرانی کی بات ہے کہ ایڈگارڈو مورتارا جیسے واقعات مزید تعداد میں نہیں ہوتے۔ حقیقت پھر بھی یہ ہے کہ انیسویں صدی کے اٹلی میں ایسی کہانیوں کی تعداد خاصی زیادہ تھی، جو ہمیں یہ واضح سوال پوچھنے پر مجبور

کرتا ہے۔ پاپائی ریاستوں میں مقیم یہودی کیتھولک نوکر چاکر کیوں رکھتے تھے، جبکہ ایسا کرنے کے خوفناک خطرات ان کے سامنے تھے؟ آخر وہ یہودی نوکر رکھنے کی کوشش کیوں نہیں کر لیتے تھے؟ ایک بار پھر جواب کا عقل سے کوئی تعلق نہیں لیکن اس کے برعکس مذہب سے مکمل حد تک ہے۔ یہودیوں کو ایسے نوکر درکار تھے جن پر سبت کے روز کام کرنے کی ممانعت نہیں تھی۔ یہودی خادمہ پر مکمل بھروسہ کیا جاسکتا تھا کہ وہ آپ کی اولاد کو عیسائی بنا کر کسی روحانی یتیم خانے کی زینت نہیں بنا دے گی۔ لیکن وہ ہفتے کے روز گھر کو گرم رکھنے کے لئے نہ تو آگ دہکا سکتی تھی اور نہ گھر کی صفائی کر سکتی تھی۔ اس وجہ سے اس دور کے بولونیا کے زیادہ تر امیر یہودی خاندان عیسائی خادمائیں رکھتے تھے۔

اس کتاب میں میں نے دانستاً صلیبی جنگوں، جنوبی امریکہ کے ہسپانوی فاتحین (conquistadores) اور ہسپانوی کلیسائی محکمہ تفتیش (Spanish Inquisition) کے خوفناک واقعات کا ذکر کرنے سے اجتناب کیا ہے۔ ظالم اور شر انگیز لوگ ہر صدی میں ہر شعبے میں پائے جا سکتے ہیں۔ لیکن اطالوی محکمہ تفتیش سے متعلق یہ کہانی اور بچّوں کی طرف اس ادارے کا روّیہ مذہبی ذہنیت اور خصوصاً اس مذہبیت سے جنم لینے والی برائیوں سے پردہ اٹھانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اوّل تو مذہبی ذہنیت کا یہ غیر معمولی ادراک کہ پانی کے چھینٹے اور چند مختصر منتر ایک بچّے کی زندگی کو مکمل طور پر بدل سکتے ہیں، اور اس کو والدین کی اجازت، خود بچّے کی اجازت، بچّے کی خوشی اور نفسیاتی صحت پر — غرضیکہ ہر اس چیز پر جسے عقل سلیم اور انسانی جذبات اہمیت دے سکتی ہیں — پرفوقیت حاصل ہے۔ کارڈینل آنٹونیلی نے برطانوی پارلیمان کے پہلے یہودی رکن لائنل روتھ چائلڈ کو ایڈگارڈو کے اغوا کے احتجاج کے جواب میں اپنےایک خط میں محکمہ تفتیش کی اس خاصیت کے بارے میں وضاحت کی ہے۔ کارڈینل نے لکھا ہے کہ وہ مداخلت کرنے سے قاصر ہے اور مزید یہ بھی کہ 'یہاں اس امر کو سمجھنا بھی مناسب ہو گا کہ اگرچہ قدرت کی آواز اہم ہے، لیکن دین کی مقدّس ذمہ داریاں اس سے بھی زیادہ اہم ہیں'۔ لیجئے! اس طرح تو معاملہ ہی ختم ہو گیا۔

دوئم یہ غیر معمولی بات ہے کہ تمام پادری، کارڈینل، اور خود پاپائے اعظم بھی حقیقتاً یہ سمجھنے میں ناکام رہے کہ وہ بیچارے ایڈگارڈو مورتارا کے ساتھ کتنا بڑا ظلم کر رہے تھے۔ یہ ہماری سمجھ سے باہر ہے لیکن وہ اپنے عقیدے میں بڑے مخلص تھے کہ اس بچّے کو اپنے والدین سے محروم کر کے اور اسے عیسائی تربیت دے کر وہ اس کے ساتھ بھلائی کا کام کر رہے ہیں۔ وہ اس کی حفاظت کو ایک فریضہ سمجھ رہے تھے! امریکہ میں مورتارا کے مسئلے کو لے کر ایک کیتھولک اخبار نے پاپائے اعظم کے موقف کا دفاع کرتے ہوئے یہ توجیہہ پیش کی کہ ایک عیسائی حکومت کے لئے یہ ناممکن تھا کہ 'ایک عیسائی بچّے کی پرورش یہودی کے ہاتھوں ہونے دی جاتی'، اور مذہبی آزادی کے اصول کا واسطہ دیتے ہوئے یہ بھی کہا کہ 'یہ ایک بچّے کا حق ہے کہ وہ عیسائیت پر چل سکے اوراسے زبردستی یہودیت پر چلنے پر مجبور نہ کیا جائے.... کفر اور تعصب کی بے لگام جنونیت کے سامنے مقدس باپ کا بچّے کی حفاظت کی خاطر یوں ڈٹ جانا ایک شاندار اخلاقی منظر ہے جو دنیا نے بہت عرصے بعد ملاحظہ کیا ہے'۔ کیا 'زبردستی'، 'مجبور'، 'بے لگام'، 'جنونیت' اور 'تعصب' کی اصطلاحات کا اس سے زیادہ صریحاً غلط استعمال بھی ممکن ہے؟ اس کے باوجود تمام تر علامات یہی ہیں کہ پاپائے اعظم سے لے کر نیچے تک تمام کیتھولک عذر خواہ مخلصانہ طور پر یہ یقین رکھتے تھے کہ وہ جو کچھ بھی کر رہے تھے وہ صحیح تھا: اخلاقی لحاظ سے بھی صحیح اور بچّے کی بہتری کے لئے بھی صحیح۔ (قبول عام، اعتدال پسند) مذہب میں اتنی طاقت ہے کہ وہ آپ کی فیصلے کی صلاحیت کو توڑ مروڑ دیتا ہے اور اندرون کی قدرتی شرافت کو گمراہ کر دیتا ہے۔ کیتھولک چرچ کی ایڈگارڈو مورتارا کو یہودی خاندان سے بچانے کی فراخ دلانہ مہربانی کے بارے میں دنیا میں منفی تاثرات دیکھ کر اخبار Il Cattolico خاصا ششدر تھا:

> ہم میں سے جو بھی اس معاملے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتا ہے اور یہودیوں کی زندگی کا جائزہ لیتا ہے – سچے کلیسا کے بغیر، ایک بادشاہ کے بغیر، اور ایک ملک کے بغیر، بکھرے ہوئے لوگ جو دنیا میں جہاں بھی جائیں خارجی ہی کہلاتے ہیں، دنیا میں عیسیٰ کے قاتل ہونے کا بد نما داغ لئے ہوئے، بدنام و رسوا ..... فوراً سمجھ جائیگا کہ پاپائے اعظم اس مورتارا لڑکے کے لئے کتنا اہم دنیاوی فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔

سوئم وہ شوخ چشمی ہے جس کی بنیاد پر مذہبی لوگ بغیر کسی ثبوت کے جانتے ہیں کہ جس عقیدے میں ان کا جنم ہوا تھا وہی راست عقیدہ ہے اور باقی سب گمراہی کا نتیجہ ہیں یا صریحاً جھوٹ ہیں۔ مندرجہ بالا اقتباسات عیسائیوں میں اس رجحان کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ یہاں ان دونوں باتوں کو ایک جیسا سمجھنا شدید نا انصافی ہو گی لیکن اگر ایڈگارڈو کے والدین چاہتے تو ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اپنے بچّے کو واپس حاصل کر سکتے تھے؛ بس انہیں صرف اتنا کرنا تھا کہ وہ پادریوں کی درخواست پر عمل کرتے ہوئے رسومات شمولیت پوری کر کے عیسائیت میں داخل ہو جاتے۔ ایڈگارڈو کو تو پانی کے چھینٹے اور درجن بھر بے معنی الفاظ سے ہی

چرا لیا گیا تھا۔ مذہبی تلقین کے مارے ذہن کی حماقت خیزی دیکھئے کہ چند مزید چھینٹوں اور بڑبڑائے گئے الفاظ سے چوری واپس کی جاسکتی ہے۔ ہم میں سے کچھ کی نظر میں والدین کا انکار محض بچکانہ ضد تھی۔ دوسروں کے لئے ان کی اصول پسندی انہیں مذہبی شہدا کی طویل تاریخی فہرست میں شامل کر دیتی ہے۔

'اپنے دل کو تسلّی دیجئے رڈلی بابو، اور مرد بنیے! آج ہم خدا کی رضا سے انگلستان میں ایسی شمع روشن کریں گے جو مجھے یقین ہے کبھی بجھائی نہ جا سکے گی'۔ یقیناً ایسے بھی عظیم مقاصد ہیں جن کے لئے جان کا نذرانہ دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہمارے شہدا رڈلی، لیٹمر اور کرینمر نے "کیتھولک بڑے سرے کے عقیدے" کے حق میں اپنے "پروٹسٹنٹ چھوٹے سرے والے عقیدے" کو ترک کرنے کی بجائے آگ میں جل جانے کو ترجیح کیوں دی ــ آخر اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے کہ ابلا ہوا انڈا کس سرے سے توڑا جائے گا؟ مذہبی ذہن کی ہٹ دھرمی ــ یا ستائش، اگر آپ کا ایسا ماننا ہے ــ ثابت قدمی ایسی ہے کہ مورٹارا خاندان نے بھی شمولیت کی بے معنی رسومات سے میسر ہونے والے موقعے سے استفادہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کیا وہ اپنی انگلیاں ایک دوسرے کے اوپر چڑھا کر یا زیر لب "نہیں" کہہ کر رسومات مکمل نہیں کر سکتے تھے؟ نہیں، کیونکہ ان کی تربیت ایک (معتدل) مذہب میں ہوئی تھی لہٰذا وہ اس سارے احمقانہ کھیل کو بڑی سنجیدگی سے لے رہے تھے۔ جہاں تک میری بات ہے، تو مجھے تو صرف بے چارے ایڈگارڈو کا ہی خیال آتا ہے ــ جو ایک ایسی دنیا میں پیدا ہوا جس پر مذہبی ذہنیت غالب تھی، جو دو حریفوں کی لڑائی کے بیچ میں پھنسا ہوا تھا، جو ایک نیک نیت مگر انتہائی ظالم فیصلے کی وجہ سے تقریباً یتیمی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔

چہارم اپنے اصل موضوع کی جانب لوٹتے ہوئے کہ ایک چھ سال کے بچّے کے بارے میں یہ کہا بھی جا سکے کہ اس کا کوئی مذہب ہے، خواہ وہ عیسائیت ہو، یہودیت یا کچھ اور۔ دوسرے انداز سے کہئے تو یہ بڑا عجیب سا کہاں لگتا ہے کہ ایک ناسمجھ معصوم بچّے کو چند رسومات سے گزارنے سے ایک لمحے میں اس کا عقیدہ ایک مذہب سے دوسرے مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے ــ لیکن یہ اس سے بھی کم عجیب ہے کہ ایک چھوٹے سے بچّے پر کسی بھی مذہب کا رکن ہونے کا ٹھپّہ لگا دیا جائے۔ ایڈگارڈو کے لئے "اس" کے مذہب سے (وہ بھی اس عمر کا ہی نہیں تھا کہ مذہب کے بارے میں مدلّل رائے قائم کر سکے) زیادہ اہم اس کے والدین اور گھر والوں کا پیار اور نگہداشت تھی، جو اس سے برہمچاری (celibate) پادریوں نے چھین لی جن کے خوفناک ظلم کے لئے واحد رعایت یہ دی جاسکتی ہے کہ وہ تمام انسانیت کی ہی جانب بے حسی کا رویہ رکھتے ہیں، ایک ایسی بے حسی جو کسی بھی ایسے ذہن پر بہت آسانی سے پیدا ہو سکتی ہے جو مذہب کے غلبے میں آ چکا ہو۔

اگر بچّے کا جسمانی اغوا نہ بھی کیا جائے تو کیا یہ بچّے کے ساتھ ظلم نہیں ہے کہ انہیں ان عقائد کا علمبردار قرار دے دیا جائے جن کے بارے میں سوچنے کی ان کی ابھی عمر ہی نہیں ہوئی؟ اس کے باوجود، یہ کام آج بھی بلا کسی روک ٹوک کے بھرپور طریقے سے جاری و ساری ہے۔ اس باب کا مقصد اس رواج پر سوال اٹھانا ہے۔

## جسمانی و ذہنی اذیت

## Physical and Mental Abuse

آجکل پادریوں کے ہاتھوں بچّوں کے ساتھ استحصال کا مطلب جسمانی استحصال سمجھا جاتا ہے، اور مجھے لگتا ہے کہ مجھے شروع میں ہی اس جسمانی استحصال کے سارے مسئلے پر صحیح سیاق و سبق میں بات کر کے بحث مکمل کر دینی چاہئے۔ بہت سے لوگ ایسا محسوس کرتے ہیں کہ یہ مسئلہ اس وقت معاشرے میں ہیجان کا باعث بنا ہوا ہے، اور ویسی ہی بلوائی نفسیات پر مشتمل ہے جو ۱۶۹۲ میں نام نہاد جادوگرنیوں پر چلائے گئے من گھڑت مقدموں کی یاد دلاتی ہے۔ "نیوز آف دی ورلڈ" ــ جو آجکل برطانیہ میں سخت مقابلے کے باوجود ملک کا سب سے غلیظ اخبار تصوّر کیا جاتا ہے ــ اس نے جولائی ۲۰۰۰ میں ایک "نام بتاؤ شرم دلاؤ" مہم شروع کی؛ بس اتنی سی کسر باقی رہی کہ اخبار نے خود ساختہ محافظانِ امن (vigilantes) کو بچّوں کا استحصال کرنے والے ملزموں کے ساتھ براہ راست شدّت آمیز سلوک کرنے پر نہیں اکسایا۔ بچّوں کے ایک ڈاکٹر (pediatrician) کے گھر پر اس لئے دھاوا بول دیا گیا کیونکہ جاہل بلوائیوں کو اس کے پیشے اور بچّوں کے ساتھ جنسی زیادتی کے مرتکب (pedophile) میں فرق معلوم نہیں تھا۔ جنسی زیادتی کے مجرموں کے بارے میں معاشرے میں ہیجان وبا کی طرح پھیلا ہوا ہے اور والدین دہشت زدہ محسوس کر رہے ہیں۔ آج کے جسٹ ولیمز (Just Williams)، ھک فن (Huck Finn)، سوالو اور امیزان (Swallows and Amazons) اس آزادی سے گھوم پھر نہیں سکتے جو گزرے وقتوں میں بچپن کے لطف کا حصہ ہوا کرتی تھی (جب کہ زیادتی کا نشانہ بننے کا خطرہ آج سے کچھ کم نہیں تھا)۔

ان دنوں سسیکس (Sussex) میں ایک آٹھ سالہ بچّی کے اغوا، جنسی زیادتی اور قتل کی خبروں کی وجہ سے جذبات عروج پر تھے؛ لہٰذا "نیوز آف دی ورلڈ" کے ساتھ انصاف کریں تو یہ ماننا پڑے گا کہ اس کی مہم ماحول کے ساتھ مناسبت رکھتی تھی۔ اس کے باوجود ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ یہ نا

انصافی ہے کہ بچّوں کے ساتھ جنسی زیادتی کے تمام مجرموں کے ساتھ وہی رویہ رکھاجائے جودر حقیقت صرف اس محدود اقلیت کے لئے مختص ہے جو قاتل بھی ہیں۔ میں نے جن تین بورڈنگ سکولوں میں پڑھا وہاں ایسے اساتذہ موجود ہیں جن کا چھوٹے چھوٹے لڑکوں کی طرف التفات تہذیب و مناسبت کی حدود پھلانگتے تھے۔ ان کے حرکات یقینی طور پر قابل مذّمت تھے۔ اس کے باوجود اگر آج پچاس سال بعد خود ساختہ محافظان امن ان کو عام قاتلوں کی طرح اپنی کاروائیوں کا نشانہ بنا رہے ہوتے تو میں ان کا دفاع کرنے پر مجبور ہو جاتا، اگرچہ میں خود بھی ان کے ظلم کا شکار رہ چکا ہوں (جو ویسے تو ایک شرمناک تجربہ رہا لیکن مجھے نقصان نہیں پہنچا سکا)۔

رومن کیتھولک چرچ نے گزشتہ ادوار سے منسلک اس ذلّت و رسوائی کا بہت بھاری بوجھ اٹھایا ہے۔ مجھے بہت سی وجوہات کی بنا پر رومن کیتھولک چرچ سے نفرت ہے۔ لیکن مجھے نا انصافی سے اس سے بھی زیادہ نفرت ہے، اور میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ پاتا کہ کہیں اس ادارے کو اس موضوع پر خصوصاً امریکہ اور آئیرلینڈ میں، ضرورت سے زیادہ شیطانی صفات سے تو نہیں نوازا گیا۔ شاید اس اضافی عوامی آزردگی کی کچھ وجہ ان پادریوں کا دوغلہ پن بھی ہے، جن کا پیشہ ہی لوگوں میں "گناہ" سے منسلک احساس جرم کو اکساتے رہنے پر مبنی ہے۔ اس پہ طرہ یہ کہ اس اعتماد کو بھی شدید ٹھیس پہنچتی ہے جو ان کو ان کے اس رتبے کی بدولت میسّر ہوتا ہے جسے عزت بخشنے کی تربیت بچّے کو پالنے میں ہی ملنی شروع ہو جاتی ہے۔ اس اضافی آزردگی کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمیں اپنے فیصلوں میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہئے۔ ہمیں دماغ کی جھوٹی یاداشتیں گڑھنے کی باکمال مہارت سے بھی ہوشیار رہنا چاہئے، خاص کر جب بے ایمان نفسیاتی معالج اور کرائے کے وکیل ان کو اپنے مفادات کی خاطر اکسا رہے ہوں۔ ماہر نفسیات الزبتھ لوفٹس نے کینہ پرور ذاتی مفادات کی مخالفت کے باوجود بڑی ہمّت دکھاتے ہوئے یہ کامیاب مظاہرہ کیا کہ لوگوں کے ذہنوں میں ایسی یاداشت پیدا کرنا کس قدر آسان کام ہے جو صریحاً جھوٹی ہیں لیکن جن کے ذہنوں میں متعارف کی گئی ہیں ان کو بلکل سچّی یاداشتوں کی طرح حقیقت پر مبنی لگتی ہیں[۲۹]۔ یہ اس قدر غیر متوقع ہوتا ہے کہ اکثر پنچایت (jury) اس مخلص مگر جھوٹی شہادت کے جھانسے میں آ جاتی ہے۔

خصوصاً آئیرلینڈ کے سلسلے میں یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ملک کی مردانہ آبادی کے ایک کثیر حصے کی تعلیم کے ذمہ دار عیسائی برادران[۱۳۰] (Christian Brothers) کی بربریت افسانوی درجے کی ہے۔ اور ایسی ہی بات لڑکیوں کے ان سکولوں کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے جنہیں آئیرلینڈ کی سادیتی حد تک ظالمانہ راہبائیں (sadistically cruel nuns) چلاتی ہیں۔ بدنام زمانہ میگڈالین دارالامان (Magdalene Asylums) جو پیٹر ملن کی فلم The Magdalene Sisters کا موضوع تھا ۱۹۹۶ تک کام کر رہا تھا۔ آج چالیس سال بعد جنسی لذّت کی نیت سے چھونے کے جرم کے مقابلے میں زد و کوب کئے جانے پر انصاف ملنا زیادہ مشکل ہے، اور ایسے وکیلوں کی کمی نہیں جو اپنا دھندہ چمکانے کی غرض سے ان جنسی زیادتیوں کے شکار لوگوں کے تعقب میں رہتے ہیں اور انہیں اپنے ماضی کو کریدنے پر مجبور کرتے ہیں۔ گرجہ گھر کے لباس خانوں میں گھبرائے ہوئے چھوا چھوئی کے کھیلوں کی ان بھولی بسری یادوں میں وکیلوں کے لئے خزانہ دفن ہے۔ کچھ واقعات تو واقعی اتنے پرانے ہوتے ہیں کہ مبیّنہ مجرم کو فوت ہوئے بھی کئی برس بیت چکے ہوتے ہیں اور وہ مقدمے میں اپنا دفاع کرنے نہیں آ سکتا۔ کیتھولک چرچ نے مقدمے خارج کروانے کے لئے مدعین کو قریب ایک ارب ڈالر دیے ہیں[۱۳۱]۔ آپ کو ان پر ترس بھی آ سکتا ہے، لیکن جب آپ کو یاد آ جائے گا کہ یہ پیسہ اصل میں آیا کہاں سے تھا تو آپ کے ترس کے جذبات غارت ہو جائیں گے۔

ایک بار ڈبلن میں اپنی تقریر کے بعد وقفہ سوالات کے دوران مجھ سے پوچھا گیا کہ میں آئیرلینڈ میں کیتھولک پادریوں کے ہاتھوں لڑکوں کی عصمت دری کے واقعات کے بارے میں کیا موقف رکھتا ہوں۔ میں نے جواب دیا کہ اگرچہ یہ واقعات شدید مذمت کے قابل ہیں، لیکن ان سے ہونے والا نقصان اس دور رس نفسیاتی نقصان سے کہیں کم ہے جو بچّے کو اس کی کیتھولک تربیت کے نتیجے میں پہنچتا ہے۔ یہ اس لمحے کی جذباتیت میں بر وقت گڑھا گیا ایک جواب تھا اور آئیرش مجمع (جو اعتزافاً آئیرلینڈ کے دانشوروں پر مشتمل تھا اور عوام کا نمائندہ نہیں تھا) کی پر تپاک اور والہانہ داد پر مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ مجھے اس واقعے کی یاد اس وقت آئی جب مجھے ایک چالیس سالہ امریکی خاتون کا خط موصول ہوا جس کی تربیت رومن کیتھولک انداز میں ہوئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ سات سال کی عمر میں اس کے ساتھ دو ناخوشگوار واقعات پیش آئے تھے۔ اس کے علاقے کے پادری نے اپنی گاڑی میں اس کے ساتھ جنسی دست درازی کی تھی۔ اور انہی دنوں اس کی ایک عزیز سہیلی کی موت واقع ہوئی اور وہ جہنم وارد ہو گئی کیونکہ وہ پروٹیسٹنٹ تھی۔ یا کم از کم اس کے والدین کے چرچ کے سرکاری نظریے کے مطابق اسے یہی بتایا گیا تھا۔ زمانہ بلوغت میں پہنچنے تک، بچّوں کے ساتھ رومن کیتھولک جسمانی اور ذہنی زیادتی کی ان دو مثالوں میں سے اسے دوسری کئی گنا زیادہ نقصان دہ لگنے لگی تھی۔ اس نے لکھا کہ

پادری کے ہاتھوں چھوئے جانے کے واقعے کا میرے ۷ سالہ ذہن پر بس "گندی حرکت" کا اثر رہا، لیکن میری سہیلی کے جہنم میں چلے جانے کا خیال مجھ میں بے پناہ، منجمد خوف پیدا کر دیتا۔ پادری کی غلیظ حرکت نے تو میری نیند حرام نہیں کی لیکن کئی بار پوری پوری رات میں خوف کے عالم میں یہ سوچ کر جاگتی رہی کہ جن لوگوں سے میں پیار کرتی ہوں وہ جہنم کی آگ میں جلیں گے، مجھے ایسے ڈراونے خواب آتے رہے۔

ہم یہ مان لیتے ہیں کہ گاڑی میں پادری کے ہاتھوں کی گئی دست درازی اس تکلیف اور ذلّت کے مقابلے میں بہت معمولی لگتی ہے جس سے کسی اغلام کے شکار لڑکے کو گزرنا پڑتا ہو گا۔ اور آجکل تو کیتھولک چرچ جہنم کے بارے میں اتنا شور شرابہ بھی نہیں کرتا جتنا کبھی کیا کرتا تھا۔ لیکن یہ مثال ہمیں یہ تو ضرور بتاتی ہے کہ اس بات کا قوی امکان رہتا ہے کہ نفسیاتی زیادتی کی تکلیف جسمانی زیادتی کی تکلیف سے کہیں زیادہ ہو سکتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ الفرڈ ہچکاک جو فلموں کے ذریعے لوگوں کو خوف میں مبتلا کر دینے کے فن کا ماہر تھا، ایک مرتبہ سوئٹزرلینڈ میں کہیں گاڑی چلا رہا تھا کہ یکایک گاڑی کی کھڑکی سے باہر اشارہ کرتے ہوئے بولا: 'اس سے زیادہ خوفناک منظر میں نے آج تک نہیں دیکھا'۔ وہاں ایک پادری کھڑا ایک بچّے سے بات کر رہا تھا اور اس کا ہاتھ بچّے کے کاندھے پر تھا۔ ہچکاک نے کھڑکی سے سر باہر نکالا اور اونچی آواز میں چلّایا: "بھاگ! بھاگ بچّے۔ اپنی جان کی خاطر بھاگ!"

'چھڑی اور پتھر بھلے ہی میری ہڈیاں توڑ دیں، لیکن الفاظ مجھے کبھی تکلیف نہیں دے سکتے'۔ یہ کہاوت اس وقت تک سچ رہ سکتی ہے جب تک آپ ان الفاظ پر ایمان نہیں رکھتے۔ لیکن اگر آپ کی ساری تربیت، والدین، اساتذہ اور پادریوں کی بتائی گئی ساری باتیں بلکل اور مکمل طور پر اس بات پر ایمان لانے ، بھرپور ایمان لانے پر آمادہ کرتی ہیں کہ گناہ گار آگ میں جلیں گے (یا کسی دوسرے نفرت انگیز نظریے پر جیسے کہ عورت اپنے خاوند کی ملکیت ہے وغیرہ) تو یہ بالکل ممکن ہے کہ الفاظ سے پہنچنے والا نقصان افعال کے نقصان سے زیادہ گہرا اور دور رس ہو گا۔ مجھے اکثر باور کرایا جاتا ہے کہ جب "بچّوں کے ساتھ بد سلوکی" کی اصطلاح کو ان اثرات کے بیان کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو اساتذہ اور پادری بچّوں کے ذہنوں پر مرتّب کرتے ہیں جب وہ ایک ابدی جہنم میں دنیاوی گناہوں کی پاداش میں جلائے جانے کی سزا پر ایمان لانے کی ترغیب دیتے ہیں، تو اس اصطلاح میں کوئی مبالغہ نظر نہیں آتا۔

ٹیلیویژن پر چلائی جانے والی دستاویزی فلم "تمام برائیوں کی جڑ — The Root of All Evil" میں میں نے بہت سے مذہبی قائدین کے انٹرویو کئے، اور مجھے اس بات پر تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا کہ میں نے صرف امریکی انتہا پسند لوگوں کا انتخاب کیا اوراسقف اعظم §§§§§§§§§§§§§ جیسے قابل عزّت لوگوں کو نظر انداز کر دیا۔ یہ تنقید سننے میں بجا بھی لگتی ہے، لیکن ۲۱ ویں صدی کے امریکہ میں جو باہر کی دنیا کو انتہا پسندی لگتی ہے وہ امریکہ میں مرکزی دھارے کی عکاسی کرتی ہے۔ انٹرویو دینے والا ایک شخص جس نے میرے برطانوی ناظرین کو سب سے زیادہ خوف زدہ کیا وہ کولوراڈو سپرنگز کا پادری ٹیڈ ہیگارٹ تھا۔ لیکن بش کے امریکہ میں انتہا پسند کہلایا جانا تو دور کی بات، وہ تو تبلیغی اجتماع کی ۳۰ میلین نفری پر مشتمل قومی انجمن (National Association of Evangelicals) کا صدر ہے، اور دعویٰ کرتا ہے کہ وہ ہر پیر کی صبح صدر بش سے فون پر بات کرتا ہے۔ اگر میں جدید امریکی معیار کے مطابق انتہا پسندوں کا انٹرویو کرنا چاہتا تو میں تنظیم تعمیر نوع (Reconstructionists) سے بات کرتا جن کا نظریہ دینی حاکمیت (Dominion Theology) امریکہ میں مذہبی حکومت قائم کرنے کے بارے میں کھلے عام پرچار کرتا ہے۔ ایک امریکی دوست نے مجھے پریشانی کے عالم میں لکھا:

> یورپی لوگوں کو یہ جاننے کی اشد ضرورت ہے کہ یہاں مذہبی عجائب کی ایک گشتی نمائش جاری ہے جو ملک میں صحیفۂ قدیم کے قوانین کو لاگو کرانے کی وکالت کرتی ہے — ہم جنس پرستوں کا قتل وغیرہ — اور سیاسی عہدے حاصل کرنے یا رائے دہی تک کے حقوق کو عیسائیوں تک محدود و محفوظ کرنا چاہتی ہے۔ درمیانے طبقے کے لوگ اس بیان بازی کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اگر لادینی گروہ چوکنے نہ ہوئے تو تعمیر نوع اور حاکمیت کے حامی واقعی ایک مذہبی امریکی ریاست کے مرکزی

§§§§§§§§§§§§§ کینٹربری کے لاٹ اسقف اعظم (archbishop)، ویسٹ منسٹر کے کارڈینل لاٹ اسقف اعظم، اور برطانیہ کے ربّی عظیم (chief rabbi) سب ہی کو انٹرویو کی دعوت دی تھی۔ سب نے دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا؛ یقیناً سب کے پاس ٹھوس وجوہات ہوں گی۔ صرف آکسفورڈ کے لاٹ پادری (bishop) نے دعوت قبول کی اور وہ اتنا ہی دلچسپ مہمان اور انتہا پسندی سے دور ثابت ہوا جتنا میرے خیال میں باقی بھی ہوں گے۔

دھارے میں نظر آئیں گے ***************۔

میں نے پادری کینان رابرٹس کا بھی انٹرویو لیا، جو ہیگارٹ کی طرح ریاست کولوراڈو سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ پادری رابرٹس کے مخصوص پاگل پن کے مظہر وہ "جہنم گھر — Hell Houses" ہیں جہاں والدین یا سکول کی انتظامیہ بچّوں کو موت کے بعد کے مناظر دکھا کر خوفزدہ کیا جاتا ہے۔ اداکار اسقاط حمل یا ہم جنس پرستی جیسے گناہوں کی وجہ سے ملنے والی سزاؤں کی منظر کشی کرتے ہیں، جن کے دوران لال پوشاک میں ملبوس ایک "شیطان" بار بار اپنی خوشی کا اظہار کرتا نظر آتا ہے۔ لیکن یہ مناظر سب سے بڑے تحفے کی طرف صرف اشارہ کرتے ہیں — خود جہنم، جس میں جلتے ہوئے گندھک کی گوگرد بھری بد بو ان کا استقبال کرتی ہیں اور ہمیشہ کے لئے آگ میں جلنے والوں کی دردناک چیخ وپکار ان بچّوں کے ہوش اڑا دیتی ہے۔

اصل تماشے کی تیاری کو دیکھنے کے بعد، جس میں شیطان وکٹورین زمانے کے بے حد جذباتی نوٹنکی باز انداز میں بھرپور "شیطانی" کر رہا تھا، میں نے اداکاروں کی موجودگی میں پادری رابرٹس کا انٹرویو لیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ کسی بچّے کے جہنم گھر کا دورہ کرنے کی بہترین عمر ۱۲ سال ہے۔ میں یہ سن کر کچھ بھونچکا سا رہ گیا، اور میں نے پادری سے پوچھا کہ اگر اسے یہ پتہ چلے کہ اس کا جہنم گھر دیکھنے کے بعد کسی بارہ سالہ بچّے کو خوفناک خواب آ رہے ہیں تو اس کا کیا رد عمل ہو گا۔ اس نے غالباً سچّائی سے مجھے یہ جواب دیا:

> میں تو یہ پسند کروں گا کہ یہ بچّے سمجھ سکیں کہ جہنم ایک ایسی جگہ ہے جہاں وہ قطعی جانا نہیں چاہیں گے۔ میری خواہش ہو گی کہ میں ان کو بارہ سال کی عمر میں ہی یہ پیغام پہنچا دوں، بہ نسبت اس کے کہ ان کو یہ پیغام مل ہی نہ سکے اور وہ عیسیٰ کی پناہ سے دور، گناہ گار کی زندگی گزارتے رہیں۔ اور اگر ان تجربات کے نتیجے میں ان کو ڈراونے خواب آتے بھی ہیں، تو میرے خیال میں ان کی زندگی میں آنے والی حتمی بہتری کے لئے چند ڈراونے خواب کی قیمت کچھ زیادہ نہیں۔

میرے خیال میں اگر آپ حقیقی معنوں میں ان سب باتوں میں یقین رکھتے ہیں جو پادری رابرٹس مانتا ہے تو آپ کو بھی لگے گا کہ بچّوں کو اس طرح ڈرانا بالکل صحیح ہے۔

ہم پادری رابرٹس کو نیم پاگل انتہا پسند کہہ کر ذمہ داری سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ ٹیڈ ہیگارٹ کی طرح وہ بھی اب امریکی معاشرے کے مرکزی دھارے کا حصہ ہے۔ اس کے با وجود مجھے حیرت ہی ہو گی اگر یہ دونوں اپنے ہم مذہب لوگوں کے اس عقائد کا ساتھ دیں کہ آتش فشاں کے دہانے سے جہنم رسیدہ روحوں کی چیخ و پکار کی آوازیں آتی ہیں[۳۲]، اور سمندروں کی اتھاہ گہرائیوں میں پائے جانے والے دیو قامت کیچوے مرقس ۹ (Mark) : ۴۳-۴۴ کی تکمیل ہیں: 'اور اگر تمہارا ہاتھ بھی تمہیں مجروح کرے تو اسے کاٹ پھینکو: تمہارے لئے بہتر ہے کہ تم زندگی میں ایک ہاتھ سے ہی رہو، بجائے اس کے کہ دو ہاتھوں سے جہنم میں چلے جاؤ، اس آگ میں جس کی بھوک کبھی نہیں مرتی: جہاں حشرات نہیں مرتے، اور جہاں آگ نہیں بجھتی'۔ یہ لوگ جہنم کے بارے میں جو بھی ایمان رکھتے ہوں، جہنم کی آگ کے یہ دیوانے دوسروں کی مصیبت پرخوشی میں شریک ہیں اور خاطر جمع رکھتے ہیں کہ وہ سب بخشے جانے والوں میں سے ہیں؛ اس جذبے کو دنیا کے سب سے بڑے عالم دین سینٹ تھامس ایکویناس نے Summa Theologica میں بہت عمدگی سے بیان کیا ہے: 'ولی لوگوں (saints) کو

*************** درج ذیل واقعہ اصل ہی لگتا ہے اگرچہ پہلے پہل مجھے لگا کہ یہ جریدہ Onion میں چھپنے والا ایک طنز آمیز مذاق ہے: www.talk۲action.org/story/۲۰۰۶/۵/۲۹/۱۹۵۸۵۵/۹۵۹.۔ یہ ایک کمپیوٹر گیم ہے جس کا نام ہے Left Behind: Eternal Forces یعنی "پیچھے رہ جانے والے: ابدی طاقتیں"۔ پی زی مائیرز اپنی عمدہ ویبسائٹ Pharyngula میں اس کا خلاصہ پیش کرتا ہے: 'تصوّر کیجئے! آپ ایک عسکری گروہ میں سپاہی ہیں، اور گروہ کا مقصد امریکہ کو عیسائی مذہبی حکومت کے طرز پر ڈھالنا اور زندگی کے ہر شعبے پر عیسیٰ کا راج قائم کرنا ہے.... آپ ایک مہم پر ہیں۔ ایک مذہبی مہم اور ایک سکری مہم۔ کیتھولک، یہودی، مسلمان، بدھ مت کے پیروکار، ہم جنس پرست، اور ہر ایسے شخص کو جو مذہب اور سیاست کی علیحدگی کی وکالت کرتا ہے، وہ یا تو مار دیا جائے یا اپنے مسلک میں شامل کر لیا جائے'۔ مزید دیکھئے http://scienceblogs.com/pharyngula/۲۰۰۶/۰۵/gta_meet_lbef.php؛ جائزے کے لئے دیکھئے

http://select.nytimes.com/gst/abstract.html?res=F۱۰۷۱FFD۳C۵۵۰C۷۱۸CDDAA۰۸۹۴DE۴۰۴۴۸۲

جہنم کی سزاؤں کا مشاہدہ کرنے کی خصوصی اجازت ہے تاکہ وہ برکات خدا کے فضل سے فیضیاب ہو سکیں'۔ کتنا اچھا آدمی ہے نا ۔

جہنم کی آگ کا خوف بہت سچّا ہو سکتا ہے، ان لوگوں کے لئے بھی جو دیگر معاملات میں منطقی نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ مذہب کے موضوع پر میری دستاویزی فلم کے بعد مجھے موصول ہونے والے بہت سے خطوط میں سے ایک یہ خط بھی شامل تھا جو ایک ذہین اور سچّی خاتون نے لکھا تھا:

> میں نے پانچ سال کی عمر سے کیتھولک سکول میں پڑھنا شروع کیا، اور سکول کی راہباؤں نے چھڑی، بید اور چمڑے کی پٹّی سے مجھے تبلیغ بھی کی۔ نوجوانی میں میں نے ڈارون کو بھی پڑھا، اور ارتقاء کے بارے میں اس کے خیالات نے میرے ذہن کے منطقی حصے پر گہرا اثر چھوڑا۔ اس کے باوجود، میں نے اپنی زندگی ذہنی تضاد اور جہنم کی آگ سے خوف کی حالت میں گزاری ہے، جو اکثر اوقات سر اٹھا لیتا ہے۔ میں نے نفسیاتی معالج سے علاج بھی کرایا ہے، جس سے مجھے اوائل عمری کی کچھ مشکلات پر قابو پانے میں مدد ملی ہے، لیکن میں اس گہرے خوف سے نمٹنے میں اب بھی ناکام ہوں۔
>
> لہٰذا آپ کو خط لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ میں آپ سے اس معالج کا پتہ پوچھنا چاہتی ہوں جس کا انٹرویو آپ نے اس ہفتے کی قسط میں لیا تھا، اور جو اس مخصوص خوف کا علاج کرتا ہے۔

مجھے آپ کا خط پڑھ کر بہت دکھ ہوا (اور ایک لمحہ کے لئے مجھے اس ذلیل خواہش کو لگام لگانا پڑا کہ ان راہباؤں کے لئے بھی کوئی جہنم ہوتا جہاں انہیں بھیجا جا سکتا)، اور میں نے خاتون کو جواب میں لکھا کہ اسے اس ادراک کی قابلیت پر انحصار کرنا چاہئے جس کی وہ — دیگر لوگوں کی مقابلے میں — حامل ہے۔ میں نے یہ بھی تجویز پیش کی کہ جہنم کا شدید گھناؤنا پن پادریوں اور راہباؤں نے اس کی غیر معقولیت کی تلافی کے لئے گڑھاہے۔ اگر جہنم معقول ہوتا تو اس کا تھوڑا سا خوفناک ہونا بھی بدی کو روکنے کے لئے کافی ہوتا۔ چونکہ ایسا ہونے کا امکان انتہائی قلیل ہے، اس کی غیر معقولیت کی نفی کرنے اور ممانعت کی تھوڑی بہت قابلیت برقرار رکھنے کے لئے اسے شدید حد تک خوفناک بنا کر پیش کرنا انتہائی ضروری ہے۔ میں نے اس خاتون کا نفسیاتی معالج جل مٹن سے بھی رابطہ کرا دیا، جو ایک خوش مزاج اور انتہائی مخلص خاتون ہے اور جس کا میں نے انٹرویو کیا تھا۔ جل خود بھی The Exclusive Brethren نامی ایک کراہت انگیز فرقہ میں پلی بڑھی تھی: اتنا نفرت انگیز فرقہ کہ www.peebs.net کے نام سے ایک ویبسائٹ ان لوگوں کی دیکھ بھال کے لئے مختص ہے جو اس فرقہ سے فرار ہونے میں کامیاب رہے۔

جل مٹن جہنم سے خائف رہنے کے ماحول میں بڑی ہوئی، بالغ ہوتے ہی عیسائیت سے فرار ہو گئی، اور اب ایسے لوگوں کا نفسیاتی علاج اور مدد کرتی ہے جن کے ذہنوں کو بچپن میں اسی طرح نقصان پہنچایا گیا ہے: 'اگر میں اپنے بچپن کو یاد کروں تو مجھے اس میں صرف خوف کا غلبہ نظر آتا ہے۔ اور جہاں حال میں مذمّت کا نشانہ بننے کا خوف تھا وہاں مستقبل میں ہمیشہ ہمیش کے لئے لعنتی گناہ گار قرار دیے جانے کا خوف بھی تھا۔ اور بچّے کے ذہن میں دہکتی آگ اور تکلیف میں پستے ہوئے دانتوں کے مناظر حقیقت اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ قطعاً تشابہات نہیں ہیں'۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ مجھے بتائے کہ بچپن میں اسے جہنم کے بارے میں کیا بتایا گیا تھا، اور اس کا جواب سن کر مجھے اتنا ہی دکھ ہوا جتنا اس کی ہچکچاہٹ کے دوران اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کو دیکھ کر ہوا تھا: 'کتنی عجیب بات ہے! اتنا وقت گزر جانے کے بعد بھی اس میں اتنی طاقت ہے.... مجھ پر اثر انداز ہونے کی.... جب آپ.... جب آپ مجھ سے یہ سوال کرتے ہیں۔ جہنم ایک خوفناک جگہ ہے۔ وہ خدا کی طرف سے مکمل طور پر مسترد کر دیے جانے کی حالت ہے۔ ایک حتمی فیصلہ ہے، اصلی آگ ہے، اصلی تکلیف ہے، اصلی تشدد ہے، اور یہ سب ایک لامتناہی سلسلے میں جاری رہتا ہے، لہٰذا اس سے کوئی چھٹکارا ممکن نہیں'۔

اس کے بعد اس نے مجھے اس باہمی حمایت کے گروہ کے بارے میں بتایا جسے وہ ان لوگوں کی مدد کے لئے چلاتی ہے جو اسی کے جیسے بچپن گزارنے

---

[++++++++++++++] اس کے ساتھ ہی این کولٹر کی دل موہ لینے والی عیسائی سخاوت ملاحظہ کریں: 'میں اپنے ہم مذہب لوگوں کے سامنے یہ بات رکھتی ہوں کہ کوئی ہے ان میں سے جو اس خیال سے خوش ہو کر ہنس نہیں پڑتا کہ رچرڈ ڈاکنز جہنم میں جلنے والا ہے؟' (کولٹر ۲۶۸: ۲۰۰۶)

کے باوجود بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے، اور مجھے تفصیل سے بتایا کہ زیادہ تر لوگوں کے لئے فرار کتنا کٹھن مرحلہ تھا: 'مذہب چھوڑنے کا عمل نہایت حیرت ناک حد تک مشکل ہوتا ہے۔ آپ اپنے سارے معاشرتی تعلقات اپنے پیچھے چھوڑ کر جا رہے ہیں، ایک پورا نظام حیات جس میں آپ کی نشو نما ہوئی ہے؛ آپ عقائد کا ایک نظام پیچھے چھوڑ کر جا رہے ہیں جسے آپ برسوں سے سینے سے لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ عموماً رشتہ داروں اور دوستوں کو بھی چھوڑنا پڑتا ہے.... اب آپ ان کے لئے حقیقت نہیں رکھتے'۔ یہاں میں نے ان خطوط کا ذکر چھیڑا جو مجھے امریکہ سے موصول ہوتے ہیں اور جن میں لوگ مجھے بتاتے ہیں کہ کیسے میری کتابیں پڑھنے کے نتیجے میں انہوں نے مذہب کو ترک کر دیا۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان میں سے اکثر اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ وہ اپنے رشتہ داروں کو بتانے کی ہمت نہیں رکھتے، یا جہاں کسی نے ایسی ہمت کی ہے تو انہیں سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ درج ذیل واقعہ ایک عام مثال ہے۔ خط لکھنے والا امریکہ میں مقیم طب کا ایک طالب علم ہے۔

> مجھے آپ سے خط و کتابت کرنے کی خواہش اس لئے ہوئی کیونکہ مذہب کے بارے میں میرے خیالات آپ سے ہم آہنگ ہیں، اور یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ امریکہ میں ایسے خیالات اکیلا کر دیتے ہیں۔ میں ایک عیسائی خاندان میں پلا بڑھا اور اگرچہ مذہب کا تصوّر میرے حلق سے اتر نہیں پاتا، مجھے کسی کے سامنے اس بات کا اعتراف کرنے کی ہمّت حال ہی میں ہوئی۔ وہ "کسی" میری اپنی محبوبہ تھی... جس پر دہشت سی طاری ہو گئی۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ لادینیت کا اعتراف حیران کن ہو سکتا ہے، لیکن اب تو ایسا لگتا ہے جیسے میں اس کے لئے کوئی اجنبی ہوں۔ وہ کہتی ہے کہ اب وہ مجھ پر اعتماد نہیں کر سکتی کیونکہ میری اخلاقیات مجھے خدا سے نہیں ملتیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ ہم اس مشکل رکاوٹ کو پار کر پائیں گے یا نہیں، اور میں مزید ایسے لوگوں پر جو مجھ سے قریب ہیں یا مجھے عزیز ہیں اپنے خیالات آشکار کرنے سے اس لئے نہیں جھجک رہا کہ مجھے نازیبہ رد عمل کا خطرہ ہے... بلکہ مجھے خطرہ ہے کہ کوئی رد عمل ہو گا ہی نہیں۔ میں نے آپ کو یہ خط صرف اس امید میں لکھا ہے کہ آپ میری مایوسی کو سمجھ سکیں اور اس میں شریک ہو سکیں۔ صرف مذہب کی وجہ سے کسی ایسے کو کھو دینے کا تصوّر کیجئے جسے آپ نے چاہا ہو اور جس نے آپ کو چاہا ہو۔ میرے بارے میں اس کے اس تاثر کے علاوہ کہ میں اب خدا سے عاری ایک کافر بن چکا ہوں، ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے انتہائی موزوں تھے۔ میری آپ بیتی مجھے آپ کے اس جملے کی یاد دلاتی ہے کہ لوگ عقیدے کے نام پر عجیب و غریب حرکات کر جاتے ہیں۔ میری بات سننے کا شکریہ۔

میں نے اس بد قسمت نوجوان کو جواب میں لکھا کہ جہاں اس کی محبوبہ نے اس کے بارے میں کچھ دریافت کیا تھا، خود اس نے بھی اپنی محبوبہ کی ذات کے بارے میں کچھ دریافت کر لیا تھا۔ کیا وہ واقعی اس کے لئے موزوں تھی؟ مجھے اس بات پر شک تھا۔

میں مذہب کو اس کے الزامات سے بری کرانے والی خصوصیات کی کھوج میں امریکی مزاحیہ اداکارہ جولیا سوینی کی ان تھک محنت اور اس کے بچپن کے خدا کو اس کی جوانی کے شکوک سے آزاد کروانے کی جد و جہد کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں۔ بلآخر اس کی کاوشیں ایک مثبت نتیجے پر اختتام پزیر ہوئیں اور آج جولیا نوجوان دہریوں کے لئے ایک قابل رشک مثال ہے۔ اس کی فلم "خدا کو چھوڑنا — Letting Go of God" کا انجام شاید سب سے جذباتی منظر ہے۔ وہ ہر طرح کی کوشش کر چکی تھی اور پھر...

> .... جیسے میں پائیں باغ میں اپنے دفتر سے نکل کر گھر کے پچھلے دروازے سے اندر داخل ہو رہی تھی، میں نے اپنے دماغ میں ایک ہلکی پھلکی آواز کی سرگوشیاں سنیں۔ مجھے نہیں معلوم یہ کتنے عرصے سے یہاں موجود تھیں، لیکن اس وقت وہ ایک درجہ اونچی ہو گئیں۔ انہوں نے کہا 'کوئی خدا نہیں ہے'۔
>
> میں نے انہیں نظر انداز کرنا چاہا۔ لیکن وہ تھوڑا اور اونچی ہو گئیں۔ 'خدا نہیں ہے۔ خدا نہیں ہے۔ اوہ خدایا! خدا <u>نہیں</u> ہے... '

میں کانپ اٹھی۔ مجھے لگا میں کشتی سے پانی میں گرنے والی ہوں۔

مجھے خیال آیا 'میں ایسا نہیں کر سکتی۔ مجھے نہیں لگتا کہ میں ایسا کر سکتی ہوں کہ خدا پر ایمان نہ رکھوں۔ مجھے خدا کی ضرورت ہے۔ دیکھو نا! ہماری بڑی پرانی رفاقت ہے... '

'مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ خدا پر کیسے ایمان نہ رکھوں۔ مجھے نہیں پتا یہ کیسے کیا جاتا ہے۔ صبح کیسے اٹھتے ہیں؛ سارا دن کیسے گزارتے ہیں'۔ مجھے لگا میرا توازن خراب ہو رہا ہے....

میں نے سوچا 'اچھا! رکو ذرا! تھوڑی دیر کے لئے خدا پر یقین نہ رکھنے والی عینک لگا کر دیکھتے ہیں۔ ایک لمحے کے لئے "خدا نہیں ہے" والی عینک پہنو، ادھر ادھر دنیا کو دیکھو، اور پھر جھٹ سے عینک اتار کر پھینک دو'۔ میں نے عینک پہنی اور اپنے اطراف دیکھنا شروع کیا۔

مجھے یہ بتاتے ہوئے بڑی شرمندگی ہو رہی ہے کہ پہلے پہل مجھے چکّر آتے محسوس ہوئے۔ مجھے واقعی یہ خیال آیا 'ارے! یہ ارض آسمان میں کیسے معلق ہے؟ تمہارا مطلب ہے ہم یونہی خلا میں لڑھکتے چلے جا رہے ہیں؟ یہ تو بہت غیر محفوظ حالات ہیں!' میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں بھاگ کر اس گرتے ہوئے ارض کو اپنے ہاتھوں میں تھام لوں۔

اور پھر مجھے یاد آیا 'ارے ہاں! کشش ثقل اور ارض کی زاویائی حرکت (gravity and angular momentum) اس بات کو یقینی بنائے ہوئے ہیں کہ یہ سورج کے گرد ایک طویل عرصے تک گردش کرتا رہے'۔

جب میں نے لاس اینجلیس کے ایک نمائش گھر میں جولیا کی فلم دیکھی تو مجھے اس منظر نے بہت متاثر کیا۔ خاص طور پر جب جولیا نے اپنے لادین ہو جانے کے بارے میں شائع ہونے والی خبر کے سلسلے میں اپنے والدین کے رد عمل کا ذکر کیا:

والدہ کی طرف سے آنے والی پہلی کال گفتگو سے زیادہ ایک چیخ تھی۔ 'دہریہ؟ دہریہ؟!؟!؟!'

والد نے فون کیا اور کہا 'تم نے اپنے خاندان، اپنے سکول اور اپنے شہر کے ساتھ دغا کیا ہے'۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں نے روسیوں کو سرکاری راز بیچ ڈالے ہوں۔ دونوں نے کہا کہ وہ آئندہ مجھ سے کبھی بات نہیں کریں گے۔ والد نے تو یہ تک کہہ دیا 'میں نہیں چاہتا کہ تم میرے جنازے پر بھی آؤ'۔ فون رکھتے ہی میرے دل میں خیال آیا 'اچھا! روک کے دکھا لینا اس وقت'۔

جولیا کی قابلیت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ آپ کو بیک وقت ہنسا بھی دیتی ہے اور رلا بھی دیتی ہے:

میرا خیال ہے کہ میرے والدین مجھ سے کچھ مایوس تھے کہ میں نے خدا پر یقین رکھنا چھوڑ دیا تھا، لیکن دہریہ ہو جانا؟! یہ تو بات ہی کچھ اور تھی۔

ڈین بارکر کی کتاب "ایمان پر یقین چھوٹ جانا: مبلغ سے دہریہ تک —Losing Faith in Faith: From Preacher to Atheist" اس کے متقی بنیاد پرست پادری اور پر جوش گشتی مبلغ سے لے کر پر اعتماد دہریے تک کے سفر کی کہانی ہے۔ اہم پہلو یہ ہے کہ دہریہ ہو جانے کے کچھ عرصہ بعد تک بھی بارکر اپنے مذہبی فرائض سرانجام دیتا رہا، کیونکہ اول تو اسے اور کوئی کام آتا نہیں تھا اور دوئم وہ اپنے آپ کو معاشرتی تعلقات کے ایک جال میں پھنسا ہوا

محسوس کرتا تھا۔ اب وہ بہت سے دوسرے امریکی پادریوں کو جانتا ہے جو اس وقت اسی تذبذب کی حالت میں ہیں جس میں کبھی وہ اپنے آپ کو پاتا تھا، اور جنہوں نے اس کی کتاب پڑھنے کے بعد اس سے اپنی مشکلات کا ذکر کرنے کی ہمّت پیدا کی۔ رد عمل کی ممکنہ شدّت اتنی زیادہ ہو گی کہ وہ اپنی لادینیت کے بارے میں اپنے گھر والوں کو بھی نہیں بتا سکتے۔ بارکر کی اپنی کہانی کا انجام نسبتاً اچھا رہا۔ پہلے پہل تو اس کے والدین کو بہت صدمہ پہنچا۔ لیکن وہ اس کے مؤدب اور مہذّب استدلال کو سنتے رہے، اور بلآخر خود بھی لادین ہو گئے۔

امریکہ کی ایک یونیورسٹی کے دو پروفیسر صاحبان نے علیحدہ علیحدہ مجھ سے بذریعہ خط اپنے والدین کے سلسلے میں رابطہ کیا۔ ایک نے کہا کہ اس کی والدہ مستقل غم زدہ رہتی ہیں کیونکہ انہیں اس کی ابدی روح کی فکر کھائے جارہی ہے۔ دوسرے نے بتایا کہ اس کے والد کہتے ہیں کہ کاش وہ پیدا ہی نہ ہوا ہوتا، کیونکہ انہیں کامل یقین ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیش کے لئے جہنم کی آگ میں جلنے والا ہے۔ یہ یونیورسٹی میں پڑھانے والے انتہائی تعلیم یافتہ پروفیسر ہیں، جو اپنی علمیت اور بالیدگی کے بارے میں بہت پر اعتماد ہیں، اور جو اپنے والدین کو نہ صرف مذہب بلکہ فہم و فراست کے دیگر معاملات میں بھی پیچھے چھوڑ چکے ہیں۔ ذرا سوچئے ان سے یا جولیا سوینی سے کم ذہنی قابلیت اور تعلیم کے حامل لوگوں پر کیا گزرتی ہو گی جب انہیں اپنے خاندان کے ضدی افراد کے سامنے اپنے موقف کا دفاع کرنا پڑتا ہو گا۔ شاید وہی جو جل مٹن کے بہت سے مریضوں پر گزرتی ہو گی۔

ٹی وی پر ہماری گفتگو کے دوران جل نے بچّوں کے مذہبی خطوط پر کی جانے والی تربیت کو ذہنی اذیت پسندی کی ایک قسم کہا تھا، اور میں اس نقطے پر یوں واپس لوٹا: 'آپ نے مذہبی اذیت پسندی کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ آپ ایک بچّے کو حقیقتاً جہنم پر ایمان رکھنے کی تربیت دینے کی ذہنی اذیت پسندی کا موازنہ کریں... آپ کے خیال میں صدمے کے اعتبار سے یہ جسمانی اذیت پسندی کے مقابلے میں کتنی گھناؤنی ہو گی'؟ اس نے جواباً کہا ' یہ ایک بہت مشکل سوال ہے... میرے خیال میں دونوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں، کیونکہ دونوں صورتوں میں اعتماد کا استحصال کیا جاتا ہے؛ بچّے سے یہ حق چھین لیا جاتا ہے کہ وہ آزاد محسوس کر سکے اور دنیا کے ساتھ معمول کے روابط استوار کر سکے.... یہ ایک طرح کی تضحیک ہے؛ دونوں صورتوں میں اپنے آپ کو جھٹلانے کی ایک کوشش ہے'۔

## بچّوں کے دفاع میں

## In Defense of Children

میرے ہم عصر ماہر نفسیات ڈاکٹر نکولس ہمفرے نے ۱۹۹۷ میں آکسفورڈ میں اپنے "ایمنسٹی لیکچر" (جو ایمنسٹی انٹرنیشنل کے حق میں چندہ اکٹھا کرنے کے لئے دیے جانے والے خطبات کا حصہ تھا) میں لاٹھی اور پتھر والی کہاوت کا استعمال کیا تھا[۱۳۳]۔ ہمفرے نے خطاب کا آغاز اس بات سے کیا کہ یہ کہاوت ہمیشہ سچّی نہیں ہوتی، اور اس ضمن میں ہیٹی کے ووڈو جادو کے ماننے والوں کا ذکر کیا جوان پرضرر رساں جادو کئے جانے کے نتیجے میں ذہن میں خوف کے جذباتی اثرات (psychosomatic effects) پیدا ہو جانے کی وجہ سے جادو کے چند ہی روز بعد فوت ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس نے سوال کیا کہ کیا ایمنسٹی انٹرنیشنل کو ایسی گفتار یا اشاعت کے خلاف آواز بلند نہیں کرنی چاہئے جو تکلیف دہ یا نقصان دہ ہو؟ اس کا اپنا جواب کسی قسم کی پابندی کے خلاف ایک رعب دار نفی میں تھا 'آزادیٔ گفتار ایک ایسا بیش قیمت حق ہے جس کے ساتھ کسی قسم کا کھلواڑ نہیں کرنا چاہئے'۔ لیکن اس کے فوراً بعد اس نے اس آزادی میں ایک اہم استثنٰی پیدا کیا — جس سے شایداس کی اپنی آزاد خیال روح بھی کانپ گئی ہو گی — کہ بچّوں کو بچانے کے سلسلے میں چند پابندیاں لگانا مناسب ہے:

> .... اخلاقی اور مذہبی تعلیم، خاص طور پر وہ تعلیم جو بچّہ گھر پر حاصل کرتا ہے، جہاں والدین کو اجازت ہوتی ہے بلکہ ان سے امید کی جاتی ہے کہ وہ اپنے بچّوں کے لئے صحیح اور غلط، جھوٹ اور سچ کا تعین کریں۔ میرا ماننا ہے کہ بچّوں کا انسانی حق ہے کہ ان کی سوچ کو دوسرے لوگوں کی غلط سوچ کی زد میں لا کر مفلوج نہ کیا جائے — چاہے یہ لوگ کوئی بھی ہوں۔ لہٰذا والدین کو بھی کوئی خدا داد حق نہیں کہ وہ جیسے چاہیں اپنی اولاد کی تہذیب و تربیت کریں: ان کے علم کے افق پر قدغن لگانے کا، ان کی تربیت عقیدت اور توہم پرستی کے ماحول میں کرنے کا، یا اس بات پر اسرار کرنے کا کہ وہ ان کے اپنے عقیدے کے مطابق صراط مستقیم پر ہی قائم رہیں۔

مختصراً، بچّوں کو یہ حق حاصل ہے کہ ان کے ذہنوں کو حماقت خیز باتوں سے کمزور نہ کیا جائے، اور بحیثیت معاشرہ، ہماری یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم ان کی اس نوعیت کے حملوں سے حفاظت کریں۔ لہٰذا ہمیں والدین کو اپنے بچّوں کوانجیل کے لغوی مفہوم پر ایمان یا سیّاروں کا ان کی زندگی پر قدرت کی تعلیم دینے سے اسی طرح روکنا چاہئے جیسے ہم والدین کو بچّوں کے دانت اکھاڑنے یا انہیں زیر زمین قید خانے میں بند کرنے سے روکتے ہیں۔

جیسا کہ متوقع تھا، اس سخت بیان کو شدید رد عمل کا سامنا کرنا پڑا۔ حماقت خیزی کیا ہے، یہ ذاتی رائے کے زمرے میں نہیں آتا؟ کیا کٹر سائنس کی ریڑھی کا کئی بار الٹایا جانا ہمیں اپنے بیان میں احتیاط برتنے کی تنبیہ نہیں کرتا؟ سائنسدان بھلے سوچتے ہوں کہ علم نجوم اور انجیل کے لغوی مفہوم کی تعلیم دینا احمقانہ فعل ہے، لیکن ایسے لوگ بھی تو ہیں جواس سے مختلف سوچ رکھتے ہیں، تو کیا انہیں اپنے بچّوں کو یہ علوم سکھانے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے؟ کیا یہ سوچنا تکبّر کی نشانی نہیں کہ بچّوں کو صرف سائنس کی تعلیم ہی دینی چاہئے۔

میں اپنے والدین کا مشکور ہوں کہ انہوں نے بچّوں کو یہ سکھانے کی بجائے کہ کیا سوچا جائے، یہ سکھانا بہتر سمجھا کہ کیسے سوچا جائے۔ اگر عادلانہ اور درست انداز سے سائنسی شواہد بچّوں کے سامنے پیش کر دیے جانے کے باوجود وہ بڑے ہو کر یہ فیصلہ کریں کہ انجیل ہی حقیقی سچ ہے یا یہ کہ سیّاروں کی نقل و حمل ان کی زندگیوں کے فیصلے کرتے ہیں، تو یہ ان کا حق ہے۔ اہم نقطہ یہ ہے کہ یہ ان کا حق ہے کہ وہ فیصلہ کریں کہ وہ کیا سوچیں گے، ان کے والدین کا نہیں کہ وہ ان پر زبردستی اپنے خیالات مسلّط کریں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بات اس وجہ سے اور بھی اہمیت اختیار کر جاتی ہے کہ یہ بچّے کل اپنی اولاد کو بھی وہی وعظ و نصیحت کریں گے جس نے ان کی اپنی ذہنیت کو تراشہ ہو گا۔

ہمفرے تجویز پیش کرتا ہے کہ جب تک بچّے چھوٹے ہوں، کمزور ہوں اور انہیں حفاظت کی ضرورت ہو، حقیقی اخلاقی ولایت کا تقاضا ہے کہ ہم یہ سمجھنے کی ایک سچّی کوشش کریں کہ اگر وہ خود فیصلے کرنے کی عمر کے ہوتے تو کیا انتخاب کرتے۔ یہاں وہ اس نوجوان لڑکی انکا (Inca) کی مثال دیتا ہے جس کی ۵۰۰ سال پرانی لاش ۱۹۹۵ میں پیرو کے پہاڑوں میں منجمد حالت میں پائی گئی۔ لاش دریافت کرنے والے ماہر بشریات نے لکھا کہ وہ لڑکی غالباً قربانی کی کسی رسم کا شکار ہوئی تھی۔ ہمفرے کے مطابق، اس جوان "برف کی شہزادی" کے بارے میں ٹیلیویژن پر ایک دستاویزی فلم دکھائی گئی تھی۔ ناظرین کو دعوت دی گئی کہ وہ:

> انکا پادریوں کے روحانی عزم سے متاثر ہوں اور لڑکی کے آخری سفر میں اس کے فخر اور جوش و خروش میں شریک ہوں کہ اسے قربانی کی سعادت کے لئے منتخب کیا گیا۔ اس دستاویزی فلم کا پیغام یہ تھا کہ انسانی قربانی اپنی نوعیت کی پر جلال تہذیبی اختراع ہے — ثقافتی تکثیریت کے تاج میں جڑا ہوا ایک اور قیمتی جوہر ہے۔

ہمفرے شرمندہ نظر آتا ہے، اور میں بھی اس بات پر نادم ہوں۔

> لیکنکسی کی مجال بھی کیسی ہوئی ایسی بات تجویز کرنے کی؟ انہوں نے کیسے ہمیں — ہمارے گھروں میں بیٹھے ہوئے اور ٹی وی دیکھتے ہوئے — دعوت دے دی کہ ہم ایک رسمی قتل کے بارے میں سوچ کر اپنے آپ کو روحانی طور پر بالیدہ محسوس کریں: ایک معصوم بچّی کا بیوقوف، رعونت سے بھرے، توہم پرست، جاہل، بوڑھے مردوں کے ایک گروہ کے ہاتھوں قتل ہو جانے پر؟ ان کی ہمّت کیسے ہوئی کہ وہ ہمیں کسی اور کے خلاف اخلاق سے گری ہوئی حرکت پر غور و فکر کے ذریعے اپنے اندر اچھائی تلاش کرنے کی دعوت دیں؟

ممکن ہے کہ ہمارا مہذب، آزاد خیال قاری کچھ کوفت محسوس کرے۔ یہ فعل یقیناً ہمارے معیار کے مطابق غیر اخلاقی اور احمقانہ ہے، لیکن انکے معیار کے بارے میں کیا کہیں گے؟ یقیناً ان کے لئے وہ قربانی ایک اخلاقی عمل تھی اور قطعاً احمقانہ نہیں تھا، اور اس میں ہر اس چیز کی رضامندی شامل تھی جسے وہ مقدس سمجھتے تھے۔ وہ لڑکی بھی بے شک اس مذہب کی ایک وفادار مومنہ رہی ہوگی ۔ ہم کون ہوتے ہیں 'قتل' جیسا لفظ استعمال کرنے والےاور ان پادریوں کو ان کے معیار کی بجائے اپنے معیار پر پرکھنے والے؟ شاید وہ لڑکی اپنی قسمت پر سرور آمیز خوشی محسوس کر رہی تھی: شاید اسے واقعی یقین تھا کہ وہ سیدھی جنّت میں جانے والی ہے جہاں اسے ہمیشہ سورج دیوتا کا قرب حاصل رہے گا۔ یا شاید – جس کا امکان کہیں زیادہ ہے کہ – وہ خوف میں چلّائی ہوگی۔

ہمفرے – اور میرا – نقطہ یہ ہے کہ قطع نظر اس بحث سے کہ وہ لڑکی اپنی مرضی سے یا مرضی کے خلاف قربان ہونے جا رہی تھی، ہمارے پاس یہ فرض کرنے کے لئے ٹھوس دلائل موجود ہیں کہ اگر اس کے پاس تمام حقائق مہیّا ہوتے تو وہ یقیناً اپنی مرضی سے قربانی دینے کے لئے رضا مند نہ ہوتی۔ مثلاً فرض کیجئے کہ اسے یہ معلوم ہوتا کہ سورج ہائڈروجن گیس کا ایک گولا ہے جو میلین ڈگری کیلون سے بھی زیادہ گرم ہے جہاں ہائدروجن جوہری پگھلاؤ کے عمل کے ذریعے ہیلئیم گیس میں تبدیل ہو جاتی ہے، اور وہ شروع میں گیس کی ایک طشتری سے پیدا ہو اتھا جس میں سے ہمارے شمسی نظام نے بشمول زمین نے جنم لیا تھا.... غالباً تب وہ ایک دیوتا کی طرح اس کی پرستش نہ کرتی، اور یوں اس کا سورج کی خوشنودی کی خاطر بلی ہو جانے کے بارے میں زاویہ یکسر تبدیل ہو جاتا۔

انکا پادریوں کو ان کی جہالت کے لئے مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا ، اور شاید ان کو بے وقوف اور متکبّر کہنا زیادتی ہو گی۔ لیکن ان پر یہ الزام تو مکمل طور سے عائد کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے ایک نا سمجھ لڑکی پر اپنے عقائد مسلط کئے جب کہ وہ ابھی یہ فیصلہ کرنے کا ہوش نہیں رکھتی تھی کہ سورج کی عبادت کی جانی چاہئے یا نہیں۔ ہمفرے کا اضافی نقطہ یہ ہے کہ دور حاضر کے دستاویزی فلم ساز اور ہم، ان کے ناظرین، ایک جوان لڑکی کی موت میں خوبصورتی تلاش کرنے کے الزام میں قابل سرزنش ہیں – 'ایک چیز جو ہماری اجتماعی تہذیب کو زرخیز بناتی ہے'۔ نسلی مذہبی عادات کی ندرت میں جلال پا لینے کے اور ان کے نام پر مظالم کو قابل قبول گردانے کا رجحان بار بار اپنا سر اٹھاتا ہے۔ یہ مہذب آزاد خیال لوگوں کے ذہنوں میں بے چینی کی وجہ بنتا ہے جو ایک جانب تو کسی کو ظلم اور تکلیف کا نشانہ بنتا دیکھ کر برداشت نہیں کر پاتے اور دوسری جانب مابعد جدیدیت (postmodernism) اور نسبتیت (relativism) کے ماننے والوں کے ہاتھوں کی جانے والی تربیت سے مجبور ہیں جو انہیں دوسری تہذیبوں کی عزت کرنا اور خود سے کم تر نہ سمجھنا سکھاتی ہے۔ بے شک خواتین کا ختنہ وحشت انگیز تکلیف پہنچاتا ہے، عورتوں میں جنسی لطف کو ختم کر دیتا ہے (یقیناً اس کا پوشیدہ مقصد یہی ہو گا)، اور تہذیب یافتہ آزاد خیال ذہن کا آدھا حصہ اس روایت کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ لیکن دوسرا آدھا نسلی ثقافتوں کی 'عزت' کرتا ہےاور سمجھتا ہے کہ "وہ" اگر "اپنی" لڑکیوں کے اعضاء مسخ کرنا چاہتے
ہیں تو ہمیں دخل اندازی نہیں کرنی چاہئے۔ در اصل مدعا یہ ہے کہ "ان" کی لڑکیاں در حقیقت ان کی بیٹیوں کی اپنی لڑکیاں ہیں، بایں ہمہ ان کی خواہشات کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے۔ لیکن اگر لڑکیاں خود ہی ختنہ کی خواہش کا اظہار کر دیں؟ تو اس کا جواب دینا مزید مشکل ہے۔ لیکن کیا، عہد بلوغت میں تمام تر حقائق معلوم ہو جانے کے بعد، کہیں وہ یہ خواہش کرسکتی ہے کہ کاش! اس نے ایسا نہ کیا ہوتا؟ ہمفرے یہ دلیل دیتا ہے کہ کوئی بھی بالغ عورت جو بچپن میں ختنہ نہ کروا سکی ہو کبھی رضاکارانہ یہ جراحی کروانے کی خواہش کا اظہار نہیں کرتی۔

آمش لوگوں کے 'اپنے بچّوں' کی 'اپنے طریقے' سے پرورش کرنے کے حق پر بحث کرنے کے بعد ہمفرے اپنے غیض و غضب کا رخ ہمارے معاشرے کے اس جوش و خروش کی طرف کرتا ہے جو ہم ثقافتی تنوّع برقرار رکھنے کے حق میں دکھاتے ہیں۔

> چلئے، تو شاید آپ یہ کہنا چاہیں گے کہ اگرچہ آمش یا حاسدم (یہودیوں کی ایک قسم) یا خانہ بدوش کے بچّوں کی ان کے والدین کے ہاتھوں پرورش ان کے لئے کسی قدر مشکلات پیدا کرتی ہے – لیکن کم از کم اس کے نتیجے میں یہ دلچسپ ثقافتی روایتیں برقرار تو رہتی ہیں۔ اگر یہ روایتیں کھو گئیں تو کیا ہماری ساری انسانی تہذیب افلاس کا شکار نہیں ہو جائے گی؟ یہ واقعی بڑے افسوس کی بات ہے کہ ثقافتی تنوّع کو برقرار رکھنے کے لئے انسانی جان کی قربانی برداشت کرنی پڑتی ہے۔
> لیکن مسئلہ یہی ہے: یہ وہ قیمت ہے جو ہمیں بحیثیت معاشرہ چکانی ہی پڑتی ہے۔ ما سوائے اس کے – اور میں آپ کو یہ یاد

---

اب یہ برطانیہ میں ایک باقاعدہ عمل بن چکا ہے۔ سکولوں کے ایک انسپکٹر نے مجھے لندن کی لڑکیوں کے بارے میں بتایا جنہیں ۲۰۰۶ میں بھی بریڈ فورڈ میں ایک "چچا" کے پاس ختنہ کے لئے بھیجا جا رہا تھا۔ سرکاری ادارے اس لئے اپنی آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں کہ کہیں ان پر 'برادری' کی طرف سے نسلی امتیاز کا الزام عائد نہ ہو جائے۔

دلانا ضروری سمجھتا ہوں – کہ یہ قیمت ہم نہیں چکاتے، وہ چکاتے ہیں۔

جب ۱۹۷۲ میں امریکی عدالت عظمیٰ نے "وسکانسن بنام یوڈر" کے مقدمے میں، جو والدین کے اپنے بچّوں کو مذہبی وجوہات کی بنا پر سکول سے اٹھا لینے کے حق کے بارے میں تھا، اپنا فیصلہ سنایا تو یہ مسئلہ عوام کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ آمش لوگ امریکہ کے مختلف علاقوں میں احاطہ بند برادریوں میں رہتے ہیں، زیادہ تر جرمن زبان کی ایک قدیم بولی پینسلوینیا ڈچ (Pennsylvania Dutch) میں بات کرتے ہیں، اور بجلی، تیل سے چلنے والے انجن، زپر(zipper)، اور جدید زندگی کی زیادہ تر آسائشوں سے اجتناب کرتے ہیں۔ آج کے دور میں سترھویں صدی کے اس دلکش مظاہرے میں ایک جاذبیت ہے۔ کیا اسے انسانی زندگی کے تنوع کی افزودگی کی خاطر تحفظ فراہم کرنا غلط ہے؟ اور اس طرز زندگی کو تحفظ فراہم کرنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ آمش لوگوں کواس بات کی اجازت ہو کہ وہ اپنے بچّوں کی تعلیم و تربیت اپنے انداز سے کر سکیں اور انہیں جدیدیت کے فاسد اثرات سے دور رکھیں۔ لیکن یقیناً ہم یہ سوال بھی کرنا چاہتے ہیں کہ کیا اس معاملے میں ان بچّوں کی کوئی رائے نہیں ہونی چاہئے؟

۱۹۷۲ میں جب وسکانسن میں رہنے والے کچھ آمش والدین نے اپنے بچّوں کو ہائی سکول سے ہٹا لیا تو مسئلہ عدالت عظمیٰ کے سامنے پیش کیا گیا۔ ایک خاص عمر کے بعد تعلیم آمش اقدار کے خلاف ہے، اور خاص طور سے سائنسی تعلیم۔ وسکانسن کی ریاست نے والدین کے خلاف مقدمہ کر دیا کہ بچّوں کو ان کے تعلیم کے حق سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ مختلف عدالتوں سے گزرتا ہوا یہ مقدمہ بلآخر عدالت عظمیٰ میں پہنچ گیا، جس نے ۶:۱ کے تناسب سے والدین کے حق میں فیصلہ سنا دیا[۳۴]۔ چیف جسٹس وارن برگر کی تحریر کردہ اکثریتی رائے میں یہ الفاظ بھی شامل تھے: 'جیسا کہ نوشتہ سے ظاہر ہے، ۱۶ سال کی عمر تک سکول میں لازمی حاضری کی وجہ سے آمش برادری اور ان کے مذہبی رسومات کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے؛ انہیں یا تو اپنا دین چھوڑ کر معاشرے کے عمومی دھارے میں شامل ہونا پڑے گا یا کسی دوسرے زیادہ روادار علاقے کی جانب نقل مکانی کرنی پڑے گی'۔

جسٹس ولیم او ڈگلس کی اقلیتی رائے تھی کہ بچّوں کی رائے پوچھی جانی چاہئے تھی۔ کیا وہ واقعی اپنی تعلیم ادھوری چھوڑنا چاہتے ہیں؟ کیا وہ واقعی آمش مذہب میں شامل رہنا چاہتے ہیں؟ نکولاس ہمفرے شاید اس سے بھی آگے بڑھ جاتا۔ اگر بچّوں سے پوچھ بھی لیا جاتا اور وہ آمش مذہب میں ہی رہنے کو ترجیح دیتے، تو کیا ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ متبادل مذہبی رویوں کے بارے میں معلومات ہونے کے باوجود بھی ان کے فیصلے آمش مذہب کے حق میں ہی ہوتے؟ اس دعوے کے قرین قیاس ہونے کے لئے کیا یہ ضروری نہیں کہ باہری دنیا کے کچھ نوجوان رضاکارانہ طور پر آمش مذہب میں شامل ہو جائیں؟ جسٹس ڈگلس نے بھی بات کو ایک دوسری سمت میں آگے بڑھایا۔ اسے کوئی وجہ نظر نہیں آئی۔ یہ فیصلہ کرتے وقت کہ والدین کو کس حد تک اجازت ہونی چاہئے کہ وہ اپنی اولاد کی تعلیم کو ادھورا رکوا سکیں، جج صاحبان کو والدین کے مذہبی خیالات کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے۔ اگر مذہب استثنیٰ کی وجہ بن سکتا ہے، تو کیا غیر مذہبی عقائد کو بھی یہ حق حاصل ہو سکتا ہے؟

عدالت عظمیٰ کی اکثریت نے راہبانہ درگاہوں کی مثبت اقدار کا ذکر کیا، جن کی موجودگی سے معاشرہ زرخیز ہوتا ہے۔ لیکن، جیسا کہ ہمفرے نے نشاندہی کی، ان دونوں میں ایک اہم فرق ہے۔ راہب آزادانہ اور رضاکارانہ رہبانیت کی زندگی کا انتخاب کرتے ہیں۔ آمش بچّوں نے آمش مذہب رضاکارانہ طور پر نہیں چنا تھا؛ وہ اس میں پیدا ہوئے تھے لہٰذا ان کے پاس کوئی متبادل راستہ نہیں تھا۔

کسی کو بلخصوص بچّوں کو، 'تنوع' کی سولی پر اور مذہبی رسومات کے تحفظ کی خاطر قربان کر دینے کے در پردہ دم بخود کر دینے والا ایک متکبرانہ اور غیر انسانی جذبہ کار فرما ہے۔ ہم اپنی گاڑیوں ، کمپیوٹر اور vaccine اور antibiotic ادویات کے ساتھ خوش رہیں گے۔ لیکن تم عجیب و غریب قسم کے لوگ، اپنی پرانی طرز کی ٹوپیوں اور پاجاموں، گھوڑا گاڑیوں، غیر مانوس لہجے، اور گھر کے باہر بنے بیت الخلاء کے ساتھ، ہماری زندگیوں کو زرخیز کرتے ہو۔ بے شک تمہیں اپنے بچّوں کو سترھویں صدی کے منجھدھار میں قید کرنے کی پوری اجازت ہونی چاہئے، ورنہ ایک ناقابل تلافی نقصان ہو جائے گا: انسانی تہذیب کے حیران کن تنوع کا ایک اہم حصہ ہمیشہ کے لئے کھو جائے گا۔ میرے اندر کا ایک چھوٹا سا حصہ اس منطق کے وزن کو سمجھ رہا ہے، لیکن میرے بقیہ وجود پر اس خیال سے کپکپی تاری ہو رہی ہے۔

# ایک تعلیمی رسوائی

## An Educational Scandal

میرے ملک کے وزیر اعظم ٹونی بلئیر کو جب رکن ایوان جینی ٹونگ نے دارالعوام (House of Commons) میں انگلستان کے شمال مشرق میں واقع ایک ایسے سکول کو حکومتی امداد دینے کے بارے میں سوال پوچھا جو لغوی انجیلی نظریہ تخلیق کی تعلیم دیتا ہے تو وزیر اعظم نے 'تنوع' کی منطق کا سہارا لیا۔ اس نے جواب دیا کہ بڑے افسوس کی بات ہو گی اگر اس مسئلے پر ہمارے خدشات 'تنوع سے بھرپور ایک تعلیمی نظام فراہم کرنے کی ہماری کوشش' کی راہ میں رکاوٹ بنیں[۳۵]۔ مذکورہ سکول، گیٹھیڈ میں واقع ایمانویل کالج، ان شہری اکادمیوں میں سے ایک ہے جو بلئیر حکومت نے بڑے فخر سے شروع کروائی تھیں۔ امیر کبیر محسنین سے درخواست کی جاتی ہے کہ کوئی حقیر رقم چندے میں دے دیں (ایمانویل کے سلسلے میں یہ رقم ۲ ملین پاؤنڈ ہے) جو اس سے کہیں زیادہ حکومتی امداد خریدنے کے کام آتی ہے (سکول کے لئے ۲۰ ملین پاؤنڈ، اور اخراجات و تنخواہیں وغیرہ)، اور سکول کی اقدار، سکول کے بیشتر گورنروں کی تقرری، طالب علموں کے انتخاب اور دیگر امور پر سرپرست کی مکمل اجارہ داری کو بھی ممکن بناتی ہے۔

ایمانویل کالج کا ۱۰ فی صدی سرپرست ر پیٹر وارڈی ہے، جو گاڑیوں کا ایک کامیاب بیوپاری ہے، اور جس کی ایک قابل تعریف خواہش ہے کہ آج کے بچّوں کو وہ تعلیم مہیّا کی جائے جو اسے میسّر نہ ہو سکی، جبکہ ایک قدرے کم قابل تعریف خواہش بچّوں پر اپنے ذاتی مذہبی عقائد تھوپنے کی بھی ہے[§§§§§§§§§§§§§§§]۔ بدقسمتی سے وارڈی امریکہ سے متاثر چند بنیادپرست معلموں کے ایک گروہ سے جا ملا ہے، جس کی قیادت ایمانویل کے ایک سابقہ پرنسپل نائجل میکوئڈ کے ہاتھ میں ہے اور جو اب وارڈی سکولوں کی پوری انجمن کا سربراہ بن چکا ہے۔ میکوئڈ کی سائنسی علمیت کا اندازہ اس کے اس عقیدے سے لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا محض دس ہزار سال پرانی ہے، یا اس اقتباس سے: 'یہ سوچنا کہ ہم ایک عظیم دھماکے کے بعد ہونے والے ارتقاء کا نتیجہ ہیں، کہ کبھی ہم بندر ہوا کرتے تھے، جب آپ انسانی جسم کی پیچیدگی کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ ناقابل یقین لگتا ہے۔۔۔ اگر آپ بچّوں کو یہ سکھائیں کہ زندگی کا کوئی مقصد نہیں – کہ وہ محض ایک کیمیاوی تغیر(chemical mutation) ہے – یہ ان کی خود اعتمادی استوار کرنے میں مددگار نہیں ہو سکتا'[۳۶]۔

کسی سائنسدان نے کبھی یہ تجویز نہیں کیا کہ بچّے کیمیاوی تغیر ہیں۔ ایسے سیاق و سباق میں ان الفاظ کا استعمال بے معنی ہے اور ہیکنی، مشرقی لندن کے 'Christian Life City -' چرچ کے 'بشپ' وین مالکم کے بیانات کے ہم پلّہ ہے جو گارڈین کی ۱۸ اپریل ۲۰۰۵ کی اشاعت کے بقول 'ارتقاء کے سائنسی شواہدات کو متنازعہ قرار دیتا ہے'۔ مالکم کو ان شواہد کی کتنی سمجھ ہے اس کا اندازہ اس کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے کہ 'صاف ظاہر ہے کہ حجریہ کے نوشتہ میں ارتقاء کے درمیانی مراحل کا ذکر غائب ہے۔ اگر ایک مینڈک بندر میں بدل گیا تھا تو کیا ہمارے پاس آج بہت سے "مینڈر"(fronkies) نہیں ہونے چاہئیں'؟

خیر، سائنس میکوئڈ کا کوئی مضمون نہیں ہے، لہٰذا ہمیں انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے اس کے سائنس کے سربراہ سٹیفن لیفیلڈ کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ ۲۱ ستمبر ۲۰۰۱ کو لیفیلڈ نے ایمانویل کالج میں "سائنس کی تعلیم: ایک انجیلی زاویہ The Teaching of Science: a Biblical Perspective" کے عنوان سے ایک خطاب کیا۔ خطاب کا متن ایک عیسائی ویبسائٹ www.christian.org.uk پر بھی شائع کیا گیا۔ لیکن اب یہ مضمون وہاں موجود نہیں ہے۔ میں نے ۱۸ مارچ ۲۰۰۲ کی ڈیلی ٹیلیگراف کی اشاعت میں اس کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا اور اسی دن یہ متن ویبسائٹ سے ہٹا دیا گیا[۳۷]۔ لیکن کسی بھی چیز کو ورلڈ وائڈ ویب سے مکمل طور سے تلف کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ سرچ انجن (انٹرنیٹ میں معلومات تلاش کرنے والے پروگرام) کی برق رفتاری کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے پاس معلومات کے ذخیرے رکھتے ہیں اور یہ ذخائر لامحالہ اصل کے تلف ہو جانے کے بعد بھی کچھ عرصے کے لئے کہیں نہ کہیں محفوظ پڑے رہتے ہیں۔ انڈیپنڈنٹ اخبار کے مذہبی امور کے پہلے نامہ نگار، ہوشیار برطانوی صحافی اینڈریو براؤن نے لیفیلڈ کا خطاب ڈھونڈ نکالا، اسے گوگل کے ذخیرے سے منتقل کر کے اپنی ویبسائٹ http://www.darwinwars.com/lunatic/liars/layfield.html پر شائع کر دیا جہاں سے لیفیلڈ اسے تلف نہیں کروا سکتا تھا۔ آپ ملاحظہ کریں گے کہ براؤن نے لیفیلڈ کے خطاب کا پتہ جن الفاظ میں دیا ہے وہ از خود بھی مزاح کا موقعہ فراہم کرتے ہیں۔ لیکن خطاب کا متن پڑھنے کے بعد ہماری ہنسی ماند پڑ جاتی ہے۔

اتفاق سے جب ایک مشتاق قاری نے ایمانویل کالج سے بذریعہ خط خطاب کو ویبسائٹ سے تلف کرنے کی وجہ جاننا چاہی تو اسے برجستہ یہ جواب ملا،

---

§§§§§§§§§§§§§§§ ایچ ایل مینکن نے بڑی دور اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ لکھا تھا: 'ہر تبلیغی کے دل کی اتھاگہرائی میں کہیں گاڑیوں کے ایک بیوپاری کا کھنڈر موجود ہوتا ہے'۔

اینڈریو براؤن نے اسے بھی شائع کر دیا:

> ایمانویل کالج تخلیق کے موضوع پر جاری ایک بحث کا محور بنا ہوا ہے۔ ایمانویل کالج کو اخبارات سے ان گنت فون کال آئے ہیں۔ اس کی وجہ سے پرنسپل اور ڈائریکٹر صاحبان کا بہت وقت ضایع ہوا ہے۔ ان حضرات کے پاس اور بھی اہم ذمہ داریاں ہیں۔ ان پر سے یہ بوجھ ہلکا کرنے کی غرض سے ہم نے فی الوقت سٹیفن لیفیلڈ کے خطاب کی نقل کو ویبسائٹ سے ہٹا دیا ہے۔

عین ممکن ہے کہ سکول کے افسران واقعی اتنے مصروف رہے ہوں کہ وہ نظریۂ تخلیق کی تعلیم دینے کے بارے میں صحافیوں کو اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت نہ دے پائے ہوں۔ اگر ایسا ہی تھا تو پھر ویبسائٹ سے ایک ایسے خطاب کا متن تلف کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے جو ایسی ہی وضاحت دے سکتا تھا اور جس سے صحافیوں کے سوالات کی تشفّی کی جا سکتی تھی، تاکہ ان افسران کا قیمتی وقت بچایا جا سکے؟ نہیں۔ انہوں نے اپنے سائنس کے سربراہ کا خطاب اس لئے ہٹا دیا کیونکہ وہ جان گئے تھے کہ اس میں چھپا دینے لائق مواد موجود ہے۔ مذکورہ خطاب درج ذیل پیراگراف سے شروع ہوتا ہے:

> ہم یہاں آغاز میں ہی یہ بیان صادر کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم اس خیال کی مخالفت کرتے ہیں، جسے ۱۷ ویں صدی میں فرانسس بیکن نے شاید نا دانستہ طور پر مقبولیت سے نواز دیا کہ 'دو کتابیں' موجود ہیں (یعنی کتاب قدرت، اور مقدس صحائف) جنہیں حقیقت کی تلاش میں جداگانہ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس، ہم اس تجویز پر ڈٹے کھڑے ہیں کہ خدا نے مقدس صحیفے کے صفحات میں پر اعتماد اورخطا سے پاک کلام پیش کیا ہے۔ یہ دعویٰ بظاہر کتنا بھی کمزور، دقیانوسی یا سادہ نظر آئے، خاص طور پر اس لادین، ٹی وی کے نشے میں دھت جدید تہذیب کو، ہمیں یقین ہے کہ یہی وہ حتی الامکان مضبوط بنیاد ہے جس پر مزید تعمیر کی جاسکتی ہے۔

آپ کو بدستور اپنی چٹکی لینی پڑتی ہے۔ آپ خواب نہیں دیکھ رہے۔ یہ آلابامہ میں خیمے میں بیٹھا کوئی تبلیغی نہیں بلکہ ایک ایسے سکول میں سائنس کا سربراہ ہے جسے برطانوی حکومت کی مالی سرپرستی حاصل ہے اور جس پر ٹونی بلئیر کو فخر ہے۔ بلئیر ایک عبادت گزار عیسائی ہے، اور ۲۰۰۴ میں اس نے ایک وارڈی سکول کی افتتاحی تقریب میں بھی حصہ لیا تھا[۳۸]۔ تنوع ایک فضیلت ہو گی۔ لیکن یہ تو تنوع کے پاگل پن کی حد ہے۔

لیفیلڈ سائنس اور صحیفے کے تقابل کی ایک فہرست پیش کرتا ہے اور جہاں بھی دونوں میں اختلاف پایا جائے وہاں صحیفے کو ترجیح دیتا ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ ارضیات کا مضمون اب قومی نصاب کا حصہ بن چکاہے، لیفیلڈ کہتا ہے کہ 'جو لوگ نصاب کے اس حصے کی تعلیم دینے پر معمور ہوں ان کو خاص احتیاط برتنے کی ضرورت ہے وہ "سیلاب کی ارضیات " کے موضوع پر لکھی گئی وٹکومب اور مورس کی تحقیق کا مطالعہ کریں۔ جی ہاں۔ "سیلاب کی ارضیات " سے وہی مراد ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ ہم کشتی نوح کی بات کر رہے ہیں۔ کشتی نوح! ــ جبکہ بچّے یہ حیران کن حقیقت کے بارے میں بھی سیکھ سکتے تھے کہ برّ اعظم افریقہ اور جنوبی امریکہ کبھی ایک دوسرے سے جڑے تھے اور اس رفتار سے دور ہو رہے ہیں جس طرح آپ کا ناخن بڑھتا ہے۔ ذیل میں لیفیلڈ (شعبہ سائنس کا سربراہ) نوح کے سیلاب کے حوالے سے ان مظاہر کو حالیہ اور پر رفتار واقعات کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے جنہیں حقیقی ارضیاتی شواہد کے مطابق ظہور پزیر ہونے میں کڑوڑ ہا سال لگ گئے:

> ہمیں اپنے ارضی طبیعیاتی نمونے میں ایک عالم گیر سیلاب کی تاریخی حقیقت کا بھی اعتراف کرنا چاہئے جیسے 'پیدائش ۶-۱۰ Genesis ' میں بیان کیا گیا ہے۔ اگر انجیل کا بیانیہ محفوظ ہے اور فہرست یافتہ شجرہ ہائے نسب (مثال کے طور پر پیدائش ۵؛ ا تواریخ ا؛ متی ا اور لوکا ۳ ) بالعموم مکمل ہیں تو ہمیں یہ ماننا چاہئے کہ یہ عالمی آفت حال ہی میں وقوع پزیر

ہوئی تھی۔ اس کے اثرات ہر جگہ بہ کثرت عیاں ہیں۔ مرکزی ثبوت و شواہد حجریہ سے بھری رسوبی چٹانوں (sedimentary rocks)، ہائڈرو کاربن ایندھن (کوئلہ، تیل اور گیس)، اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے انسانی آبادی کے مختلف گروہوں میں ایک عظیم سیلاب کی داستان کے رائج ہونے میں ملتے ہیں۔ ایک کشتی میں نمائندہ جانوروں کو پانی کے اتر جانے تک کامیابی کے ساتھ ایک سال تک رکھنے کی عمل پزیری کے بارے میں جان ووڈموراپ اور دیگر لوگوں کی تحقیق مطالعہ کے لئے میسر ہے۔

ایک طرز سے یہ نائجل میکوئیڈ یا بشپ وین مالکم جیسے جہلا کی بکواس سے بھی زیادہ برا ہے، کیونکہ لیفیلڈ نے سائنس کی تعلیم حاصل کر رکھی ہے۔ حیران کر دینے والا ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجئے:

جیسا کہ ہم نے آغاز میں کہا، ہمیں کن باتوں پر ایمان رکھنا چاہئے اس کے بارے میں عیسائیوں کے پاس ٹھوس وجوہات موجود ہیں جن کی بنا پر وہ قدیم اور جدید صحائف کو قابل اعتماد رہنما مانتے ہیں۔ یہ محض مذہبی دستاویزات نہیں ہیں۔ یہ ہمیں زمین کی تاریخ کا ایک درست حساب فراہم کرتی ہیں جسے فراموش کر کے ہم اپنے ہی نقصان کو آواز دے رہے ہیں۔

یہ اشارے کہ صحائف ارضیاتی تاریخ کا حقیقی حساب فراہم کرتے ہیں کسی بھی ذی وقار عالم دین کے رونگٹے کھڑے کر دیں گے۔ میں نے اپنے دوست آکسفورڈ کے پادری اعظم رچرڈ ہیرس کے ساتھ مل کر ٹونی بلئیر کو ایک خط لکھا جس پر ہم نے آٹھ پادری اعظم اور نو سائنسدانوں کے بھی دستخط لئے[۳۹]۔ نو سائنسدانوں میں رائل سوسائٹی کے صدر (جو پہلے ٹونی بلئیر کے مشیر تھے)، سوسائٹی کے حیاتیات اور طبیعیات کے سکریٹری، قدرتی تاریخ کے عجائب گھر(Museum of Natural History) کے ڈائریکٹراور سر ڈیوڈ ایٹنبورو، جو شاید انگلستان میں سب سے محترم ہستی ہیں شامل تھے۔ پادریوں میں ایک رومن کیتھولک اور سات اینگلکن شامل تھے – برطانیہ کے سب مایہ ناز مذہبی قائدین کووزیر اعظم کے دفتر سے بے دلی سے لکھا ہوا ناکافی سا ایک جواب موصول ہوا، جس میں سکول کے اچھے امتحانی نتائج اور سکولوں کے معائنہ کے سرکاری ادارے آفسٹیڈ کی سکول کے حق میں اچھی رپورٹ کا ذکر کیا گیا تھا۔ بظاہر بلئیر صاحب کو یہ خیال نہیں آیا کہ اگر آفسٹیڈ کے افسران ایک ایسے سکول کو اعلیٰ رپورٹ دے رہے ہیں جہاں یہ پڑھایا جاتا ہے کہ کائنات اس وقت وجود میں آئی جب کہ حقیقت میں کتے کو بھی سدھایا جا چکا تھا، تو شاید ادارے کے اپنے معیار میں بھی کچھ تھوڑی بہت اونچ نیچ سرزد ہو گئی تھی۔

سٹیفن لیفیلڈ کے خطاب کا سب سے تکلیف دہ حصہ شایداس کا اختتامی حصہ 'کیا کیا جا سکتا ہے' ہو گا، جہاں وہ ان حربوں کے بارے میں بات کرتا ہے جسےاساتذہ سائنس کی جماعت میں بنیاد پرست عیسائیت کو مسلط کرنے کی غرض سے استعمال کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ سائنس کے اساتذہ کو ترغیب دیتا ہے کہ

ہر ایسے موقعے پر جہاں کسی کتاب، امتحانی سوال، یا کسی مہمان کی گفتگو میں ارتقائی/ قدیم ارضی نمونے (ملین یا بلین سال) کا استعمال کیا جائے، وہاں بڑے احترام سے اس بیان کی غلطی کی نشاندہی کر دی جائے۔ جس قدر ممکن ہو، ہمیں ان معلومات کی متبادل (اور بہتر) انجیلی وضاحت مہیا کرنی چاہئے۔ آگے چل کر ہم حیاتیات، طبیعیات، اور کیمیا سے مثالیں دے کر اس بات کو واضح کریں گے۔

لیفیلڈ کا بقیہ خطاب کسی تشہیری کتابچے (propaganda manual) سے کم نہیں، اور حیاتیات، طبیعیات، اور کیمیا کے اساتذہ کے لئے ایک نادر وسیلہ ہے جو قومی نصاب کی حدود کے تھوڑا ذرا اندر رہتے ہوئے شواہد کی بنیاد پر دی جانے والی سائنسی تعلیم کو تہس نہس کرنا چاہتے ہیں اور اس کی جگہ انجیل کے

صحیفے مسلط کرنا چاہتے ہیں۔

۱۵ اپریل ۲۰۰۶ کو بی بی سی کے منجھے ہوئے نامہ نگار جیمز ناٹی نے سر پیٹر وارڈی کا ریڈیائی انٹرویو کیا۔ انٹرویو کا موضوع رشوت کے الزامات کے سلسلے میں جاری پولیس کی تفتیش تھا، جس سے وارڈی منکر تھا، کہ بلئیر حکومت نے امیر لوگوں کی سیٹی اکادمی اسکیم میں حصہ لینے کی طرف راغب کرنے کے لئے نوابی کے رتبے (knighthoods and peerages) سے نوازنے کے وعدے کئے تھے۔ ناٹی نے وارڈی سے نظریۂ تخلیق کے بارے میں بھی سوال کیا، اور وارڈی نے الزام سے صریحاً انکار کر دیا کہ ایمانوئیل کالج اپنے طالب علموں کو "جواں ارض تخلیق" (young Earth creationism) کے نظریہ کی تعلیم دیتا ہے۔ ایمانوئیل کالج کے ایک سابقہ طالب علم پیٹر فرینچ نے اتنے ہی صریحاً انداز میں دعویٰ کیا تھا[۱۴۰] کہ 'ہمیں سکھایا گیا کہ دنیا ۶۰۰۰ سال پرانی ہے'***************۔ یہاں کون سچ بول رہا ہے؟ معلوم نہیں۔ لیکن لیفیلڈ کا خطاب اس کی سائنس پڑھانے کی حکمت عملی کے بارے میں سب کچھ بیان کر ہے۔ کیا وارڈی نے کبھی لیفیلڈ کا واضح منشور نہیں پڑھا؟ کیا وہ واقعی نہیں جانتا کہ اس کا سائنس کا سربراہ کیا گل کھلا رہا ہے؟ پیٹر وارڈی نے اپنی دولت پرانی گاڑیوں کے بیوپار میں بنائی تھی۔ آپ اس سے ایک گاڑی کیوں خریدیں گے؟ اور کیا آپ ٹونی بلئیر کی طرح اسے ۱۰ فصد قیمت پر ایک سکول کو بیچ دیں گے، اور ساتھ میں اخراجات کی ذمہ داری بھی اٹھا لیں گے؟ چلئے، بلئیر کے لئے تھوڑی دریا دلی دکھا دیتے ہیں، کہ اس نے واقعی لیفیلڈ کا خطاب نہیں پڑھا تھا۔ شاید یہ امید کرنا بھی زیادتی ہو گی کہ اب اس کی توجہ اس خطاب کی طرف ہو سکے گی۔

ہیڈ ماسٹر میکوئیڈ نے سکول کی وسیع النظری کا دفاع کرنے کی کوشش کی جو مربیانہ خوش فہمی کی ایک عمدہ مثال ہے:

> میں آپ کو یہاں کے ماحول کے بارے میں بتانے کے لئے چھٹی فارم (بارھویں جماعت کے برابر) میں فلسفے کے موضوع پر دیے گئے ایک خطاب کی مثال دے سکتا ہوں۔ شکیل جماعت میں بیٹھا تھا، اور اس نے کہا 'قرآن صحیح اور سچا ہے'۔ اور اس طرف بیٹھی کلئیر بولی 'نہیں ، انجیل سچّی ہے'۔ لہٰذا ہم نے ان کی مماثلت کی بات کی، اور یہ بھی دریافت کیا کہ وہ کہاں کہاں ایک دوسرے سے اختلاف کرتی ہیں۔ اور ہم سب نے اس بات پر اتفاق کیا کہ دونوں درست نہیں ہو سکتیں۔ بلآخر، میں نے کہا 'معاف کرنا شکیل، لیکن تم ہی غلط ہو'۔ اور اس نے کہا 'معاف کیجئے گا میکوئیڈ صاحب، لیکن آپ غلط ہیں۔ قرآن سچا ہے'۔ پھر سب دوپہر کے کھانے کے لئے چلے گئے اور وہاں بحث جاری رہی۔ ہم یہی چاہتے ہیں۔ کہ بچّوں کو معلوم ہو کہ ان کے ایمان کی وجہ کیا ہے، اور وہ اپنے ایمان کا دفاع کر سکیں'[۱۴۱]۔

کیا دل آویز منظر ہے! شکیل اور کلئیر اپنے مدعے پر بحث کرتے ہوئے اور اپنے غیر متفق عقائد کا دفاع کرتے ہوئے ایک ساتھ دوپہر کے کھانے کے لئے چلے گئے۔ لیکن کیا یہ منظر واقعی اتنا دل آویز تھا؟ درحقیقت، میکوئیڈ نے جو تصویر پیش کی ہے وہ قابل رحم نہیں ہے کیا؟ شکیل اور کلئیر نے اپنی بحث کی بنیاد آخر کن دلائل پر رکھی تھی؟ دونوں فریقین نے اپنی زور دار اور تعمیری بحث میں کن شواہد کا استعمال کیا؟ کلئیر اور شکیل نے محض اپنی اپنی کتاب کی برتری پر اسرار کرنے کے علاوہ تو کچھ اور نہیں کیا۔ بظاہر انہوں نے اتنا ہی کہا، اور درحقیقت آپ بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے اگر آپ کو بھی یہی کہا گیا ہے کہ سچ صحیفوں سے ملتا ہے شواہد سے نہیں۔ کلئیر ، شکیل اور ان کے معاصرین تعلیم حاصل نہیں کر رہے تھے۔ ان کا سکول انہیں مایوس کر رہا تھا، اور ان کے سکول کا پرنسپل ان کا جنسی نہیں دماغی استحصال کر رہا تھا۔

## بیدارئ شعور– ایک بار پھر

## Consciousness Raising – Once Again

اور اب ایک اور دل آویز منظر۔ ایک بار کرسمس کے دنوں میں میرا روزانہ کا اخبار "انڈپنڈنٹ Independent" تہوار سے منسلک تصاویر تلاش کر

*************** اس غلطی کی حدود کا اندازہ لگانے کے لئے تصوّر کیجئے کہ لندن سے نیو یارک تک کا فاصلہ ۸ء۷ گز ہے۔

رہا تھا اور اسے ایک سکول کے میلاد مسیح کے ڈرامہ (Nativity Play) میں دل کو گرما دینے والا عالمگیر نوعیت کا یہ منظر مل گیا، جسے اخبار نے فخریہ شہ سرخی میں لکھا تھا، "تین دانا" آدمیوں کے کردار نبھانے کے لئے شدبریت (ایک سکھ)، مشرّف (ایک مسلمان) اور عاڈیل (ایک عیسائی) کو منتخب کی گیا تھا، یہ سب چار سال کی عمر کے تھے۔

دل آویز؟ دل کو گرما دینے والا؟ نہ اول، نہ دوئم۔کلیتاً یہ بیہودگی ہے۔ صحیح دماغ والا ایسا کون شخص ہو گا جو چار سالہ بچّوں پر ان کے والدین کی سنساری اور الٰہیاتی رائے مسلط کرنا پسند گا؟ میری بات کو سمجھنے کے لئے ایک ایسی ہی متبادل تصویر کا تصوّر کیجئے اور شہ سرخی کو یوں بدل دیجئے: 'شدبریت (ایک کینزئینKeyesian )، مشرّف (ایک مانیٹرسٹMonetarist ) اور عاڈیل (ایک مارکسسٹMarxist )،عمر چار سال'۔ کیا یہ تصویر طیش آمیز احتجاجی خطوط کی وجہ نہیں بنے گی؟ یقیناً ہونی بھی چاہئے۔ اس کے باوجودمذہب کے عجیب و غریب استحقاق کی بدولت کسی نے تصویر کی اشاعت پر آواز تک نہیں نکالی۔ اور نہ ہی کسی ایسے موقعے پر پہلے کبھی نکالی گئی ہے۔ ذرا اس شور شرابے کا تصوّر کیجئے اگر شہ سرخی میں یہ لکھا ہوتا: ' شدبریت (ایک دہریہ)، مشرّف (ایک ملحد) اور عاڈیل (ایک لادین انسان دوست)، عمر چار سال'۔ کیا ان بچّوں کے والدین کے خلاف تفتیش نہ شروع ہو جاتی کہ آیا وہ بچّوں کی تربیت کے قابل ہیں بھی یا نہیں؟ برطانیہ میں جہاں مذہب اور ریاست کے درمیان کوئی آئینی دیوار نہیں ہے، دہریے والدین رخنہ پیدا کئے بغیر اپنے بچّوں کو اس مذہب کی تعلیم حاصل کرنے دیتے ہیں جو ان کے معاشرے میں دی جارہی ہو۔ "دی برائیٹس ڈوٹ نیٹ – 'The-Brights.net " (ایک امریکی مہم جس کا مقصد دہریوں کی ایک نئی پہچان استوار کرنا ہے، جیسے کسی زمانے میں ہم جنس پرستوں نے اپنے لئے gays کی پہچان بنائی تھی) اس نے بچّوں کی شمولیت سے منسلک اصول وضع کرنے میں بڑی احتیاط کا مظاہرہ کیا ہے: 'برائیٹ بننے کا فیصلہ خود بچّے کا ہونا چاہئے۔ کوئی بچّہ جسے بتایا گیا ہو کہ وہ برائیٹ ہو سکتا ہے یا اسے برائیٹ ہونا پڑے گا، برائیٹ نہیں بن سکتا'۔ کیا آپ کسی گرجے یا مسجد کا تصوّر بھی کر سکتے ہیں جو اس قسم کا خود سے انکار کرنے والا قانون بنائے؟ لیکن کیا انہیں اسی پر مجبور نہیں کیا جانا چاہئے؟ از راہ تبصرہ آپ کو بتاتا چلوں کہ میں نے بھی برائیٹس میں شمولیت اختیار کی ہے، کسی حد تک اس حقیقی تجسس کی وجہ سے کہ کیا ایسے لفظ کو تہذیبی نسبہ کے طور پر لسانیات میں شامل کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ میں جانتا تو نہیں لیکن یہ جاننے کی خواہش ضرور ہے کہ کیا لفظ gay بھی دانستاً داخل زبان کر لیا گیا تھا یا حادثاتی طور پرشامل ہو گیا[۱۴۲]؟ آغاز میں کچھ دہریوں نے بھی 'مغرور' کہلائے جانے کے ڈر سے برائٹس کی مہم کی کھلم کھلا مذمّت کی، جس کی وجہ سے مہم لڑکھڑا سی گئی تھی۔ اس کے برعکس ہم جنسوں کی مہم Gay Pride جھوٹی شرمساری کا شکار نہیں ہوئی، اور کامیاب رہی۔

ایک گزشتہ باب میں میں نے شعور کی بیداری کے بارے میں سیر حاصل بات کی تھی، جہاں میں نے آزادی نسواں کی علمبردار خواتین کو "نیک نیت لوگ" کی بجائے مروجہ اصطلاح "نیک نیت مرد" کے استعمال پر شرمندہ کرنے کی کامیاب کوشش کا ذکر کیا۔ یہاں میں آپ کے شعور کو ایک اور انداز سے بیدار کرنا چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں جب کسی بچّے پر کسی خاص مذہب سے منسلک ہونے کا ٹھپّہ لگا دیا جائے تو ہم سب کو اسی طرح شرمندگی محسوس کرنی چاہئے۔ بچّے کائنات، زندگی اور اخلاقیات کی شروعات کے بارے میں رائے رکھنے کے لئے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ 'عیسائی بچّہ' یا 'مسلمان بچّہ' کی اصطلاح تک کے استعمال پر آپ کو ایسی تکلیف اور کوفت ہونی چاہئے جیسے سکول میں بورڈ پر ناخن رگڑتے ہوئے ہوتی ہے۔

امریکی ریڈیو چینل KPFT-FM پر نشر ہونے والے آئرش زبان کے ریڈیو پروگرام ایریز(Aires) کی ۳ ستمبر ۲۰۰۱ کی یہ رپورٹ ملاحظہ کیجئے:

> شمالی بیلفاسٹ کی آرڈوئن روڈ پر واقع 'ہولی کراس گرلز پرائمری سکول' کی طالبات کو سکول میں داخل ہوتے وقت برطانیہ کے وفاداروں کے احتجاج کا سامنا کرنا پڑا۔ احتجاج کرنے والوں کو منتشر کرنے کے لئے رائل السٹر کانسٹیبلری اور برطانوی فوج کے سپاہیوں کی مدد طلب کی گئی۔ احتجاج کرنے والوں کے درمیان سے بچّیوں کے لئے راستہ بنانے کے لئے خصوصی جنگلے کھڑے کئے گئے۔ احتجاج کرنے والے ان بچّیوں کا مذاق اڑا رہے تھے اور فرقہ پرستانہ الفاظ استعمال کر رہے تھے۔ جب بچّیاں اور ان کے والدین سکول کے دروازے سے اندر داخل ہو رہے تھے تو احتجاجیوں نے ان پربوتلیں اور پتھر بھی برسائے۔

فطری بات ہے کہ کوئی بھی نفیس انسان ان بدقسمت بچّیوں کی تکلیف کو دیکھ کر پریشان ہو جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان کے اس طرح سے

"عیسائی بچّیاں" کہلائے جانے پر بھی ایسے ہی پریشانی محسوس کریں۔ (باب ا میں میں نے اس بات کی نشاندہی کی تھی کہ آئیرلینڈ میں تمیز کے دائریرے میں رہتے ہوئے پروٹسٹنٹ کو "وفادار Loyalist" کہا جاتا ہے جبکہ کیتھولک کو "قوم پرست Nationalist" کہا جاتا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ بچّوں پر بے دھڑک کیتھولک اور پرٹسٹنٹ کے ٹھپّے لگا دینے والے بالغ لوگ — جیسے کہ تخریب کار یا جلوس — پر یہی مذہبی ٹھپّے لگانے سے کترا جاتے ہیں۔)

ہمارا معاشرہ، بشمول غیر مذہبی حصے کے اس احمقانہ خیال کو تسلیم کرتا ہے کہ ننھے منّے بچّوں کو ان کے والدین کاتوسط سے مذہب کی تبلیغ کرنا احسن اور صحیح ہے، اور ان پر "کیتھولک بچّہ"، "پروٹسٹنٹ بچّہ"، "مسلمان بچہ"، "یہودی بچّہ" وغیرہ جیسے مذہبی ٹھپّے لگانا بھی جائز ہے۔ اگرچہ ان کے ہم پلّہ ٹھپّے — جیسے کہ قدامت پسند بچّے، آزاد خیال بچّے، ریپبلکن بچّے، ڈیموکریٹ بچّے — استعمال نہیں کئے جاتے۔ آپ سے درخواست ہے کہ اس معاملے میں اپنے شعور کو بیدار کیجئے، اور جہاں بھی ایسی حرکت ہوتی دیکھیں آسمان سر پر اٹھا لیجئے۔ کوئی بھی بچّہ عیسائی بچّہ یا مسلمان بچہ نہیں ہوتا، بلکہ عیسائی والدین کا بچّہ یا مسلمان والدین کا بچّہ ہوتا ہے۔ از راہ گفتگو، ناموں کی یہ ترکیب خود بچّوں کے شعور کی بیداری کے سلسلے میں خاصی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ جب کسی بچّے کو یہ سکھایا گیا ہو کہ وہ 'مسلمان والدین کی اولاد ہے'، تو وہ فوراً سمجھ جائے گا کہ مذہب ایک ایسی چیز ہے جس کا بڑے ہونے پر انتخاب بھی کیا جا سکتا ہے، — اور ٹھکرایا بھی جاسکتا ہے۔

سکولوں میں مذاہب کے تقابل کی تعلیم کے حق میں اچھا خاصا مقدمّہ بنایا جا سکتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ میرے اپنے شکوک بھی پہلی بار اس وقت پیدا ہوئے جب نو برس کی عمر میں (سکول نے نہیں میرے والدین نے) مجھے یہ سکھایا کہ جس عیسائی مذہب میں میری پرورش ہوئی تھی وہ بہت سے ایسے غیر مطابق مذہبی نظاموں میں سے ایک ہے ۔ مذہبی عذر خواہ خود بھی اس حقیقت کو محسوس کرتے ہیں، یہ ان کے لئے خوف کا باعث ہوتا ہے۔ انڈیپنڈنٹ اخبار میں میلاد مسیح کے ڈرامہ کی خبر شائع ہونے کے بعد مدیر کو کوئی ایک بھی خط موصول نہیں ہوا جس میں چار سال کے بچّوں پرمذہبی ٹھپّے لگا دینے کے بارے میں شکایت کی گئی ہو۔ واحد منفی خط "تحریک ہائے حقیقی تعلیم - Campaign for Real Education " سے موصول ہوا، جس کے نمائندے نک سیٹن نے کہا کہ بین المذاہب تعلیم شدید حد تک خطرناک ہے کیونکہ 'آج کل بچّوں کو سکھایا جاتا ہے کہ تمام مذاہب اپنی قدر میں برابر ہیں، جس کا مطلب ہے کہ ان کے اپنے مذہب کی کوئی خاص وقعت نہیں ہے'۔ باکل! اس کا یہی مطلب ہے۔ اس نمائندے کو واقعی پریشان ہونا چاہئے۔ ایک اور موقعے پر، اسی صاحب نے کہا کہ 'تمام عقائد کو درست تسلیم کرنا غلط ہے۔ ہر ایک کو، چاہے وہ ہندو ہو، یہودی ہو، عیسائی ہو یا مسلمان، حق ہے کہ وہ اپنے عقیدے کو باقی سب عقائد سے افضل سمجھے — ورنہ عقیدہ رکھنے کا مطلب ہی کیا ہے؟[۱۴۳]'

واقعی! عقیدہ رکھنے کا کیا مقصد ہے؟ اور یہ کیسی صاف حماقت ہے؟ یہ عقائد آپس میں کوئی مطابقت نہیں رکھتے۔ ورنہ اپنے عقیدے کو برتر سمجھنے کا کیا مطلب ہوا؟ لہٰذا، ان میں سے اکثریت 'دوسروں سے برتر' نہیں ہو سکتی۔ بچّوں کو مختلف عقیدوں کے بارے میں سیکھنے دیں، انہیں ان عقائد کی آپسی غیر ہم آہنگی کا مطالعہ کرنے دیں، اور انہیں اس غیر ہم آہنگی کے نتائج کے برے میں اپنے فیصلے کرنے دیں۔ اور جہاں تک اس عقیدے کی صحت کا سوال ہے، تو یہ ان بچّوں پر چھوڑ دیں، کہ وہ جب صحیح عمر کے ہوں تو خود ہی فیصلہ کرلیں ں۔

## مذہبی تعلیم کی ادبی تہذیب کے لئے خدمات

## Religious Education as Part of Literary Culture

مجھے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ میں اپنے وقت کے تعلیم یافتہ لوگوں کے مقابلے میں حالیہ دہائیوں کے لوگوں کی کمزور مذہبی معلومات سے بہت مایوس ہوں۔ یا شاید مسئلہ دہائیوں سے منسلک نہیں ہے۔ ۱۹۵۴ میں رابرٹ ہنڈ کی متفکّرانہ کتاب "خدا کیوں کر قائم ہیں - Why do Gods Persist" کے مطابق، امریکہ میں گیلپ کی منعقدہ ایک رائے شماری میں یہ باتیں پتہ چلیں۔ تین چوتھائی کیتھولک اور پروٹسٹنٹ صحیفۂ قدیم کے ایک بھی نبی کا نام نہیں بتا پائے۔ دو تہائی سے زائد لوگوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ پہاڑی پر وعظ (Sermon on the Mount) کس نے دیا تھا۔ ایک واضح اکثریت کا خیال تھا کہ موسیٰ عیسیٰ کے بارہ حواریوں میں سے ایک تھا۔ یہ ریاست ہائے متحدہ کا حال تھا، جو ترّقی یافتہ دنیا میں سب سے زیادہ مذہبی معاشرہ ہے۔

۱۶۱۱ کی کنگ جیمز بائیبل —کی مستند اشاعت — میں ایسے قطعات موجود ہیں جو اپنے آپ میں انگریزی ادب کے شاہکار ہیں، مثلاً گیتوں کے گیت (Song of Songs)، اور شاندار "عہد نامہ عتیق - Ecclesiastes" (جس کے بارے میں مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ اصلی عبرانی میں بھی بہت عمدہ لگتا ہے)۔ لیکن سب سے اہم وجہ جس کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انجیل کو ہمارے تعلیمی نصاب کا حصہ ہونا چاہئے یہ ہے کہ یہ کتاب ہماری ادبی تہذیب کی ایک اہم

ماخذ ہے۔ اور یہی منطق یونانی اور رومی خداؤں کے دیو مالائی قصّے کہانیوں پر بھی صادق آتی ہے، اور ہم ان پر ایمان لائے بغیر ان کے بارے میں پڑھ سکتے ہیں۔ ذیل میں انجیل سے ماخوذ یا اس سے متاثر چند فقرے اور جملے درج ہیں جو ادبی اور روز مرّہ کی انگریزی میں پائے جاتے ہیں، اعلیٰ شاعری سے لے کر گھسی پٹی کہاوت تک، ضرب المثل سے لے کر عام گپ شپ تک ہر ایک کی مثالیں ملتی ہیں:

Be fruitful and multiply • East of Eden • Adam's Rib • Am I my brother's keeper? • The mark of Cain • As old as Methuselah • A mess of pottage • Sold his birthright • Jacob's ladder • Coat of many colours • Amid the alien corn • Eyeless in Gaza • The fat of the land • The fatted calf • Stranger in a strange land • Burning bush • A land flowing with milk and honey • Let my people go • Flesh pots • An eye for an eye and a tooth for a tooth • Be sure your sin will find you out • The apple of his eye • The stars in their courses • Butter in a lordly dish • The hosts of Midian • Shibboleth • Out of the strong came forth sweetness • He smote them hip and thigh • Philistine • A man after his own heart • Like David and Jonathan • Passing the love of women • How are the mighty fallen? • Ewe lamb • Man of Belial • Jezebel • Queen of Sheba • Wisdom of Solomon • The half was not told me • Girded up his loins • Drew a bow at a venture • Job's comforters • The patience of Job • I am escaped with the skin of my teeth • The price of wisdom is above rubies • Leviathan • Go to the ant thou sluggard; consider her ways, and be wise • Spare the rod and spoil the child • A word in season • Vanity of vanities • To everything there is a season, and a time to every purpose • The race is not to the swift, nor the battle to the strong • Of making many books there is no end • I am the rose of Sharon • A garden inclosed • The little foxes • Many waters cannot quench love • Beat their swords into plowshares • Grind the faces of the poor • The wolf also shall dwell with the lamb, and the leopard shall lie down with the kid • Let us eat and drink; for tomorrow we shall die • Set thine house in order • A voice crying in the wilderness • No peace for the wicked • See eye to eye • Cut off out of the land of the living • Balm in Gilead • Can the leopard change his spots? • The parting of the ways • A Daniel in the lions' den • They have sown the wind, and they shall reap the whirlwind • Sodom and Gomorrah • Man shall not live by bread alone • Get thee behind me Satan • The salt of the earth • Hide your light under a bushel • Turn the other cheek • Go the extra mile • Moth and rust doth corrupt • Cast your pearls before swine • Wolf in sheep's clothing • Weeping and gnashing of teeth •Gadarene swine • New wine in old bottles • Shake off the dust of your feet • He that is not with me is against me • Judgement of Solomon • Fell upon stony ground • A prophet is not without honour, save in his own country • The crumbs from the table • Sign of the times • Den of thieves • Pharisee • Whited sepulchre • Wars and rumours of wars • Good and faithful servant • Separate the sheep from the goats • I wash my hands of it • The sabbath was made for man, and not man for the sabbath • Suffer the little children • The widow's mite • Physician heal thyself • Good Samaritan • Passed by on the other side • Grapes of wrath • Lost sheep • Prodigal son • A great gulf fixed • Whose shoe latchet I am not worthy to unloose • Cast the first stone • Jesus wept • Greater love hath no man than this • Doubting Thomas • Road to Damascus • A law unto himself • Through a glass darkly • Death, where is

thy sting? • A thorn in the flesh • Fallen from grace • Filthy lucre • The root of all evil • Fight the good fight • All flesh is as grass • The weaker vessel • I am Alpha and Omega • Armageddon • De profundis • Quo vadis • Rain on the just and on the unjust

[ہم نے ان الفاظ اور فقروں کا ترجمہ اس لئے نہیں کیا کیونکہ لغوی ترجمہ ان کی اہمیت اور مرتبہ کو بیان نہیں کر سکتا]۔

ان میں سے ہر ایک محاورہ، ضرب المثل اور فقرہ کنگ جیمز بائیبل ــ کی مستند اشاعت سے ہی لیا گیا ہے۔ یقیناً انجیل سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ہم انگریزی ادب کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔ اور صرف سنجیدہ ادب ہی نہیں۔ لارڈ جسٹس باون کی یہ درجہ ذیل نظم بہت ہی پر لطف اور اختراع پسندانہ ہے:

The rain it raineth on the just,
And also on the unjust fella.
But chiefly on the just, because
The unjust hath the just's umbrella

بارش انصاف پسند پر برستی ہے۔
اور انصاف کے دشمن پر بھی۔
لیکن زیادہ تر انصاف پسند پر ہی، کیونکہ
انصاف کے دشمن کے پاس انصاف پسند کا چھاتا ہوتا ہے۔

لیکن اگر آپ مطیع ۵:۴۵ کے سیاق و سباق سے نا آشنا ہوں تو اس نظم کا لطف ادھورا رہ جاتا ہے: ('اور وہ سورج کو طلوع کرواتا ہے بھلے پر بھی اور برے پر بھی، اور بارش برساتا ہے انصاف پسند پر بھی اور انصاف دشمن پر بھی')۔ اور اگر آپ بپتسمہ دینے والے یوحنا (John the Baptist) کے انجام سے نا واقف ہیں تو آپ My Fair Lady کے مرکزی کردار الیزا ڈولٹل کے تخیل کا لطف نہیں اٹھا سکتے:

'Thanks a lot, King,' says I in a manner well bred,
'But all I want is 'Enry 'Iggins' 'ead.'

'شکریہ بادشاہ سلامت'، میں کہتی ہوں بڑی شائستگی سے
لیکن مجھے تو صرف ہینری ہگنز کا سر چاہئے۔

میرے خیال میں پی جی ووڈہاؤس انگریزی ادب میں ہلکے پھلکے مزاح کا سب سے بڑا مصنف ہے، اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ انجیل سے اقتباس کی گئی میری فہرست کے آدھے سے زائد فقرے اس کی کہانیوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ (شاید گوگل ان سب کو نہیں ڈھونڈ پائے گا۔ وہ 'خالہ اور کاہل' نامی افسانے کے نام کی "کہاوتوں ں ٦:٦" سے منسوب کرنے میں ناکام رہے گی)۔ ووڈہاؤس کا مجموعہ انجیل کے اقتباسات سے بھرا پڑا ہے، جو نہ تو میری فہرست میں ہیں اور نہ ہی انگریزی زبان کی کہاوتوں اور ضرب المثل میں موجود ہیں۔ ساری رات شراب نوشی کے بعد اگلی صبح جاگنے کی تکلیف کا بیان برٹی ووسٹر کی زبانی سنئے: 'مجھے خواب آ رہے تھے کیسے کوئی خبیث میری کھوپڑی میں میخیں راسخ کر رہا ہے۔ کوئی عام میخیں نہیں، بلکہ ویسی جیسی حیبر کی بیوی یاعیل نے استعمال کی تھیں، لال دہکتی ہوئی'۔ برٹی اپنی ایک تعلیمی کامیابی کے بارے میں بہت فخر محسوس کرتا تھا، کہ اس نے ایک بار صحیفے کی معلومات کے سلسلے میں انعام جیتا تھا۔

جو بات مزاحیہ ادب کے بارے میں سچ ہے وہ سنجیدہ ادب کے بارے میں اور بھی زیادہ حقیقی ہے۔ نصیب شاہین نے شیکسپیئر کے کلام میں انجیل سے تیرہ سو اقتباسات کا حساب لگایا ہے، جس کا کثرت سے حوالہ دیا جاتا ہے[۱۴۴]۔ فیر فیکس ورجینیا میں (ٹمپلٹن فاؤنڈیشن کی مالی معاونت سے) شائع ہونے والی "انجیل

کی معلوماتی رپورٹ - The Bible Literacy Report" بہت سی مثالیں پیش کرتی ہیں اور انگریزی کے اساتذہ کی اس بات پر اتفاق کا ذکر کرتی ہے کہ ان کے مضمون کو مناسب انداز سے سمجھنے کے لئے انجیل کی تعلیم نہایت ت اہم ہے"[۱۴۵]. یقیناً فرانسیسی، جرمن، اطالوی، روسی، ہسپانوی اور دیگر یورپی ادبی مجموعوں پر بھی یہی دلیل صادق آتی ہے۔ اور عربی، یا بر صغیر ہند کی زبانیں بولنے والے لوگوں کے لئے اپنے ادبی اثاثے کی تعریف کے لئےغالباً قرآن یا بھگوت گیتا کی معلومات اتنی ہی اہم ہوتی ہوں گی۔ اور آخر میں، فہرست کو مکمل کرتے ہوئے، ناروے کے خداؤں کے بارے میں جانے بغیر آپ واگنر کی موسیقی (جس کے بارے میں ذکی انداز میں کہا گیا ہے کہ یہ جیسی سننے میں لگتی ہے اصل میں اس سے کہیں بہتر ہے) کی صحیح داد نہیں دے سکتے۔

میں اس نقطے پر مزید زور نہیں دوں گا۔ میں شاید اپنے سےبڑی عمر کے قارئین کو تو یہ بات باور کرانے میں کامیاب ہو ہی گیا ہوں کہ لادین زاویۂ نگاہ قطعاً ہمیں انجیل یا دیگر الہامی کتابوں کو تعلیمی نصاب سے علیحدہ کرنے کی ترغیب نہیں دیتا۔ ہم تاریخی طور پر ان مذاہب سے منسوب رہنے والے توہم پرست عقائد کو تسلیم کئے بغیر بھی یہودی مذہب، اینگلکن فرقے یا اسلام کے تہذیبی اور ادبی اثاثے سے ایک جذباتی وفاداری برقرار رکھ سکتے ہیں، اور شادی و موت کی مذہبی رسومات میں حصہ لے سکتے ہیں۔ ہم اپنے ثقافتی ورثے سے تعلق توڑے بغیر خدا سے تعلق توڑ سکتے ہیں۔

# باب ۱۰ : ایک انتہائی ضروری خلاء ؟

A MUCH NEEDED GAP?

اس سے زیادہ دل کو دہلا دینے والی کیا بات ہو سکتی ہے کہ آپ ایک ۱۰۰ انچ کی دور بین سے کسی دور افتادہ کہکشاں کا معائنہ کر پائیں، ایک ۱۰۰ سال پرانے حجریہ (fossil) یا کسی ۵۰۰،۰۰۰ سال پرانے اوزار کو اپنے ہاتھوں میں تھامے، گرانڈ کینئین جیسے زمان و مکان کے عظیم خلاء کے سامنے کھڑا ہو یا کوئی سائنسدان کا خطاب سنیں جس نے کائنات کی ابتداء پر نظر ڈالی اور پلک نہیں جھپکی؟ یہ ہے گہری اور مقدس سائنس۔ (مائیکل شرمر)

'یہ کتاب ایک اشد ضروری خلاء کو پر کرتی ہے'۔ یہ مذاق اس لئے کامیاب ہے کیونکہ ہم اس کے دونو ں مختلف مطلب بیک وقت سمجھ سکتے ہیں۔ اتفاق کی بات ہے، میرا یہ خیال تھا کہ یہ لطیفہ کسی کا ایجاد کردہ ہے لیکن یہ جان کر مجھے بڑی حیرانی ہوئی کی ناشرین اپنی معصومیت میں اس کا باقاعدہ استعمال کرتے رہے ہیں۔ www.amazon.co.uk/Tel-Quel-Reader-Patrick-Ffrench/dp/۰۴۱۵۱۵۷۱۴۵ مذکورہ لنک میں اس کتاب کا ذکر دیکھئے جو ' پس ساختیاتی (post-structuralism) تحریک پر مبنی ادب میں ایک اشد ضروری خلاء کو پر کرتی ہے'۔ یہ کتنا موزوں اور حسین اتفاق ہے کہ یہ مسلمہ فاضل کتاب مشیل فوکو، رولا بارتھ اور جولیا کرسٹیوا جیسے اعلیٰ پائے کے جعلی فرانسیسی پسند آئکون(icons ) کے بارے میں ہے۔

کیا مذہب ایک اشد ضروری خلاء کو پر کرتا ہے؟ عموماً ایسا کہا جاتا ہے کہ انسان کے دماغ میں خدا کی ساخت کا ایک خلاء موجود ہوتا ہے جو پر ہونا چاہتا ہے: ہمارے اندر خدا کے لئے ایک نفسیاتی چاہت ہے — ایک خیالی دوست، باپ، بڑا بھائی، راز داں اور اعتراف کرنے والا — اور اس ضرورت کو مطمئن کرنا نہایت اہم ہے قطع نظر اس بات سے کہ خدا کا وجود ہے یا نہیں۔ لیکن، کیا یہ ممکن ہے کہ ہم جس خلاء کو "خدا" سے پر کر رہے ہیں اسے کسی اور چیز سے پر کیا جائے تو بہتر ہو گا؟ شاید سائنس؟ یا فنون لطیفہ؟ انسان دوستی؟ انسانیت پرستی؟ قبر سے آگے کی زندگیوں کو اہمیت دیے بغیر اس زندگی سے پیار؟ قدرت سے پیار، یا عظیم ماہر حشرات الارض ای او ولسن کے الفاظ میں حب حیاتیات (Biophilia) ؟

مذہب کے بارے میں عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مختلف ادوار میں اس نے چار اہم فرائض ادا کئے ہیں: وضاحت، نصیحت، تسلّی اور کشف۔ تاریخ کے دوران مذہب کی خواہش رہی ہے کہ وہ انسان کے وجود اور کائنات کی حقیقت کی وضاحت مہیا کر سکے۔ اس فرض کی بجا آوری میں سائنس نے مذہب کو مکمل طور پر پیچھے چھوڑ دیا ہے، اور اس کا بیان باب ۴ میں کیا جا چکا ہے۔ نصیحت سے میری مراد اخلاقیات کی تعلیم و تربیت سے ہے، جس پر میں نے باب ٦ اور ۷ میں بات کی ہے۔ لیکن ابھی تک میں نے دلاسے اور کشف کے موضوعات کے ساتھ انصاف نہیں کیا، اور اس آخری باب میں مختصراً ان کے بارے میں چند باتیں کی جائیں گی۔ تسلّی کے موضوع پر ابتداًیں میں بچپن میں "خیالی دوست" کے تجربے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو مذہبی اعتقاد سے بہت قربت رکھتاہے۔

## بنکر

## BINKER

میرا خیال ہے کرسٹوفر روبن کا حقیقت میں ایسا خیال نہیں ہو گا کہ Winnie the Pooh اور Piglet (بچّوں کی مشہور کہانی کے کردار) اس سے باتیں کرتے ہیں۔ لیکن کیا بنکر مختلف تھا؟

بنکر — جیسا میں نے اس کو نام دیا ہے — میرا راز ہے۔<br>
اور بنکر ہی وجہ ہے کہ میں کبھی اکیلا نہیں پڑتا۔<br>
کھیل کے کمرے میں کھیلتا ہوا، کرسی پر بیٹھا<br>
میں جہاں بھی مصروف رہوں، بنکر وہیں ہوتا ہے۔

ارے! ابّا ہوشیار ہیں، بڑے ہوشیار قسم کے آدمی
اور امّاں سے اچھا پوری دنیا میں کوئی نہیں
اور آیا تو آیا ہے، جسے میں آیا ہی کہتا ہوں
لیکن یہ سب بنکر کو نہیں دیکھ سکتے۔

بنکر ہر وقت بولتا رہتا ہے، کیونکہ میں اسے بولنا سکھا رہا ہوں
اور کبھی کبھی وہ عجیب سی آوازیں بھی نکالتا ہے
اور کبھی صرف علتوں کی آوازوں میں غرّاتا ہے....
کرنا سب مجھے ہی پڑتا ہے کیونکہ اس کا گلا ہی خراب رہتا ہے۔
ارے! ابّا ہوشیار ہیں، بڑے ہوشیار قسم کے آدمی
اور امّاں تو سب ہی کچھ جانتی ہیں
اور آیا تو آیا ہے، جسے میں آیا ہی کہتا ہوں
لیکن یہ سب بنکر کو نہیں جانتے۔

ہم باغ میں کھیلتے ہیں تو بنکر شیروں جیسا بہادر ہوتا ہے؛
اور رات میں لیٹے ہوئے بنکر چیتوں جیسا بہادر ہوتا ہے۔
بنکر ہاتھی سے بھی بہادر ہے، وہ کبھی نہیں، کبھی بھی نہیں روتا....
سوائے اس وقت کے جب اس کی آنکھ میں صابن لگ جاتا ہے۔
ارے! ابّا تو ابّا ہیں، جیسے ابّا ہوتے ہیں۔
اور امّاں تو اتنی امّاں ہیں جتنا کوئی ہو سکتا ہے۔
اور آیا تو آیا ہے، جسے میں آیا ہی کہتا ہوں
لیکن یہ سب بنکر جیسے نہیں ہیں۔

بنکر لالچ بھی نہیں کرتا، لیکن کھانے کا شوق تو ہے۔
جب کوئی مجھے مٹھائی دیتا ہے تو مجھے ان کو یاد دلانا پڑتا ہے۔
'بنکر کو بھی چاکلیٹ چاہئے، تو مجھے دو ٹکڑے دے دیجئے'۔
پھر میں اس کی خاطر کھا بھی لیتا ہوں، کیونکہ اس کے دانت ابھی نئے ہیں ۔
مجھے ابّا سے پیار ہے، لیکن ان کے پاس تو کھیلنے کا وقت ہی نہیں؛
مجھے امّاں سے بھی پیار ہے، لیکن انہیں بھی کہیں جانا پڑتا ہے؛
اور میں آیا سے بھی لڑ پڑتا ہوں جب وہ میرے بال بناتی ہے؛
لیکن بنکر تو صرف بنکر ہے، اور ہر وقت وہیں ہوتا ہے۔

اے اے ملن — اور اب ہم چھ ہیں

A. A. Milne – And Now We Are Six --

[†††††††††††††††] یہ نظم اے اے ملن کی املاک سے اجازت کے بعد شامل کی گئی۔

کیا خیالی دوست بنانے کا رجحان بچپن کے عام تصوّراتی کھیلوں سے مختلف ایک اعلیٰ درجے کا فریب نظر ہے؟ میرے اپنے تجربات یہاں میری رہنمائی نہیں کر پا رہے ہیں۔ بہت سے والدین کی طرح، میری والدہ بھی میری کہی ہوئی بچکانہ باتوں کو ایک کاپی میں لکھ لیتی تھیں۔ ان سادہ سے جھوٹے موٹے دکھاوں (اب میں چاند کا باسی ہوں.... آلہ رفتار... بابل کا رہائشی) کے علاوہ میں دوسرے درجے کے دکھاوں کا بھی بہت شوقین تھا (اب میں ایک الّو ہوں جو پن چکّی ہونے کا دکھاوا کر رہا ہے) جو شاید معکوس ہوں (اب میں ایک لڑکا ہوں جو رچرڈ ہونے کا دکھاوا کر رہا ہے)۔ مجھے کبھی بھی یہ یقین نہیں تھا کہ میں ان میں سے کوئی بھی چیز ہوں، اور میرے خیال میں بچپن کے خیالی کھیلوں میں یہ سچ مشترک ہوتا ہے۔ لیکن میرے پاس کوئی بنکر نہیں تھا۔ بالغ عمر میں لی گئی شہادتوں کو دیکھا جائے تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ ان میں سے چند تو ایسے ہیں جو اپنے بچپن میں یہ مانتے تھے کہ ان کے خیالی دوست حقیقی وجود رکھتے ہیں جبکہ کچھ ان کو واضح فریب نظر کے طور پر بھی دیکھتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ بچپن کا یہ 'بنکر رجحان' بالغ عمر کے مذہبی عقیدے کو سمجھنے میں ہماری مدد کر سکتا ہے۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ ماہرین نفسیات نے اس پر اس نقطۂ نظر سے تحقیق کی ہے یا نہیں، لیکن میرے خیال میں یہ تحقیق کے لئے ایک بہت عمدہ موضوع فراہم کر سکتا ہے۔ دوست اور رازدار، عمر بھر کے لئے ایک بنکر: یقیناً یہ ایک ایسا فریضہ ہے جو خدا سر انجام دیتا ہے — ایک ایسا خلاء جو خدا کے چلے جانے سے باقی رہ جائے گا۔

ایک اور بچّی کے پاس 'جامنی رنگ کا بونا' تھا، جو اس کے لئے حقیقی وجود رکھتا تھا اور جو ایک دم لطیف سی کھنک کے ساتھ چمکتے ہوئے اپنے آپ کو ہوا میں سے ظاہر کرتا تھا۔ وہ بڑی باقاعدگی سے بچّی سے ملاقات کرنے آتا تھا، خاص کر جب وہ اکیلا پن محسوس کرتی تھی، لیکن جیسے جیسے بچّی بڑی ہوتی گئی بونے کا آنا کم ہوتا گیا۔ سکول میں داخلے سے پہلے ایک دن وہ جامنی رنگ کا بونا بچّی کے پاس اپنی مخصوص کھنکتی چمک کے ساتھ نمودار ہوا اور اسے بتایا کہ اب وہ اسے ملنے نہیں آئے گا۔ بچّی کچھ اداس ہو گئی لیکن بونے نے اسے سمجھایا کہ اب وہ بڑی ہو گئی ہے اور مستقبل میں اسے بونے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اسے چلنا ہو گا، کیونکہ اب اور بچّے اس کی توجہ کے مستحق ہیں۔ جاتے جاتے اس نے وعدہ کیا کہ اگر کبھی واقعی بچّی کو اس کی ضرورت پڑی تو وہ بخوشی آ جائے گا۔ بہت سال بعد وہ خواب میں ملنے آیا، جب وہ بچّی ایک ذاتی مشکل سے گزر رہی تھی اور اسے ایک اہم فیصلہ کرنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ خوابگاہ کا دروازہ کھلا اور کتابوں کا ایک انبار نمودار ہوا.... جسے جامنی رنگ کا بونا دھکیل رہا تھا۔ اس نے خواب کی یہ تعبیر کی کہ اسے یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہئے — اس نے یہ صلاح قبول کر لی، جو اس کے لئے فائدہ مند ثابت ہوئی۔ اس کہانی کو سن کر میں تھوڑا آبدیدہ ہونے لگتا ہوں، اور لوگوں کی زندگیوں میں خیالی دوستوں کے دلاسا اور مشاورت فراہم کرنے کے کردار کی سمجھ کے جتنے قریب پہنچ سکتا ہوں، پہنچ جاتا ہوں۔ ایسا ممکن ہے کہ ایک ہستی کا وجود صرف تخیل میں ہو، لیکن پھر بھی بچّے کے لئے پوری طرح حقیقی ہو اور اسے سچّا ذہنی سکون اور اچھی صلاح دیتا ہو۔ مزید بر آں، صرف خیالی دوست — اور خیالی خدا — کے پاس ہی اتنا وقت اور صبر ہوتا ہے کہ ان کو دیکھنے والے انسان کو اپنی مکمل توجہ دے سکے۔ اور وہ نفسیاتی معالج یا پیشہ ور مشیروں سے سستے بھی پڑتے ہیں۔

کیا اپنے مشاورت اور تسلّی دینے کے کردار میں خدا بنکروں سے کسی قسم کی 'طفلی شباہت سازی' (paedomorphosis) کے ذریعے ارتقاء کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں؟ دور بلوغت میں بچکانہ خصوصیات کے باقی بچ جانے کے عمل کو نفسیات کی زبان میں طفلی شباہت سازی کہا جا سکتا ہے۔ پیکنیز کتوں کی شکلیں طفلی شباہت رکھتی ہیں: بالغ کتوں کی شکلیں بھی بچّوں جیسی ہی ہوتی ہیں۔ عمل ارتقاء میں یہ ایک معروف نمونہ ہے اور بڑھے ہوئے ماتھے اور کھنچے ہوئے جبڑے جیسی انسانی خصوصیات کی افزائش کے لئے اس کی اہمیت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ ماہرین ارتقاء نے ہمیں بھی نابالغ بندر سے مشابہ قرار دیا ہے، اور یہ واقعی سچ ہے کہ اپنی بالغ حالت کے مقابلے میں نابالغ بن مانس یا گوریلے انسان سے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔ کیا مذہب کا ارتقاء بھی ایسے ہی کسی عمل کے نتیجے میں ہوا ہو گا جہاں اس لمحے کو کہ جب بچّے اپنے اپنے بنکر کو چھوڑ دیتے ہیں، بتدریج نسلوں پر محیط وقفے تک ملتوی رکھا گیا — جیسے ارتقاء کے دوران ہمارے ماتھے ابھر گئے تھے اور جبڑے چھوٹے ہو گئے تھے؟

میرا خیال ہے منطق کو مکمل کرنے کے لئے ہمیں الٹ امکان کو بھی مد نظر رکھنا چاہئے۔ بجائے یہ فرض کرنے کے کہ خدا قدیم بنکر سے پیدا ہوئے ہوں گے، کیا ہم یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ بنکر عمل ارتقاء کے نتیجے میں قدیم خداؤں سے پیدا ہوئے ہوں گے؟ مجھے اس کا بہت کم امکان نظر آتا ہے۔ یہ خیال مجھے امریکی ماہر نفسیات جولین جینز کی کتاب "دو مجلسی ذہن کے فتور کے نتیجے میں شعور کی ابتداء — The Origin of Consciousness in the Breakdown of the Bicameral Mind" پڑھنے کے بعد آیا، جو اپنے نام کی طرح ایک عجیب و غریب کتاب ہے۔ یہ ان کتابوں میں سے ہے جو یا تو مکمل بکواس ہوتی ہیں یا دانش کا ایک اعلیٰ نمونہ ہوتی ہیں، لیکن درمیان میں نہیں! اور شاید یہ اوّل الذکر ہی ہے، لیکن میں اپنے آپ کو غلط فیصلے سے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔

جینز کا مشاہدہ ہے کہ اکثر لوگ اپنے خیالات کا ادراک اپنی "خودی" اور ایک مزید داخلی کردار کے درمیان ایک مکالمے کی صورت میں کرتے ہیں۔

آج کے دور میں ہم یہ بات سمجھ چکے ہیں کہ دونوں 'آوازیں' ہماری اپنی ہی ہیں — اور جو ایسا نہیں سمجھ پاتے انہیں دماغی مریض سمجھا جاتا ہے۔ ایک قلیل عرصے کے لئے ایولن واح (Evelyn Waugh) کے ساتھ بھی ایسی ہی واردات ہوئی اور وہ چند دن ذہنی مریض رہا۔ منہ پھٹ واح نے ایک دوست سے کہا: 'بہت عرصے سے تم سے ملاقات نہیں ہوئی، لیکن حال میں میں بہت کم لوگوں سے مل پایا کیونکہ — جانتے ہو تم؟ — میں پاگل ہو گیا تھا۔' صحتیابی کے بعد واح نے ایک ناول لکھا "گلبرٹ پنفولڈ کی آزمائش — The Ordeal of Gilbert Pinfold" جس میں اس نے اپنی ہذیانی کیفیت (hallucination) اور دماغ میں سنائی دینے والی آوازوں کی منظر کشی کی ہے۔

جینز کا خیال ہے کہ ۱۰۰۰ سال قبل از مسیح میں وہ اس بات سے آگاہ نہیں تھے کہ دوسری آواز — گلبرٹ پنفولڈ کی آواز — ان کے اپنے اندر سے آتی ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ پنفولڈ والی آواز خدا ہے: اپالو (Appolo)، یا اشطر (Astarte)، یا خداوند یاہوے (Yahweh)، یا کوئی نچلے درجے کا گھریلو خدا، جو انہیں صلاح یا حکم دیتا ہے۔ جینز نے یہ نشاندہی بھی کی کہ ان خداؤں کی آماجگاہ دماغ کے اس نصف کرہ سے میں نہیں جہاں سے قابلِ سماعت آواز کی ہدایات جاری ہوتی ہیں، بلکہ اس کے الٹ والا کرہ ہے۔ "دو دیوانے ذہن کا فتور" جینز کی نظر میں ایک تاریخی تبدیلی تھا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب لوگوں پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ بیرونی لگنے والی یہ آوازیں اصل میں ان کے اندر سے ہی آ رہی تھیں۔ جینز تو اس حد تک جاتا ہے کہ وہ اس تبدیلی کو انسانی شعور کی بیداری گردانتا ہے۔

خالق خدا پیتاہ (Ptah) کے بارے میں ایک قدیم مصری عبارت میں دیگر تمام خداؤں کو پیتاہ کی 'زبان' یا 'آواز' کی مختلف صورتوں کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ جدید تراجم لغوی 'آواز' والے معنی ترک کرتے ہوئے دیگر خداؤں کو تشریحاً پیتاہ کے ذہن کے 'مجسم تصوّر' کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ جینز ایسی 'تعلیم یافتہ' تشریحات کو نظر انداز کرتے ہوئے لغوی معنی کو ترجیح دیتا ہے۔ یہ خدا حالت ہذیان میں سنی گئی آوازیں تھے، جو انسانوں کے ذہنوں کے اندر بول رہے تھے۔ جینز مزید یہ بھی کہتا ہے کہ ان خداؤں کا ارتقاء وفات شدہ بادشاہوں سے منسلک یادوں سے ہوا جو اب بھی، ایک زاویے سے اپنی رعایہ پر ان خیالی آوازوں کے ذریعے راج کر رہے تھے۔ چاہے آپ جینز کے نقطۂ نگاہ کو تسلیم کریں یا نہ کریں، جینز کی کتاب اتنی دلچسپ تو ضرور ہے کہ مذہب کے موضوع پر لکھی جانے والی کسی بھی کتاب میں اس کا ذکر واجب ہے۔

اب ہم خداؤں اور "بنکر" کے ترّقیاتی نقطۂ نظر سے ایک دوسرے سے منسلک ہونے کا ایک نظریہ تراشنے کی مشق کی جانب چلتے ہیں، جو میں نے جینز کے خیالات مستعار لیتے ہوئے شروع کیا ہے، لیکن اس کی 'طفلی شباہت سازی' کے نظریے سے الٹ سمت میں۔ میری تجویز کا لب لباب یہ ہے کہ دو دیوانے ذہن کا فتور تاریخ میں ایک دم وقوع پزیر نہیں ہوا بلکہ انسانی ذہن میں ہذیانی آوازوں اور شبیہوں کے حقیقی نہ ہونے کے ادراک کے لمحے کے بتدریج بچپن کی جانب سفر کی صورت میں پیش آیا۔ ایک طرح سے، 'طفلی شباہت سازی' کے نظریے سے الٹ، ہذیانی خدا پہلے بالغ ذہنوں سے غائب ہوئے، اور پھر پیچھے، مزید پیچھے کم عمری میں ہی غائب ہوتے چلے گئے، حتیٰ کہ آج وہ صرف بنکر یا جامنی بونے کی صورت میں ہی باقی بچے ہیں۔ لیکن میرے نظریے کی اس صورت میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ یہ بالغ دماغوں میں آج بھی خداؤں کی بدستور موجودگی کی وضاحت فراہم کرنے سے قاصر ہے۔

شاید بہتر یہ ہو گا کہ بنکر اور خداؤں کو ایک دوسرے کے اب و جد تصوّر کرنے کی بجائے دونوں کو ایک ہی نفسیاتی رجحان کے ضمنی پیداوار کے طور پر دیکھا جائے۔ خداؤں اور بنکر میں ذہنی سکون فراہم کرنے کی صلاحیت مشترک ہے، اور وہ آپ کو نت نئے خیالات کے بارے میں سوچنے کے لئے ایک اچھی سلیٹ فراہم کرتے ہیں۔ ہم باب ۵ میں پیش کئے گئے مذہبی ارتقاء کو نفسیاتی ضمنی پیداوار کے طور پر دیکھنے کے نظریے سے بہت دور نہیں نکل پائے ہیں۔

## تسلّی یا دلاسا

## Consolation

اب وقت آن پہنچا ہے کہ تسلّی دینے میں ہم خدا کے اہم ترین کردار کا اعتراف کریں؛ اور اگر اس کا وجود نہیں ہے، تو انانیت کو درپیش اس کے مترادف مہیا کرنے کی کٹھن مشکل کا بھی اعتراف کرنا پڑے گا۔ بہت سے لوگ جو تسلیم کرتے ہیں کہ شاید خدا کا وجود نہیں ہے اور وہ اخلاقیات کے لئے ضروری بھی نہیں ہے پھر بھی ایک ترپ کا پتہ ہاتھ میں لئے آتے ہیں: خدا کی وہ مبیّنہ نفسیاتی یا جذباتی ضرورت۔ لوگ کسی قدر تند خوئی سے پوچھتے ہیں کہ اگر آپ مذہب کو زندگی سے نکال دیں گے تو اس کی جگہ کیا مہیّا کریں گے؟ قریب المرگ مریضوں کو، ان کے رنجیدہ لواحقین کو، ان اکیلی 'ایلینور

رگبی ' کو جن کا خدا کے علاوہ کوئی دوست نہیں، آپ کے پاس دینے کے لئے کیا ہے؟

اس سوال کے جواب میں کہنے والی پہلی بات تو ایسی ہے کہ اس کے کہنے کی ضرورت بھی نہیں ہونی چاہئے۔ مذہب کے دلاسا دینے کی قابلیت اس کو سچ ثابت نہیں کر دیتی۔ اگر ہم ایک بہت ہی بڑی رعایت کر بھی دیں؛ اور یہ حتمی طور پر ثابت ہو بھی جائے کہ خدا میں یقین انسان کی نفسیاتی اور جذباتی صحت کے لئے ناگزیر ہے؛ اگر تمام دہریے نا امید قسم کے خلل اعصاب کے مریض ہوتے جو کل کائنات پر غصے کی وجہ سے خود کشی کی طرف گامزن ہوتے — تب بھی یہ تمام ریت کے ذرّے کے برابر بھی اس بات کا ثبوت نہ ہوتا کہ مذہبی عقیدہ سچ ہے۔ شاید یہ خود کو خدا کے وجود کے بارے میں قائل کرنے کی خواہش کے حق میں ثبوت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے، خواہ خدا کا وجود ہو یا نہ ہو۔ جیسا کہ میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں، " طلسم ٹوٹتا ہے — Breaking the Spell" میں ڈینئیل ڈینیٹ خدا پر عقیدہ رکھنے اور عقیدے میں یقین رکھنے کے درمیان فرق بیان کرتا ہے: یہ عقیدہ کہ کسی عقیدے پر یقین کرنا مرغوب ہے، اگرچہ وہ عقیدہ جھوٹ بھی ہو: 'اے مالک میں یقین کرتا ہوں؛ میری بے یقینی کو یقین میں بدل دے' (مارک ۹:۲۴)۔ ایمان والوں کو ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ عقیدے کا دعویٰ ضرور کریں، خواہ وہ اس کے قائل ہوں یا نہ ہوں ۔ غالباً اگر آپ کسی بات کو بار بار دہرائیں تو آپ خود کو اس کے سچ ہونے کا یقین بھی دلاسکتے ہیں۔ میرے خیال میں ہم سب ہی ایسے لوگوں کو جانتے ہیں جو مذہبی عقیدے کے خیال میں بہت لذّت محسوس کرتے ہیں، اور اس پر کئے جانے والے حملوں پر برہم بھی ہوتے ہیں، لیکن ہچکچاتے ہوئے اعتراف بھی کرتے ہیں کہ وہ خود کسی عقیدے سے منسلک نہیں۔ میں اپنے ہیرو پیٹر میڈاوار کی کتاب "سائنس کی حدود — The Limits of Science" کے باب ۲ میں ایک اعلیٰ پائے کی مثال دیکھ کر ششدر رہ گیا: 'مجھے خدا پر اور مذہبی جوابات پر، یقین نہ ہونے کا افسوس ہے، کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اگر خدا پر یقین کرنے کے مستند سائنسی اور فلسفیانہ ثبوت دریافت ہو جائیں تو بہت سے لوگوں کو اطمینان اور سکون ملے گا'۔

ڈینیٹ کی تفریق پڑھنے کے بعد سے میں اسے متعدد مواقع پر استعمال کر چکا ہوں۔ اس میں قطعی کوئی مبالغہ نہیں کہ دہریوں کی اکثریت — کم از کم جن کو میں جانتا ہوں — اپنی لادینیت کو تقویٰ کے بہروپ کے پیچھے چھپائے رکھتے ہیں۔ وہ خود تو کسی مافوق الفطرت چیز پر ایمان نہیں رکھتے لیکن غیر منطقی عقائد کے لئے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ بھی رکھتے ہیں۔ یہ لوگ ایمان رکھنے پر یقین کرتے ہیں۔ بڑی حیرانی کی بات ہے کہ کتنے ہی لوگ "X سچ ہے" اور "یہ ایک نیک خواہش ہے کہ لوگ اس بات پر ایمان لائیں کہ X سچ ہے" کی دو صورتوں میں فرق نہیں بتا سکتے۔ یا شاید حقیقت میں وہ اس منطقی مغالطے میں پڑتے ہی نہیں ہیں بلکہ سچ کو انسانی جذبات کے مقابلے میں محض غیر اہم سمجھتے ہیں۔ میں انسانی جذبات کی مذمّت نہیں کر رہا۔ لیکن ایک معاملے کے بارے میں ہمارا ذہن بالکل صاف ہونا چاہئے: ہم کسی بھی گفتگو میں کسی چیز کے بارے میں بات کرتے ہیں، جذبات یا حقیقت؟ دونوں اہم ہیں، لیکن دونوں ایک نہیں ہیں۔

بہر طور میری فرضی رعایت بے جا اور غلط تھی۔ دہریوں میں ہار مان لینے کے غصے سے بھرپور رجحان کے پائے جانے کے بارے میں میں نے کبھی کوئی ثبوت نہیں دیکھے۔ کچھ دہریے ے خوش رہتے ہیں، اور کچھ دکھ اور تکلیف میں ہی رہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح کچھ عیسائی، یہودی، مسلمان، ہندو اور بدھ پرست بھی دکھی رہتے ہیں جبکہ کچھ خوش رہتے ہیں۔ شاید خوشی اور ایمان (یا اس کی غیر موجودگی) میں کوئی شماریاتی تعلق موجود ہو لیکن مجھے شک ہے کہ دونوں ہی اطراف کوئی مضبوط تعلق ممکن ہو گا۔ مجھے یہ سوال کرنے میں زیادہ دلچسپی ہے کہ کیا ہمارے پاس خدا کی غیر موجودگی میں خود کو غمزدہ محسوس کرنے کی کوئی خاطر خواہ وجہ موجود ہے۔ میں اس کتاب کو اس بحث پر ختم کرنا چاہوں گا کہ غمزدہ محسوس کرنے کی بجائے یہ کہنا کہ مافوق الفطرت عقائد کی غیر موجودگی کے باوجود ایک مکمل اور خوشگوار زندگی گزاری جا سکتی ہے ، اس حقیقت کے سچ کو پوری طرح بیان نہیں کر پاتی ہے۔ اس سے پہلے مجھے مذہب کے ان دعوں کا معائنہ کرنا ہو گا کہ وہ انسان کو تسلی دینے کا کام کرتا ہے۔

انگریزی لغت Shorter Oxford Dictionary کے مطابق تسلّی کا انگریزی مترادف لفظ consolation کا مطلب غم یا ذہنی تکلیف کی تخفیف کا نام ہے۔ میں تسلی کو دو اجزا میں تقسیم کروں گا۔

۱. **براہ راست جسمانی تسلّی** — رات کے اندھیرے میں پہاڑ کی چوٹی پر پھنسے ہوئے ایک آدمی کو سینٹ برنارڈ نسل کے کتے کی رفاقت میں راحت میسّر آ سکتی ہے، خصوصاً اگر اس کے گلے میں برانڈی کا پیپا بھی بندھا ہوا ہو۔ روتی ہوئی بچّی کو مضبوط باہوں کے سہارے اور تسلّی بخش الفاظ سے راحت میسّر ہو سکتی ہے۔

---

‡‡‡‡‡‡‡‡‡‡‡‡‡ مشہور زمانہ پاپ موسیقی کے گروپ " بیٹلز۔ Beatles" کے گیت Eleanor Rigby میں ایک ایسی خاتون کا ذکر کیا گیا ہے جو ساری عمر اکیلے پن کی زندگی گزار کر اکیلے ہی مر گئی۔

۲. **کسی ایسی حقیقت کی دریافت جس کی قدر نہ کی گئی ہو، یا موجودہ حقائق کو دیکھنے کے غیر دریافت شدہ زاویے کے ذریعے تسلّی** — جنگ میں مارے جانے والی کسی شخص کی بیوہ کو اس بات سے تسلی مل سکتی ہے کہ وہ اس کے بچّے کی ماں بننے والی ہے، یا یہ کہ اسے شہید کی موت میسّر آئی۔ کسی مسئلے کے بارے میں سوچ کے ایک نئے زاویے کی دریافت سے بھی تسلّی حاصل ہو سکتی ہے۔ ایک فلسفی نے یہ نقطہ اٹھایا کہ کسی بوڑھے آدمی کی وفات کوئی خاص بات نہیں رکھتی ہے۔ وہ جو کبھی بچّہ تھا، وہ تو کب کا 'مر' چکا تھا، ایکدم وفات پا کر نہیں، بلکہ بالغ ہو جانے کی وجہ سے ۔ شیکسپیئر نےانسانی زندگی کے سات ادوار بتائے ہیں کہ کس طرح انسان کشاں کشاں موت سے قریب ہوتا جاتا ہے۔اس نقطہ نظر سے بوڑھے آدمی کی وفات کا لمحہ ان تمام ست رو اموات سے مختلف نہیں جن سے انسان اپنی زندگی میں گزرتا ہے"[۴۶]۔ ایک ایسا شخص جو اپنی موت کے خیال سے لطف اندوز نہیں ہوتا اس بدلتے ہوئے نقطۂ نظر سے خاصی تقویت حاصل کرے گا۔ یا شاید نہ بھی کرے۔ لیک یہ سوچ بچار کے نتیجے میں حاصل ہونے والی تسلّی کی ایک ممکنہ مثال ہے ۔ مارک ٹوین کا موت کے خوف کو نظر انداز کر دینا اسی نوعیت کی مزید ایک مثال ہے: ' میں موت سے نہیں ڈرتا۔ کیونکہ میں تو ولادت سے پہلے اربوں سال سے مرا ہوا ہی تھا، اور اس کی وجہ سے مجھے کبھی دقّت محسوس نہیں ہوئی'۔ یہ سرسری جھلک ہماری موت کی ناگزیر حقیقت پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ لیکن ہمیں اس کی ناگزیری کا مشاہدہ کرنے کا ایک نیا زاویہ مہیّا کیا گیا ہے اور شاید اس میں ہمارے لئے تسلّی کا پہلو بھی موجود ہے۔ تھامس جیفرسن کو بھی موت کا خوف نہیں تھا نہ ہی موت کے بعد کسی دوسری زندگی پر ایمان تھا۔ کرسٹوفر ہچنز کے مطابق 'جب اس کے دن ڈھلنے لگے تو جیفرسن نے ایک سے زیادہ دفعہ اپنے دوستوں کو لکھا کہ وہ اپنے آخری وقت کے انتظار میں نہ تو پر امید ہے اور نہ خوف زدہ۔ صریح انداز میں کہئے تو جیفرسن عیسائی نہیں تھا'۔

صحت مند ذہن اب برٹرینڈ رسل کے دعوے کے لئے تیّار ہیں جو اس نے اپنے ۱۹۲۵ کے مضمون "میرا ایمان کیا ہے — What I Believe" میں کیاہے :

> میرا یہ ایمان ہے کہ جب میں مروں گا تو میرا جسم گل سڑ جائے گا اور میری انا باقی نہیں بچے گی۔ میں جوان نہیں ہوں، اور مجھے زندگی سے پیار ہے۔ لیکن میں نیست و نابود ہو جانے کے خیال کی وجہ سے خوف سے لرزنےسے نفرت کروں گا۔ خوشی پھر بھی خوشی ہے، اگر چہ اس کو ختم ہو جانا ہے، لیکن تخیّل اور محبت اپنی چاشنی سے محروم ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کو دوام نہیں۔ بہت سے لوگ بڑے وقار کے ساتھ تختہ دار پر چڑھ گئے؛ یقیناً ہمیں اس وقار سے دنیا میں انسان کے مقام کے بارے میں کچھ سیکھنا چاہئے۔ جہاں سائنس کے کھلے ہوئے دریچے ہمیں شروع میں روایتی کہانیوں کی ہلکی حرارت سے محروم کر کے حقیقت کی ٹھنڈ میں ٹھٹھرنے پر مجبور کرتے ہیں، وہاں تازہ ہوا اپنے ساتھ ایک نیا جوش بھی لے کر آتی ہے؛ کھلی فضا کی اپنی ہی ایک شان و شوکت ہے۔

جب میں نے سولہ سال کی عمر میں اپنے سکول کی لائبریری میں رسل کا یہ مضمون پڑھا تھا تو اس سے بہت متاثر ہوا تھا، لیکن میں اسے تقریباً بھول ہی چکا تھا۔ اس بات کا بہت امکان ہے کہ جب میں نے ۲۰۰۳ میں "شیطان کا مصاحب — A Devil's Chaplain" میں درج ذیل جملے لکھے تو میں رسل کو غیر دانستہ (اور ڈارون کو دانستہ) خراج تحسین پیش کر رہا تھا:

> زندگی کے اس زاویے میں ایک عظمت ہے، اگرچہ جہالت کے محفوظ کمبل کے اندر سے یہ زاویہ بہت تاریک اور سرد لگ سکتا ہے۔ ادراک کی آندھی کے سامنے ڈٹ جانے میں ایک عجیب تازگی حاصل ہوتی ہے: ییٹس (Yeats) کی "آندھیاں جو تاروں کی کہکشاؤں سے گزرتی ہیں"۔

دونوں طرح کی تسلّیاں دینے میں سائنس کے مقابلے میں مذہب کی کارکردگی کیسی ہے؟ پہلی قسم کی تسلّی میں یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ خدا کے

مضبوط بازو، خواہ وہ فرضی ہی ہوں، بالکل اسی طرح تسلّی فراہم کر سکتے ہیں جیسے ایک حقیقی دوست کے بازو، یا سینٹ برنارڈ کتے کے گلے میں برانڈی کا پیپا اسے تسلی دیتے ہیں۔ لیکن سائنس سے ایجاد کی گئی ادویات بھی آرام پہنچاتی ہیں، اور عام طور پر برانڈی سے بہتر ہی کام کرتی ہیں۔

اب دوسرے قسم کی تسلّی کی طرف توجّہ کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب کی افادیت کو تسلیم کرنا بہت آسان ہے۔ زلزلے جیسی کسی ناگہانی آفت میں گھرے ہوئے لوگ عموماً یہ بتاتے ہیں کہ انہیں اس خیال سے دلاسا ملتا ہے کہ یہ سب انسانی سمجھ سے بالا تر مشیت الٰہی کا حصہ ہے: بے شک اس میں کوئی بہتری ہو گی جو وقت آنے پر ہم پر آشکار ہو گی۔ اگر کسی کو موت کا خوف ہے تو موت کے بعد کی زندگی پر مخلص ایمان اس کے لئے بہت تسلّی بخش ہو سکتا ہے — سوائے ایسی صورت حال کے کہ اسے یہ یقین ہو کہ وہ جہنم یا عالم برزخ میں جانے والا ہے۔ وہم کے ازالے تک جھوٹے عقیدے بھی اتنے ہی تسلّی بخش ہوتے ہیں جتنے سچّے عقیدے ۔ اس منطق کا اطلاق غیر مذہبی عقیدوں پر بھی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جان لیوا کینسر میں مبتلا مریض سے اس کی صحتیابی کے بارے میں جھوٹ بول کر اس مریض کو اتنا ہی سکون پہنچا سکتا ہے جتنا کسی ایسے مریض کے ساتھ سچ بولنے سے پہنچتا ہے جو مہلک بیماری میں مبتلا نہیں ہے۔ ڈاکٹر کے جھوٹ کا وہم دور کرنے کے مقابلے میں موت کے بعد زندگی میں مخلص ایمان کا وہم توڑنا کہیں زیادہ مشکل ہے۔ ڈاکٹر کا جھوٹ اس وقت تک برقرار رہ سکتا ہے جب تک بیماری کی علامات واضح نہیں ہو جاتیں۔ لیکن موت کے بعد زندگی میں ایمان رکھنے والے کے وہم کا ازالہ ممکن ہی نہیں ہے۔ رائے شماری سے پتا چلتا ہے کہ امریکہ کی تقریباً ۹۵ فیصد آبادی اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ وہ دنیاوی موت کے بعد بھی زندہ رہیں گے۔ میرے لئے یہ ایک معمہ ہے کہ شہادت کے خواہشمند حضرات کو چھوڑ کر، ایسے عقیدے کا اظہار کرنے والے کتنے معتدل مذہبی لوگ ہوں گے جو اپنے دل میں اس پر کامل یقین بھی رکھتے ہوں گے۔ اگر وہ مخلص ہیں تو کیا ان سب کو ایمپل فورتھ کی خانقاہ کے راہب کی طرح پیش نہیں آنا چاہئے؟ جب پادری اعظم بیسل ہیوم نے اسے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ مر رہا ہے تو راہب کی خوشی کی انتہا نہ رہی: 'مبارک ہو! یہ تو بڑی زبردست خبر ہے۔ کاش میں بھی آپ کے ساتھ چل سکتا'[۱۴]۔ ایسا لگتا ہے کہ راہب واقعی ایک مخلص عقیدت مند تھا۔ یہ کہانی ہماری توجہ کا مرکز اس لئے بن جاتی ہے کہ یہ ایک نایاب اور غیر متوقع رد عمل پر مشتمل ہے، اور شاید ہمیں محظوظ بھی کرتی ہے — ایک طرح سے اس خاکے کی یاد دلاتی ہے جس میں ایک برہنہ خاتون ایک علم اٹھائے ہوئے ہے جس پر لکھا ہے 'پیار کرو، جنگ نہیں' اور ایک راہ گیر کہہ رہا ہے اس کو کہتے ہیں سچّا اخلاص!' سارے عیسائی اور مسلمان اپنے کسی عزیز کی وفات کے بارے میں سننے کے بعد ایسا ہی کچھ کیوں نہیں کہتے جیسا خانقاہ کے راہب نے کہا تھا؟ جب ایک ڈاکٹر ایک متقی عورت کو یہ بتاتا ہے کہ اس کی زندگی میں چند مہینے ہی باقی رہ گئے ہیں تو وہ خوشی سے پھولے کیوں نہیں سماتی جیسے وہ سیشیلز میں چھٹیاں گزارنے جا رہی ہو؟ 'مجھ سے تو انتظار نہیں ہو رہا!' اس کے پاس بیٹھے ہوئے عقیدت مند ملاقاتی اسے گزرے ہوئے لوگوں تک پہنچانے کے لئے پیغامات کیوں نہیں دیتے؟ 'چچا رابرٹ کو میری طرف سے بہت سارا پیار دینا....'

جب مذہبی لوگ کسی مرنے والے کے پاس بیٹھے ہوتے ہیں تو اس انداز میں کیوں بات نہیں کرتے ؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ جن باتوں پر یقین رکھنے کے دعویدار ہیں درحقیقت ان پر یقین نہیں رکھتے؟ یا شاید یقین تو رکھتے ہیں لیکن موت کے عمل سے خوف زدہ ہیں؟ اور شاید اس خوف کی معقول وجہ بھی موجود ہے۔ دنیا میں ہماری جنس وہ واحد جنس ہے جسے اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ اپنی تکلیف سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ڈاکٹر کے پاس جا کر ہمیشہ کی نیند کی درخواست کر سکے۔ لیکن اس صورت میں سہل مرگی (euthanasia) اور امدادی خود کشی (assisted suicide) کی سب سے زیادہ مخالفت مذہبی لوگوں کی طرف سے ہی کیوں ہوتی ہے؟ کیا ہمیں ' ایمپل فورتھ کی خانقاہ کے راہب' یا 'سیشیلز میں چھٹیوں' کے موت کے نمونے کے مطابق یہ توقع نہیں کرنی چاہئے کہ مذہبی لوگوں کا اس جہان فانی سے اس قدر بیہودہ انداز سے چمٹے رہنے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہو گا؟ اس منطق کے باوجود دیکھنے میں یہی آتا ہے کہ اگر کوئی شخص رحم کے قتل (mercy killing) یا امدادی خود کشی کی جذباتی شدّت سے مخالفت کرتا ہے تو آپ ایک بڑی رقم کے ساتھ شرط لگا سکتے ہیں کہ وہ مذہبی ثابت ہو گا۔ سرکاری وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ جان لینے کا ہر قسم کا واقعہ گناہ ہی ہے۔ لیکن اگر اس عمل سے جنّت کی جانب سفر کی رفتار میں تیزی آ سکتی ہے تو اسے گناہ کیوں کہا جائے؟

امدادی خود کشی کی طرف میرا رویّہ مارک ٹوین کے اوپر دیے گئے مشاہدے کو لے کر آگے بڑھتا ہے۔ مر جانا پیدا نہ ہونے سے مختلف نہیں — میں ویسا ہی ہو جاؤں گا جیسا میں ولیم فاتح (William the Conquerer) کے دور میں یا ڈائینوسار یا سہ لختہ حجریہ (trilobites) کے وقت میں تھا۔ اس میں خوف کی کوئی بات نہیں۔ لیکن وفات پانے کا عمل ضرور حسب قسمت تکلیف دہ اور ناخشگوار ہو سکتا ہے — ایک ایسا تجربہ جس کے ذریعہ ہمیں اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی عادت سی ہو گئی ہے، جیسے لبلبے کی جراحی کے دوران بے ہوشی کی دوا کی مدد سے ہم درد سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ کا پالتو جانور شدید درد میں مبتلا ہے اور آپ اس کی تکلیف ختم کرنے کے لئے جانوروں کے ڈاکٹر کو نہیں بلاتے تاکہ اسے ایسی مقدار میں دوائی دی جائے جس کے بعد وہ ابدی نیند سو

جائے، تو آپ پر جانور کے ساتھ بربریت کا رویّہ رکھنے کا الزام لگ سکتا ہے۔ لیکن اگر آپ کا ڈاکٹر آپ کی تکلیف دور کرنے کی غرض سے ایسی ہی رحم دلی کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس کے خلاف اقدام قتل کا مقدمہ چلایا جانے کا خطرہ ہے۔ جب میں مر رہا ہوں گا تو میری خواہش ہو گی کہ مجھے بیہوشی کی دوا دینے کے بعد میری جان بالکل ویسے ہی نکال دی جائے جیسے جسم سے لبلبہ نکال لیا جاتا ہے۔ لیکن مجھے یہ سعادت میسّر نہیں ہو گی، کیونکہ میں بد قسمتی سے homo sapiens یعنی انسان پیدا ہوا ہوں، Cannis familiaris یعنی پالتو کتّا یا Felis catus یعنی بلّا پیدا نہیں ہوا۔ عموماً پوری دنیا میں یہی صورت حال ہو گی، اور میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہو گا کہ میں سوئٹزرلینڈ، نیدرلینڈ یا اوریگون منتقل ہو جاؤں۔ ایسے روشن خیال مقامات اتنے کم کیوں ہیں؟

لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ سوال بھی اٹھایا جا سکتا ہے کہ لبلبہ نکالنے اور جان نکالنے میں کیا کوئی اہم فرق نہیں ہے؟ در حقیقت نہیں ہے؛ خاص طور پر اگر آپ ویسے بھی قریب المرگ ہی ہیں۔ اور موت کے بعد کی زندگی پر ایمان نہیں رکھتے ہیں۔ اگر آپ کا یہ ایمان ہے، تو پھر موت تو صرف ایک زندگی سے دوسری زندگی کی جانب نقل مکانی ہے۔ اور اگر نقل مکانی کا یہ عمل تکلیف دہ ثابت ہو تو خواب آور دوا کے بغیر اس سے گزرنے کی خواہش اتنی ہی ناپید ہونی چاہئے جتنی لبلبے کی جراحی کے وقت ہو سکتی ہے۔ ہم میں سے ان لوگوں کو جو کہ موت کو منتقلی کے عمل کی بجائے اختتامی عمل سمجھتے ہیں سہل مرگی یا امدادی خودکشی کی مخالفت میں ہونا چاہئے۔ جب کہ ہم ہی ہیں جو اس کی حمایت کرتے ہیں[§§§§§§§§§§§§§§§§]۔

اسی ضمن میں، میں اپنی پہچان کی اس نرس کے مشاہدات کا ذکر کرنا چاہوں گا جو بوڑھے لوگوں کے سرکاری گھر میں کام کرتی ہے، جہاں وقت بے وقت موت کی آمد و رفت جاری رہتی ہے؟ اس نے محسوس کیا ہے کہ موت سے خوف زدہ رہنے والے زیادہ تر لوگ مذہبی ہوتے ہیں۔ اس کے مشاہدے کو شماریات کے اصولوں کے مطابق پیش کرنا ضروری ہے، لیکن اگر ہم فرض کر لیں کہ وہ سچ بول رہی ہے تو ہمیں پوچھنا پڑے گا کہ یہاں چل کیا رہا ہے؟ جو کچھ بھی ہے، وہ مرنے والوں کو تسلّی دینے کی قابلیت کے سلسلے میں مذہب کی بہت حوصلہ افزا تصویر کشی نہیں کرتا ہے[****************]۔ کیتھولک لوگوں کے میں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاید وہ مقام کفارہ (purgatory) سے خوفزدہ ہیں۔ کارڈینل ہیوم نے اپنے ایک دوست کو ان الفاظ میں الوداع کہا: 'اچھا بھئی، الوداع۔ میرا خیال ہے اب مقام کفّارہ پر ہی ملاقات ہو گی'۔ لیکن میرے خیال میں ان شفقت بھری آنکھوں میں شک کی چمک تھی۔

مقام کفّارہ کا نظریہ مذہب ہمیں عالم دین کی ذہنی حالت کے بارے میں ایک مضحکہ خیز انکشاف کرتا ہے۔ مقام کفّارہ ایک طرح سے جزیرہ ایلیس (Ellis Island) ہے، ایک جہنمی انتظار گاہ جہاں ان روحوں کو رکھا جاتا ہے جن کے گناہ اتنے شدید نہیں کہ انہیں سیدھے جہنم بھیج دیا جائے، لیکن جن کو گناہ سے پاک ماحول میں داخل کرنے سے پہلے کچھ مزید پاکی کی ضرورت ہے ۔ قرون وسطٰی کے دور میں کیتھولک کلیسا پیسوں کے عوض بخشش بیچا کرتا تھا۔ سادہ الفاظ میں اس کا مطلب تھا کہ آپ پیسے دے کر مقام کفّارہ میں اپنے دن کم کروا سکتے تھے اور کلیسا حقیقی معنوں میں (اور بڑے گمان کے ساتھ) اس کی سندیں بھی جاری کرتا تھا جن میں مقام کفّارہ کے خریدے گئے دنوں کا اندراج ہوتا تھا۔ رومن کیتھولک چرچ ایک ایسا ادارہ ہے جس کے لئے شاید "حرام کی کمائی" کی اصطلاح خاص طور سے ایجاد کی گئی ہو گی۔ اور اس کے پیسے بنانے والے سارے ہتھکنڈوں میں سے بخشش بیچنا شاید تاریخ میں دھوکے کی سب سے بڑی ترکیبوں میں سر فہرست ہے، دور حاضر میں نائیجیرین انٹرنیٹ دھوکے میں قرون وسطٰی کا متبادل ہے، لیکن یہ اس سے بھی کئی گنا زیادہ کامیاب ہے
۔

ابھی حال ہی میں ۱۹۰۳ تک، پاپائے اعظم پائیس دہم (Pope Pius X) یہ حساب بھی مرتب کر سکتا تھا کہ پادریوں کے مختلف درجات مقام کفّارہ میں قیام کے کتنے دن کم کرسکتے ہیں: کارڈینل ۲۰۰ دن، اسقف اعظم ۱۰۰ دن، اور بشپ صرف ۵۰ دن کم کر سکتا تھا۔ لیکن اس کے دور میں بخشش براہ راست

---

[§§§§§§§§§§§§§§§§] امریکی دہریوں کے موت کے بارے میں رویّوں پر کی گئی ایک تحقیق میں یہ دریافت ہوا: ۵۰ فیصد امریکی دہریے اپنی زندگی کی کامیابیوں کی یادوں کا جشن منانا چاہتے ہیں؛ ۹۹ فیصد ان لوگوں کے لئے امدادی خودکشی کی حمایت کرتے ہیں جو اس کی درخواست کریں، اور ۷۵ فیصد اسے اپنے لئے بھی پسند کرتے ہیں۔ ۱۰۰ فی صد ہسپتال کے کسی ایسے عملے سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتے جو انہیں مذہب کی تبلیغ کریں۔ دیکھئے http://nursestoner.com/myresearch.html

[****************] ایک آسٹریلیائی دوست نے بڑھاپے میں مذہبی رجحانات کے اضافے کے بارے میں ایک بڑی عمدہ اصطلاح وضع کی: 'فائنل امتحان کی تیّاری۔ cramming for the final'۔ اس کا اصلی لطف لینے کے لئے اس عبارت کو مخصوص آسٹریلیائی لہجے میں ادا کرنے کی کوشش کریں۔

مقام کفّارہ کو مقام قید (limbo) نہ سمجھا جائے، جہاں ان بچّوں کی روحوں کو بھیجا جاتا ہے جنہیں وفات سے پہلے رسمی غسل پاکیزگی نہیں دیا جاسکا۔ اور جنین (feotuses) یا نبان (blastocysts) کا کیا ہو گا؟ اور اب کمال خود اعتمادی سے پاپائے اعظم بینیڈکٹ سولہ (Pope Benedict XVI) نے منسوخ کر دیا۔ کیا اس کا مطلب ہے کہ جو بچّے صدیوں سے وہاں قید کاٹ رہے ہیں یکا یک جنّت کی جانب تیرتے ہوئے روانہ ہو جائیں گے؟ یا وہ تو وہیں رہیں گے اور صرف آئیندہ فوت ہونے والے بچّے جنّت جا پائیں گے؟ یا کیا پہلے آنے والے تمام پاپائے اعظم اپنی عصمت کے باوجود غلط تھے؟ یہ اس قسم کی چیز ہے جس کے بارے میں ہم سب کو کہا جاتا ہے کہ "عزّت کریں"۔

پیسے کے لئے نہیں بیچی جاتی تھی۔ قرون وسطیٰ میں بھی پیسہ وہ واحد شے نہیں تھی جس کے عوض آپ مقام کفّارہ سے عارضی فرار حاصل کر سکتے تھے۔ آپ عبادتوں کے عوض بھی بخشش خرید سکتے تھے، خواہ وہ موت سے پہلے کی گئی آپ کی اپنی عبادتیں ہوں یا وفات کے بعد آپ کے حق میں کی گئی دوسروں کی عبادتیں ہوں۔ اور پیسے سے عبادتیں خریدی جا سکتی تھیں۔ اگر آپ امیر تھے تو آپ اپنی روح کے ایصال ثواب کے لئے بند و بست کر سکتے تھے۔ نیو کالج، جو میرا اپنا آکسفورڈ کالج ہے کی بنیاد ۱۳۷۹ میں (اور اس وقت "نیا" ہی کہلاتا تھا) اس صدی کے عظیم ہمدرد اور انسان دوست، ونچسٹر کے بشپ ولیم آف وکھام نے رکھی۔ قرون وسطیٰ کا پادری اپنے دور کا بل گیٹس بن سکتا تھا، اور (خدا تک پہنچنے والی) انفارمیشن ہائیوے کے متبادل کا انتظام سنبھال کر بے پناہ دولت کما سکتا تھا۔ اس کا تعلق غیر معمولی حد تک وسیع تھا اور وکھام نے اپنی دولت اور اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے دو اہم تعلیمی ادارے قائم کئے، ایک ونچسٹر میں اور ایک آکسفورڈ میں۔ تعلیم وکھام کے لئے بہت اہمیت رکھتی تھی، لیکن کالج کی چھ صدیاں منانے کے سلسلے میں ۱۹۷۹ میں شائع کی گئی نیو کالج کی سرکاری تاریخ کے مطابق کالج بنانے کا بنیادی مقصد 'ایک ایسی خانقاہ بنانا تھا جہاں اس کی روح کی بخشش کے لئے سفارش کی جا سکے۔ اس نے عبادت گاہ کے لئے دس پادری، تین منشی اور سولہ حمد گانے والوں کا انتظام بھی کیا اور حکم دیا کہ اگر کالج کی آمدنی گر جائے تو صرف ان انیتس لوگوں کی کفالت جاری رکھی جائے'۔ وکھام نے نیو کالج کی باگ ڈور ایک انجمن (Fellowship) کے ہاتھ میں سونپ دی، جو کہ خود سے منتخب ہونے والا ایک ادارہ ہے اور چھ سو سال سے زائد عرصے سے بدستور قائم ہے۔ غالباً اس کی خواہش تھی کہ ہم صدیوں تک اس کی روح کے لئے دعائیں مانگتے رہیں۔

آجکل کالج میں صرف ایک پادری ہے اور کوئی منشی نہیں، اور وکھام کے لئے صدیوں تک روزانہ کی جانے والی دعائیں بھی کم ہو کر اب صرف سال میں دو تقریبات تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ صرف حمد گانے والے ترقی کرتے رہے ہیں، اور ان کی موسیقی واقعی جادوئی ہے۔ اس انجمن کے رکن ہونے کے ناطے مجھے خفیف سا احساس جرم محسوس ہوتا ہے کہ میں نے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ اپنے دور کے نقطۂ نظر سے وکھام آج کے دور کے کسی امیر آدمی کی طرح ہے جو تبرید (cryogenics) کی کسی کمپنی کو ایک بہت بڑی رقم دیتا ہے تاکہ اس کے جسم کو منجمد کر کے مستقبل کے زلزلوں، خانہ جنگی، جوہری جنگوں اور دیگر حادثات سے محفوظ رکھا جا سکے، جب تک طبی سائنس اس حد تک ترّقی نہ کر لے کہ اسے پگھلا کر اس کی بیماری کا علاج کیا جا سکے۔ کیا ہم جیسے انجمن کے رکن فی زمانہ کالج کے بانی کے ساتھ کئے گئے معاہدے کی خلاف ورزی تو نہیں کر رہے؟ اگر ایسا ہے تو ہم بڑے اچھے ماحول میں ہیں۔ قرون وسطیٰ کے سینکڑوں محسن اس بھروسے میں ہی فوت ہو گئے کہ ان کے جانشین ان کے مقام کفّارہ کے قیام کے دوران ان کے لئے عبادت کرتے رہیں گے۔ میں سوچنے پر مجبور ہوں کی قرون وسطیٰ کے ان گنت فنون لطیفہ کے خزانے اور عمارات ابدی حیات کی پیشگی ادائیگیوں کے طور پر شروع کئے گئے ہوں گے، جن کے بھروسے ہم آج توڑ چکے ہیں۔

لیکن مقام کفّارہ کے نظریے کے بارے میں جو بات مجھے سب سے زیادہ حیران کرتی ہے وہ ان شواہد سے منسلک ہے جو اس نظریے کو ثابت کرنے کے لئے علماء دین پیش کرتے رہے ہیں: ثبوت جو اتنی شدید حد تک کمزور ہے اس اعتماد کو اور بھی مضحکہ خیز بنا دیتا ہے جس کے ساتھ یہ پیش کیا جاتا ہے۔ کیتھولک انسائیکلوپیڈیا میں مقام کفّارہ کے حصے میں ایک ذیلی حصہ "ثبوت" کے نام سے بھی ہے۔ مقام کفّارہ کے حق میں بنیادی ثبوت کچھ یوں ہے۔ اور مرنے والے اپنے گناہوں اور اچھے کاموں کی بنیاد پر سیدھے ہی جہنم یا جنّت میں چلے جاتے تو ان کے حق میں دعا مانگنا بے معنی سا فعل ہوتا۔ 'کیونکہ مرنے والوں کے لئے دعا مانگی ہی کیوں جائے اگر ہمیں ان روحوں کو تسلّی دینے کی دعا کی طاقت پر اعتبار ہی نہیں جو فی الحال خدا کے کرم سے دور ہیں'۔ لیکن پھر بھی ہم مرنے والوں کے لئے دعا کرتے ہیں، یا نہیں؟ لہٰذا مقام کفّارہ کا وجود ناگزیر ہے، ورنہ ہماری دعائیں بے معنی ہوتیں۔ یہ دلیل اس منطق کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے جو علماء دین کے یہاں پائی جاتی ہے۔

اس لاجواب غیر استخراج (non sequitur) کا عکس ہمیں ایک اور جگہ تسلّی کی دلیل میں بہت بڑے پیمانے پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ دلیل کچھ اس طرح بنائی جاتی ہے: یقیناً خدا ہو گا، کیونکہ اگر وہ نہ ہوتا تو یہ زندگی کھوکھلی، بے معنی، اور بے مقصد ہوتی، بے معنی پن اور غیر اہمیت کا ایک بیابان۔ ہمیں یہ دکھانا بھی کیوں ضروری ہو کہ یہ منطق اپنے پہلے در پر ہی لڑھک جاتی ہے؟ شاید زندگی کھوکھلی ہی ہے۔ شاید مرنے والوں کے لئے ہماری دعائیں بے مقصد ہی ہیں۔ اس کے برعکس قیاس کرنا اس نتیجے کو ہی سچ فرض کر لینے کے مترادف ہے جس سچ کے لئے ہم ثبوت پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ مبیّنہ قیاس مطلق شفّاف حد تک دائرہ نما (circular) ہے۔ آپ کی بیگم کے چلے جانے کے بعد شاید زندگی واقعی کھوکھلی، بنجر اور ناقابل برداشت ہو گئی ہو گی۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس سے اس کے مردہ ہونے میں کوئی کمی نہیں آ جاتی۔ اس مفروضے میں بچپنا جھلکتا ہے کہ کوئی اور (بچّوں کے سلسلے میں والدین اور

---

جو کہ ایک خاتون ہے۔ وکھام کو معلوم ہو جائے تو وہ کیا سوچے گا؟

بالغوں کے سلسلے میں خدا) کی ذمہ داری ہے کہ وہ آپ کی زندگی کو وجہ یا مقصد فراہم کرے۔ یہ ان لوگوں کا بچپنا ہے کہ پیر میں موچ آتے ہی فوراً ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہیں کہ کوئی نظر آجائے جس پر مقدمہ دائر کیا جا سکے۔ میری صحت مندی کی ذمہ داری کسی اور کے کندھوں پر ہے، اور میری تکلیف کا ذمہ دار بھی کوئی اور ہے۔ کیا یہ کوئی دوسری نوعیت کا بچپنا ہے جو خدا کی 'ضرورت' کے پیچھے کار فرما ہے؟ کہیں ہم واپس "بنکر" پر تو نہیں پہنچ گئے؟

اس کے برعکس حقیقی بالغ زاویہ تو یہ ہے کہ ہماری زندگی اتنی ہی با معنی، بھر پور اور شاندار ہے جتنا ہم اسے بنانا چاہیں۔ اور ہم واقعی اسے بہت شاندار بنا سکتے ہیں۔ اگر سائنس کوئی غیر مادی قسم کی تسلّی فراہم کرتی ہے، تو یہ میرے آخری موضوع کشف (inspiration) میں منسلک ہو جاتا ہے۔

## کشف

## Inspiration

یہ پسند یا ذاتی رجحان کی بات ہے؛ اور بد قسمتی سے اس کا ایک اثر یہ ہے کہ یہاں بحث کا جو طریقہ مجھے استعمال کرنا ہو گا وہ منطق کی بجائے خطابت ہے۔ میں نے یہ طریقہ پہلے استعمال کیا ہے، اور میرے علاوہ اور لوگوں نے بھی، جن میں "ہلکا نیلا نقطہ — Pale Blue Dot" میں کارل سیگن، "حب حیات — Biophilia" میں او ولسن، "سائنس کی روح — Soul of Science" میں مائیکل شرمر، اور "اقرار صالح — Affirmations" میں پال کرٹز شامل ہیں۔ "قوس قزح کو ادھیڑنا — Unweaving the Rainbow" میں میں نے یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ اگر ہم DNA کے مجموعات کی قرعہ اندازی کے نتیجے میں سامنے آنے والے ان تمام ممکنہ انسانوں کی اکثریت کے بارے میں سوچیں جو کبھی پیدا نہیں ہوں گے، تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ ہم بہت خوش قسمت ہیں کہ ہم زندہ ہیں۔ ہم جیسے خوش قسمت لوگوں کے لئے میں نے زندگی کی محدود مدّت کا تصور لیزر کی ایک شعاع کی صورت میں پیش کیا جو وقت کے عظیم الشان پیمانے پر چل رہی ہے۔ روشنی کے اس نقطے کے پیچھے مردہ ہوئے ماضی کا اندھیرا ہے اور آگے انجانے مستقبل کا۔ ہم ناقابل بیان حد تک خوش قسمت ہیں کہ ہم اپنے آپ کو روشنی کے اس نقطے میں پاتے ہیں۔ روشنی میں ہمارا وقت چاہے کتنا بھی قلیل ہو، اگر ہم اس کا ایک لمحہ بھی ضایع کریں یا شکایت کریں کہ یہ بنجر یا بے لطف یا (بچکانہ انداز میں) یا بیزار کن ہے، تو کیا یہ ان کروڑوں، اربوں جانوں کی سخت تذلیل نہیں ہو گی جنہیں کبھی زندگی بخشی ہی نہیں جائے گی؟ جیسے کہ کئی ملحد مفکّرین مجھ سے قبل مجھ سے بہتر انداز میں کہہ چکے ہیں، یہ علم کہ ہمیں ایک ہی زندگی ملی ہے اس زندگی کو مزید نادر اور قیمتی بنا دیتا ہے۔ اس مطابقت سے ملحد زاویہ زندگی کی تصدیق کرنے والا اور زندگی کو بڑھانے والا زاویہ ہے؛ ساتھ ہی ساتھ یہ زاویہ ان لوگوں کی خود فریبی، دل پسند سوچ، یا افسوس ناک خود ترسی کا شکار نہیں ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی کا ان کی جانب کوئی قرض ہے۔ ایمیلی ڈکنسن نے کہا:

کہ زندگی پھر کبھی نہ آئے گی
یہی ادا تو اس کی دلبرانہ ہے

اگر خدا کے ختم ہونے سے خلاء پیدا ہو گا، تو مختلف لوگ اسے مختلف طریقوں سے پر کریں گے۔ میرے طریقہ ٔکار میں سائنس کی وافر مقدار کا بہت عمل دخل ہے، جو کہ اصلی دنیا کی حقیقت کو سمجھنے کی ایک سچّی اور منظّم کاوش ہے۔ میں کائنات کو سمجھنے کی انسانی کوشش کو بنیادی ڈھانچے استوار کرنے کی مہم سمجھتا ہوں۔ ہم سب اپنے اپنے انداز میں دنیا کا ایک ذہنی تصوّر تعمیر کرتے ہیں جس میں ہم اپنے آپ کو پاتے ہیں۔ دنیا کا قلیل ترین تصوّر وہ ہے جو ہمارے ماضی بعید کے آبا و اجداد اس میں اپنی بقا کو یقینی بنانے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ اس سمولیشن سافٹ ویئر (simulation software) کی تعمیر اور اصلاح قدرتی انتخاب کے ذریعے ہوئی تھی، اور افریقی جنگل کی دنیا سے مانوس ہمارے آبا و اجداد کے لئے بنائی گئی یہ سافٹ ویئر نہایت مہارت رکھتی ہے: درمیانی جسامت والی مادی اشیا کی ایک سہ ابعادی (three dimensional) دنیا جس میں یہ اشیاء ایک دوسرے کے مقابلے میں متوسط رفتار سے چلتی ہیں۔ ایک غیر متوقع انعام کے طور پر، ہمارے دماغوں میں اتنی طاقت ہے کہ اس درمیانی افادیت کے تصوّر سے کہیں زیادہ پیچیدہ تصوّر بنانے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ فنون اور سائنس اس قابلیت کے اہم مظہر ہیں۔ سائنسی ذہن کو آزاد کرنے اور نفسیات کو مطمئن کرنے کی طاقت کا بیان کرنے کی غرض سے میں ایک آخری منظر دکھانا چاہتا ہوں۔

## تمام برقعوں کی ماں

## The Mother of All Burkas

ہماری سڑکوں پر نظر آنے والے نہایت افسوسناک مناظر میں سے ایک منظر اس عورت کا ہے جو سر تا پا ایک سیاہ بے وضع لبادے میں ڈھکی ہوتی ہے اور باہرلی دنیا کو ایک باریک چاک سے دیکھتی ہے۔ برقعہ محض عورتوں کے استحصال کا ایک ہتھیار اور ان کی خوبصورتی اور آزادی پر کئے جانے والے خانقاہی جبر کا ذریعہ نہیں ہے؛ اور نہ صرف شدّت آمیز مردانہ ظلم اور سہمی ہوئی عورت کی فرمانبرداری کا نشان ہے۔ میں اس کے باریک چاک کو کسی اور چیز کی علامت کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہوں۔

ہماری آنکھیں دنیا کو برقی مقناطیسی طیف (electromagnetic spectrum) کے ایک باریک چاک کے ذریعے دیکھتی ہیں۔ نظر آنے والی روشنی اس گہرے اندھیرے طیف میں ایک تنگ روشن شگاف سے زیادہ کچھ نہیں، جس کے ایک سرے پر لمبی ریڈیائی لہریں (radio waves) ہیں اور دوسرے سرے پر چھوٹی گاما شعائیں (gamma rays)۔ یہ شگاف کتنا تنگ ہے اس کا ادراک محال ہے اور وضاحت نہایت مشکل۔ ایک بے انتہا بڑے سیاہ برقعے کا تصوّر کیجئے اور اس میں ایک انچ بڑا چاک لگائیے۔ اگر چاک کے اوپر کا کپڑا پوشیدہ طیف کی چھوٹی لہروں والے سرے کی نمائندگی کرتا ہے اور چاک کے نیچے کا کپڑا پوشیدہ طیف کے لمبی لہروں والے حصے کی نمائندگی کرتا ہے تو برقعہ کتنا لمبا ہو کہ نظر آنے والا طیف ایک انچ کے مترادف ہو؟ ہم جن فاصلوں کی بات کرر رہے ہیں ان کی عاقلانہ نمائندگی لوگارتھمی پیمانے (logarithmic scales) کے استعمال کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس قسم کی کتاب کا آخری باب یقیناً لوگارتھمی پیمانے اچھالنے کے لئے موزوں جگہ نہیں ہے، لیکن میرا یقین کیجئے یہ تمام برقعوں کی ماں ثابت ہو گا۔ نظر آنے والی روشنی کا ایک انچ پوشیدہ طیف کے میل در میل اندھیرے کے مقابلے میں ــــ جس میں ریڈیائی لہریں برقعے کا پائنچہ ہیں اور گاما شعائیں حجاب ــــ مضحکہ خیز حد تک چھوٹا ہے۔ سائنس ہمارے لئے اس چاک کو کھولا کرتی ہے۔ چاک اتنا چوڑا ہو جاتا ہے کہ کالا غلاف مکمل طور پر گر جاتا ہے، اور ہمارے حواس کو نشاط آور آزادی سے ہمکنار کرتا ہے۔

بڑی دور بینیں شیشے کے آئینے اور عدسے استعمال کر کے آسمانوں کی گہرائیوں کا معائنہ کرتی ہیں، اور ان کی مدد سے نظر آنے والے ستارے وہ ہیں جن کی روشنی اس طول موج (wavelengths) کی دکھنےوالی باریک سی پٹی میں موجود ہے۔ لیکن ایسی دوربینیں بھی ایجاد کی جاچکی ہیں جو ایکس رے یا ریڈیائی طول موج میں "دیکھ" سکتی ہیں اور ہمیں متبادل آسمانوں کی ایک کثرت سے متعارف کراتی ہیں۔ قدرے چھوٹے پیمانے پر، کیمرے پر مخصوص مقطر (filter) لگانے سے طیف کے بالائی بنفشی (ultraviolet) حصے میں "دیکھا" جا سکتا ہے اور پھولوں کی ایسی تصاویر لی جاسکتی ہیں جن میں ایسی دھاریاں اور نقطے نظر آتے ہیں جو انسان کی آنکھ سے اوجھل ہیں لیکن حشرات کو نظر آتے ہیں اور شاید انہیں راغب کرنے کے لئے ہی 'ترتیب' دئے گئے ہیں۔ حشرات کی آنکھوں کا طیف بینی کا دریچہ (spectral window) ہمارے جیسا ہی ہوتا ہے لیکن برقعے پر تھوڑا اوپر کی جانب سرکا ہوا: حشرات لال رنگ نہیں دیکھ سکتے لیکن بالائی بنفشی حصے میں ہمارے مقابلے میں زیادہ دور تک دیکھ سکتے ہیں ــــ " بالائی بنفشی باغ میں"§§§§§§§§§§§§§§§§۔

روشنی کے تنگ دریچے کا استعارہ شاندار حد تک چوڑے کیف میں پھیلتا ہوا سائنس کے دوسرے حصوں میں بھی ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ ہم جسامتوں کے ایک عجائب گھر کے مرکز کے قریب رہتے ہیں اور دنیا کو ایسے اعضاء حواس اور اعصابی نظام کے ذریعے دیکھتے ہیں جو صرف درمیانی رفتار پر چلتی ہوئی درمیانی جسامتوں کو پہنچاننے اور سمجھنے کی قابلیت ہی رکھتے ہیں۔ ہم ایسی اشیاء کے درمیان آرام و سکون پاتے ہیں جو حجم میں چند کلو میٹر (پہاڑ کی چوٹی سے نظر آنے والا منظر) سے لے کر ملی میٹر کی ایک دہائی تک (سوئی کا نقطہ) ہوتے ہیں۔ ان حدود سے باہر تو ہماری قوت تخیّل بھی ناکام ہو جاتی ہے اور ہمیں آلات اور ریاضی کا سہارا لینا پڑتا ہے ــــ جو خوش قسمتی سے ہمیں استعمال کرنے آتے ہیں۔ جسامتوں، فاصلوں اور رفتار کی وہ حدود جن سے ہمارے تخیّلات مطمئن ہیں ایک چھوٹی سی پٹّی ہے جو امکانات کے ایک طویل سلسلے کے درمیان کہیں واقع ہے، چھوٹے سرے پر مقداروں کے نرالے پن (quantum strangeness) سے لے کر بڑے سرے پر آئنسٹائن کے علم کائنات تک۔

ہماری تنگ درمیانی حدود، جن سے ہمارے آباء و اجداد مانوس تھے، کے باہر کے فاصلوں سے نمٹنے کے لئے ہمارے تخیّلات افسوسناک حد تک ناقابل ہیں۔ ہم الیکٹرون کا ایک چھوٹی سی گیند کے طور پر تصوّر کرتے ہیں، جو نیوٹرون اور پروٹون کے ایک بڑے گروہ کے گرد مدار میں چکر لگاتے رہتے ہیں۔ لیکن

---

§§§§§§§§§§§§§§§§ میں نے رائل انسٹی ٹیوشن میں کرسمس پر جو پانچ خطبات دیے ان میں سے ایک کا نام "بالائے بنفشی باغ" تھا۔ بی بی سی نے یہ خطبات "کائنات میں پرورش پانا۔ Growing Up in the Universe" کے نام سے نشر کئے تھے۔ آپ ان خطبات کی DVD کے لئے www.richarddawkins.net/home پر جاکر درخواست دے سکتے ہیں۔

حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ الیکٹرون چھوٹی گیندوں کی طرح نہیں ہوتے۔ وہ ہمارے مشاہدے میں موجود کسی بھی چیز کی طرح نہیں ہیں۔ جب ہم حقیقت کے افق کے عظیم فاصلوں کے قریب اڑتے ہیں تو وہاں یہ بھی واضح نہیں رہتا کہ "کی طرح" کی اصطلاح کا کوئی مطلب ہو بھی سکتا ہے یا نہیں۔ ہمارے تخیلات میں ابھی اتنی مہارت پیدا نہیں ہوئی کہ مقداروں کے مضافات میں جھانک سکیں۔ اس پیمانے پر کوئی بھی چیز اس طرح سے حرکت نہیں کرتی جس طرح مادے کو حرکت کرنی چاہئے — جیسا کے ارتقانے ہمیں سکھایا ہے —۔ اور نہ ہی ہم ان اشیا کی حرکات کے متحمل ہو پاتے ہیں جو روشنی کی رفتار کی مناسب کسر (fraction)کے برابر رفتار پر سفر کرتے ہیں۔ عقل سلیم ہمیں مایوس کر دیتی ہے، کیونکہ عقل سلیم کا ارتقاء ایک ایسی دنیا میں ہوا ہے جہاں نہ تو کوئی چیز حیرت انگیز رفتار سے سفر کرتی ہے اور نہ ہی وہ بہت بڑی یا چھوٹی جسامت کی ہوتی ہے۔

اپنے مضمون "ممکن دنیائیں — Possible Worlds" کے اختتام پر عظیم ماہر حیاتایت جے بی ایس ہالڈین لکھتا ہے کہ 'مجھے شک ہے کہ کائنات نہ صرف اس سے زیادہ عجیب ہے جتنا ہم سوچتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ عجیب ہے جتنا ہم سوچ سکتے ہیں... مجھے یہ بھی شک ہے کہ نہ صرف زمین و آسمان میں اس سے زیادہ چیزیں موجود ہیں جن کے بارے میں کسی فلسفیانہ نظام میں سوچا گیا ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں جن کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے'۔ از راہ گفتگو، مجھے اس تجویز پر بہت حیرت ہے کہ ڈرامہ ہیملٹ کی وہ مشہور زمانہ تقریر جس کا حوالہ ہیلڈین نے دیا روایتی طور پر غلط طریقے سے ادا کی جاتی ہے۔ عام طور پر زور لفظ "تمہارے" پر دیا جاتا ہے:

ارض و سماوات میں اس سے ماسوا بہت کچھ ہے، ہوراشیو!
جس کا تمہارے فلسفے میں تصوّر کیا جا سکتا ہے۔

واقعی، زیادہ تر لوگ بدھوؤں کی طرح ان مصرعوں کو کنایۃً یوں ادا کر دیتے ہیں جیسے ہراشیو ساری دنیا کے تمام سطحی عقلیت پسندوں اور متشکک لوگوں کا نمائندہ ہے۔ لیکن کچھ فلسفی لفظ "تمہارے" کو تقریباً غائب کرتے ہوئے لفظ "فلسفے" پر زور دیتے ہیں.... 'تمہارے فلسفے میں تصور کیا جا سکتا ہے'۔ ہمارے موجودہ مقاصد پر اس تفریق کا کوئی خاطر خواہ اثر نہیں پڑتا، سوائے اس کے کہ دوسری تشریح ہیلڈین کے 'کسی فلسفیانہ نظام' کو مناسب انداز سے اپنی جگہ یاد دلا دیتی ہے۔

یہ کتاب جس شخص کے نام منسوب کی گئی ہے اس کی زندگی کا محور ہی سائنس کا وہ نرالا پن تھا جس کو وہ مزاح کی حد تک لے جاتا تھا۔ ذیل میں درج جملے بھی ایسی فی البدیہہ تقریر سے ماخوذ ہیں جو اس نے ۱۹۸۸ میں کیمبرج میں کی تھی: 'یہ حقیقت کہ ہم کشش ثقل کے ایک گہرے کنویں کی زمین پر رہتے ہیں۔ گیس سے اٹے ایک سیّارے کی سطح پر، جو نوّے میلین میل دور موجود جوہری آگ کے ایک گولے کے گرد چکّر لگا رہاہے اور ہم ان سب کو روز مرّہ کی بات سمجھتے ہیں ہمیں کچھ اشارہ تو دیتا ہے کہ ہمارے زاویے کس قدر ٹیڑھے ہو سکتے ہیں'۔ جہاں سائنسی ادب کے دوسرے مصنفین سائنس کے انوکھے پن کو ہماری حس اسرار کو اجاگر کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں، وہاں ڈگلس ایڈمز اسے ہمیں ہنسانے کے لئے استعمال کرتا ہے (جن لوگوں نے The Hitchiker's Guide to the Galaxy پڑھی ہے انہیں شاید ابدی غیر ممکن انجن infinite improbability drive کی یاد آئی ہو)۔ شاید ہنسی جدید طبعیات کے کچھ زیادہ عجیب معموں کے لئے بہترین رد عمل ہے۔ اس کا متبادل — مجھے کبھی کبھی لگتا ہے — رونا ہے۔

مقداری میکانیات (quantum mechanics)، بیسویں صدی کی سائنسی فتوحات کی وہ شاندار چوٹی، اصلی دنیا کے بارے میں شاندار حد تک کامیاب پیش گوئیاں کرتی ہے۔ رچرڈ فینیمین اس کی درستی کا موازنہ شمالی امریکہ کی چوڑائی کو ایک انسانی بال کی باریکی کی درستگی کی حد تک ماپنے سے کرتا ہے۔ پیش گوئیاں کرنے کی اس کامیابی کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ نظریہ مقدار (quantum theory) کسی نہ کسی طریقے سے تو سچ ہونا ہی چاہئے؛ ہمارے پاس کسی بھی چیز کا جتنا علم ہے،وہ بالکل سادہ اور ہماری عقل میں سمجھ آنے والے حقائق جتنا ہی سچ ہے۔ اس کے باوجود وہ مفروضے جو نظریہ مقدار کی کامیاب پیش گوئیاں کرنے کی خاطر بنانے پر مجبور ہے اتنے پر اسرار ہیں کہ خود فینیمین بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گیا تھا (اس اقتباس کے بہت سے نمونے موجود ہیں، اور میرے خیال میں درج ذیل سب سے مناسب ہے): 'اگر آپ کو لگتا ہے کہ آپ کو نظریہ مقدار سمجھ آ گیا ہے.... تو آپ کو نظریہ مقدار سمجھ نہیں آیا'[°°°°°°°°°°°°°°°°]۔

نظریۂ مقدار اتنا عجیب ہے کہ ماہرین طبیعیات کسی نہ کسی خلاف قیاس 'تشریح' پر انحصار کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں۔ انحصار درست اصطلاح ہے۔ "حقیقت کی چادر — The Fabric of Reality" میں ڈیوڈ ڈیوچ نظریۂ مقدار کی 'بہت سی دنیاؤں' والی تشریح سے متاثر نظر آتا ہے، شاید اس لئے کہ

---

[°°°°°°°°°°°°°°°°] ایسی طرح کاایک جملہ نیلز بوہر سے بھی منسوب ہے: 'اگر نظریۂ مقدار نے کسی شخص کو ششدر نہیں کیا، تو پھر وہ نظریہ مقدار کو سمجھ نہیں پایا'۔

اس کے بارے میں برائی کے طور پر آپ صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ احمقانہ حد تک بے مصرف (wasteful)ہے۔ یہ کائنات ہائے کی ایک کثیر اور تیزی سے بڑھتی ہوئی تعداد کا مفروضہ پیش کرتی ہے جو بہ یک وقت وجود رکھتے ہیں اور سوائے مقداری میکانکی پر مبنی تجربات کے ذریعے سےایک دوسرے کے وجود سے بے خبر ہیں۔ ان میں سے کچھ کائناتوں میں میں پہلے ہی مر چکا ہوں، اور کچھ میں آپ کی سبز موچھیں ہیں، وغیرہ غیرہ۔

اس کی متبادل 'کوپنہیگن تشریح' اتنی ہی بے معنی ہے ــ بے مصرف تو نہیں لیکن نا قابل بیان حد تک تناقضات کا مظہر (paradoxical)ہے ۔ اروِن شروڈنگر نے اسے بلّی کی تمثیل کے ذریعے تمسخر کا نشانہ بنایاہے۔ شروڈنگر کی بلّی ایک ڈبے میں بند ہے، جس میں قتل کا ایک طریقۂ کار نصب ہے جو ایک مقداری میکانی واقعہ (quantum mechanical event) کی وجہ سے حرکت میں آتا ہے۔ ڈھکن کھولنے سے قبل ہمیں معلوم نہیں ہو سکتا کہ بلّی مر گئی ہے۔ عقل سلیم ہمیں یہی بتاتی ہے کہ بلّی ڈبے کے اندر یا تو زندہ ہو گی یا نہیں ہو گی۔ کوپنہیگن تشریح عقل سلیم کی مخالفت کرتی ہے: ڈبے کے کھلنے سے قبل صرف ایک چیز کا وجود ہے اور وہ احتمال (probability) ہے۔ جیسے ہی ڈھکن کھولا جاتا ہے، ذرے کی لہری خصوصیات پارہ پارہ ہو جاتی ہیں (the wave function collapses) اور ہمارے پاس صرف ایک واقعہ رہ جاتا ہے: یا تو بلّی مر چکی ہے یا بلّی زندہ ہے۔ جب تک ہم ڈھکن نہیں کھولتے، وہ نہ تو زندہ ہوتی ہے اور نہ مردہ۔

ایک ہی واقعے کی ' متعدد دنیاؤں والی' تشریح کا یہاں اطلاق کیا جائے تو کچھ کائناتوں میں بلّی زندہ ہے اور کچھ میں مری ہوئی ہے۔ لیکن دونوں ہی تشریحات عقل سلیم اور الہام کے تقاضے پورے نہیں کر پاتے ہیں ۔ زیادہ دبنگ قسم کے ماہر طبیعیات کو ان باتوں کی پروا نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ اس بحث کے پیچھے کار فرما ریاضی صحیح طریقے سے کام کرے اور تجربات پیش گوئیوں پر پورے اتریں۔ ہم میں سے زیادہ تر لوگ ان کے ساتھ چلنے سے کتراتے ہیں۔ہمیں اس قسم کا تصور کرنے کی ضرورت ہے کہ آخر 'حقیقت' میں ہو کیا رہا ہے ۔ ویسے، مجھے معلوم ہے کہ شروڈنگر نے بلّی کے ذہنی تجربے کی تجویز محض کوپنہیگن تشریح کی حماقت خیزی کو بے نقاب کرنے کے لئے دی تھی۔

ماہر حیاتیات لوئیس وولپرٹ کا ماننا ہے کہ جدید طبیعیات کا انوکھا پن محض برفانی تودے کی چوٹی ہے۔ سائنس عقل سلیم پر تشدد کرتی ہے[۴۸]۔ مثال کے طور پر وولپرٹ حساب لگاتا ہے کہ 'پانی کے ایک گلاس میں موجود سالمے (molecules) سمندر میں پانی کے گلاسوں کی مقدار سے کہیں زیادہ ہیں'۔ کیونکہ کرۂ ارض کا سارا پانی سمندروں کے ذریعے اپنا دائرہ حیات مکمل کرتا ہے، اس لئے اس بات کے امکانات بہت روشن ہیں کہ جب آپ پانی کا ایک گلاس پیتے ہیں تو اس میں سے کم از کم ایک قطرہ تو ایسا ہو گا جو کبھی اولیور کروموِیل کے مثانے سے گزر کر آیا ہو گا۔ ویسے تو اولیور کروموِیل یا مثانوں میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ کیا ابھی ابھی آپ نے اپنے سانس کے ساتھ نائٹروجن کا ایک ایٹم تو نہیں سونگھا جو کبھی کسی دراز قد فرن نخلی (cycad) درخت کے قریب کھڑے تیسرے نباتات خور سوسمار (iguanadon) نے سانس لیتے ہوئے خارج کیا تھا؟ کیا آپ خوش نہیں ہیں کہ آپ ایک ایسی دنیا میں جی رہے ہیں جہاں نہ صرف ایسا قیاس ممکن ہے بلکہ آپ کو یہ سمجھنے کا بھی استحقاق ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اور کھلے عام کسی دوسرے کو سمجھا بھی سکتے ہیں، اپنی رائے یا اپنے عقیدے کے طور پر نہیں بلکہ ایک ایسے تصوّر کے طور پر جسے آپ کے استدلال کو سمجھ جانے کے بعد وہ قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے؟ شاید یہ اس بات کا ایک پہلو ہے جس کے بارے میں کارل سیگن نے اشارہ کیا تھا جب اس نے "شیطانوں سے بھری دنیا: سائنس بطور اندھیرے میں روشنی کا دیا The Demon-Haunted World: Science as a Candle in the Dark" کو لکھنے کی وجۂ تحریک کا ذکر کیا: 'سائنس کی وضاحت نہ کرنا مجھے گمراہ کن لگتا ہے۔ جب آپ محبت میں گرفتار ہوتے ہیں تو آپ ساری دنیا کو بتانا چاہتے ہیں۔ یہ کتاب ایک ذاتی بیان ہے، اور سائنس سے میری عمر بھر کی محبت کی عکاسی کرتی ہے'۔

پیچیدہ زندگی کا ارتقاء، یا یوں کہئے کہ ایک ایسی کائنات میں اس کا وجود جو طبیعیاتی قوانین کے تابع ہے، شدید حد تک حیرت انگیز ہے ــ یا ہوتا ہے ، سوائے اس حقیقت کے کہ حیرت ایک ایسا جذبہ ہے جو ایک ایسے دماغ میں ہی پیدا ہوا ہو سکتا ہے جو اس حیرت انگیز عمل کا نتیجہ ہے۔ ایک بشری زاویہ ایسا بھی ہے جس کے مطابق ہمارا وجود بھی حیرت انگیز نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن میرے خیال میں جب میں یہ کہتا ہوں کہ یہ عمل ناقابل بیان حد تک حیرت انگیز ہے، تو میں تمام انسانیت کی نمائندگی کر رہا ہوں۔

ذرا سوچئے اس کے بارے میں۔ ایک سیّارے پر، اور غالباً پوری کائنات میں صرف ایک ہی سیّارے پر، ایسے سالمے جو عام طور پر ایک پتھر سے زیادہ کچھ نہیں بنا سکتے، اکٹھے ہو کر پتھر ہی کی جسامت کے اتنی حیران کن پیچیدگی کے حامل ایسے مادے بناتے ہیں جو بھاگنے، کودنے، تیرنے، اڑنے، دیکھنے، سننے، اور دوسرے ایسے پیچیدہ مادوں کو پکڑنے اور کھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے کچھ مادے سوچنے اور محسوس کرنے، اور دوسرے پتھر کی جسامت کے مادوں کے پیار میں ڈوب جانے کی قابلیت بھی رکھتے ہیں۔ اب ہم سمجھ چکے ہیں کہ عمل کیسے ہوتا ہے، لیکن صرف ۱۸۵۹ سے۔ ۱۸۵۹ سے پہلے یہ سب واقعی

بے حد عجیب لگتا تھا۔ لیکن ہم ڈارون کے مرہو ن منت ہیں کہ اب یہ صرف عجیب لگتا ہے۔ ڈارون نے برقعے کے چاک کو پکڑا اور اسے پھاڑ دیا جس سے فہم کا ایک سیلاب اندر داخل ہو گیا جس کی خیرہ کر دینے والی جدّت اور انسانی جذبے کو اجاگر کرنے کی طاقت کا شاید کوئی ثانی نہیں — سوائے اس کوپرنیکی احساس کے کہ دنیا کائنات کا محور نہیں ہے۔

'مجھے بتاؤ'، بیسویں صدی کے مشہور فلسفی لڈوگ وٹگنسٹائن ین نے ایک بار ایک دوست سے پوچھا 'بجائے یہ کہنے کے کہ زمین سورج کے گرد چکّر کاٹ رہی ہے، لوگ ہمیشہ یہ کیوں کہتے ہیں کہ لوگوں کا یہ کہنا قدرتی تھا کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے؟' دوست نے جواب دیا 'ظاہر ہے، کیونکہ ایسا دکھتا ہے کہ سورج زمین کے گرد گھوم رہاہے'۔ اس پر وٹگنسٹائن نے جواباً سوال کیا 'اور اگر ایسا لگتا کہ زمین اپنے محور کے گرد گھوم رہی ہے تو پھر کیسا دکھائی دیتا؟' میں کبھی کبھی اپنے خطبات میں اس گفتگو کا ذکر اس امید پہ کرتا ہوں کہ سامعین ہنسیں گے، لیکن زیادہ تر وہ ششدر اور خاموش ہو جاتے ہیں۔

اس محدود دنیا میں جس میں ہمارے دماغوں کا ارتقاء ہوا، بڑے اجسام کے مقابلے میں چھوٹے اجسام کے ہلنے کے امکانات زیادہ روشن ہیں، اور بڑے اجسام اس حرکت کا پس منظر مہیا کرتے ہیں۔ جیسے جیسے دنیا اپنے محور کے گرد گھومتی ہے، وہ اجسام جو ہم سے قریب ہونے کی وجہ سے بڑے لگتے ہیں — پہاڑ، درخت، عمارات، خود زمین بھی — سورج اور ستاروں جیسے اجسام فلکی کے مقابلے میں سب ایک دوسرے کے ساتھ اور مشاہدہ کرنے والے کے ساتھ بھی مکمل ہم عصری میں حرکت کرتے ہیں۔ ہمارے ارتقاء پزیر دماغ پیش منظر میں موجود پہاڑوں اور درختوں کی بجائے اجسام فلکی کے بارے میں حرکت کا ایک فریب بن دیتے ہیں۔

میں اب اوپر دیے گئے نقطے کی پیروی کرنا چاہتا ہوں، کہ جس طریقے سے ہم دنیا کو دیکھتے ہیں، اور جس وجہ سے ہمیں کچھ باتیں سمجھنے میں آسانی محسوس ہوتی ہے اور کچھ کو سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے، وہ یہ ہے کہ ہمارے دماغ بھی عمل ارتقاء کا نتیجہ ہیں: ہمارے جسم میں موجود کمپیوٹر جن کا ارتقاء ہمیں دنیا میں زندہ رہنے میں مدد دینے کے لئے ہوا ہے، — میں اسے درمیانی دنیا کہوں گا — جہاں ہماری زندگی کے لئے اہم اجسام نہ تو بہت بڑے تھے نہ چھوٹے تھے؛ ایک ایسی دنیا جہاں چیزیں یا تو ساکت تھیں یا روشنی کی رفتار کے مقابلے میں بہت سست روی سے حرکت کرتی تھیں، اور جہاں تقریباً بعد از قیاس (improbable) کو با آسانی ناممکن (impossible) تصوّر کیا جاسکتا تھا۔ ہمارے ذہنی برقعے کا چاک اس لئے چھوٹا ہے کیونکہ ہمارے قدیم آبا و اجداد کو اپنی بقاء کی خاطر اس سے بڑے چاک کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔

سائنس نے ہمیں سکھایا ہے کہ ارتقائی وجدان کی پیشگوئیوں کے بر خلاف بلّور (crystal) اور پتھروں جیسے بظاہر ٹھوس نظر آنے والے اجسام در حقیقت تقریباً خلاء کے بنے ہوئے ہیں۔ ایٹم کی جانی پہچانی تصویر کے مطابق نیوکلیس میدان میں مکھی کے برابر ہیں۔ دوسرا ایٹم اس میدان کے باہر ہے۔ سخت ترین، ٹھوس ترین، کثیف ترین پتھر بھی 'حقیقت میں' تقریباً ایک خلاء ہی ہیں، ایک ایسا خلاء جسے چند ذرّے توڑتے تو ہیں لیکن ایک دوسرے سے اتنے دور ہیں کہ ان کا ہونا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ تو پھر پتھر اس قدر سخت، ٹھوس اور غیر متداخل (impenetrable) کیوں لگتے ہیں؟

میں تصوّر بھی کرنے کی کوشش نہیں کروں گا کہ وٹگنسٹائن ن نے اس کا کیا جواب دیا ہوتا۔ لیکن ارتقائی حیاتیات کے ماہر کی حیثیت سے میں یہ جواب دوں گا۔ ہمارے دماغوں کا ارتقاء اس لئے ہوا تھا کہ وہ ہمارے جسموں کو دنیا میں اس پیمانے پر اپنا راستہ تلاش کرنے میں مدد کر سکیں جس پیمانے پر وہ جسم میں عمل کرتے ہیں۔ ہم نے ایٹم کی دنیا میں اپنا راستہ ڈھونڈنے کے لئے ارتقاء کیا ہی نہیں۔ اگر کیا ہوتا تو ہمارے دماغ پتھر کو خالی خلاء سے "بھرا ہوا" ہونے کا ادراک کر ہی لیتے۔ پتھر ہمارے ہاتھوں کو سخت اور غیر متداخل لگتے ہیں کیونکہ ہمارے ہاتھ ان میں داخل نہیں ہو سکتے ہیں۔ داخل نہ ہو سکنے کا مادّے کے ذرّات کے حجم اور آپسی فاصلوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے برعکس داخل نہ ہو سکنے کا تعلق قوتوں کے ان قطعات (force fields) سے ہے جو ٹھوس مادّے کے ان دور افتادہ ذرّوں سے منسلک ہیں۔ ہمارے دماغوں کو ٹھوس پن اور غیر متداخلیت جیسے تصوّرات تعمیر کرنے کا فائدہ حاصل ہوتا ہے، کیونکہ یہ تصوّرات ہمیں اپنے جسموں کو ایک ایسی دنیا میں راستے بنانے میں سہولت فراہم کرتا ہے جس میں اشیاء — جنہیں ہم ٹھوس کہتے ہیں — ایک دوسرے کے ساتھ ایک ہی خلاء میں موجود نہیں ہو سکتے۔

اس موقع پر ایک مزاحیہ وقفہ لیا جائے — جان رونسن کی "آدمی جو بکریوں کو تاڑتے ہیں --- The Men Who Stare at Goats" سے اقتباس ہے:

یہ ایک سچّی کہانی ہے۔ ۱۹۸۳ کی گرمیاں ہیں۔ میجر جرنل البرٹ سٹبلبائن سوئم آرلنگٹن، ورجینیا میں اپنی میز کے پیچھے بیٹھا ہے، اور اپنی دیوار کو گھور

رہا ہے جس پر اس کے بے شمار فوجی اعزاز آویزاں ہیں، جو ایک طویل اور مایہ ناز زندگی کی کہانی سناتے ہیں۔ وہ ریاست ہائے متحدہ کے جاسوسی کے ادارے کا سربراہ ہے، اور اس کے پاس سولہ ہزار سپاہیوں کی فوج ہے... وہ اعزازات سے پرے، دیوار کو دیکھتاہے۔ اسے احساس ہے کہ اسے کچھ کرنا ہے، اگرچہ ایسا کرنے کا خیال بھی اسے خوفزدہ کرتا ہے۔ وہ اس انتخاب کے بارے میں سوچتا ہے جو اسے ابھی کرنا ہے۔ وہ اس دفتر میں رہ سکتا ہے یا برابر والے دفتر میں جا سکتا ہے۔ یہی اس کا انتخاب ہے۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ برابر والے دفتر میں جائے گا.... وہ کھڑا ہوتا ہے، میز کے پیچھے شروع کرتا ہے۔ میرا مطلب ہے، وہ سوچتا ہے کہ آخر یہ ایٹم کس چیز کا بناہوا ہے؟ خلاء! وہ اپنی رفتار تیز کر دیتا ہے۔ میں زیادہ تر کس چیز کا بنا ہوا ہوں؟ وہ سوچتا ہے۔ ایٹم! اب وہ تقریباً بھاگ رہا ہے۔ یہ دیوار زیادہ تر کس چیز کی بنی ہوئی ہے؟ وہ سوچتا ہے۔ ایٹم! مجھے بس اتنا ہی کرنا ہے کہ تمام خلاؤں کو ایک دوسرے میں ضم کر دے... اور پھر جرنل سٹبلبائنن کی ناک دیوار سے ٹکرا جاتی ہے۔ دھت تیری کی، وہ سوچتا ہے۔ ایک بار پھر جرنل سٹبلبائنن دیوار کے اندر سے گزر جانے میں ناکامی کی وجہ سے پریشان ہو جاتا ہے۔

جرنل سٹبلبائن اپنے ادارے کی ویب سائٹ یٹ کے مطابق "دائرے سے باہر سوچنے والا شخص"ہے، وہ اس ادارے کواپنی نوکری مکمل ہو جانے کے بعد اپنی بیوی کے ساتھ چلاتا ہے۔ جس کا نام HealthFreedomUSA ہے، جو 'وائیٹامن، معدنیات، وغیرہ جیسی اضافی ادویات (supplements)، جڑی بوٹیوں، ہومیوپیتھک علاج، غذائی ادویات اور صاف کھانے (کیڑے مار دواؤں کی آمیز ش سے پاک)' جیسے مہموں کے لئے وقف ہے، 'اور دوا اور اس کی مقدار کے معالے میں (حکومتی دھونس کے ذریعے) ادویات بنانے والے بڑے اداروں کی مداخلت سے آزاد ہے'۔ بیش قیمت جسمانی سیال کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا ۔

کیونکہ ہمارا ارتقاء درمیانی دنیا میں ہوا ہے، ہمیں بدیہی طور پر ایسے خیالات سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی کہ: 'جب ایک میجر جرنل اس رفتار سے حرکت کرتا ہے جس پر عام طور پر درمیانی دنیا کے میجر جرنل اور دیگر اجسام حرکت کرتے ہیں، اور درمیانی دنیا کے کسی ٹھوس جسم سے ٹکراتا ہے، تو اس کی ترّقی بڑے تکلیف دہ انداز میں رک جاتی ہے'۔ ہمارے دماغ یہ تصوّر کرنے کے قابل ہی نہیں ہیں کہ اگر ہم ایک نیوٹرینو (neutrino) ہوتے تو دیوار کی ان خالی جگہوں میں سے گزرتے ہوئے کیسا محسوس کرتے جن پر وہ دیوار "حقیقت" میں مبنی ہے؟ اور نہ ہی ہماری فہم و فراست ان اثرات کی متحمل ہو سکتی ہیں جو روشنی کی رفتار سے حرکت کرتے ہوئے مرتّب ہوتے ہیں۔

انسانی وجدان، کسی بیرونی مدد سے آزادہیں، جس کا ارتقاء درمیانی دنیا میں ہوا ہے، گیلیلیو کے اس دعوے کا یقین کرنے میں بھی مشکل محسوس کرتے ہیں کہ اگر ہوا کا کراؤ (air friction) مداخلت نہ کرے تو مینار سے پھینکا گیا توپ کا گولا اور پرندے کا پر زمین پر ایک ہی وقت میں آن پہنچتے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ درمیانی دنیا میں ہوا کا ٹکراؤ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اگر ہمارا ارتقاء ہی خلاء میں ہوا ہوتا تو ہم توقع رکھتے کہ گولا اور پر ایک ہی وقت میں زمین پر پہنچیں گے۔ لیکن ہم درمیانی دنیا کے رہنے والے ہیں، اور یہ بات ہماری قوت تصوّر پر حدود قائم کرتی ہے۔ اگر ہم میں کوئی خاص قابلیت نہ ہو یا ہمیں کوئی انوکھی ہی قسم کی تعلیم نہ دی گئی ہو تو ہمارے برقعے کا تنگ چاک ہمیں صرف اتنی ہی اجازت دیتا ہے کہ ہم درمیانی دنیا کو دیکھ سکیں۔

ایک مخصوص زاویے سے ہم جانوروں کو نہ صرف درمیانی دنیا میں رہنا ہوتا ہے بلکہ ایٹم اور الیکٹرون کی خوردبین دنیا میں بھی رہنا پڑتا ہے۔ وہ اعصابی تحریکیں جن کی مدد سے ہم سوچتے ہیں یا تصوّر و تخیّل کے گھوڑے دوڑاتے ہیں خوردبین دنیا میں ہونے والی سرگرمیوں کی مرہوون منت ہیں۔ لیکن ہمارے قدیم آبا وءاجداد کی کوئی بھی حرکت یا کوئی بھی فیصلہ ان کی خودبین دنیا کی سمجھ پر منحصر نہیں رہا ہو گا۔ اگر ہم جرثومے (bacteria) ہوتے جو درجۂ حرارت کے باعث ہونے والی سالموں کی حرکت (Brownian motion) کی وجہ سے ادھر ادھر دھکے کھاتے پھرتے، تو صورت حال مختلف ہوتی۔ لیکن ہم درمیانی دنیا کے مکین اتنے جسیم ہیں کہ براؤنئین حرکت کو محسوس ہی نہیں کر سکتے۔ اسی طرح، ہماری زندگیاں کشش ثقل کے غلبے میں رہتی ہیں، لیکن سطحی کشیدگی (surface tension) کی نازک طاقت کا ادراک نہیں کر سکتی ۔ ایک چھوٹے سے مکوڑے کے لئے صورت حال بالکل الٹ ہو گی؛ اسے سطحی کشیدگی قطعی نازک نہیں لگے گی۔

"تخلیق، زندگی اور اسے کیسے بنایا جائے - Creation, Life and How to Make It" میں سٹیو گرینڈ نے مادے کے بارے میں ہمارے

www.healthfreedomusa.org/aboutus/president.shtml.، جرنل سٹبلبائن ین کے کردار کی غمّازی کرنے والی تصاویر یہاں ملاحظہ کیجئے

www.mindcontrolforums.com/images/Mind۹۴.jpg.

خبط کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ہم میں ایک رجحان پایا جاتا ہے کہ صرف وہ چیزیں 'حقیقت' رکھتی ہیں جو ٹھوس اور مادی 'چیزیں' ہیں۔ خلاء میں برقی مقناطیسیت کے اتار چڑھاؤ کی 'لہریں' ہمیں 'غیر حقیقی' لگتی ہیں۔ وکٹورین دور کے مفکّرین کا خیال تھا کہ لہروں کو لہر ہونے کے لئے ان کا کسی مواد 'میں' موجود ہونا لازمی ہے۔ ایسے کسی مواد کے بارے میں کوئی معلومات موجود نہیں تھیں، اس لئے انہوں نے ایک ایسا مواد 'ایجاد' کر لیا اور اس کا نام ضیا بخش صاف آسمان (luminiferous ether) رکھ دیا۔ لیکن ہمیں اپنی فہم و فراست کو 'حقیقی' مادے کے خیال سے تقویت حاصل ل ہوتی ہے کیونکہ ہمارے آبا ؤ اجداد کا اتقاء درمیانی دنیا میں ہوا تھا، جہاں مادہ ایک فائد دہ مند خیال ہے۔

دوسری طرف ایک عجیب صورت ہے کہ ہم درمیانی دنیا والے بھنور کو بھی پتھر جیسی ٹھوس حقیقت کی طرح ایک 'چیز' کے طور پر دیکھتے ہیں، حالانکہ بھنور کے اندر موجود مادہ ہر لحہ تبدیل ہو رہا ہوتا ہے۔ تنزانیہ کے صحرائی میدان میں ماسائی قبیلے کے مقدس آتش فشاں اول دونیو لینگائی کے سائے تلے ۱۹۶۹ کے پھٹنے کے واقعے کے نتیجے میں جمع ہونے والی راکھ کا ایک ڈھیر ہے۔ تند ہواؤں نے اس میں ایک 'شکل' تراش دی ہے۔ لیکن خوبصورت بات یہ ہے کہ وہ جسمانی طور پر حرکت کرتی ہے۔ تکنیکی زبان میں اسے 'باہکان' کہتے ہیں۔ پورے کا پورا راکھ کا ڈھیر ۱۷ میٹر فی سال کی رفتار سے ریگستان میں مغربی سمت میں سفر کر رہا ہے۔ اپنی ہلالی شکل برقرار رکھتے ہوئے، وہ ہلال کے کناروں کی سمت میں حرکت کرتا رہتا ہے۔ ہوا ریت کو ہلال کی باہری ہلکی ڈھلوان پر چڑھاتی ہے اور ریت کے ذرّے نچ پر پہنچنے کے بعد کھڑی ڈھلوان کی طرف گرتے جاتے ہیں۔

حقیقتاً، باہکان بھی ایک لہر کے مقابلے میں زیادہ "چیز" ہے۔ لہر کھلے سمندر میں افقی زاویے میں سفر کرتی ہے لیکن اس کے اندر پانی کے سالمے عمودی زاویے میں حرکت کرتے ہیں۔ اس ہی طرح صوتی لہریں بھی سپیکر سے کان تک سفر کرتی ہیں لیکن ہوا کے سالمے حرکت نہیں کرتے: وہ آندھی ہو گی، آواز نہیں۔ سٹیو گرینڈ کہتا ہے کہ آپ اور میں مستقل 'چیزیں' ہونے سے زیادہ لہریں ہیں۔ وہ اپنے قارئین کو ایک اپنے بچپن کے کسی تجربے کے بارے میں سوچنے کی دعوت دیتا ہے:

> کوئی واقعہ جو آپ کو اچھی طرح یاد ہو، جسے آپ دیکھ سکتے ہیں، محسوس کر سکتے ہیں، شاید سونگھ بھی سکتے ہیں جیسے آپ اب بھی وہیں ہیں۔ آخر آپ اس وقت واقعی وہاں تھے، یا نہیں؟ ورنہ آپ کو یہ سب کچھ کیسے یاد رہتا؟ لیکن اصل دھماکہ اب ہو گا: آپ وہاں نہیں تھے! آپ کے جسم میں اس وقت موجود کوئی ایک بھی ایٹم اس واقعہ کے وقت موجود نہیں تھا.... مادہ ایک جگہ سے دوسری جگہ انتقال کرتا رہتا ہے اور وقتی طور پر "آپ" بننے کے لئے ایک جگہ تھم جاتا ہے۔ لہٰذا آپ جو کچھ بھی ہیں، وہ مادہ نہیں ہیں جس سے آپ تعمیر ہوئے ہیں۔ اگر یہ جملہ پڑھ کر آپ کے رونگٹے کھڑے نہیں ہوئے، تو اسے دوبارہ پڑھئے، اور اس وقت تک پڑھئے جب تک آپ کے رونگٹے کھڑے نہ ہو جائیں۔ کیونکہ یہ بات آپ کے لئے بہت اہم ہے۔

'حقیقتاً' ایک ایسا لفظ نہیں ہے جسے سادہ خود اعتمادی سے استعمال کیا جانا چاہئے۔ اگر نیوٹرینو کا ایسا دماغ ہوتا جو اس کے آبا ؤ اجداد کے ارتقاء کا نتیجہ ہوتا، تو وہ یہی کہتا کہ پتھر 'واقعی' خلاء پر ہی مشتمل ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس ایسے دماغ ہیں جو درمیانی جسامت کے ایسے آبا ؤ اجداد کے ارتقاء کا نتیجہ ہیں جو پتھروں کے بیچ سے نہیں گزر سکتے تھے۔ لہٰذا ہمارا 'حقیقتاً' ایک ایسا 'حقیقتاً' ہے جس میں پتھر ٹھوس ہوتے ہیں۔ جانور کے لئے 'حقیقتاً!' وہ ہے جس کی اس کے دماغ کو اس کی بقار اور افزائش کے لئے ضرورت ہے۔ اور چونکہ مختلف اجناس مختلف دنیاؤں میں رہ رہی ہیں، اس لئے حقیقتوں کے کئی اقسام موجود ہیں۔

ہم حقیقی دنیا کو جس طرح دیکھتے ہیں وہ بے روغن حقیقی دنیا نہیں بلکہ اس کا ایک زاویہ ہے جس کا قاعدہ ہمارے حواس مرتب کرتے ہیں — ایک زاویہ جو تعمیر ہی اس مقصد کے لئے کیا جاتا ہے تاکہ وہ ہمیں اصلی دنیا سے نمٹنے میں مدد دے سکے۔ اس زاویے ے کی حیثیت کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم کس قسم کے جانور ہیں۔ اڑنے والے جانور کو چلنے والے، تیرنے والے یا چڑ ھنے والے جانور سے مختلف زاویے ے کی ضرورت ہے۔ شکاری جانور کو شکار ہونے والے جانور کے مقابلے میں ایک مختلف زاویے ے کی ضرورت ہے، اگرچہ ان کی دنیائیں ایک دوسرے سے متجاوز ہیں۔ بندر کے دماغ میں ایسی سافٹ وئیر کی

---

کچھ لوگ گرینڈ کے بیان کے لغوی سچ سے انکار کریں گے، مثلاً ہڈی کے سالموں کے سلسلے میں۔ لیکن بیان کی نیت درست ہے۔ آپ کسی جامد مادی 'چیز' سے زیادہ ایک لہر ہیں۔

ضرورت ہے جو ابعاد ثلاثہ (three dimensional) میں درختوں اور ٹہنیوں کا ایک ذہنی خاکہ بنا سکے۔ کشتی چلانے والے کے دماغ کو ابعاد ثلاثہ سافٹ وئیر کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ وہ تالاب کی سطح پر ایک چپٹی دنیا میں رہتا ہے۔ نیولے کی زاویے تعمیر کرنے کی سافٹ ویئر اسے زیر زمین سرنگیں کھودنے میں مدد فراہم کرتی ہے۔ تل چوہے کی سافٹ وئیر نیولے جیسی ہی ہو گی، لیکن گلہری، جو کہ تل چوہے کی طرح کترنے والے جانوروں کی جنس rodent سے تعلق رکھتی ہے، دنیا کا زاویہ بنانے کے لئے بندر کے جیسی سافٹ وئیر کا استعمال کرتی ہے۔

میں نے "اندھا گھڑی ساز - Blind Watchmaker" اور دیگر جگہ پر قیاس آرائی کی کہ چمگادڑیں رنگوں کو اپنے کانوں سے 'دیکھتی' ہیں۔ دنیا کا جو زاویہ چمگادڑوں کو ابعاد ثلاثہ میں مکوڑے پکڑنے کی غرض سے اپنا راستہ تلاش کرنے کے لئے درکار ہے اس زاویےے کی مانند ہے جو چڑیاں اس قسم کے مقاصد حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ چمگادڑ اپنے زاویے ے کے متغیرات کو جدید کرنے کے لئے باز گزشت کا استعمال کرتی ہے جبکہ چڑیا روشنی کا ۔ میرا خیال ہے چمگادڑیں باز گشت کی کسی فائدہ مند خصوصیت جیسے کہ سطح کی صوتی ساخت کو عنوان عطا کرنے کی غرض سے ادراک یافتہ رنگوں کو اندرونی طور پر استعمال کرتی ہیں، مثلاً 'لال' یا 'نیلا'۔ جبکہ چڑیاں ان ہی ادراک یافتہ رنگوں کو روشنی کی لمبی اور چھوٹی طول موج کے عنوان عطا کرنے کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ میرا نقطہ یہ ہے کہ زاویے کی نوعیت کا انحصار اس بات پر ہے کہ اسے استعمال کیسے کیا جائے گا نہ کہ کونسے حواس بروئے کار لائے جائیں گے۔ چمگادڑوں سے سیکھنے والا سبق یہ ہے۔ دانیاوی زاویے ے کی عمومی صورت ــــ برعکس ان متغیرات کے جو ہر وقت حواس کے اعصاب میں داخل ہو رہے ہوتے ہیں ــ جانور کی طرز زندگی سے مطابقت کانمونہ ہے، جیسے کہ جانور کے پر، ٹانگیں یا دم ہیں۔

ممکن دنیا (possible worlds) کے عنوان سے لکھے گئے مقالے میں ــــ جس کا اوپر بھی ذکر کیا گیا ہے ــ جے بی ایس ہالڈین نے ان جانوروں کے بارے میں بھی بات کی ہے جن کی دنیا میں بو کا غلبہ ہے۔ اس نے دیکھا کہ کتے دو مختلف چربی زدہ تیزابوں کی بو میں تفریق کر سکتے ہیں ــــ کیپرلک ایسڈ اور کیپرویئک ایسڈ ــــ دونوں کو پانی کے ایک میلین حصے میں ایک حصہ ڈال کر پتلا کرنے کے بعد بھی واحد فرق یہ ہے کہ کیپرلک ایسڈ کے سالمے کی کڑی میں کیپرویئک ایسڈ کے سالمے کی کڑی کے مقابلے میں کاربن کے دو ایٹم اضافی ہیں۔ ہالڈین نے اندازہ لگا لیا کہ ایک کتا دونوں تیزابوں کو بو کی بنیاد پر ان کے سالمے کے وزن کے حساب سے ترتیب دے سکتا ہے، جیسے ایک آدمی پیانو کے تاروں کو ان کی آواز کے حساب سے ترتیب دے سکتا ہے۔

ایک اور چربی زدہ تیزاب ہے، جس کا نام کیپرک ایسڈ ہے اور جس میں مذید دو اضافی کاربن ایٹم موجود ہیں۔ ایک ایسے کتے کو جسے پہلے کبھی کیپرک ایسڈ کا سامنا نہیں ہوا اس کی بو کا تصوّر کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہو گی، جیسے ہمیں باجے کو ایک سر اوپر بجتا ہوا تصوّر کرنے میں دشواری نہیں ہو گی۔ مجھے یہ بالکل منطقی لگتا ہے کہ ایک کتا، یا گینڈا، مختلف بو کے آمیزے کا ادراک ہم آہنگ سروں کی طرح ہی کرتے ہوں۔ شاید کہیں بے ہنگمی بھی ہوتی ہو۔ لیکن شاید مکمل راگ ہی ممکن نہ ہوں، کیونکہ راگ سروں کے ایک دم اور صحیح لمحوں پر بجنے یا خاموش ہو جانے سے بنتے ہیں، جبکہ مختلف بو کے ساتھ ایسا نہیں کیاجا سکتا۔ شاید کتے اور گینڈے رنگوں میں بو سونگھتے ہیں۔ یہاں بھی وہی دلیل استعمال ہو گی جو چمگادڑوں کے سلسلے میں استعمال ہوتی ہے۔

ایک بار پھر، جن ادراک (pereceptions) کو ہم "رنگ" کہتے ہیں وہ ہمارے دماغ کے خارجی دنیا میں پائے جانے والے اہم امتیازات کو پہچاننے کے اوزار ہیں۔ ادراک یافتہ رنگوں کا ــــ جنہیں فلسفی "کوالیہ" کہتے ہیں، یعنی ہوش میں کئے گئے نفسی تجربات کی انفرادی مثالیں ــــ مخصوص طول موج (wavelengths) سے کوئی خلقی تعلق نہیں ہے۔ یہ وہ اندرونی ٹھپّے ہیں جو دماغ کو بیرونی دنیا کی حقیقت کے زاویے تعمیر کرتے وقت میسّر ہوتے ہیں، تاکہ وہ امتیازات کئے جا سکیں جو اس جانور کی بقاء کے لئے نہایت اہم ہیں۔ ہمارے سلسلے میں، یا کسی پرندے کے سلسلے میں، اس کا مطلب ہے مختلف طول موج کی روشنی۔ میرے قیاس کے مطابق چمگادڑ کے سلسلے میں شاید یہ مختلف بازگشت کی صفات یا بناوٹ ہوں گے، جیسے کہ چمکدار کے لئے لال، مخملی کے لئے نیلا، اور کھردرے کے لئے سبز۔ اور کتے یا گینڈے کے سلسلے میں یہی ٹھپّے بو کی پہچان کے لئے استعمال کیوں نہیں کئے جا سکتے؟ چمگادڑ یا گینڈے، تالابی کھٹّل (pond skater) یا نیولے، چھال بھوترے (bark beetle) یا جرثومے کی نامعلوم دنیا کا تصوّر کرنے کی طاقت ان استحقاق ہائے میں سے ایک ہے جو سائنس ہمیں فراہم کرتی ہے ،جب وہ ہمارے برقعے کے کالے کپڑے کو کھینچتی ہے اور ہمارے لطف کے لئے ہمیں وہ وسیع مناظر دکھاتی ہے جو پردے کے باہر موجود ہیں۔

درمیانی دنیا کا استعارے ــــ مظاہر کے درمیانے درجات جو برقعے کا باریک چاک ہمیں دیکھنے کی اجازت دیتا ہے ــــ کا اطلاق دیگر درجات یا 'طیف' پر بھی ہوتا ہے۔ ہم غیر اغلیت (improbability) کے درجات تعمیر کر سکتے ہیں، جس میں برقعے کی طرح کے ایک تنگ دریچے سے ہمارے وجدان اور تخیّل گزرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ غیر اغلیت کے طیف کی ایک جانب وہ واقعات ہیں جنہیں ہم ناممکن کہتے ہیں۔ معجزات ایسے واقعات ہیں جو شدید حد تک بعد از قیاس ہیں۔ میڈونا کا مجسمہ ہماری سمت میں ہاتھ ہلا سکتا ہے۔ اس کی بلوری ساخت (crystalline structure) جن ایٹموں پر مشتمل ہے آگے پیچھے حرکت کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ تعداد میں بہت زیادہ ہیں اور ان کی حرکت کی سمت کے بارے میں کوئی اتفاق نہیں ہے لہٰذا ہاتھ، جیسے کہ ہم اسے درمیانی دنیا میں دیکھتے

ہیں، بالکل ساکت رہتا ہے۔ لیکن یہ ہلتے ہوئے ایٹم یک ہی وقت میں ایک ہی سمت میں حرکت کر بھی سکتے ہیں۔ دوبارہ۔ اور دوبارہ۔۔۔ اور پھر ہاتھ ہلے گا۔ اور ہمیں اپنی طرف ہلتا ہوا نظر بھی آئے گا۔ ہو بھی سکتا ہے، لیکن ایسا ہو سکنے کے امکانات اتنے کمزور ہیں کہ اگر آپ نےکائنات کے آغاز کے وقت ایسے واقعے کے امکان کا نمبر لکھنا شروع کیا ہوتا تو آج بھی اس کے صفر کے ہندسے ابھی لکھ ہی رہے ہوتے۔ ایسے امکانات کا حساب لگانے کی طاقت — ہار مان لینے کی بجائے قریب ناممکن کا تعین کرنے کی قوت — سائنس کے انسانی روح کو آزاد کر دینے والے دان کا ایک اور نمونہ ہے۔

درمیانی دنیا میں ارتقاء کی وجہ سے ہم صحیح طریقے سے قریب ناممکن واقعات سے نمٹنے کی قابلیت نہیں رکھتے۔ لیکن کائناتی خلاء کی گہرائیوں یا ارضیاتی وقت (geological time) میں درمیانی دنیا میں ناممکن لگنے والے واقعات ناگزیر نظر آنے لگتے ہیں۔ ہم جس دریچے سے ممکنات کے طیف کو دیکھنے کے عادی ہیں سائنس اس دریچے کے پٹ کھول پھینکتی ہے۔ حساب اور استدلال ہمیں امکانات کی ان گہرائیوں تک جانے کی آزادی بخشتے ہیں جو کبھی وہم کی حدود سے باہر تھے یا جن میں مافوق الفطرت بلائیں بستی تھیں۔ ہم نے دریچے کے اس طور کھل جانے کا ذکر باب ۴ میں بھی کیا تھا جہاں ہم نے زندگی کے آغاز کے عدم احتمال پر بھی غور کیا اور کیسے، اگر خاطر خواہ سیارتی وقت مہیّا کر دیا جائے تو ایک تقریباً ناممکن کیمیائی واقعہ بھی ناگزیر ہو جاتاہے ؛ اور جہاں ہم نے ممکنہ کائناتوں کے طیف کا جائزہ بھی لیا، جس میں ہر کائنات کے اپنے قوانین اور مستقل اعداد ہیں، اور اپنے آپ کو زندگی کے موافق اقلیتی کائناتوں میں سے کسی ایک میں پانے کی بشریاتی ضرورت کا ذکر بھی کیا۔

ہم ہالڈین کی ' ہمارے تصوّر سے بھی زیادہ عجیب' کی تشریح کیسے کریں؟ اس سے بھی زیادہ عجیب جس کا اصولی طور پر تصوّر کیا جاسکتا ہے؟ یا ہمارے دماغوں کے درمیانی دنیا میں ارتقاء کی حدود کی بنیاد پر صرف ہمارے تصوّر سے زیادہ عجیب؟ کیا ہم تربیت اور مشق کی مدد سے اپنے آپ کو درمیانی دنیا سے آزاد کرا سکتے ہیں، برقعہ اتار پھینک سکتے ہیں، اور بہت چھوٹے، بہت بڑے اور بہت تیز قسم کی وجدانی — اور ریاضی پر مبنی — سمجھ حاصل کر سکتے ہیں؟ مجھے واقعی اس سوال کا جواب معلوم نہیں ہے، لیکن مجھے بے حد خوشی ہے کہ میں ایک ایسے دور میں زندہ ہوں جس میں انسانیت افہام و تفہیم کی حدود کو آگے بڑھا رہی ہے۔ اس سے بڑھ کر، شاید ہم آگے چل کر یہ بھی دریافت کر لیں کہ کوئی حدود موجود ہی نہیں ہے۔

جو لوگ مذہب کو ترک کرنا چاہتے ہیں، ان کی مدد کی غرض سے ہم نے دوستانہ رابطوں کی ایک جزوی فہرست تیّار کی ہے، جس کی تفصیلات درج ذیل ہیں۔

میں اپنی ویبسائٹ www.richarddawkins.net پر ایک مکمل فہرست شائع کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہوں، اور آپ کی معافی کا خواستگار بھی ہوں کہ یہ فہرست زیادہ تر انگریزی بولنے والی دنیا تک ہی محدود ہے:

**USA**

American Atheists
PO Box ۵۷۳۳, Parsippany, NJ ۰۷۰۵۴-۶۷۳۳
Voicemail: ۱-۹۰۸-۲۷۶-۷۳۰۰
Fax: ۱-۹۰۸-۲۷۶-۷۴۰۲
Email: info@atheists.org
www.atheists.org

American Humanist Association
۱۷۷۷ T Street, NW, Washington, DC ۲۰۰۰۹-۷۱۲۵
Telephone: (۲۰۲) ۲۳۸-۹۰۸۸
Toll-free: ۱-۸۰۰-۸۳۷-۳۷۹۲
Fax: (۲۰۲) ۲۳۸-۹۰۰۳
www.americanhumanist.org

Atheist Alliance International
PO Box ۲۶۸۶۷, Los Angeles, CA ۹۰۰۲۶
Toll-free: ۱-۸۶۶-HERETIC
Email: info@atheistalliance.org
www.atheistalliance.org

The Brights
PO Box ۱۶۳۴۱۸, Sacramento, CA ۹۵۸۱۶ USA
Email: the-brights@the-brights.net
www.the-brights.net

Center For Inquiry Transnational
Council for Secular Humanism
Campus Freethought Alliance
Center for Inquiry – On Campus
African Americans for Humanism
۳۹۶۵ Rensch Road, Amherst, NY ۱۴۲۲۸
Telephone: (۷۱۶) ۶۳۶-۴۸۶۹
Fax: (۷۱۶) ۶۳۶-۱۷۳۳
Email: info@secularhumanism.org; www.centerforinquiry.net
www.secularhumanism.org; www.campusfreethought.org
www.secularhumanism.org/index.php?section=aah&page=index

Freedom From Religion Foundation
PO Box ۷۵۰, Madison, WI ۵۳۷۰۱
Telephone: (۶۰۸) ۲۵۶-۵۸۰۰
Email: info@ffrf.org
www.ffrf.org

Anti-Discrimination Support Network (ADSN)
Freethought Society of Greater Philadelphia
PO Box ۲۴۲, Pocopson, PA ۱۹۳۶۶-۰۲۴۲
Telephone: (۶۱۰) ۷۹۳-۲۷۳۷
Fax: (۶۱۰) ۷۹۳-۲۵۶۹
Email: fsgp@freethought.org
www.fsgp.org/

Institute for Humanist Studies
۴۸ Howard St, Albany, NY ۱۲۲۰۷
Telephone: (۵۱۸) ۴۳۲-۷۸۲۰
Fax: (۵۱۸) ۴۳۲-۷۸۲۱
www.humaniststudies.org

International Humanist and Ethical Union – USA

Appignani Bioethics Center

PO Box ۴۱۰۴, Grand Central Station, New York, NY ۱۰۱۶۲

Telephone: (۲۱۲) ۶۸۷-۳۳۲۴

Fax: (۲۱۲) ۶۶۱-۴۱۸۸

Internet Infidels

PO Box ۱۴۲, Colorado Springs, CO ۸۰۹۰۱-۰۱۴۲

Fax: (۸۷۷) ۵۰۱-۵۱۱۳

www.infidels.org

James Randi Educational Foundation

۲۰۱ S.E. ۱۲th St (E. Davie Blvd), Fort Lauderdale, FL ۳۳۳۱۶-۱۸۱۵

Telephone: (۹۵۴) ۴۶۷-۱۱۱۲

Fax: (۹۵۴) ۴۶۷-۱۶۶۰

Email: jref@randi.org

www.randi.org

Secular Coalition for America

PO Box ۵۳۳۳۰, Washington, DC ۲۰۰۰۹-۹۹۹۷

Telephone: (۲۰۲) ۲۹۹-۱۰۹۱

www.secular.org

Secular Student Alliance

PO Box ۳۲۴۶, Columbus, OH ۴۳۲۱۰

Toll-free Voicemail / Fax: ۱-۸۷۷-۸۴۲-۹۴۷۴

Email: ssa@secularstudents.org

www.secularstudents.org

The Skeptics Society

PO Box ۳۳۸, Altadena, CA ۹۱۰۰۱

Telephone: (۶۲۶) ۷۹۴-۳۱۱۹

Fax: (۶۲۶) ۷۹۴-۱۳۰۱

Email: editorial@skeptic.com

www.skeptic.com

Society for Humanistic Judaism

۲۸۶۱۱ W. ۱۲ Mile Rd, Farmington Hills, MI ۴۸۳۳۴

Telephone: (۲۴۸) ۴۷۸-۷۶۱۰

Fax: (۲۴۸) ۴۷۸-۳۱۵۹

Email: info@shj.org

www.shj.org

**Britain**

British Humanist Association

۱ Gower Street, London WC۱E ۶HD

Telephone: ۰۲۰ ۷۰۷۹ ۳۵۸۰

Fax: ۰۲۰ ۷۰۷۹ ۳۵۸۸

Email: info@humanism.org.uk

www.humanism.org.uk

International Humanist and Ethical Union – UK

۱ Gower Street, London WC۱E ۶HD

Telephone: ۰۲۰ ۷۶۳۱ ۳۱۷۰

Fax: ۰۲۰ ۷۶۳۱ ۳۱۷۱

www.iheu.org/

National Secular Society

۲۵ Red Lion Square, London WC۱R ۴RL

Tel: ۰۲۰ ۷۴۰۴ ۳۱۲۶

Fax: ۰۸۷۰ ۷۶۲ ۸۹۷۱

www.secularism.org.uk/

New Humanist

۱ Gower Street, London WC۱E ٦HD

Telephone: ۰۲۰ ۷۳۲٦ ۱۱۵۱

Fax: ۰۲۰ ۷۰۷۹ ۳۵۸۸

Email: info@newhumanist.org.uk

www.newhumanist.org.uk

Rationalist Press Association

۱ Gower Street, London WC۱E ٦HD

Telephone: ۰۲۰ ۷۳۲٦ ۱۱۵۱

Fax: ۰۲۰ ۷۰۷۹ ۳۵۸۸

Email: info@rationalist.org.uk

www.rationalist.org.uk/

South Place Ethical Society (UK)

Conway Hall, Red Lion Square, London WC۱R ۲RL

Telephone: ۰۲۰ ۷۲۴۲ ۸۰۳۷/۴

Fax: ۰۲۰ ۷۲۴۲ ۸۰۳٦

Email: library@ethicalsoc.org.uk

www.ethicalsoc.org.uk

**Canada**

Humanist Association of Canada

PO Box ۸۷۵۲, Station T, Ottawa, Ontario, K۱G ۳J۱

Telephone: ۸۷۷-HUMANS-۱

Fax: (٦۱۳) ۷۳۹-۴۸۰۱

Email: HAC@Humanists.ca

http://hac.humanists.net/

**Australia**

Australian Skeptics

PO Box ۲۶۸, Roseville, NSW ۲۰۶۹

Telephone: ۰۲ ۹۴۱۷ ۲۰۷۱

Email: skeptics@bdsn.com.au

www.skeptics.com.au

Council of Australian Humanist Societies

GPO Box ۱۵۵۵, Melbourne, Victoria ۳۰۰۱

Telephone: ۶۱۳ ۵۹۷۴ ۴۰۹۶

Email: AMcPhate@bigpond.net.au

http://home.vicnet.net.au/~humanist/resources/cahs.html

**New Zealand**

New Zealand Skeptics

NZCSICOP Inc.

PO Box ۲۹-۴۹۲, Christchurch

Email: skeptics@spis.co.nz; http://skeptics.org.nz

Humanist Society of New Zealand

PO Box ۳۳۷۲, Wellington

Email: jeffhunt۹۰@yahoo.co.nz

www.humanist.org.nz/

**India**

Rationalist International

PO Box ۹۱۱۰, New Delhi ۱۱۰۰۹۱

Telephone: ۹۱ ۱۱ ۵۵۶ ۹۹۰ ۱۲

Email: info@rationalistinternational.net

www.rationalistinternational.net/

**Islamic**

Apostates of Islam

www.apostatesofislam.com/index.htm

Dr Homa Darabi Foundation

(To promote the rights of women and children under Islam)

PO Box ۱۱۰۳۹, Truckee, CA ۹۶۱۶۲, USA

Telephone (۵۳۰) ۵۸۲ ۳۱۹۷

Fax (۵۳۰) ۵۸۲ ۰۱۵۶

Email: homa@homa.org

www.homa.org/

FaithFreedom.org

www.faithfreedom.org/index.htm

Institute for the Secularization of Islamic Society

Email: info@SecularIslam.org

www.secularislam.org

# حوالہ جاتی یا مجوزہ کتب کی فہرست


Adams, D. (۲۰۰۳). *The Salmon of Doubt*. London: Pan.

Alexander, R. D. and Tinkle, D. W., eds (۱۹۸۱). *Natural Selection and Social Behavior*. New York: Chiron Press.

Anon. (۱۹۸۵). *Life – How Did It Get Here? By Evolution or by Creation?* New York: Watchtower Bible and Tract Society.

Ashton, J. F., ed. (۱۹۹۹). *In Six Days: Why ۵۰ Scientists Choose to Believe in Creation*. Sydney: New Holland.

Atkins, P. W. (۱۹۹۲). *Creation Revisited*. Oxford: W. H. Freeman.

Atran, S. (۲۰۰۲). *In Gods We Trust*. Oxford: Oxford University Press.

Attenborough, D. (۱۹۶۰). *Quest in Paradise*. London: Lutterworth.

Aunger, R. (۲۰۰۲). *The Electric Meme: A New Theory of How We Think*. New York: Free Press.

Baggini, J. (۲۰۰۳). *Atheism: A Very Short Introduction*. Oxford: Oxford University Press.

Barber, N. (۱۹۸۸). *Lords of the Golden Horn*. London: Arrow.

Barker, D. (۱۹۹۲). *Losing Faith in Faith*. Madison, WI: Freedom From Religion Foundation.

Barker, E. (۱۹۸۴). *The Making of a Moonie: Brainwashing or Choice?* Oxford: Blackwell.

Barrow, J. D. and Tipler, F. J. (۱۹۸۸). *The Anthropic Cosmological Principle*. New York: Oxford University Press.

Baynes, N. H., ed. (۱۹۴۲). *The Speeches of Adolf Hitler,* vol. ۱. Oxford: Oxford University Press.

Behe, M. J. (۱۹۹۶). *Darwin's Black Box*. New York: Simon & Schuster.

Beit-Hallahmi, B. and Argyle, M. (۱۹۹۷). *The Psychology of Religious Behaviour, Belief and Experience*. London: Routledge.

Berlinerblau, J. (۲۰۰۵). *The Secular Bible: Why Nonbelievers Must Take Religion Seriously*. Cambridge: Cambridge University Press.

Blackmore, S. (۱۹۹۹). *The Meme Machine*. Oxford: Oxford University Press.

Blaker, K., ed. (۲۰۰۳). *The Fundamentals of Extremism: The Christian Right in America*. Plymouth, MI: New Boston.

Bouquet, A. C. (۱۹۵۶). *Comparative Religion*. Harmondsworth: Penguin.

Boyd, R. and Richerson, P. J. (۱۹۸۵). *Culture and the Evolutionary Process*. Chicago: University of Chicago Press.

Boyer, P. (۲۰۰۱). *Religion Explained*. London: Heinemann.

Brodie, R. (۱۹۹۶). *Virus of the Mind: The New Science of the Meme*. Seattle: Integral Press.

Buckman, R. (۲۰۰۰). *Can We Be Good Without God?* Toronto: Viking.

Bullock, A. (۱۹۹۱). *Hitler and Stalin*. London: HarperCollins.

Bullock, A. (۲۰۰۵). *Hitler: A Study in Tyranny*. London: Penguin.

Buss, D. M., ed. (۲۰۰۵). *The Handbook of Evolutionary Psychology*. Hoboken, NJ: Wiley.

Cairns-Smith, A. G. (۱۹۸۵). *Seven Clues to the Origin of Life*. Cambridge: Cambridge University Press.

Comins, N. F. (۱۹۹۳). *What if the Moon Didn't Exist?* New York: HarperCollins.

Coulter, A. (۲۰۰۶). *Godless: The Church of Liberalism*. New York: Crown Forum.

Darwin, C. (۱۸۵۹). *On the Origin of Species by Means of Natural Selection*. London: John Murray.

Dawkins, M. Stamp (۱۹۸۰). *Animal Suffering*. London: Chapman & Hall.

Dawkins, R. (۱۹۷۶). *The Selfish Gene*. Oxford: Oxford University Press.

Dawkins, R. (۱۹۸۲). *The Extended Phenotype*. Oxford: W. H. Freeman.

Dawkins, R. (۱۹۸۶). *The Blind Watchmaker*. Harlow: Longman.

Dawkins, R. (۱۹۹۵). *River Out of Eden*. London: Weidenfeld & Nicolson.

Dawkins, R. (۱۹۹۶). *Climbing Mount Improbable*. New York: Norton.

Dawkins, R. (۱۹۹۸). *Unweaving the Rainbow*. London: Penguin.

Dawkins, R. (۲۰۰۳). *A Devil's Chaplain: Selected Essays*. London: Weidenfeld & Nicolson.

Dennett, D. (۱۹۹۵). *Darwin's Dangerous Idea*. New York: Simon & Schuster.

Dennett, D. C. (۱۹۸۷). *The Intentional Stance*. Cambridge, MA: MIT Press.

Dennett, D. C. (۲۰۰۳). *Freedom Evolves*. London: Viking.

Dennett, D. C. (۲۰۰۶). *Breaking the Spell: Religion as a Natural Phenomenon*. London: Viking.

Deutsch, D. (۱۹۹۷). *The Fabric of Reality*. London: Allen Lane.

Distin, K. (۲۰۰۵). *The Selfish Meme: A Critical Reassessment*. Cambridge: Cambridge University Press.

Dostoevsky, F. (۱۹۹۴). *The Karamazov Brothers*. Oxford: Oxford University Press.

Ehrman, B. D. (۲۰۰۳a). *Lost Christianities: The Battles for Scripture and the Faiths We Never Knew*. Oxford: Oxford University Press.

Ehrman, B. D. (۲۰۰۳b). *Lost Scriptures: Books that Did Not Make It into the New Testament*. Oxford: Oxford University Press.

Ehrman, B. D. (۲۰۰۶). *Whose Word Is It?* London: Continuum.

Fisher, H. (۲۰۰۴). *Why We Love: The Nature and Chemistry of Romantic Love*. New York: Holt.

Forrest, B. and Gross, P. R. (۲۰۰۴). *Creationism's Trojan Horse: The Wedge of Intelligent Design*. Oxford: Oxford University Press.

Frazer, J. G. (۱۹۹۴). *The Golden Bough*. London: Chancellor Press.

Freeman, C. (۲۰۰۲). *The Closing of the Western Mind*. London: Heinemann.

Galouye, D. F. (۱۹۶۴). *Counterfeit World*. London: Gollancz.

Glover, J. (۲۰۰۱). *Humanity: A Moral History of the Twentieth Century*. Princeton: Yale University Press.

Glover, J. (۲۰۰۶). *Choosing Children*. Oxford: Oxford University Press.

Goodenough, U. (۱۹۹۸). *The Sacred Depths of Nature*. New York: Oxford University Press.

Goodwin, J. (۱۹۹۴). *Price of Honour: Muslim Women Lift the Veil of Silence on the Islamic World.* London: Little, Brown.

Gould, S. J. (۱۹۹۹). *Rocks of Ages: Science and Religion in the Fullness of Life*. New York: Ballantine.

Grafen, A. and Ridley, M., eds (۲۰۰۶). *Richard Dawkins: How a Scientist Changed the Way We Think.* Oxford: Oxford University Press.

Grand, S. (۲۰۰۰). *Creation: Life and How to Make It.* London: Weidenfeld & Nicolson.

Grayling, A. C. (۲۰۰۳). *What Is Good? The Search for the Best Way to Live*. London: Weidenfeld & Nicolson.

Gregory, R. L. (۱۹۹۷). *Eye and Brain.* Princeton: Princeton University Press.

Halbertal, M. and Margalit, A. (۱۹۹۲). *Idolatry*. Cambridge, MA: Harvard University Press.

Harris, S. (۲۰۰۴). *The End of Faith: Religion, Terror and the Future of Reason.* New York: Norton.

Harris, S. (۲۰۰۶). *Letter to a Christian Nation*. New York: Knopf.

Haught, J. A. (۱۹۹۶). *۲۰۰۰ Years of Disbelief: Famous People with the Courage to Doubt.* Buffalo, NY: Prometheus.

Hauser, M. (۲۰۰۶). *Moral Minds: How Nature Designed our Universal Sense of Right and Wrong*. New York: Ecco.

Hawking, S. (۱۹۸۸). *A Brief History of Time*. London: Bantam.

Henderson, B. (۲۰۰۶). *The Gospel of the Flying Spaghetti Monster*. New York: Villard.

Hinde, R. A. (۱۹۹۹). *Why Gods Persist: A Scientific Approach to Religion.* London: Routledge.

Hinde, R. A. (۲۰۰۲). *Why Good Is Good: The Sources of Morality*. London: Routledge.

Hitchens, C. (۱۹۹۵). *The Missionary Position: Mother Teresa in Theory and Practice*. London: Verso.

Hitchens, C. (۲۰۰۵). *Thomas Jefferson: Author of America*. New York: HarperCollins.

Hodges, A. (۱۹۸۳). *Alan Turing: The Enigma*. New York: Simon & Schuster.

Holloway, R. (۱۹۹۹). *Godless Morality: Keeping Religion out of Ethics*. Edinburgh: Canongate.

Holloway, R. (۲۰۰۱). *Doubts and Loves: What is Left of Christianity*. Edinburgh: Canongate.

Humphrey, N. (۲۰۰۲). *The Mind Made Flesh: Frontiers of Psychology and Evolution*. Oxford: Oxford University Press.

Huxley, A. (۲۰۰۳). *The Perennial Philosophy*. New York: Harper.

Huxley, A. (۲۰۰۴). *Point Counter Point*. London: Vintage.

Huxley, T. H. (۱۸۷۱). *Lay Sermons, Addresses and Reviews*. New York: Appleton.

Huxley, T. H. (۱۹۳۱). *Lectures and Essays*. London: Watts.

Jacoby, S. (۲۰۰۴). *Freethinkers: A History of American Secularism*. New York: Holt.

Jammer, M. (۲۰۰۲). *Einstein and Religio*n. Princeton: Princeton University Press.

Jaynes, J. (۱۹۷۶). *The Origin of Consciousness in the Breakdown of the Bicameral Mind.* Boston: Houghton Mifflin.

Juergensmeyer, M. (۲۰۰۰). *Terror in the Mind of God: The Global Rise of Religious Violence*. Berkeley: University of California Press.

Kennedy, L. (۱۹۹۹). *All in the Mind: A Farewell to God*. London: Hodder & Stoughton.

Kertzer, D. I. (۱۹۹۸). *The Kidnapping of Edgardo Mortara*. New York: Vintage.

Kilduff, M. and Javers, R. (۱۹۷۸). *The Suicide Cult*. New York: Bantam.

Kurtz, P., ed. (۲۰۰۳). *Science and Religion: Are They Compatible?* Amherst, NY: Prometheus.

Kurtz, P. (۲۰۰۴). *Affirmations: Joyful and Creative Exuberance*. Amherst, NY: Prometheus.

Kurtz, P. and Madigan, T. J., eds (۱۹۹۴). *Challenges to the Enlightenment: In Defense of Reason and Science*. Amherst, NY: Prometheus.

Lane, B. (۱۹۹۶). *Killer Cults*. London: Headline.

Lane Fox, R. (۱۹۹۲). *The Unauthorized Version*. London: Penguin.

Levitt, N. (۱۹۹۹). *Prometheus Bedeviled*. New Brunswick, NJ: Rutgers University Press.

Loftus, E. and Ketcham, K. (۱۹۹۴). *The Myth of Repressed Memory: False Memories and Allegations of Sexual Abuse*. New York: St Martin's.

McGrath, A. (۲۰۰۴). *Dawkins' God: Genes, Memes and the Meaning of Life*. Oxford: Blackwell.

Mackie, J. L. (۱۹۸۵). *The Miracle of Theism*. Oxford: Clarendon Press.

Medawar, P. B. (۱۹۸۲). *Pluto's Republic*. Oxford: Oxford University Press.

Medawar, P. B. (۱۹۸۴). *The Limits of Science*. Oxford: Oxford University Press.

Medawar, P. B. and Medawar, J. S. (۱۹۷۷). *The Life Science: Current Ideas of Biology*. London: Wildwood House.

Miller, Kenneth (۱۹۹۹). *Finding Darwin's God*. New York: HarperCollins.

Mills, D. (۲۰۰۶). *Atheist Universe: The Thinking Person's Answer to Christian Fundamentalism*. Berkeley: Ulysses Books.

Mitford, N. and Waugh, E. (۲۰۰۱). *The Letters of Nancy Mitford and Evelyn Waugh*. New York: Houghton Mifflin.

Mooney, C. (۲۰۰۵). *The Republican War on Science*. Cambridge, MA: Basic Books.

Pagels, E. and King, K. L. (۲۰۰۷). *Reading Judas*. London: Viking.

Perica, V. (۲۰۰۲). *Balkan Idols: Religion and Nationalism in Yugoslav States*. New York: Oxford University Press.

Phillips, K. (۲۰۰۶). *American Theocracy*. New York: Viking.

Pinker, S. (۱۹۹۷). *How the Mind Works*. London: Allen Lane.

Pinker, S. (۲۰۰۲). *The Blank Slate: The Modern Denial of Human Nature*. London: Allen Lane.

Plimer, I. (۱۹۹۴). *Telling Lies for God: Reason vs Creationism*. Milsons Point, NSW: Random House.

Polkinghorne, J. (۱۹۹۴). *Science and Christian Belief: Theological Reflections of a Bottom-Up Thinker*. London: SPCK.

Rees, M. (۱۹۹۹). *Just Six Numbers*. London: Weidenfeld & Nicolson.

Rees, M. (۲۰۰۱). *Our Cosmic Habitat.* London: Weidenfeld & Nicolson.

Reeves, T. C. (۱۹۹۶). *The Empty Church: The Suicide of Liberal Christianity*. New York: Simon & Schuster.

Richerson, P. J. and Boyd, R. (۲۰۰۵). *Not by Genes Alone: How Culture Transformed Human Evolution.* Chicago: University of Chicago Press.

Ridley, Mark (۲۰۰۰). *Mendel's Demon: Gene Justice and the Complexity of Life.* London: Weidenfeld & Nicolson.

Ridley, Matt (۱۹۹۷). *The Origins of Virtue*. London: Penguin.

Ronson, J. (۲۰۰۵). *The Men Who Stare at Goats.* New York: Simon & Schuster.

Ruse, M. (۱۹۸۲). *Darwinism Defended: A Guide to the Evolution Controversies*. Reading, MA: Addison-Wesley.

Russell, B. (۱۹۵۷). *Why I Am Not a Christian*. London: Routledge.

Russell, B. (۱۹۹۳). *The Quotable Bertrand Russell*. Amherst, NY: Prometheus.

Russell, B. (۱۹۹۷a). *The Collected Papers of Bertrand Russell*, vol. ۲: *Last Philosophical Testament,* ۱۹۴۳–۱۹۶۸. London: Routledge.

Russell, B. (۱۹۹۷b). *Collected Papers*, vol. ۱۱, ed. J. C. Slater and P. Köllner. London: Routledge.

Russell, B. (۱۹۹۷c). *Religion and Science*. Oxford: Oxford University Press.

Ruthven, M. (۱۹۸۹). *The Divine Supermarket: Travels in Search of the Soul of America*. London: Chatto & Windus.

Sagan, C. (۱۹۹۵). *Pale Blue Dot*. London: Headline.

Sagan, C. (۱۹۹۶). *The Demon-Haunted World: Science as a Candle in the Dark*. London: Headline.

Scott, E. C. (۲۰۰۴). *Evolution vs. Creationism: An Introduction*. Westport, CT: Greenwood.

Shennan, S. (۲۰۰۲). *Genes, Memes and Human History*. London: Thames & Hudson.

Shermer, M. (۱۹۹۷). *Why People Believe Weird Things: Pseudoscience, Superstition and Other Confusions of Our Time*. New York: W. H. Freeman.

Shermer, M. (۱۹۹۹). *How We Believe: The Search for God in an Age of Science.* New York: W. H. Freeman.

Shermer, M. (۲۰۰۴). *The Science of Good and Evil: Why People Cheat, Gossip, Care, Share, and Follow the Golden Rule*. New York: Holt.

Shermer, M. (۲۰۰۵). *Science Friction: Where the Known Meets the Unknown*. New York: Holt.

Shermer, M. (۲۰۰۶). *The Soul of Science*. Los Angeles: Skeptics Society.

Silver, L. M. (۲۰۰۶). *Challenging Nature: The Clash of Science and Spirituality at the New Frontiers of Life*. New York: HarperCollins.

Singer, P. (۱۹۹۰). *Animal Liberation*. London: Jonathan Cape.

Singer, P. (۱۹۹۴). *Ethics*. Oxford: Oxford University Press.

Smith, K. (۱۹۹۵). *Ken's Guide to the Bible*. New York: Blast Books.

Smolin, L. (۱۹۹۷). *The Life of the Cosmos*. London: Weidenfeld & Nicolson.

Smythies, J. (۲۰۰۶). *Bitter Fruit*. Charleston, SC: Booksurge.

Spong, J. S. (۲۰۰۵). *The Sins of Scripture*. San Francisco: Harper.

Stannard, R. (۱۹۹۳). *Doing Away with God? Creation and the Big Bang*. London: Pickering.

Steer, R. (۲۰۰۳). *Letter to an Influential Atheist*. Carlisle: Authentic Lifestyle Press.

Stenger, V. J. (۲۰۰۳). *Has Science Found God? The Latest Results in the Search for Purpose in the Universe*. New York: Prometheus.

Stenger, V. J. (۲۰۰۷). *God, the Failed Hypothesis: How Science Shows that God Does Not Exist*. New York: Prometheus.

Susskind, L. (۲۰۰۶). *The Cosmic Landscape: String Theory and the Illusion of Intelligent Design*. New York: Little, Brown.

Swinburne, R. (۱۹۹۶). *Is There a God?* Oxford: Oxford University Press.

Swinburne, R. (۲۰۰۴). *The Existence of God*. Oxford: Oxford University Press.

Taverne, R. (۲۰۰۵). *The March of Unreason: Science, Democracy and the New Fundamentalism*. Oxford: Oxford University Press.

Tiger, L. (۱۹۷۹). *Optimism: The Biology of Hope*. New York: Simon & Schuster.

Toland, J. (۱۹۹۱). *Adolf Hitler: The Definitive Biography*. New York: Anchor.

Trivers, R. L. (۱۹۸۵). *Social Evolution*. Menlo Park, CA: Benjamin/Cummings.

Unwin, S. (۲۰۰۳). *The Probability of God: A Simple Calculation that Proves the Ultimate Truth*. New York: Crown Forum.

Vermes, G. (۲۰۰۰). *The Changing Faces of Jesus*. London: Allen Lane.

Ward, K. (۱۹۹۶). *God, Chance and Necessity*. Oxford: Oneworld.

Warraq, I. (۱۹۹۵). *Why I Am Not a Muslim*. New York: Prometheus.

Weinberg, S. (۱۹۹۳). *Dreams of a Final Theory*. London: Vintage.

Wells, G. A. (۱۹۸۶). *Did Jesus Exist?* London: Pemberton.

Wheen, F. (۲۰۰۴). *How Mumbo-Jumbo Conquered the World: A Short History of Modern Delusions*. London: Fourth Estate.

Williams, W., ed. (۱۹۹۸). *The Values of Science: Oxford Amnesty Lectures* ۱۹۹۷. Boulder, CO: Westview.

Wilson, A. N. (۱۹۹۳). *Jesus*. London: Flamingo.

Wilson, A. N. (۱۹۹۹). *God's Funeral*. London: John Murray.

Wilson, D. S. (۲۰۰۲). *Darwin's Cathedral: Evolution, Religion and the Nature of Society*. Chicago: University of Chicago Press.

Wilson, E. O. (۱۹۸۴). *Biophilia*. Cambridge, MA: Harvard University Press.

Winston, R. (۲۰۰۵). *The Story of God*. London: Transworld/BBC.

Wolpert, L. (۱۹۹۲). *The Unnatural Nature of Science*. London: Faber & Faber.

Wolpert, L. (۲۰۰٦). *Six Impossible Things Before Breakfast: The Evolutionary Origins of Belief*. London: Faber & Faber.

Young, M. and Edis, T., eds (۲۰۰٦). *Why Intelligent Design Fails: A Scientific Critique of the New Creationism*. New Brunswick: Rutgers University Press.

---

# نوٹس

**دیباچہ**

[۱] پیپر بیک اشاعت کی طباعت کے لئے جانے تک تو ایسی کوئی امید پیدا نہیں ہوئی تھی۔ لیکن آپ http://richarddawkins.net/store سے DVD خرید سکتے ہیں۔

[۲] وہ انٹرویو جس ٹی وی ڈاکومینٹری کا حصہ تھا وہ بعد میں کتاب کی شکل میں شائع ہوئی۔ Winston ۲۰۰۵

**باب نمبر۱: ایک شدید مذہبی دہریہ**

**احترام غیر مستحق**

[۳] Dennet ۲۰۰٦

[۴] تقریر کا مکمل مسودہ 'کیا خدا مصنوعی ہے' میں شائع ہوا۔ Adams ۲۰۰۳

[۵] Perica (۲۰۰۲). See also http://www.historycooperative.org/journals/ahr/۱۰۸،۵/br_۱۵۱.html.

[٦] 'Dolly and the cloth heads', in Dawkins (۲۰۰۳).

[۷] http://www.oyez.org/cases/۲۰۰۰-۲۰۰۹/۲۰۰۵/۲۰۰۵-۰۴-۱۰۸۴/.

[۸] *Columbus Dispatch*, ۱۹ Aug. ۲۰۰۵.

[۹] *Los Angeles Times*, ۱۰ April ۲۰۰٦.

[۱۰] http://gatewaypundit.blogspot.com/۲۰۰٦/۰۲/islamic-societyof-denmark-used-fake.html.

[۱۱] http://news.bbc.co.uk/۲/hi/south_asia/۴٦۸٦۵۳٦.stm; http://www.neandernews.com/?cat=٦.

[۱۲] *Independent*, ۵ Feb. ۲۰۰٦.

[۱۳] Andrew Mueller, 'An argument with Sir Iqbal', *Independent on Sunday*, ۲ April ۲۰۰٦, Sunday Review section, ۱۲–۱٦.

[۱۴] Mitford & Waugh – ۲۰۰۱

**باب نمبر۲: مفروضہ خُدا**

**کثرت پرستی۔ شرک**

[۱۵] http://www.newadvent.org/cathen/۰٦۲۰۸b.htm

[۱٦] http://www.catholic-forum.com/saints/indexsnt.htm?NF=۱.

## لادینیت، بائی قوم اور امریکی مذہب

[۱۷] *Congressional Record*, ۱۶ Sept. ۱۹۸۱.

[۱۸] http://www.stephenjaygould.org/ctrl/buckner_tripoli.html.

[۱۹] Giles Fraser, 'Resurgent religion has done away with the country vicar', *Guardian*, ۱۳ April ۲۰۰۶.

[۲۰] Robert I. Sherman, in *Free Inquiry* ۸: ۴, Fall ۱۹۸۸, ۱۶.

[۲۱] http://www.fsgp.org/adsn.html

[۲۲] An especially bizarre case of a man being murdered simply because he was an atheist is recounted in the newsletter of the Freethought Society of Greater Philadelphia for March/April ۲۰۰۶. Go to http://www.fsgp.org/newsletters/newsletter_۲۰۰۶_۰۳۰۴.pdf and scroll down to 'The murder of Larry Hooper'

[۲۳] http://www.hinduonnet.com/thehindu/mag/۲۰۰۱/۱۱/۱۸/stories/۲۰۰۱۱۱۱۸۰۰۰۷۰۴۰۰.htm.

## الحاد کی عقلی مفلسی

[۲۴] Quentin de la Bédoyère, *Catholic Herald*, ۳ Feb. ۲۰۰۶.

[۲۵] Carl Sagan, 'The burden of skepticism', *Skeptical Inquirer* ۱۲, Fall ۱۹۸۷.

[۲۶] I discussed this case in Dawkins (۱۹۹۸).

[۲۷] T. H. Huxley, 'Agnosticism' (۱۸۸۹), repr. in Huxley (۱۹۳۱). The complete text of 'Agnosticism' is also available at http://www.infidels.org/library/historical/thomas_huxley/huxley_wace/part_۰۲.html.

[۲۸] Russell, 'Is there a God?' (۱۹۵۲), repr. in Russell (۱۹۹۷b).

[۲۹] Andrew Mueller, 'An argument with Sir Iqbal', *Independent on Sunday*, ۲ April ۲۰۰۶, Sunday Review section, ۱۲–۱۶.

[۳۰] *New York Times*, ۲۹ Aug. ۲۰۰۵. See also Henderson (۲۰۰۶).

[۳۱] Henderson (۲۰۰۶).

[۳۲] http://www.lulu.com/content/۲۶۷۸۸۸.

## دعا کا عظیم تجربہ

[۳۳] H. Benson et al., 'Study of the therapeutic effects of intercessory prayer (STEP) in cardiac bypass patients', *American Heart Journal* ۱۵۱: ۴, ۲۰۰۶, ۹۳۴–۴۲.

[۳۴] *New York Times*, ۱۱ April ۲۰۰۶.

## نیول چیمبرلین دبستان ارتقاء پسندان

[۳۵] In court cases, and books such as Ruse (۱۹۸۲). His article in *Playboy* appeared in the April ۲۰۰۶ issue.

[۳۶] Jerry Coyne's reply to Ruse appeared in the August ۲۰۰۶ issue of *Playboy*.

[۳۷] Madeleine Bunting, *Guardian*, ۲۷ March ۲۰۰۶.

[۳۸] Dan Dennett's reply appeared in the *Guardian*, ۴ April ۲۰۰۶.

[۳۹]

http://scienceblogs.com/pharyngula/۲۰۰۶/۰۳/the_dawkinsdennett_boogeyman.php;
http://scienceblogs.com/pharyngula/۲۰۰۶/۰۲/our_double_standard.php;
http://scienceblogs.com/pharyngula/۲۰۰۶/۰۲/the_rusedennett_feud.php.

## سبز بونے

[40] http://vo.obspm.fr/exoplanetes/encyclo/encycl.html.

[41] Dennett (۱۹۹۵).

## باب نمبر ۳ : وجودِ خدا کے حق میں دلائل

### وجودیت کی دلیل اور قیاس پر مبنی دیگر دلائل

[42] http://www.iep.utm.edu/o/ont-arg.htm. William Grey: 'Gasking's proof', *Analysis,* Vol ٦٠, No

### ذاتی تجربے سے دلیل

[43] فریب کے مسئلے کو رچرڈ گریگوری اپنی مختلف کتابوں میں، خصوصاً ۱۹۹۹ میں زیر بحث لائے ہیں۔

[44] وضاحت پیش کرنے کی میری کوشش ڈاکنز (۱۹۹۸) کے صفحات ٦۹-۲٦۸ میں دی گئی ہے۔

[45] http://www.sofc.org/Spirituality/s-of-fatima.htm

### الہامی صحیفوں سے دلیل

[46] ٹام فلن۔ "متیٰ بمقابلہ لوکا"۔ Free Inquiry ۲۵:۱۔ ۲۰۰۴، صفحہ ۴۵ – ۳۴؛ رابرٹ گلولی، "دنیا کے نور پہ روشنی"۔ Free Inquiry ۲۵:۱۔ ۲۰۰۴، صفحہ ۳۰ - ۲۷؛

[47] ایہرمین ۲۰۰٦ اور ایہرمین ۲۰۰۳a, b

### معتبر مذہبی سائنسدانوں سے دلیل

[48] بیت حلامی اور آرگائیل۔ ۱۹۹۷

[49] ای جے لارسن اور ایل وتھیم۔ 'صفحہ اول کے سائنسدان خدا سے انکار کرتے ہیں'۔ 'Leading scientists still reject God', *Nature* ۳۹۴, ۱۹۹۸, ۳۱۳

[50] http://www.leaderu.com/ftissues/ft۹٦۱۰/reeves.html میں تھامس ریوز، یونیورسٹی آف وسکانسن کے تاریخ کے پروفیسر نے امریکہ میں مذہبی خیالات کی تاریخ کا بڑا عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ (۱۹۹٦)

[51] http://www.answersingenesis.org/docs/۳۵۰٦.asp.

[52] آر الزبتھ کارنویل اور مائیکل سٹیراٹ ۔ زیر تکمیل مسودہ۔ ۲۰۰٦

[53] پال بیل، "کیا آپ یقین کریں گے؟" مینسا میگزین ۲۰۰۲ صفحہ ۱۳ – ۱۲ [(مینسا (Mena) انتہائی ذہین لوگوں کی ایک انجمن ہے۔ ان کے جریدے میں عام طور پر اس واحد موضوع کے بارے میں مقالے چھپتے رہتے ہیں جو ان کی انجمن کے قیام کا سبب ہیں)]۔

## باب نمبر ۴: حتمی طور پر ایسا کیسے کہا جا سکتا ہے کہ خدا نہیں ہے؟

### حتمی بوئنگ ۷۴۷

[54] مزاحیہ خاکوں کے مصوّر گرٹ کورٹ ہاف نے اس مشابہت کے دائرہ کار، استعمال اور اقتباسات کے بارے میں اس لنک میں بہت تفصیل مہیا کی ہے۔

http://home.wxs.nl/~gkorthof/kortho۴٦a.htm

### بیداریٔ شعور بطور قدرتی انتخاب

[55] ایڈمز (۲۰۰۲) صفحہ ۹۹۔ "ایڈمز کے لئے میرا نوحہ" جو میں نے اس کی وفات کے اگلے روز لکھا Salmon of Doubt میں حرف آخر کے طور پر شامل کیا گیا اور A Devil's Chaplain میں بھی شائع ہوا ہے، جس میں سینٹ مارٹن آن دی فیلڈ چرچ میں اس کی یاد میں رکھی گئی محفل کا حال بھی درج ہے۔

[56] Der Spiegel میں چھپنے والا انٹرویو۔ ۲٦ دسمبر ۲۰۰۵

[57] سکنڈر۔ (۲۰۰٦: ۱۷)

[۵۸] بیہے۔۱۹۹۶
[۵۹]

.http://www.millerandlevine.com/km/evol/design۲/article.html

[۶۰] ڈوور مقدمے کا یہ بیان، بشمول اقتباسات، اے بوٹارو، ایم اے انلے، اور این جے ماٹز کی کے مقالے "'Immunology in the spotlight at the Dover "Intelligent Design" trial' ۲۰۰۶ میں Nature Immunology ۷ میں شائع ہوا تھا۔

[۶۱] جے کوئین: "تفصیل میں خدا: ارتقاء کو حیاتیاتی کیمیا کا چیلینج": نیچر ۳۸۳ ۔۱۹۹۶ ۸-۲۲۷۔ میرے اور کوئین کا مقالہ 'ایک دھڑا غلط ہو سکتا ہے' گارڈئین میں ا ستمبر ۲۰۰۵ میں شائع ہوا:
http://www.guardian.co.uk/life/feature/story/۰,۱۳۰۲۶,۱۵۵۹۷۴۳,۰۰.html
فصیح بلاگر کا کمنٹ اس لنک پر موجود ہے:http://www.religionisbullshit.net/blog/۲۰۰۵_۰۹_۰۱_archive.php

[۶۲] ڈاکنز۔ ۱۹۹۵

[۶۳] کارٹر نے بعد میں تسلیم کیا کہ شاید پہلے سے مشہور اصطلاح 'بشریت کا اصول' کی بجائے 'تفہیم کی قابلیت کا اصول' بہتر نام ہو سکتا تھا۔ بی کارٹر: 'اصول بشریت اور ارتقاء حیات پر اس کے اثرات'، رائل سوسائٹی کے فلسفیانہ معاملات اے ۳۱۰، ۱۹۸۳ صفحات ۶۳-۳۴۷۔ اصول بشریت کی مکمل بحث کے لئے بیرو اور ٹیپلر (۱۹۸۸) کا مطالعہ کیجئے۔

[۶۴] کومنز (۱۹۹۳)

[۶۵] میں نے اس بحث کو اپنی کتاب "The Blind Watchmaker ۔اندھا گھڑی ساز" میں زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ (ڈاکنز ۱۹۸۶)

## اصول بشری کا کونیاتی بیان

[۶۶] مرے گیل۔مین سے اقتباس، "Edge" کی ویبسائٹ http://www.edge.org/۳rd_culture/bios/smolin.html. پر۔

[۶۷] وارڈ (۹۹ :۱۹۹۶)۔ پولکنگ ہورن (۱۹۹۴:۵۵)

## کیمبرج میں ایک وقفہ

[۶۸] جے ہورگن 'ٹمپلٹن فاؤنڈیشن: ایک شکی کا زاویہ'۔ ۲۰۰۶. ۷ April *Chronicle of Higher Education,*
http://www.edge.org/۳rd_culture/horgan۰۶/horgan۰۶_index.html

[۶۹] پی بی میڈیوار، "انسان کا معجزہ - The Phenomenon of Man" پر تبصرہ (۱۹۸۲: ۲۴۲)

[۷۰] ڈینیٹ ۱۹۹۵: صفحہ ۱۵۵

## باب نمبر ۵: مذہب کی بنیادیں

[۷۱] ڈاکنز۔ ۱۹۸۲:۳۰ سے اقتباس

[۷۲] کے سٹیریلنی: "بیہودہ بندر"۔ گرافن اور رڈلی میں. (۲۳-۲۱۳ :۲۰۰۶)

[۷۳] این اے شانئوں: 'Terminological kinship, genealogical relatedness and village fissioning among the Yanomamö Indians'، الیکسینڈر اور ٹنکل (۱۹۸۱: Ch ۲۸) میں۔

[۷۴] سی ڈارون: "انسان کا نزول۔ The Descent of Man" (نیو یارک، ایپلٹن ۱۸۷۱)، جلد ا، صفحہ ۱۵۶۔

## نفسیاتی طور پر مذہب کے لئے تیار

[۷۵] ملاحظہ کیجیے ۲۰۰۵ – Buss

[۷۶] ڈیبرا کیلمین۔ کیا بچے 'بدیہی توحید پرست' ہوتے ہیں؟ Psychological Science۔ ۱۵:۵، ۲۰۰۴، ۳۰۱-۲۹۵

[۷۷] ڈینیٹ ۱۹۸۷۔

[۷۸] گارڈین اخبار۔ ۳۱ جنوری ۲۰۰۶

[79] ستمبر ۲۰۰۶

[80] http://jmm.aaa.net.au/articles/۱۴۲۲۳.htm

[81] اخلاقیات کی بنیاد پر ایک تحقیق؛ ایم ہاؤسر اور پی سنگر، 'مذہب کے بغیر اخلاقیات'۔ ۲۶:۱ Free Inquiry، ۲۰۰۶، ۱۹-۱۸

### اگر کوئی خدا نہیں، تو اچھائی کیوں کی جائے؟

[82] دوستوسکی (۱۹۹۴) جلد ۲، باب ۶، صفحہ ۸۷

## باب نمبر ۷ : 'افضل' کتاب اور بدلتی ہوئی اخلاقی روح عصر

[83] لین فاکس ۱۹۹۲؛ برلنبلاؤ ۲۰۰۵

[84] بالووے (۲۰۰۵، ۱۹۹۹)، رچرڈ ہالووے کی 'روبہ صحت ہونے والا عیسائی' کی اصطلاح

کتاب کے ایک تبصرے میں دیکھی جاسکتی ہے جو گارڈین اخبار میں ۱۵ فروری ۲۰۰۳ کو چھپا تھا۔

### صحیفہ قدیم۔ The Old Testament

[85] امریکی پادریوں کے خوفناک وعظ کے مجموعہ کے لئے دیکھئے http://universist.org/neworleans.htm۔ جن میں سمندری طوفان کترینہ کا تمام تر الزام انسان کے گناہ پر ڈالا گیا ہے۔

[86] پیٹ رابرٹسن۔ بی بی سی کی رپورٹ http://news.bbc.co.uk/۲/hi/americas/۴۴۲۷۱۴۴.stm

### کیا صحیفہ جدید قدرے بہتر ہے؟ Is the New Testament Any Better?

[87] آرڈاکنز۔ دہریے عیسٰی کے حق میں۔ Atheists for Jesus، ۲۵:۱ Free Inquiry، ۲۰۰۵، ۱۰ - ۹

[88] جب جولیا سوینی بدھ مت کا ذکر کرتی ہے تو بالکل نشانے پر ہے۔ جیسے کبھی کبھی عیسیت یت کو اسلام کے مقابلے میں ایک بہتر اور نرم دل مذہب کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، ویسے ہی بدھ مت کو بہترین مذہب بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن پچھلی زندگی میں کردہ گناہوں کی پاداش میں تناسخ (reincarnation) کے بعد معاشرتی تنزلی کا نظریہ خاصہ تکلیف دہ خیال ہے۔ جولیا سوینی کہتی ہے: 'میں تھائی لینڈ گئی جہاں مجھے ایک ایسی عورت سے ملنے کا اتفاق ہوا جو ایک ایسے بچّے کی نگہداشت کر رہی تھی جس کا جسم انتہائی بد نما تھا۔ میں نے اس عورت سے کہا "کتنی بڑی بات ہے کہ آپ اس بے چارے بچّے کی نگہداشت کر رہی ہیں" تو وہ بولی "اسے بیچارہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس نے اپنی پچھلی زندگی میں کوئی بہت ہی برا کام کیا ہوگا جس کی اتنی بڑی سزا مل رہی ہے"'۔

۸۹ فرقوں کے زیر استعمال ہتھکنڈوں کے تفصیلی تجزیے کے لئے دیکھئے "بیکر ۱۹۸۴ Barker"۔ جدید فرقوں کے بارے میں صحافیوں کی رپورٹیں آپکو "لین۱۹۹۶ Lane" اور "جاورز و کلڈف Kilduff & Javers" میں مل جائیں گی۔

۹۰ پال والیلی اور اینڈریو بنکومب "عیسایت یت کی تاریخ: الہام بقول یہوداہ۔ "History of Christianity: The Gospel According to Judas"

[91] ورمیز ۲۰۰۰

### ہمسائے سے شفقت برتیں Love Thy Neighbour

[92] ہارٹنگ کا یہ مقالہ پہلے پہل ۳:۴ Skeptic میں ۱۹۹۵ میں شائع ہوا، لیکن اب مذکورہ لنک http://strugglesforexistence.com/?p=article_p&id=۱۳ پر با آسانی میسّر ہے۔

[93] سمتھ ۱۹۹۵

[94] گارڈین ۱۲ مارچ ۲۰۰۲ : http://books.guardian.co.uk/departments/politicsphilosophyandsociety/story/۰,,۶۶۳۳۴۲,۰۰.html.

[95] اینڈی گلین، 'امریکہ میں بین المذاہب شادیاں: اشکال اور حالیہ رجحانات'، جریدہ برائے شادی و خاندان۔ Journal of Marriage and the Family ۴۴:۳، ۱۹۸۲، ۶۶ – ۵۵۵

### اخلاقی روح عصر۔ The Moral Zeitgeist

[96] http://www.ebonmusings.org/atheism/new۱۰c.html

[97] ہکسلے ۱۸۷۱

[98] http://www.classic-literature.co.uk/american-authors/۱۹th-century/abraham-lincoln/the-writings-of-abraham-lincoln-۰۴/

### ہٹلر اور سٹالن کے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ دہریے تو نہیں تھے؟

### What About Hitler and Stalin? Weren't They Athiests?

[99] بلّوک ۱۹۹۱

[100] بلّوک ۲۰۰۵

[101] رچرڈ ای سمتھ کے مارچ ۱۹۹۷ میں Free Thought Today نامی جریدے میں شایع ہونے والے اس مقالے میں ہٹلر اور دیگر نازیوں سے کئی اقتباسات اور ان کے ذرائع موجود ہیں۔ اگر میں کسی اور اشاعت کا حوالہ نہ دوں تو یہی فرض کیا جائے کہ میں نے سمتھ کے مقالے سے حوالہ دیا ہے۔ http://www.ffrf.org/fttoday/۱۹۹۷/march۹۷/holocaust.html.

[102] http://homepages.paradise.net.nz/mischedj/ca_hitler.html

[103] بلوک ۲۰۰۵ : ۹۶

[104] ایڈولف ہٹلر، ۱۲ اپریل ۱۹۲۲ کی تقریر؛ بینز (۲۰ – ۱۹ : ۱۹۴۲)

[105] بلوک ۲۰۰۵ : ۴۳

[106] یہ اقتباس، اور اسے بعد والا اقتباس دونوں ہٹلر کے مذہب کے موضوع پر آنا نکول گیلر کے لکھے گئے مقالے سے ماخوذ ہیں۔ http://www.ffrf.org/fttoday/back/hitler.html

[107] http://www.contra-mundum.org/schirrmacher/NS_Religion.pdf.

## باب نمبر ۸: مذہب کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ اتنی شدید مخالفت کیوں؟

### بنیاد پرستی اور سائنس کی ماتحتی

[108] "سچ کیا ہے" باب ۲،۱ (ڈاکنز ۲۰۰۳)

[109] وائیز سے منسلک میرے دونوں اقتباسات اس کی ۱۹۹۹ کی کتاب "چھ دن میں۔ In Six Days" سے لئے گئے ہیں، جو کہ جواں زمین کے نظریہ کے حامی تخلیق پسندوں کے مقالوں کا مجموعہ ہے (Ashton ۱۹۹۹)۔

[110] ابن وڑاق۔ ۱۹۹۵ : ۱۷۵۔

[111] عیسیٰ کو مسخرہ کہنے پر جان ویلیم گوٹ کی سزائے قید کا ذکر The Indypedia میں دیکھا جاسکتا ہے، جو Independent اخبار نے ۲۹ اپریل ۲۰۰۶ کو شائع کیا تھا۔ بی بی سی پر توہین کا مقدمہ دائر کرنے کی کوشش کا ذکر ۱۰ جنوری ۲۰۰۵ کی بی بی سی نیوز میں دیکھا جاسکتا ہے: http://news.bbc.co.uk/۱/hi/entertainment/tv_and_radio/۴۱۶۱۱۰۹.stm.

[112] http://adultthought.ucsd.edu/Culture_War/The_American_Taliban.html

### ایمان اور ہم جنس پرستی

[113] ہاجز Hodges ۱۹۸۳

[114] یہ، اور اس حصے کے باقی تمام اقتباسات اوپر درج شدہ امریکی طالبان کی ویبسائٹ سے لئے گئے ہیں۔ http://adultthought.ucsd.edu/Culture_War/The_American_Taliban.html

[115] http://adultthought.ucsd.edu/Culture_War/The_American_Taliban.html

[116] فریڈ فیلپس کے ویسٹبورو چرچ کی اپنی ویبسائٹ godhatesfags.com سے: http://www.godhatesfags.com/fliers/jan۲۰۰۶/۲۰۰۶۰۱۳۱_coretta-scott-king-funeral.pdf

### ایمان اور انسانی جان کی حرمت

[117] مونی ۲۰۰۵ اور سلور ۲۰۰۶، جو اس وقت شائع ہوئی جب میری کتاب روگردانی کے آخری مراحل میں تھی، جس کی وجہ سے میں یہاں اس پر اس بھرپور انداز سے بحث نہیں کر پایا جس کی وہ حق دار ہے۔

[118] ٹیکساس کے باقی ریاستوں سے مختلف ہونے کے بارے میں ایک دلچسپ تجزیے کے لئے دیکھئے:
http://www.pbs.org/wgbh/pages/frontline/shows/execution/readings/texas.html

[119] http://en.wikipedia.org/wiki/Karla_Faye_Tucker

[120] رینڈل ٹیری کے یہ اقتباسات اسی ویبسائٹ پر ہیں جس کا پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے۔ http://adultthought.ucsd.edu/Culture_War/The_American_Taliban.html

[121] فاکس نیوز پر رپورٹ ملاحظہ کیجئے: http://www.foxnews.com/story/۰,۲۹۳۳,۹۶۲۸۶,۰۰.html

[122] ایم سٹامپ، ڈاکنز ۱۹۸۰

### بیتھوون کا مغالطہ عظیم The Great Beethoven Fallacy

[123] http://www.warroom.com/ethical.htm

[124] میڈاوار اور میڈاوار ۱۹۷۷

### عقائد کی 'اعتدال پسندی' کیسے جنونیت کو بڑھاوا دیتی ہے

[۱۲۵] یوہان ہاری کا یہ مقالہ پہلی بار انڈیپنڈنٹ میں ۱۵ جولائی ۲۰۰۵ کو شائع ہوا، اور اب اس لنک پر http://www.johannhari.com/archive/article.php?id=۲۴۰ دیکھا جا سکتا ہے۔

[۱۲۶] جریدہ "ولیج وائیس" ۱۸ مئی ۲۰۰۴ http://www.villagevoice.com/news/۰۴۲۰,perlstein,۵۳۵۸۲,۱.html

[۱۲۷] ہیرس ۲۰۰۴: ۲۹

[۱۲۸] نصرہ حسن 'ایمان والوں کا اسلحہ خانہ 'An arsenal of Believers، New Yorker ۱۹ نومبر ۲۰۰۱۔ مزید دیکھئے http://www.bintjbeil.com/articles/en/۰۱۱۱۱۹_hassan.html

## باب نمبر ۹: بچپن، اذیت اور مذہب سے فرار

## Chapter ۹: CHILDHOOD, ABUSE AND THE ESCAPE FROM RELIGION

### جسمانی و ذہنی اذیت Physical and Mental Abuse

[۱۲۹] لوفٹس اور کیچمین ۱۹۹۴

[۱۳۰] آئیرش ٹائمز میں جان واٹرز کی رپورٹ دیکھئے: http://oneinfour.org/news/news۲۰۰۳/roots/.

[۱۳۱] ایسوسیئٹڈ پریس۔ ۱۰ جون ۲۰۰۵ : http://www.rickross.com/reference/clergy/clergy۴۲۶.html

[۱۳۲] http://www.av۱۶۱۱.org/hell.html.

### بچوں کے دفاع میں –In Defense of Children

[۱۳۳] این ہمفرے، 'ہم بچوں کو کیا بتائیں، ویلیمز (۱۹۹۸) میں؛ ہمفرے (۲۰۰۲) میں دوبارہ شائع کیا گیا۔

[۱۳۴] http://www.law.umkc.edu/faculty/projects/ftrials/conlaw/yoder.html

### ایک تعلیمی رسوائی – An Educational Scandal

[۱۳۵] گارڈین ۱۵ جنوری ۲۰۰۵ http://www.guardian.co.uk/weekend/story/۰,,۱۳۸۹۵۰۰,۰۰.html

[۱۳۶] Times Education Supplement، ۱۵ جولائی ۲۰۰۵

[۱۳۷] http://www.telegraph.co.uk/opinion/main.jhtml

[۱۳۸] گارڈین ۱۵ جنوری ۲۰۰۵ : http://www.guardian.co.uk/weekend/story/۰,,۱۳۸۹۵۰۰,۰۰.html

[۱۳۹] میرے خط کا متن، جس کو آکسفورڈ کے پادریٔ اعظم نے تحریر کیا، وہ یوں تھا:

محترم وزیر اعظم!

ہم پادریوں اور سائنسدانوں کے ایک گروہ کی حیثیت سے آپ کو گیٹسھیڈ کے ایمانوئیل سٹی ٹیکنالوجی کالج میں سائنس کی تعلیم سے منسلک اپنے خدشات سے آگاہ کرنے کی غرض سے یہ خط لکھ رہے ہیں۔ ارتقاء ایک ایسا سائنسی نظریہ ہے جو اپنے اندر بہت سے مضامین میں بے شمار مظاہر کی وضاحت کی عظیم قوت رکھتا ہے۔ ثبوت و شواہد پر باریک بینی سے دھیان دینے سے اس میں بہتری پیدا کی جا سکتی ہے، اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے، اور اس کو یکسر تبدیل بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ کالج میں رائج انجیل کے قصۂ تخلیق کی طرز کا 'زاویۂ ایمان' نہیں ہے، جس کا مقصد بالکل مختلف ہے۔

در حقیقت مسئلہ اس سے بڑھ کر ہے کہ کالج میں کیا پڑھایا جا رہا ہے۔ ہماری تشویش بڑھ رہی ہے کہ ان نئے مذہبی سکولوں میں کیا پڑھایا جائے گا اور کیسے پڑھایا جائے گا۔ ہمارا ماننا ہے کہ ان سکولوں اور ایمانوئیل سٹی ٹیکنالوجی کالج کے نصاب پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ سائنس اور مذہبی علوم کے مضامین دونوں کی عزت اور تکریم میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔

آپ کے مخلص۔

[۱۴۰] برٹش ہیومنسٹ ایسوسیشن نیوز، مارچ اپریل ۲۰۰۶

[۱۴۱] آبزرور ۲۲ جولائی ۲۰۰۴ : http://observer.guardian.co.uk/magazine/story/۰,۱۱۹۱۳,۱۲۵۸۵۰۶,۰۰.html

### بیداریٔ شعور ایک بار پھر – Consciousness Raising – Once Again

[۱۴۲] آکسفورڈ ڈکشنری اس لفظ کی تاریخ کو ۱۹۳۵ کی امریکی جیل خانوں میں رائج بازاری بولی سے منسلک کرتی ہے۔ ۱۹۵۵ میں پیٹر وائیلڈ بلڈ نے اپنی مشہور کتاب "خلاف قانون۔ Against the Law" میں gay کی تعریف لکھتے ہوئے اسے ہم جنس پرستی کے بارے میں امریکی خوش کلامی سے تعبیر کیا۔

[۱۴۳] http://observer.guardian.co.uk/magazine/story/۰،۱۱۹۱۳،۱۲۵۸۵۰۲،۰۰.html

### مذہبی تعلیم کی ادبی تہذیب کے لئے خدمات

### Religious Education as Part of Literary Culture

[۱۴۴] شاہین نے تین کتابیں لکھی ہیں، جن میں مزاحیہ ڈرامے، غمناک ڈرامے اور تاریخی ڈرامے میں پائے جانے والے انجیلی اقتباسات کی علیحدہ علیحدہ فہرستیں مہیا کی گئی ہیں۔ ۱۳۰۰ کا حساب یہاں درج ہے:
http://www.shakespearefellowship.org/virtualclassroom/StritmatterShaheenRev.htm

[۱۴۵] http://www.bibleliteracy.org/Secure/Documents/BibleLiteracyReport۲۰۰۵.pdf

## باب نمبر ۱۰: ایک انتہائی ضروری خلاء؟

## Chapter ۱۰: A MUCH NEEDED GAP?

### تسلّی یا دلاسا Consolation –

[۱۴۶] جہاں تک میری یاداشت ساتھ دیتی ہے، یہ دلیل آکسفورڈ کے فلسفی ڈیریک پارفٹ کی گڑھی ہوئی ہے۔ میں نے اس کے آغاز پر پورے طریقے سے تحقیق نہیں کی کیونکہ میں اسے محض فلسفیانہ تسلّی کی مثال کے طور پر استعمال کر رہا ہوں۔

[۱۴۷] بی بی سی نیوز میں پیش کی گئی http://news.bbc.co.uk/1/hi/special_report/۱۹۹۹/۰۲/۹۹/cardinal_hume_funeral/۳۷۲۲۶۳.stm

### تمام برقعوں کی ماں -- The Mother of All Burkas

[۱۴۸] وولپرٹ ۱۹۹۲